تذکرۃ الخلیل

حیات طیبہ

قدوۃ العلماء تاج المحدثین زبدۃ الفقہاء سراج المناطقہ

الامام الہمام الاوحد مولانا الشیخ خلیل احمد المدنی المہاجر قدس سرہ

مؤلفہ

حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مکتبہ قاسمیہ

پسرور روڈ ○ سیالکوٹ شہر

تذکرۃ الخلیل

حیاتِ طیبہ

قدوۃ العلماء تاج المحدثین زبدۃ الفقہاء سراج المناظرین

الامام الہمام الاوحد مولانا الشیخ خلیل احمد المدنی المہاجر قدس سرہٗ

مؤلفہٗ

حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مکتبہ قاسمیہ

رنگ پورہ روڈ ○ سیالکوٹ شہر

طباعت سرورق : ریپن پریس لمیٹڈ لاہور

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا

الحمد للہ کہ سوانح قدوۃ العلماء تاج المحدثین زبدۃ الفقہاء سراج السالکین

الامام الہمام الاوحد مولانا الشیخ ابی ابراہیم خلیل احمد المدنی المہاجر قدس سرہ

بنام

تذکرۃ الخلیل

جس کے ضمن میں حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی، مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، مولانا الحاج صدیق احمد صاحب انبہٹوی اور

مولانا الحاج الشیخ عبد الرحیم صاحب رائپوری قدس اللہ اسرارہم کے پیارے حالات بھی آگئے ہیں،

اور ہندوستان کی مشہور دینی درسگاہ مظاہر العلوم کے دار الطلبہ وکتب خانہ اور قدیم دار الحدیث

کے تین عکسی فوٹو مطبوعہ بھی شامل ہیں:

مؤلفہ

بندۂ حقیر فقیر طالب فیوض نامتناہی محمد عاشق الٰہی عفی اللہ عنہ میرٹھی

ناشر

مکتبہ قاسمیہ رنگپورہ روڈ سیالکوٹ شہر

نام کتاب ـــــ تذکرۃ الخلیلؒ

مؤلف ـــــ حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ

طابع ـــــ محمد شریف قاسمی

ناشر ـــــ مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ

تزئین و آرائش ـــــ سید انور حسین نفیس رقم لاہور

مطبع ـــــ اعوان پرنٹنگ پریس سیالکوٹ
اقبال پرنٹنگ پریس سیالکوٹ

صفحات ـــــ ۴۷۲

قیمت مجلد ـــــ دس روپے پچاس پیسے

تاریخ اشاعت ـــــ ربیع الاول ۱۳۸۹ھ مطابق مئی ۱۹۶۹ء

دریا بحباب اندر

آغازِ سخن

مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ کی یہ خوش بختی ہے کہ اس کو حق سبحانہ نے "تذکرۃ الخلیلؒ" کی دوبارہ اشاعت کی توفیق ارزانی فرمائی۔ تذکرۃ الخلیل پہلی بار شائع ہونے کے بعد دوبارہ شائع نہ ہوسکی ——— اس کی پہلی اشاعت خود کتاب کے مؤلف حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی مرحوم کی جلیل القدر مساعی کی رہینِ منت ہے۔

چونکہ چھپنے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں کتاب نایاب ہوگئی تھی اس لئے تشنگانِ معرفت اور طالبانِ حقیقت کے ذوق وشوق میں ایک عرصہ سے تلاطم تھا۔ اور مشتاق نگاہیں حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ العزیز سے استفادے اور ان کی سیرت کے مطالعہ کے لئے بیتاب تھیں۔

پاکستان بننے کے بعد بعض خود غلط افراد نے جب اکابر علمائے دیوبند کے دامانِ احترام کو اپنی ناجائز ہرزہ سرائیوں کا نشانہ بنایا تو شوقِ طلب کی بے تابیوں میں اور اضافہ ہوا۔

مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی ذات گرامی چونکہ طبقۂ علماء میں اپنی شانِ جامعیت کی وجہ سے ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ بیک وقت بہترین متکلم، بزرگ ترین محدث، بلند ترین فقیہ، نیک ترین عارف اور صوفی تھے ——— یہ حقیقت ہے کہ مسلک اہل السنت کا علم کلام کی روشنی میں تحقیقی مطالعہ کرنے طالبانِ حدیث کیلئے فنِ حدیث کے معارف جاننے، اربابِ فتویٰ کے لئے فقہی مسائل کی باریکیاں سمجھنے اور تصوف وسلوک کے بارے میں معرفت وحقیقت کے دقائق معلوم کرنے والوں کے لئے آپ کی ذات بہترین مرجع ہے ——— اس لئے تذکرۃ الخلیل کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت ہے۔

مکتبہ قاسمیہ کو وقت کی اس ضرورت کا عرصہ سے احساس تھا مگر حالات کی نامساعدت

اور کتاب کی نایابی طباعت کی راہ میں حائل تھی ــــــ تقریباً چھ ماہ کی تلاش و جستجو کے بعد ایک مخلص دوست سے ایک پرانا نامکمل نسخہ ملا۔ کتابت شروع کرانے کے بعد مکمل نسخہ کی تلاش جاری رکھی اور ملک کے مختلف حصوں میں اس کی خاطر سفر کیا۔ الحمدللہ کوشش کامیاب ہوئی اور اب کتاب مکمل ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کتاب میں کوئی ردّ و بدل نہیں کیا گیا پرانے نسخے کی ہو بہو نقل کر دی گئی ہے۔ صرف شروع میں ایک اجمالی فہرست بنا کر لگا دی گئی ہے۔ تاکہ کسی مضمون کو تلاش کرنے میں تکلیف نہ ہو۔

اس سلسلے میں میں اپنے اُن احباب کرام اور بزرگان گرامی قدر خصوصاً محترم جناب سیّد انور حسین الحسینی نفیس رقم لاہور کا تہ دل سے شکر گذار ہوں کہ جنہوں نے کتاب کی تلاش کے سلسلے میں میری خصوصی مدد فرمائی۔ اور ان ہی کی کوششوں سے کتاب اس مکمل صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔

نیز خصوصیت سے اپنے مربّی محترم حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی صدر دار العلوم الشہابیہ سیالکوٹ کا ممنونِ احسان ہوں کہ جن کی پدرانہ شفقت و محبت اور خصوصی عنایات کی بدولت میں یہ کتاب پیش کرنے کے قابل ہوا ہوں۔ فقط

محمد شریف قاسمی
ناظم مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ

عرضِ مصنف

مبسملاً و حامداً و مصلیاً و مسلماً

بندۂ ناچیز عاشق الٰہی عرض کرتا ہے کہ تالیف کی دشواریاں وہی سمجھتا ہے جس کو اس کا اتفاق پیش آیا ہو۔ خصوصاً سوانح عمری جس کا مدار حافظہ و یادداشت پر ہے۔ کہ زندگی میں کسی کو پتہ نہیں کون پہلے مرے گا کون پیچھے۔ اور اس لئے واقعات کے ضبط کرنے کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ پھر سوانح بھی جب کسی جامع شریعت و طریقت بزرگ کی ہو جس کی عمر کا ہر لمحہ دین کے کسی علمی و عملی نرالے رنگ میں گذرا ہو کہ کوئی سال چھوڑنے کے بھی قابل نہیں۔ اور کوئی ہر وقت ساتھ بھی نہیں رہا کہ تمام کارناموں کو محفوظ کرلے اور اگر صاحب سوانح مؤلف کا روحانی باپ ہو تب تو اس کی دشواری کا ٹھکانا ہی نہیں رہتا کہ یہ تعلق دردِ فراق سے رونے پر مجبور کرتا اور چلتے ہوئے قلم کو بھی پکڑ لیتا ہے۔ ایسی اہم خدمت پر احباب اور بزرگوں نے مجھ جیسے نااہل کو مجبور کیا اور وہ بھی ایسے وقت کہ دماغ و دل بیکار ہو چکا اور ہاتھ میں رعشہ بڑھ گیا تھا۔ برادرانِ طریقت سے مدد چاہی کہ اپنی معلومات قلم بند کر کے بھیج دیں تو اکثر جگہ سے جواب آگیا کہ کچھ یاد ہی نہیں ہے اور بعض حضرات نے اپنے مکاتیب بھیج دیئے کہ اس سے انتخاب کرلو۔

یہ ایک مستقل دردسری تھی اور وہ بھی ناتمام۔ ہاں بعض حضرات نے کچھ معلومات بھیجیں جن کا شکر گذار ہوں مگر ضرورت تھی ہر عنوان میں کچھ نہ کچھ مدد کی اور وہ کہیں سے نہ ملی۔ سفر بھی کئے تقاضے کے خطوط بھی بار بار جگہ جگہ لکھے مگر جب کچھ نہ بن پڑا تو اپنی ہی یادداشت پر اکتفا کر کے بنام خدا قلم ہاتھ میں لے لیا اور سرسری فکر سے جو کچھ یاد آتا گیا لکھنا شروع کر دیا۔

چونکہ بچپن سے اس کی عادت ہے کہ جب تک کاتب کے اوقات ضائع کا بوجھ نہ پڑے کوئی مضمون لکھا نہیں جاتا اس لئے کتابت و طباعت کا ساتھ ساتھ معاملہ کر لیا۔ اتفاق کی بات کہ میری بھتیجی مرض احتباس نفاس میں مبتلا ہو گئی اور ایک مہینہ سے زیادہ اس کو سرسامی دورے پڑے کہ ہر وقت تیمار داری ضروری تھی۔ آخر اس کا انتقال ہو گیا۔ اور مہینہ بھر بعد اس کی نشانی بچی جس کی ولادت ماں کے لئے مرض الموت بنی تھی نیز رخصت ہو گئی۔

اسی اثنا میں بعض مخلصین دوستوں کی خدمت علالت اور دیگر ضروریات سے بار بار سفر پیش آیا اور دو مہینے یہ حالت رہی کہ ہفتہ میں تین دن کے لئے گھر آتا اور ہفتہ بھر کا مضمون لکھ کر کاتب کے حوالے کر کے دوسرے سفر میں چلا جاتا تھا۔ اس سراسیمگی میں چلتے پھرتے پریشان و متفرق اوراق پر اس کا مضمون لکھا گیا کہ نظر ثانی کی بھی نوبت نہیں آئی اور ساتھ ساتھ لکھائی و چھپائی ہو کر چار مہینے میں مطبوعہ کتاب بن گئی۔ صرف حق تعالیٰ شانہ کا فضل تھا کہ اس نے کام لے لیا ورنہ ظاہری لحاظ سے مجھے حق نہیں ہے کہ اس کو حضرت کی حیات طیبہ کی سوانح کہہ سکوں۔ الحاصل جو کچھ بھی ہوا وہ نمونہ دکھانے کے لئے ضرورت پوری کرنے کے درجے میں اس وقت پیش کرتا ہوں ؏

گر قبول افتد زہے عزو شرف

اور التجا کرتا ہوں کہ زلت و لغزش سے چشم پوشی فرما کر دعائے خیر میں یاد رکھیں ؎

احب الصالحین ولست منهم
لعل الله یرزقنی صلاحا

کیا عجب ہے کہ دوبارہ طبع ہو تو اس سے اچھی حالت میں ہو جائے۔

وصلی الله تعالیٰ علی سیدنا محمد وآلہ وسلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم ○

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی | کز تو مجنوں شد پریشان و غوی
از ہمہ خوباں تو افزوں نیستی | گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی
دیدۂ مجنوں اگر بودے ترا | ہر دو عالم بے خطر بودے ترا

تیرہ سو برس سے زیادہ زمانہ گزرا کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے ظلمت کدۂ عالم کو نور بخشنے والا پیغمبر دنیا میں بھیجا جس کے ہاتھ میں سیادت نسل کا جھنڈا اور سر پر خاتمیت انبیاء کا تاج تھا کہ قحط کی ماری ہوئی سوکھی زمین اس کے قدموں کی برکات سے لہلہانے لگی۔ اور تاریکی میں ڈوبا ہوا ملک اس کے چمکتے ہوئے چہرہ کی شعاعوں سے جگمگا اٹھا۔ وہ مخلوق جس کے قلوب اپنے پیدا کرنیوالے خدا سے اتنے ناآشنا ہو چکے تھے کہ اپنی جیسی حادث و فانی ہستیوں بلکہ اپنے ہاتھوں گھڑی ہوئی مٹی اور لکڑی کی مورتوں کو عالم میں تصرف کرنے والا خدا سمجھ بیٹھے اور کفر و شرک کو دین و ایمان بنائے ہوئے تھے۔ دفعۃً چونکے اور آخر اس مقناطیسی کشش کی طرف منجذب ہو کر جو آہن کو پارس بنانے کی غرض سے آئی تھی۔ ایسے موحد بنے کہ دنیا میں شرک کا وجود ان کو شاق گزرنے لگا۔ اور ان کی منتہائے مراد صرف یہ رہ گئی کہ سطح عالم پر جو بھی پیدا ہو وہ کاش بجز حق تعالیٰ کے کسی کا بھی بندہ و غلام نہ بنے۔

اللہ اللہ۔ یا وہ وقت تھا کہ جس دن آپ نے توحید کا اعلان کیا۔ تو ایک شخص بھی آپ کا ہمنوا نہ تھا۔ بلکہ آپ کی الوکھی صدا کو بچہ بچہ حیرت و رنج و غصہ اور عتاب و دشمنی کی تیز نظروں سے دیکھتا تھا۔ اور یا تئیسویں سال وہ وقت آیا کہ آپ محبارہ شوق میں اپنے محبوب خدا کا فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے گھر سے نکلے تو ایک لاکھ سے زیادہ مجمع جس میں بچے اور بوڑھے مرد اور عورت ملکی و غیر ملکی امراء و فقراء حکام و محکومین سب ہی شامل تھے عاشقانہ و غلامانہ طریق پر آپ کے ہمرکاب اور آپ کی ہر ہر ادا پر عاشقانہ و والہانہ طرز پر جان نثار کرنے والے ساتھ تھے جن میں ہر فرد صرف ہدایت یافتہ

ہی نہیں، بلکہ ہادی و راہبر ہونے کی سند لے چکا اور اُس کو سید ولد آدم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ پروانہ عطا ہو چکا تھا کہ اِنَّ اَصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم[1] حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین مبین کی پائیدار تخم ریزی چونکہ ختم دنیا تک قائم رہنے والی تھی۔ اور آپ کے ہاتھوں کا لگایا ہوا باغ قیامت تک باقی و قائم رہنے والا تھا۔ اس لئے آپ کے روشن کئے ہوئے چراغوں کا سلسلۂ نور رسانی متعدی ہوا اور ایک مشعل سے دوسری مشعل اور ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہو کر ہر قرن اور ہر زمانے میں ہر ملک اور ہر بستی کے اندر اس نور کا مخلوق کو نظارہ کراتا رہا جس کا اصل مخزن قلب محمدی اور جس کا مشکوٰۃ سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود تھا۔

کہ حضرت روحی فداہ خود ارشاد فرما چکے تھے علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل یہ علماء امت جنہوں نے اپنے پیشوا اپنے امام اپنے ہادی اپنے سرپرست اپنے آقا اپنے مولیٰ اور اپنے مورث اعلیٰ سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے عالم قدس کو روانہ ہو جانے کے بعد آپ کی نیابت میں فرائض نبوت کو انجام دیا، اور مخلوق کی رہبری کو اپنا مقصود حیات بنا دیا۔ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں جن کی تعداد حیطۂ شمار سے باہر اور انسانی حد و حساب سے بیرون ہے۔

اسی گروہ کے ایک فرد کا جن کا مبارک نام مولانا خلیل احمدؒ ہے یہ شیریں تذکرہ ہے۔ کہ اہل اللہ کے حالات اور سوانح میں بھی قدرت نے ایک ایسی حلاوت اور کشش عطا فرمائی ہے۔ جو مظلم قلوب کو نور اور افسردہ دلوں کو تازگی بخشتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان حضرات کے کارنامے صدقات جاریات بن جاتے ہیں، کہ بزمانہ حیات جس طرح مخلوق نے ان کی صحبت کے نظارہ سے ہدایت کا [illegible] پایا ہے۔ اسی طرح بعد الوفات ان کے حالات عالیہ کی سماعت و مطالعہ سے توجہ الی اللہ کا نفع پاتی اور رغبت و شوق کے ساتھ یہ کھنچی ہوئی اپنے خدا کی طرف لپکتی ہے ؎

احب الصالحین ولست منھم لعل اللہ یرزقنی صلاحا

ایک ہرے بھرے باغ میں ہزارہا قسم کے پھول ہوتے ہیں، جن میں ہر ایک کا رنگ دوسرے سے جدا اور ہر ایک کی بو دوسرے سے الگ ہوتی ہے۔ لیکن اگر بلبل صرف گلاب کی پتیوں پر

---

[1] میرے صحابی مثل ستاروں کے ہیں، کہ جس کا اتباع کرلوگے، راہ یاب ہو جاؤ گے ۱۲

صد قسے اور وارسی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے پھول پھول نہیں یا ان کی بوئے خوش چھپانے کے قابل نہیں۔ اسی طرح امت محمدیہ کے ہزاراں ہزار سرداران ملت میں سلفاً و خلفاً ہر بزرگ ایک جدا دلربائی لایا ہے جس کے میٹھے تذکرہ سے روح کو فرحت پہنچتی ہے، مگر باوجود اس کے بندۂ ناچیز گلستانِ رشیدی کے ایک خاص نونہال کے تذکرہ کی طرف صرف اس لئے متوجہ ہوا کہ میری پیاس بجھانے اور ہر آن و ہر لمحہ مجھ پر ایک خاص احسان فرمانے میں اس مقدس ہستی کو خاص دخل تھا۔ اس لئے جس طرح کسی دلق پوش بے نوا فقیر سے پوچھا جائے گا کہ تجھے سب سے پیارا کون ہے۔ تو وہ کہے گا، کہ میرا باپ، اسی طرح مجھ سے اگر کوئی سوال کرے گا، کہ تیرے نزدیک بزرگ تر کون ہے۔ تو میرے روئیں روئیں سے یہی نکلے گا، کہ مولانا خلیل احمد قدس سرہ العزیز۔ مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے ؎

گفت معشوقے بعاشق کاے فتے	تو بغربت دیدۂ بس شہر ہا
پس کدامی شہر زاںہا خوشتر است	گفت آں شہرے کہ دروے دلبر است

بایں ہمہ اعتقاد ہے۔ کہ اموات ہوں یا احیاء اور اسلاف گزشتہ ہوں یا اخلاف موجودہ جتنے بھی اہلِ حق نائبین رسالت ہیں۔ اپنے سر کے تاج اور محبوب و مطاع ہیں۔ کہ گو الوان مختلف اور طریق تربیت الگ الگ ہیں مگر سب ایک بحرِ توحید کے غواص اور ایک دریائے ہدایت کی نہریں ہیں۔ حق تعالیٰ ان کے مراتب عالیہ میں ترقیات بخشے اور مخلوق کو ان کی ذات سے دینی برکات حاصل کرنے کا تا دیر وقت عطا فرمائے کہ یہی حضرات بقائے کائنات عالم کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

کسی بزرگ کی سوانح لکھنا درحقیقت اس کا منصب ہے جو صاحب سوانح کے حالات ظاہریہ و باطنیہ سے واقفیت کاملہ اور اس کے ساتھ مناسبت و مجانست تامہ رکھتا ہو کہ ہر قول و فعل کو جو کہ ثمرہ ہے، حالت قلبیہ کا وزن کر سکے اور اس کو اپنے موقع پر استشہاد میں لا سکے۔ مگر بندۂ ناچیز کا حال یہ کہ اپنے مشاغل دنیا میں منہمک رہنے کی وجہ سے حاضری کا اتفاق بھی بار ہا ایک دو دن سے زیادہ نصیب نہ ہوتا تھا۔ اور مناسبت کا تو ذکر ہی کیا کہ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" مشہور مقولہ ہے۔ لہٰذا حضرت کے علم دوست اعزہ اور اہل مدرسہ سے منتظر تھا کہ

اس خدمت کو انجام دے کر ایک حجّم غفیر کو مرہونِ منت اور خوش وقت بنائیں گے۔ مگر افسوس کہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ اور آخر یہ سمجھ کر کہ عمر کا ہر لمحہ غنیمت ہے۔ جتنا وقت بھی اس خیال و دھیان میں گزر جائے نعمت ہے۔ اور مشتے نمونہ از خروارے جو کچھ بھی ہدیۂ ناظرین ہو سکے مبارک ہے۔ اس شغل کی طرف مائل ہوا اور شوق پورا کرنے لگا۔ کہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔

اس ترتیب سوانح میں بڑا دخل میرے بزرگوں حضرت مولانا رحیم بخش صاحب و الحاج شیخ رشید احمد اور مخلص دوستوں حضرت مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کو ہے۔ کہ ان حضرات کا حکم اور اصرار ہوا جس کی تعمیل سے انکار کو سوءِ ادب سمجھا ورنہ ایمان کی بات یہ ہے۔ کہ میں اپنی بے بضاعتی و ناکارگی کے سبب حضرت کی سوانح لکھنے کا اہل نہیں اور نہ وہ قابلیت اپنے اندر پاتا ہوں جو کسی جامع شریعت و طریقت شیخ کی سوانح عمری کے لئے ضروری ہے۔ رہا تذکرۃ الرشید کا قصہ کہ جس کی وجہ سے احباب کی نظریں میری طرف اٹھیں سو حقیقت یہ ہے۔ کہ اس کی تسطیر و تکمیل جو کچھ بھی ہوئی۔ وہ خود حضرت قدس سرہ کی توجہات روحانیہ اور اعانت قلبیہ و لسانیہ کی بدولت ہوئی جس پر مجھے خود حیرت و استعجاب ہے۔ مگر اب خود حضرت کی سوانح کس قلب اور کس قلم سے لکھوں کہ خود یتیم اور مصدوم القلب ہوں اور یوں بھی بائیس سال کا زمانہ گزر جانے کے سبب نہ وہ امنگ و ابھار رہا ہے اور نہ قلب و قلم میں وہ طاقت و زور کہ ہر قوت انحطاط پذیر ہے مگر سمجھتا ہوں۔ اس وقت سوانح کا مقصود تمامی احوال کا استیعاب تو ہے نہیں کہ جس شخص نے اپنی عمر کے ستر سال کے ان گنت لمحات کو دینی خدمات میں صرف کیا۔ اس کا وہی احاطہ کر سکتا ہے۔ جو ہر لمحہ ساتھ رہا اور ہر قول و فعل کو ضبط و محفوظ کرتا رہا ہو اور ایسا دنیا میں کوئی ہے نہیں۔ بلکہ جس کے ساتھ قلوب کو محبت و عقیدت ہوتی ہے، اس کی زندگی میں کسی کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ وہ دن بھی خدا دکھائے گا۔ کہ یہ سایہ ہمارے سروں سے اٹھ جائے گا۔ اور لوگ ہم سے خواہشمند ہوں گے کہ ان کی سوانح لکھو۔ اس لئے جو واقعات نظر کے سامنے گزرتے بھی ہیں۔ وہ محفوظ نہیں رہتے اور اگر ان کو سوچا بھی جائے تو زلت و غلطی کا احتمال ان کو لکھنے سے روکتا ہے۔ اور ان وجوہ سے صاحب سوانح کے متوسلین جن سے بھی درخواست کی جائے۔ کہ اپنی معلومات

لہ جو چیز سب نہ مل سکے۔ اس کو بالکل چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ ۱۲

قلم بند کر دیجئے۔ کہ سب کو فراہم کر کے سوانح مرتب کر لی جائے تو چار طرف سے سکوت یا یہ جواب ملتا ہے۔ کہ کوئی بات بھی یاد نہیں بایں وجہ سوانح میں کسی بزرگ کے ہزار کمالات میں ایک کمال کا اظہار بھی دشوار ہے۔ البتہ محض نمونہ کے درجہ میں چند محاسن تذکرہ میں آجاتے ہیں جن کا مقصود صرف یہ ہے۔ کہ جن قلوب میں تعلق مع اللہ کی استعداد ہے۔ ان کو اتباع کا شوق و رغبت پیدا ہو جائے۔ اور یہ ذریعہ بن جائے ہدایت اور اس نور کے شیوع کا جو بوساطت اکابر امت سلسلہ بہ سلسلہ قلب محمدی کی مشعل و مشکوٰۃ سے حاصل ہوا۔ اور تا روز قیامت منور و منتقل ہوتا رہے گا۔

پس جو کچھ بھی بن پڑا شکستہ دلی و ہجوم قلب کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں پیش کرتا ہوں اور ہم عصر حضرات سے ملتجی ہوں کہ مورخ کی مشکلات اور نااہل کی دشواریوں پر نظر فرما کر مسامحت و چشم پوشی سے کام لیں اور ناقدانہ و معترضانہ نگاہ نہ ڈالیں کہ اپنے علمی وعملی ہر قسم کے ضعف کا مجھے خود اقرار ہے۔ جس نیت سے قلم اٹھانے کی جرأت ہوئی ہے۔ حق تعالیٰ اس کو قبول اور زلت قلم کو محو و معاف فرمائے تو انشاء اللہ کسی درجہ میں میرے اور نیز ناظرین کے لئے دینی بہبودی اور روحانی نفع سے خالی نہیں۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ۔

نسبی شرافت

خدا در انتظار حمد ما نیست	محمد چشم بر راہ ثنا نیست
خدا حمد آفرین مصطفےٰ بس	محمدؐ حامد حمد خدا بس
مناجاتے اگر خواہی بیاں کرد	بہ بیتے ہم قناعت میتواں کرد
محمد از تو میخواہم خدا را	الٰہی از تو حب مصطفےٰ را

سہارنپور سے ۱۲ میل بجانب جنوب شرفا کی ایک قدیم بستی ہے جس کو بزمانہ فیروز تغلق بادشاہ ۷۱۲ھ میں سپہ سالار فوج سعد اللہ بیگ نے آباد کیا۔ اور فیروز آباد نام رکھ کر فوجی کیمپ قرار دیا تھا۔ کچھ مدت کے بعد اس قصبہ کی شہرت انبہٹہ کے نام سے ہو گئی۔ جس کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ کہ بعض کہتے ہیں، اس زمین کی صلاحیت اور زراعت و غلہ جات کی کثرت پیداوار کے سبب اس کا نام انبہٹہ ہوا کہ آن غلہ کو کہتے ہیں، یا چونکہ انب اس جگہ بکثرت ہوتا تھا۔ اس لئے انب ہٹہ یعنی انبہ کی آڑھت اور منڈی

بن کر انبہٹہ کہلانے لگا۔ بہرحال اس زمین کو عربی النسل خاندانوں کی بود و باش کا فخر حاصل ہوا کہ صدیقی و فاروقی و ایوبی شیوخ اس میں آباد ہوئے اور سنہ ۱۰۰۰ھ میں امام وقت حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سرہ نے اس کو قیامگاہ بنا کر اس فخر میں بیش از بیش اضافہ کر دیا۔ کہ آپ کا وطن بن جانے کے بعد اس کا نام انبہٹہ پیرزادگان ہو گیا۔ کیونکہ آپ نسباً سید اور مشرباً خاندان چشتیہ کے چمک دار ستارہ تھے جن کے نور سے بستی اور اس کے نواح معمور ہوئے اور آپ کے صاحبزادے شاہ محمد باقر کی پوتی محفوظ بی بنت نظام الدین ایوبی خاندان میں شاہ غلام محمد سے بیاہی گئیں کہ اس رشتہ سے یہاں کے انصاری شیوخ شاہ ابوالمعالی کی دختری اولاد میں ہوئے اور پیرزادے کہلائے ابوالمعالی متوکلانہ و فقیرانہ شان سے ایام گزاری کرتے کچے کوٹھے میں رہتے اور فاقہ و گمنامی کو محبوب سمجھتے تھے مگر آپ کا نور چونکہ پھیلنے والا تھا اس لئے شہرت مقدر تھی۔ اور آج ایک کثیر مخلوق آپ کی ثنا خواں ہے۔

شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ جن کا وطن ٹھسکہ میرانجی ضلع انبالہ تھا حضرت شاہ ابوالمعالی کے خادم خاص اور عاشق جاں نثار تھے۔ ایک مرتبہ بارش زیادہ ہوئی۔ اور شاہ بھیک اپنے وطن میں تھے کہ بارش کی کثرت دیکھ کر فکر ہوا میرے پیر کا کچا کوٹھا بارش سے گر گیا ہوگا۔ اس لئے بے چین ہو کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں دریا پڑتا تھا جس میں کشتی بھی نہ تھی۔ مگر اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر عبور کر گئے رات ہی رات چل کر صبح کے وقت انبہٹہ پہونچے اور دیکھا کہ درحقیقت کوٹھا گر گیا اور شیخ باہر بیٹھے ہیں۔ سلام کیا اور شیخ کے دریافت کرنے پر اپنے مضطربانہ سفر کی وجہ بیان کر کے مٹی لا لا کر کوٹھا دوبارہ تعمیر کر دیا۔

شیخ ایک مرتبہ کسی مخلص کی استدعا پر سہارنپور آئے تو شاہ بھیک ساتھ تھے اور ان کو معلوم تھا کہ پیرانی صاحبہ اور صاحبزادہ کو فاقے پر فاقے ہوتے ہیں۔ اس لئے جب حضرت شیخ کی دعوت ہوتی تو شاہ بھیک علیحدہ جا کر یہ طے کر لیتے کہ دو آدمی کا کھانا زائد دینا پڑے گا۔ چنانچہ عشا کی نماز شیخ کے ساتھ پڑھتے اور اس کے بعد دو نفر کا کھانا لے کر انبہٹہ روانہ ہو جاتے۔ دستک دے کر دروازہ کھلواتے اور کھانا حوالہ کر کے الٹے پاؤں واپس ہوتے حتیٰ کہ شیخ جب تہجد کے لئے حسب معمول اٹھتے تو شاہ بھیک لوٹا بھر کر پیش کرتے۔ چند روز بعد جب حضرت ممدوح انبہٹہ آئے اور بی بی سے پوچھا کہ کیوں کر گزری تو ان کو تعجب ہوا اور کہا کہ اس دفعہ تو تم روزانہ کھانا بھیجتے رہے پھر گزر کا سوال کیسا؟ اور بیان

کیا کہ دو گھڑی رات گزرنے پر پہر رات تمہارے شاہ بھیک کھانا لاتے۔ اور واپس ہو جایا کرتے تھے۔ شیخ یہ سن کر خاموش ہو گئے اور باہر آ کر شاہ بھیک سے پوچھا۔ تو انہوں نے صورت حال عرض کی اور کہا کہ اماں جی اور صاحبزادہ صاحب تو فاقہ کرتے اور بھیک اپنا پیٹ بھرتا۔ اس کو غیرت نے گوارا نہیں کیا۔ شیخ کو اس جواب پر مسرت ہوئی۔ اور یہ فرما کر کہ تو نے میرے توکل میں تو فرق ضرور ڈالا مگر خدمت کا حق ادا کر دیا۔ اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اور روحانی نعمت جو کچھ دینی تھی، وہ عطا فرما دی۔ شاہ بھیک نے اپنے قلب کو نور معرفت سے معمور دیکھا تو شیخ کے قدم چوم لئے۔ اور مستانہ وار شوق میں یہ دوہا زبان سے نکلا۔

بھیکا مالی پر واریاں پل میں سو سو بار — کاگا سے ہنس کیا اور کرت نہ لاگی بار

یعنی بھیک (اپنے مرشد) ابوالمعالی پر آن سو سو دفعہ قربان ہو کہ انہوں نے اس کو زاغ سے ہنس (یعنی ناکارہ و نااہل سے اہل) بنا دیا اور (ایسی جلدی بنایا کہ) دیر بھی نہ لگی۔ ادھر سینہ سے سینہ لگا اور ادھر ولایت و معرفت الٰہیہ نصیب ہو گئی)

سنہ ۱۱۲۲ھ میں شاہ ابوالمعالی نے وصال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے کہ بستی کی غربی جانب آپ کی خانقاہ اور مزار اب بھی موجود ہے آپ کے خلیفہ حضرت شاہ مدار اپنے شیخ کے جانشین ہوئے جن کا مزار سمت مشرق ہے اور دوسرے خلیفہ حضرت شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ نے موضع کوہرام میں قیام کیا۔ اور وہیں وصال فرما کر مدفون ہوئے محمد شاہ بادشاہ کا وزیر روشن الدولہ حضرت شاہ بھیک سے بیعت اور آپ کا مخلص مرید تھا۔ اس نے اپنے دادا پیر شاہ ابوالمعالی کے پوتوں شاہ امام الدین اور شاہ نظام الدین کو صوبہ بنا دیا تھا کہ مخدوم بن کر آرام سے زندگی گزاریں۔ ایک مرتبہ ملک میں امساک باراں ہو کر قحط پڑا اور مخلوق گھبرا گئی۔ تو محمد شاہ نے وزیر سے کہا کہ میں تو تمہارے پیر کا معتقد اس وقت ہوں گا، جب کہ کل کو بارش ہو۔ روشن الدولہ نے عرض کیا کہ حضور میرا پیر خدا تو نہیں تھا، کہ بارش برسانا اس کے اختیار میں ہو۔ البتہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ اس لئے واسطہ دے کر اللہ سے دعا کروں گا۔ کیا عجب ہے کہ قبول ہو جائے۔ چنانچہ عشاء سے فارغ ہو کر تمام رات جاگا۔ اور دعا مانگی کہ یا اللہ شاہ بھیک کا واسطہ مجھ فقیر کو بھیک دے۔ آخر شب میں غنودگی طاری ہوئی اور خواب میں شاہ بھیک کی زیارت ہوئی کہ فرماتے ہیں، کیوں گھبراتے ہو تمہاری دعا قبول ہوئی اور فلاں وقت بارش ہو گی، صبح کو روشن الدولہ دربار میں آیا تو بادشاہ نے پوچھا کہو۔ دعا

بھی مانگی ہو مت کیا کہ ہاں جہاں پناہ مانگی اور الحمد اللہ قبولیت کی بشارت بھی ملی کہ فلاں وقت بارش ہو جائے گی چنانچہ اسی وقت بارش ہوئی اور اتنا موسلادھار مینہ برسا کہ مخلوق نہال ہوگئی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر وزیر سے کہا کہ مانگو کیا مانگتے ہو وزیر نے جواب دیا کہ میرے پاس حضور کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ اب جو دینا ہو وہ میرے پیر کی اولاد پر وقف کر دیجئے۔ چنانچہ بائیس گاؤں مزار کو دوام پر وقف کیے گئے لیکن شاہ مہیک کے جانشین سجادہ نے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ یہاں جو کچھ آیا ہے۔ وہ حضرت ابوالمعالی کی عنایت و توجہ سے آیا ہے۔ لہذا وہی مقدس جگہ اس کی مستحق ہے۔ کہ اس پر وقف ہو۔ اس بناء پر معافی دوام شاہی عطیہ شاہ ابوالمعالی کی اولاد کے نام منتقل ہوا جس کی آمدنی چھ ہزار تھی۔ اور اب تک سجادگان شیخ اس پر قابض و متصرف ہیں۔

یہی انبہٹہ پیرزادگان حضرت مولانا خلیل احمد مہاجر مدنی قدس سرہ العزیز کا وطن ہے جو کہ آپ کے مرشد حضرت قطب العالم مخدوم الکل امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز کے وطن یعنی قصبہ گنگوہ سے پانچ کوس ہے اور آپ اسی ایوبی خاندان کے ایک ممتاز فرد تھے جن کو شاہ ابوالمعالی قدس سرہ کی دختری اولاد ہونے کے لحاظ سے سادات سے تعلق اور سید الاشراف سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ اس رحمی علاقہ کی وجہ سے بعض پیرزادگان نے اپنے کو نسباً سید سمجھا، مگر حضرت قدس سرہ نے سلسلۃ الانساب کو اجداد کے ساتھ اہم اور اصل قرار دے کر ہمیشہ اپنے آپ کو ایوبی بتایا کہ نسبی شرافت کے لئے یہ بھی کچھ کم نہیں کہ آپ کے جد امجد حضرت ابوایوب خالد انصاری صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ جن کا گھر اس مہاجر ماہتاب رسالت کا مدینہ میں سب سے پہلی قیام گاہ بنا جن کو اہل مکہ نے نا قدردان بن کر اپنے سے علیحدہ کیا تھا کہ اسی گھر سے نعمت ہائے خداوندی کی وہ تقسیم شروع ہوئی جس سے آج دنیا کا گوشہ گوشہ مالا مال ہو رہا ہے۔

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

چنانچہ آپ نے اپنے بھتیجے لطیف احمد سلمہ اللہ کو ان کے والد یعنی اپنے بھائی مولوی رشید احمد کے انتقال پر نسبی تحقیق کے جواب میں ایک خط تحریر فرمایا تھا جس کا ضروری حصہ بجنسہ درج کرتا ہوں "رشید احمد مرحوم ساکن انبہٹہ ضلع سہارنپور انصار کے خاندان میں سے تھے۔ اس لواح کے انصاری خواجہ ابوایوب رض کی اولاد میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے اجداد اصل گنگوہ کے رہنے والے ہیں۔ جو انبہٹہ سے پانچ کوس ہے۔

ان کے اجداد میں سے شیخ عبدالرشید کے والد ایک خانہ جنگی میں مقتول ہوئے اس لئے ان کی والدہ اُن کو اپنے میکہ سہارنپور میں لے آئیں اور ایک عرصہ تک سہارنپور رہیں۔ اس کے بعد ان کی اولاد میں سے شیخ غلام محمد کی شادی سید شاہ ابو المعالی کے خاندان میں ہوئی تھی اُس کے بعد سے اُن کی اولاد کا قیام انبہٹہ میں رہا۔ مرحوم کے والد کے دادا شاہ قطب علی صاحب انبہٹہ ہی میں رہے۔ چونکہ شاہ ابو المعالی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سید تھے۔ اس لئے شیخ غلام محمد کی جو اولاد سیدہ کے بطن سے ہوئی وہ اپنے آپ کو غلطی اور بے علمی سے سید سمجھتے رہے۔ مرحوم چونکہ پڑھے لکھے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس غلطی کو خلاف دیانت سمجھکر اپنے لئے پسند نہیں کیا۔ اور ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے اجداد انصاریین کی طرف منسوب کرتے رہے"

حضرت قدس سرہٗ کا جدی سلسلۃ الانساب جس کو حضرت کے چچازاد بھائی مولانا صدیق احمد رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ مولانا فاروق احمد صاحب سابق شیخ الحدیث ریاست بہاولپور نے تحریر فرما کر بھیجا اور حضرتؒ کے نواسہ داماد مولوی مسعود علی صاحب مدرس مظاہر علوم نے رسالہ المظاہر میں درج کیا ہے اس طرح ہے۔ مولانا شاہ خلیل احمد بن شاہ مجید علی بن شاہ احمد علی بن شاہ قطب علی بن شاہ غلام محمد بن شرف الدین خاں بن غلام محی الدین بن عبدالرشید بن محمد فیض بن نظام الدین بن امین الدین عرف قاضی امن بن خواجہ فرید الدین بن خواجہ محمد فاضل بن خواجہ ہاشم بن خواجہ علاؤالدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ نجم الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ عبدالحمید بن خواجہ کبیر بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ تاج الدین بن خواجہ منہاج الدین ...... بن خواجہ ہاشم بزرگ بن خواجہ ابی اسمٰعیل عبداللہ انصاری بن خواجہ ابی منصور محمد بن علی بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن ابی منصور مت بن ابی ایوب خالد الخزرجی الانصاری صحابی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کہ قسطنطنیہ کی جنگ میں شہید اور وہیں مدفون ہوئے۔

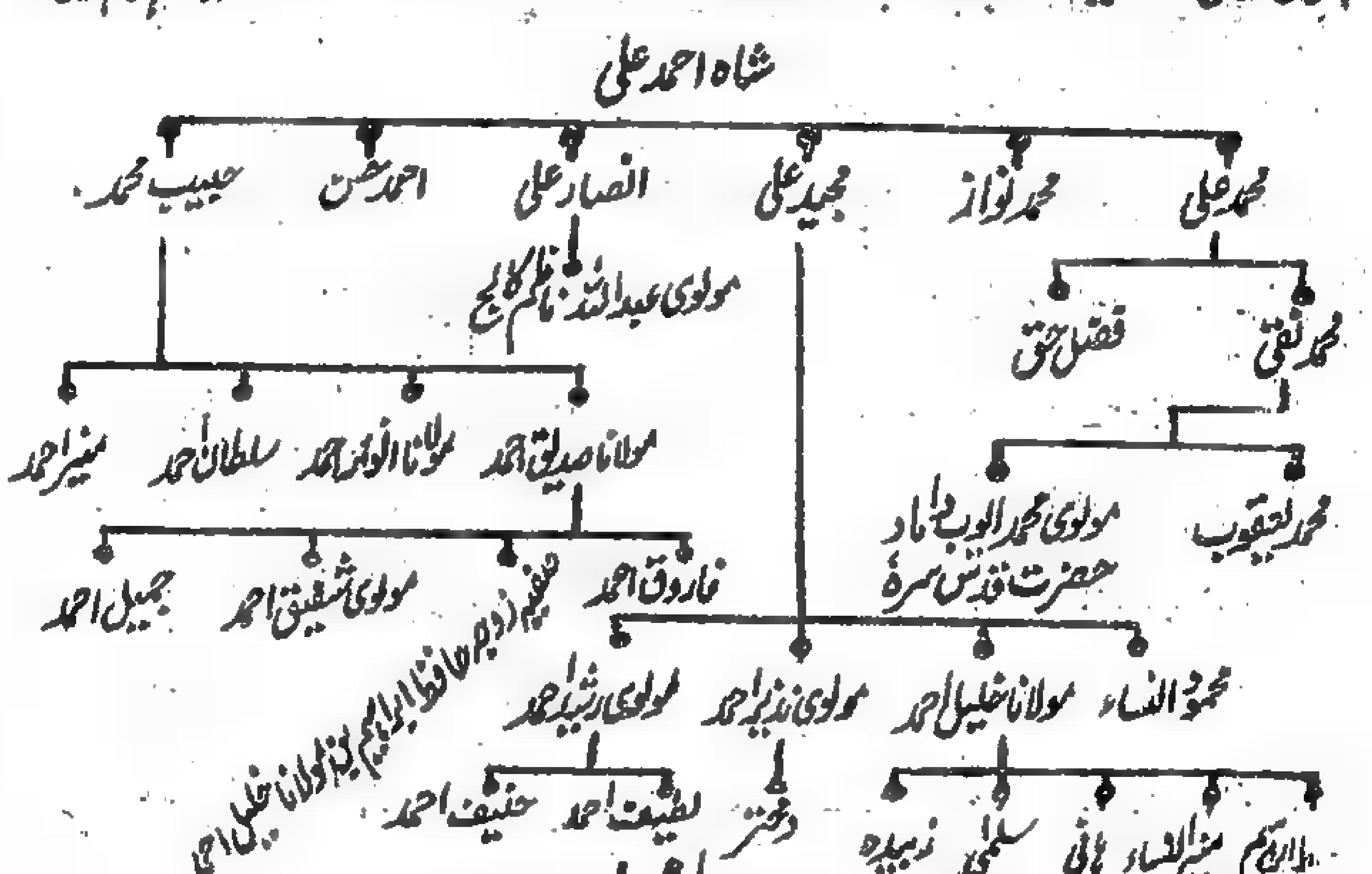
دسویں پشت یعنی قاضی امن پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب اپنے روحانی باپ حضرت مرشد گنگوہی قدس سرہ کے ننھیال نسب سے مل جاتا ہے جس کو بندہ

تذکرۃ الرشید کے شروع میں بحوالہ شیخ محمد شفیع قدوسی گنگوہی نقل کر چکا ہے۔ مگر بردو متعلقہ سلسلۃ الانساب میں اور بہرحال کچھ اختلاف ظاہر ہو رہا ہے کہ گنگوہی شجرۃ الانساب میں خواجہ فرید الدین اور خواجہ محمد فاضل کے درمیان خواجہ شاہ کا اور خواجہ شرف الدین و خواجہ عبد الحمید کے درمیان خواجہ یداللہ کا توسط زائد ہے جو ابنہٹوی نقل میں نہیں ہے نیز اس میں خواجہ عبد الحمید ہے اور گنگوہی نقل میں خواجہ عبد المجید ہے۔ اسی طرح اس میں خواجہ ہاشم بزرگ بن خواجہ ابی اسمٰعیل عبد اللہ ہے اور گنگوہی نقل میں خواجہ ہاشم بن خواجہ اسمٰعیل بن خواجہ عبد اللہ ہراتی ہے اور ابو منصور مست و حضرت ابو ایوب کے درمیان حضرت ایوب بن ابی ایوب کا توسط زائد ہے جو کثرت نقول میں کاتب کی زلت قلم سے اکثر ہو جاتا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ صواب اس نقل میں ہے یا اس نقل میں۔ بہرحال حضرت قدس سرہ سلسلۂ اجداد سے ایوبی انصاری ہیں اور آپ کے جد رابع شاہ غلام محمد کا عقد چونکہ حضرت سیدہ محفوظ بی بی بنت شاہ نظام الدین بن شاہ محمد باقر بن شاہ ابو المعالی سے ہوا جن کے بطن سے شاہ قطب علی پیدا ہوئے اور یہی تعلق آپ کے اجداد کے قیام و توطن انبہٹہ کا سبب ہوا لہٰذا آپ کو سلسلۂ سادات کی طرف انتساب حاصل ہوا اور اس غیر اختیاری شرافت حسبی و نسبی نے آپ کے کمالات علمیہ و عملیہ اور اخلاق طبعیہ و روحانیہ میں وہ بے بہا اضافہ کر دیا جس پر زبان سے بے اختیار نکلتا ہے ؎

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام ‌ ‌ بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

شاہ قطب علی رحمۃ اللہ علیہ صاحب نسبت بزرگ تھے ان کی لڑکیاں تو کئی تھیں جن کا تعلق ازدواج ساڈھورہ وغیرہ میں خاندان پیرزادگان کے ساتھ ہوا مگر لڑکا بڑی تمناؤں کے بعد حق تعالیٰ نے ایک ہی عطا فرمایا تھا جن کا نام احمد علی رکھا گیا ان کو حق تعالیٰ نے بڑا صاحب نصیب بنایا اور چھ بیٹے عنایت فرمائے شاہ محمد علی شاہ محمد نواز۔ شاہ احمد حسن۔ مولانا انصار علی۔ شاہ مجید علی اور شاہ حبیب محمد۔ ایوبی خاندان میں گیا ہوا علم سب سے پہلے مولانا انصار علی صاحب کے

ذریعہ آیا جن کے تین صاحبزادوں میں مولوی عبداللہ صاحب ناظم دینیات علی گڑھ کالج زیادہ مشہور ہیں۔ شاہ مجید علی صاحب کے چند لڑکیاں ہوئیں جن میں پانچ نے خوردسالی میں انتقال کیا اور ایک زندہ رہکر صاحب اولاد ہوئیں جن کا نام محمود النساء تھا اور تین صاحبزادے ہوئے حضرت مولانا خلیل احمدؒ مولوی نذیر احمدؒ اور مولوی رشید احمدؒ اور شاہ حبیب محمد صاحب کے جو کہ سب میں چھوٹے تھے چار فرزند ہوئے۔ مولانا صدیق احمد مولانا انوار احمد۔ سلطان احمد۔ منیر احمد۔ وضاحت کے لئے مختصر شجرہ درج کرتا ہوں جس سے آئندہ تذکرہ واقعات میں مدد ملے گی اور معلومات تعلقات میں سہولت ہوگی۔



ولادت اور طفولیت

شاد باش اے خستہ ہجران بلا	کز پئے درد تو درماں میرسد
در دل افسردہ روحے میدہد	مردہ تن را مژدۂ جاں میرسد
بہر نشر علم و نشر نور دین	بحر عرفان مہر تاباں میرسد
سالکان جادۂ تحقیق را	قافلہ سالار کنعاں میرسد

حضرت قدس سرہ اواخر صفر ۱۲۶۹ھ ہجری مطابق اوائل دسمبر ۱۸۵۲ء میں اپنی ننہیال قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے کہ آپ کی والدہ ماجدہ بی بی مبارک النساء مولانا

محمد یعقوب صاحب مدرس مدرسہ عالیہ دیوبند کی حقیقی بہن اور حضرت استاذ الکل مولانا مملوک العلی صاحب قدس سرہٗ کی بیٹی تھیں جو کہ شوہر کے کسی ریاست میں ملازم ہونیکے سبب اپنے میکہ میں مقیم تھیں مولانا مملوک العلی صاحب جنہوں نے درسیات کا اکثر حصہ ماہتاب ہند حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس سرہٗ کے ارشد تلامذہ حضرت مولانا رشید الدین خانصاحب دہلوی سے پڑھا تھا فلک علم کے نیرین امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی و قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا محمد مظہر صاحب صدر المدرسین مظاہر علوم سہارنپور جیسی مقدس و مشہور ہستیوں کے استاذ تھے کہ ان سب حضرات نے علوم دینیہ و فنون ادبیہ کی پیاس اسی بحر زخار کے آب دہن سے بجھائی اور ہر چہار طرف سے پریشان ہو کر اسی آستانہ پر شفاء و تسکین پائی تھی۔ آپ کی دوسری صاحبزادی مسماۃ نجیب النساء حضرتؒ کے چچا مولوی انصار علی صاحب کے عقد نکاح میں آئیں کہ مولوی عبد اللہ صاحب ناظم دینیات علی گڑھ کالج حضرت قدس سرہ کے چچیرے بھائی بھی تھے اور خلیرے بھی اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ دونوں کے حقیقی ماموں تھے۔

حضرت اپنی والدہ محترمہ کے بطن سے توام پیدا ہوئے کہ آپ سے چند گھنٹے قبل آپ کے ایک بھائی تولد ہوئے جو تنومند اور خوش رو تھے اور ان کی دیکھ بھال میں مشغول ہو کر حضرت کی طرف کسی کی توجہ بھی نہ ہوئی کہ دبلے ضعیف اور نحیف الجثہ تھے حتیٰ کہ آپ کو دایہ نے غسل بھی نہیں دیا اور ململ کے ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر آپ کو علیحدہ کھٹولے پر ڈال دیا۔ مگر قدرت کو منظور تھا کہ اس بچہ پر جس کی طرف ماں کی نگاہ توجہ بھی نہیں اٹھتی ہے۔ کسی وقت دنیا کی نظریں پڑیں اور اس کا نورانی چہرہ تماشا گاہ عالم بنے اس لئے تنومند بھائی کو دنیا سے اٹھا لیا اور اس طرح پر ماں کی آغوش آپ کے لئے خالی ہو گئی کہ اب سارے کنبہ کی محبت و پیار کی نظریں خالص آپ پر پڑنے لگیں۔ ظہیر الدین اور خلیل احمد دو نام آپ کے تجویز ہوئے اور چونکہ آپ کا بھائی نوزائیدہ دنیا سے رخصت ہوا تھا اس لئے تفاول کے درجہ میں اللہ رکھا بھی آپ

کا نام پڑا۔ کنبہ کی بڑی بوڑھی عورتیں بچپن میں اسی نام سے آپ کو پکارتی تھیں نیز چونکہ شروع سے آپ خوبصورت تھے جیسے گلاب کا پھول اس لئے بعض عزیزوں نے آپ کا نام نُوتی رکھا اور اسی نام سے آپ کو پکارنا ان کو پیارا معلوم ہوتا تھا۔ آپ کے والد ماجد شاہ مجید علی چونکہ ریاست میں ملازم تھے اور سفر کی وہ سہولتیں مہیا نہ تھیں جو آج ریل اور پختہ سڑکوں و موٹروں کی وجہ سے نصیب ہیں اس لئے برسوں میں وطن آنا ہوتا تھا اور اسی وجہ سے آپ کی رضاعت اور ابتدائی تربیت زیادہ تر آپ کے ماموں اور نانا کے پاس ہوئی۔ تاہم آپ کی والدہ آپ کو لے کر انبہٹہ آئیں اور یہاں سسرال میں بھی کافی قیام کیا کرتی تھیں۔

عمر شریف کا پانچواں سال شروع ہوا تو آپ کو مکتب میں بٹھانے کی تجویز ہوئی۔ اور خود آپ کے نانا حضرت مولانا مملوک العلی صاحب نے تبرکاً بسم اللہ شریف پڑھا کر قاعدہ شروع کرا دیا۔ فطرۃً آپ ذکی اور ذہین تھے اس لئے ناظرہ قرآن شریف جلد ختم کر لیا اور اس کے بعد اردو پڑھنا شروع کر دیا۔ انہیں ایام میں ۵۷ء کا وہ سانحہ پیش آیا جو غدر ہندوستان کے نام سے مشہور ہے اور جس کی تاریخ ہندوستان سے اسلامی سلطنت کے جلنے کی تاریخ ہے۔ آپ کے چچا شاہ حبیب محمد کے خسر حضرت شاہ حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ جن کی شادی انصاری خاندان انبہٹہ میں ہوئی تھی دراصل رامپور منہیاران کے رہنے والے تھے مگر چونکہ ظفر بادشاہ ان کے معتقد تھے۔ اس لئے حضرت ممدوح کا قیام دہلی میں رہتا تھا۔ جب شاہ دہلی قید کر کے رنگون بھیج دیئے گئے تو گورنمنٹ برطانیہ نے شاہی خواص کو بھی بنگاہِ اشتباہ دیکھا اور اس لئے شاہ حسن عسکری روپوش ہو کر انبہٹہ چلے آئے کہ گو انکی بیوی کا غدر سے چند سال قبل انتقال ہو چکا تھا مگر ان کی لڑکی مسماۃ امۃ اللہ جو کہ حضرت کی چچی اور مولانا صدیق احمد صاحب کی والدہ ہیں انبہٹہ میں موجود تھیں، اور یہ مصاہرت کا رشتہ اس کی امید دلاتا تھا کہ انصاری خاندان ان کی مدد میں کوتاہی نہ کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ شاہ احمد حسن کے علاوہ جو کہ اس وقت بسلسلہ گورنمنٹی ملازمت کسی معزز عہدہ پر سندھ میں تشریف رکھتے تھے باقی

پانچوں بھائی وطن میں موجود تھے اور انہوں نے پناہ گزین عزیز کی حمایت میں اپنی جائداد اپنے مال اپنی آبرو اپنے عیش و آرام اور اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال دیا کہ بار ہا ان کے اور ان کی اکثر رعایا کے مکانوں کی تلاشی ہوئی مگر محصور کا پتہ نہ چلا اور گرفتاری عمل میں نہ آسکی گورنمنٹ کی نظر اس وقت سیاست و انتظام پر تھی اور یہ حضرات اس پر اڑے ہوئے تھے کہ بادشاہ کے پیر کو ملکی معاملات سے کیا تعلق اور بے گناہ کو اس کس مپرسی کے زمانہ میں موت کے حوالہ کر دینا صریح ظلم اور بے دردی ہے جو کہ مذہب اور شرافت دونوں کے خلاف ہے ہاں امن ہو جانے کے بعد جبکہ تحقیق حالات کا زمانہ آئے تو معاملہ زیر تحقیق لایا جائے مگر وقت نازک تھا اور اس حمیت کو باغی کی حمایت سمجھا جاتا تھا اس لئے پانچوں بھائیوں کو گرفتار کرکے سہارنپور کی حوالات میں بند کر دیا گیا اور کم وبیش ڈیڑھ دو ماہ ان صاحبوں کو ان تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑا۔ آخر شاہ احمد حسن صاحب اطلاع پا کر سہارنپور پہنچے اور بھائیوں کو چھڑا کر وطن لائے

شاہ حسن عسکری نے جب دیکھا کہ صرف میری وجہ سے میرے عزیزوں کو طرح طرح کی مصیبت جھیلنی پڑتی ہے اور ان کی شرافت خاندانی اس کو گوارا نہیں کرتی کہ مجھے آزاد کریں تو خفیہ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور سہارنپور پہنچکر اپنے آپ کو حکومت کے حوالہ کر دیا۔ آخر پھانسی پر چڑھا دیئے گئے اور ساری جائداد ضبط کر لی گئی جو امر مقدر تھا وہ کسی کے ٹالے نہ ٹلا۔ مگر جس کے نامۂ اعمال میں جو کچھ لکھا جانا تھا وہ لکھ لیا گیا۔

مولانا صدیق احمد صاحب تو شاہ حسن عسکری کے نواسے ہی تھے مگر ان کے ساتھ خود حضرت سے بھی شاہ صاحب رح کو اس درجہ محبت تھی کہ گویا نواسے ہی ہیں اور یہ علامت تھی اس سعادت کی جس کا آئندہ ظہور ہونے والا تھا ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت رح نے قرآن مجید اور ابتدائی کتب اردو و فارسی کی تعلیم انبہٹہ اور نانوتہ میں، مختلف اساتذہ سے پائی کیونکہ آپ کی والدہ جہاں جاتیں آپ ان کے ساتھ ہوتے اور وہیں کسی مکتب میں سلسلۂ تعلیم شروع فرما دیتے کہ وقت ضائع نہ ہو۔ فارسی میں

آپ بوستان تک پہنچ لئے تھے۔ مگر "ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات" آپ پریشان رہا کرتے تھے کہ جس نظم اور قابلیت کے ساتھ جلد آپ فارغ ہونا چاہتے تھے وہ نانوتہ یا انبہٹہ میں کہیں نظر نہ آتا تھا۔ اتفاق سے آپ کے چچا مولوی انصار علی صاحب جو کہ ریاست گوالیار میں بعہدۂ صدر الصدور فائز تھے بحصول رخصت وطن تشریف لائے اور بھتیجے کا شوق اور ذکاوت و ذہن دیکھ کر خواہش مند ہوئے کہ اپنے ساتھ گوالیار لے جائیں اور خود عربی و دینیات پڑھائیں۔

ہر چند کہ عزیزوں کا اور خصوصاً ماں کا دل گوارا نہ کرتا تھا کہ نور نظر کو آنکھ سے اوجھل کریں اور ایسے وقت کالے کوسوں بھیج دیں کہ آج آنے کا قصد کر دتو رتھ اور بہل کی سواری میں مہینہ بھر گذار کر وطن پہنچو۔ مگر اللہ رے شوق علم دین کہ کسی نے بھی خلاف نہ کیا اور آپ طالب علم بن کر چچا کے ساتھ بہل میں سوار ہو گئے۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ جس وقت میں اپنے چچا کے ساتھ بہل میں سوار ہو کر بقصد گوالیار چلا ہوں تو میری عجیب کیفیت تھی۔ کبھی وطن کا چھوٹنا والدہ کا فراق اور اقربا و ہمجولیوں سے جدا ہونا اپنا اثر ڈالتا اور مجھ کو پریشان بنا دیتا تھا اور کبھی وطن میں تعلیم کی بدنظمی اور حصول علم میں اپنی ناکامی و نقصان کا تصور ہو کر گوالیار میں یکسوئی کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں مشغولیت اور چچا کی شفقت و حسن تعلیم کا رنگ غالب آتا تو مجھے باغ باغ کئے دیتا تھا۔ آخر اسی کشاکشی میں بہلی روانہ ہو گئی اور میں وطن سے باہر نکلا۔ اس سفر میں کچھ ایسی دلچسپیاں تھیں کہ تھوڑا ہی سفر طے ہونے کے بعد وطن اور اہل وطن کا خیال نسیاً منسیاً ہو گیا اور سفر میں ہر نئی چیز کو دیکھ کر چچا سے اس کے متعلق پوچھتا اور تحقیق کرتا ہوا خوش خوش گوالیار پہنچ گیا۔ نیز فرمایا کہ میری عمر اس وقت گیارہ سال کی تھی اور وہ واقعات اب مجھے خواب کی طرح ذہن میں رہ گئے۔

چچا کی شفقت و محبت کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرمایا کرتے تھے کہ گوالیار میں کوئی یہ نہ سمجھتا تھا کہ خلیل احمد ان کا بیٹا نہیں ہے۔ میرے چچازاد بھائی مولوی عبداللہ بھی چچا صاحب کے پاس تھے اور جن کو اتنا معلوم تھا کہ ان میں ایک

حضرت مولانا کا بیٹا ہے اور ایک برادر زادہ وہ مولوی عبد اللہ کو برادر زادہ خیال کرتے تھے۔ حالانکہ واقعہ برعکس تھا کہ وہ بیٹے تھے اور یہ بھتیجا۔

گوالیار پہنچ کر حضرت رح نے میزان الصرف اپنے عم بزرگوار سے شروع کی اور فطری ذہانت سے چند ہی روز میں صرف میر اور پنج گنج تک پڑھ لیا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں حضرت کے والد ماجد شاہ مجید علی صاحب جن کی عمر کا اکثر حصہ ریاستوں کی ملازمت میں باہر ہی گذرا تھا ملازمت ترک فرما کر وطن تشریف لائے اور مستقل قیام فرمایا تو حضرت کو گوالیار سے وطن واپس بلا لیا کہ خود پردیس سے آکر بھی لخت جگر پردیس میں نگاہوں سے دور رہا تو وطن آنے کا حظ ہی کیا نصیب ہوا۔ والدین کی محبت بھری آغوش اور نظر کے زیر سایہ رہ کر آپ کی تعلیم مولوی سخاوت علی صاحب کے حوالہ ہوئی جو قصبہ کے مشہور استاذ اور محترم عالم تھے اور آپ نے ان سے کافیہ تک پڑھا۔ مگر آپ کی ذکاوت استعداد میں جس قابلیت اور تعلیم میں جس نظم کی جویاں تھی وہ یہاں حاصل نہ تھی اور یوں بھی وطن کا قیام اور گھر کا عیش و آرام اس شوق کو پورا نہ ہونے دیتا تھا جو آپ کے قلب میں موجیں مارا کرتا تھا آخر بعض اعزہ کی رائے ہوئی کہ اس طرح عمر ضائع کرنے سے کیا حاصل ان کو سرکاری مدرسہ میں داخل کر دیا جائے کہ انگریزی پڑھ لیں۔ چنانچہ آپ اور آپ کے چچا زاد بھائی مولانا صدیق احمد صاحب قصبہ کے انگریزی اسکول میں داخل ہو گئے۔ جس کا ماسٹر ہندو تھا اور کافیہ تک نحوی استعداد ہونے کی وجہ سے چھ ماہ میں دونوں صاحبوں نے اتنی انگریزی پڑھ لی کہ دو سال سے پڑھنے والی جماعت کا مقابلہ کرنے لگے اور گرامر یعنی انگریزی ترکیب پر تو اتنے قادر تھے کہ ماسٹر حیران ہوتا اور کہا کرتا تھا کہ تم ایسی جلد اور صحیح ترکیب کرتے ہو کہ میں بھی نہیں کر سکتا۔ مولانا صدیق احمد نے جواب دیا کہ ہم نے عربی میں شرح جامی پڑھی ہے اور اس لئے ترکیب نحوی کسی زبان کی بھی ہو ہمیں دشوار نہیں۔ اس نے کہا کہ ہم کو بھی عربی پڑھا دو فرمایا بہت اچھا مگر اس کو پڑھانے کا وقت کیا آتا خود انگریزی پڑھنے ہی کا وقت قریب الختم تھا کہ گوا اپنے

بڑوں کی تعمیل حکم میں انگریزی شروع کردی تھی مگر دل اُچاٹ تھا اور وہ قلب جو علوم عربیہ کا لذت آشنا ہو چکا تھا اس کا خواہشمند تھا کہ کاش علوم دین کی تعلیم کا کوئی بہترین انتظام ہو جائے اور یہاں سے چھٹکارا نصیب ہو۔ دفعتہً محرم ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد قائم ہونے کی خبر آپ کے کانوں میں پڑی اور یہ بھی سُنا کہ صدر مدرس آپ کے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قرار پائے۔ لہذا آپ کی طلب میں جوش آیا اور والدین سے اجازت چاہی کہ دیوبند بھیج دیں چنانچہ آپ دیوبند تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے آپ کے لئے کافیہ کا سبق تجویز فرما کر جماعت کافیہ میں شریک کر دیا۔

دارالعلوم دیوبند سے چھ مہینہ بعد رجب ۸۳ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کا افتتاح ہوا اور مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی کہ وہ بھی قریبی رشتہ سے حضرت کے ماموں ہوتے تھے یہاں صدر مدرس تجویز ہوئے۔ ہر چند کہ دیوبند میں تعلیم کے بہترین نظم کے ساتھ حقیقی ماموں کی شفقت مادری شفقت کا لطف دے رہی تھی۔ مگر قدرت کو منظور تھا کہ جس نونہال کے ہاتھوں مظاہر علوم کو حیرت بخش ترقی ہونے والی مقدر ہے وہ اسی مدرسہ کا خوشہ چین و مرہون احسان بنے اس لئے دیوبند سے آپ کا دل گھبرایا اور آپ سہارنپور چلے آئے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب سے بہ نسبت مولانا محمد مظہر صاحب کے اگرچہ زیادہ قریبی تعلق قرابت تھا لیکن پھر بھی خدا جانے دیوبند میں کیوں دل نہ لگا جس وقت میں یہاں پہنچا ہوں بس اس طرح مانوس ہو گیا کہ گویا ہمیشہ سے یہیں رہتا تھا۔

ہر چند کہ انگریزی کی چند ماہہ تعلیم کو آپ نے خیرباد کہدیا اور علم دین کے اشتغال میں کوشش بھی کی کہ وہ پڑھا ہوا ذہن سے نکل جائے مگر اس بے توجہی پر بھی آپ انگریزی حروف اور ہندسے پہچان لینے اور حروف مفردہ کو جوڑ کر خطوط کی مہر وغیرہ پڑھ لیا کرتے تھے۔ آپ کے بھتیجے مولوی فاروق احمد کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ بہاولپور تشریف لائے اور آپ کے نام ایک خط آیا

جس میں کاتب نے اپنا پتہ نہ لکھا تھا۔ حضرت سوچنے لگے کہ کس کا خط ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مُہر ڈاکخانہ دیکھ لی جائے شاید اس سے کچھ پتہ چلے۔ حضرت نے مُہر پر نظر ڈالی اور فرمایا فلاں فلاں حروف پڑھے جاتے ہیں۔ اور خط کا رُخ میری طرف کر دیا۔ میں نے حضرت کے کیساتھ عرض کیا کہ انگریزی حروف بھی حضرت پڑھ لیتے ہیں؟ فرمایا ہاں جب ابتدا میں انبہٹہ کے انگریزی مدرسہ میں داخل ہوا تھا اس وقت سیکھے تھے۔ حضرت اس کو مسرت اور شکر گزاری کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ الحمدللہ حق تعالیٰ شانہٗ نے انگریزی سے نجات دی اور علم دین نصیب فرمایا۔

تکمیلِ علم اور فراغِ تحصیل

جس وقت حضرت قدس سرہ مظاہر علوم میں تشریف لائے تو کافیہ، شرح جامی کا کوئی سبق مدرسہ میں نہ تھا اور تمامی اسباق کا نظام الاوقات مرتب ہو چکا تھا لہٰذا مولانا محمد مظہر صاحب نے آپکو مختصر معانی کی جماعت میں شریک کر دیا اور آپ دل نہاد ہو کر ہمہ تن تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے اکثر کتابیں، خصوصاً کتب حدیث و فقہ و اصول و تفسیر حضرت مولانا محمد مظہر صاحب سے پڑھیں اور باقی کتابیں بالخصوص منطق و فلسفہ و ہیئت و ریاضی مدرسہ کے دیگر مدرسین سے۔ اس طرح پر ۱۲۸۶ھ میں جب کہ آپ کی عمر شریف ۱۹ سال تھی آپ نے درس نظامیہ ختم کر لیا اور پانچ سال میں مدرسہ سے سند فراغ حاصل کی۔ اس کے بعد علوم ادبیہ میں مہارت کا شوق آپ کو پنجاب کی طرف کھینچنے لگا کہ ہندوستان کے مشہور ادیب مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری اسوقت اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر اور علوم شرقیہ کے استاذ اعظم تھے کہ طالبان علوم دور دور سے آ کر انوار ادبیہ کا مولانا سے اقتباس کرتے اور فصاحت عرب کی حقیقت سے آشنا ہو کر مسرور و شاد کام جایا کرتے تھے۔ اس لئے باوجودیکہ

فراغ کے بعد آپ کا تقرر بعہدہ معین المدرسین اسی مدرسہ میں ہو چکا تھا مگر ذوقِ عربیت نے آپکو سفر پر مجبور کیا اور آپ نے لاہور پہنچ کر مولانا سے علوم ادبیہ کی خاطر خواہ تکمیل فرمائی۔

ہر چند کہ آپ نے تمامی علوم نقلیہ و عقلیہ میں کمال حاصل کیا مگر جو اُنس اور تناسب آپ کی طبیعت کو کلام الرسول اور علم فقہ کے ساتھ تھا وہ خود ہی اپنی نظیر ہے اور اس کی شہادت کے لئے حضرت کے چند ہزار وہ فتاویٰ جن سے مدرسہ کی ضخیم ضخیم چار جلدیں لبریز اور بھری ہوئی ہیں و نیز آخر عمر کا زرین کارنامہ جس کا نام بذل المجہود فی حل ابی داؤد ہے پیش کرنا کافی ہے۔ کہ بذل المجہود پانچ جلدیں کر مطبوع ہو چکی اور ہزاراں ہزار تشنہ کامانِ علم حدیث کو سیراب کر رہی ہے۔ اور فتاویٰ کے متعلق بھی خیال ہے کہ مدرسہ کی طرف سے مطبوع ہو جاویں تاکہ ہر قسم کی ضروریات شرعیہ سے عامہ مخلوق قیامت تک منتفع ہوتی رہے۔ چند مخصوص فتاویٰ جو حضرت کے دستِ مبارک کے لکھے ہوئے تھے اور جن میں کسی عالم کی خلاف تحریر کے سبب اہمیت تھی وہ نقل کرا کر درج سوانح بھی کروں گا۔ مدرسہ کی رودادِ قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث کی پہلی کتاب مشکوٰۃ شریف حضرت نے ۸۵ھ میں پڑھی اور امتحان سالانہ میں اعلیٰ نمبر حاصل کر کے مختصر معانی و شرح عقائد انعام میں پائی ۸۶ھ میں بخاری و ہدایہ اخیرین میں امتحان دیا اور جامع ترمذی انعام میں ملی۔ غرض صحاح کی اکثر کتب آپ نے حضرت مولانا محمد مظہر صاحب سے ختم کیں مگر ابوداؤد اس زمانہ میں نہیں پڑھی۔ چنانچہ بذل المجہود کے ترجمۃ المؤلف کی تسطیر کے وقت مولانا محمد زکریا صاحب کے استفسار پر حضرت نے خود فرمایا کہ میں نے ابوداؤد شریف دورہ کے ساتھ نہیں پڑھی بلکہ اپنی ملازمت کے زمانہ میں پڑھی ہے۔ میں خود بھی جہاں ملازمت پر ہوتا رمضان میں مکان پر چلا آتا اور حضرت استاذ بھی رمضان المبارک اُن ایام میں اپنی سسرال قصبہ گنگوہ میں گزارا کرتے تھے۔ ایک سال میں نے بھی رمضان وہیں گزارا اور ابوداؤد شریف پڑھی۔ سال کی تعیین تو یاد نہیں مگر میں تعلیم سے فارغ

ہو ہوا کر ملازم ہو چکا تھا۔

یہ ابتدائے حضرت کی دورہ کی تعلیم ہے جس کا سلسلہ اسناد اس طرح ہے کہ آپ کے استاذ حضرت مولانا محمد مظہر اور ان کے استاذ مولانا مملوک العلی اور وہ شاگرد تھے مولانا رشید الدین خان دہلوی کے اور وہ مولانا شاہ عبد العزیز کے اور وہ حضرت حجۃ اللہ مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے جن کا سلسلہ اسناد مشہور و معروف اور اکثر کتب حدیث بالخصوص ترمذی شریف کے اوائل میں مطبوع موجود ہے اس لئے اسکا تذکرہ چھوڑ دیا گیا۔ رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

مظہر علوم حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نے بخاری شریف حضرت اقدس مولانا شاہ اسحاق صاحب مہاجر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی پڑھی ہے اور شاہ صاحب اعلیٰحضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی کے مشہور شاگرد ہیں اس طرح پر حضرت کا سلسلۂ سند صرف دو واسطوں سے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس سرہ کے ساتھ جا ملا نیز ۱۲۹۳ھ میں جبکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھوپال میں مدرسی پر فائز تھے۔ تو حضرت مولانا عبد القیوم صاحب بڈھانوی سے جو کہ حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب کے ارشد تلامذہ ہونے کے علاوہ داماد بھی تھے دوبارہ بخاری شریف شمائل ترمذی اور کچھ حصہ مسلم شریف کا و تیر مسلسلات حجۃ اللہ شاہ ولی اللہ د نوادر اور ذر ثمین پڑھ کر جملہ احادیث کی اجازت اور سند حاصل کی۔ پھر اسی سال کے ختم پر جبکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو حرمین شریفین کی پہلی مرتبہ حاضری نصیب ہوئی جو کہ حج فرض کا سفر تھا تو مکہ مکرمہ میں شیخ المشائخ مولانا الشیخ احمد دحلان مفتی شافعیہ سے روایت و اجازت حدیث حاصل کی اور مدینۃ الرسول میں محدث دار الہجرۃ استاذ الکل حضرت مولانا الشاہ عبد الغنی المہاجر المجددی النقشبندی کو جملہ کتب حدیث کے اوائل سنا کر بالاجمال اور قبولیت دعاء عند الملتزم کی بالتفصیل اجازت حاصل کی۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کا عطا کردہ اجازت نامہ جس کو بندہ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کر لیا تھا اور دعاء عند الملتزم کی سند جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بندہ ناچیز کو عطا

فرماتے وقت خود ارشاد فرمائی تھی تبرکاً درج کرتا ہوں ۔

الحمد للہ اولاً وآخراً والصلوٰۃ والسلام دائماً وسرمداً۔ اما بعد فیقول الملتجی الی حرم النبی
عبد الغنی بن ابی سعید المجددی سامحہ اللہ بلطفہ الحفی ۔ قد قرء علیّ من اوائل الکتب الستۃ مولانا
الشیخ خلیل احمد وطلب منی اجازتہا واجازۃ لبقیۃ کتب الاحادیث والفقہ والتفسیر فاجزتہ
ان یروی عنی ویجیز غیرہ من ناہل لہذا الفن الشریف مع الشرائط المعتبرۃ عند علماء ہذا الشان
واللہ المستعان وصلی اللہ علی سید الانس والجان علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام الاتمان
الاکملان ۔۔ فی المدینۃ المنورہ سنہ ١٢٩٤ھ (مہر)

یقول مولانا الشاہ عبد الغنی اخبرنی بہ شیخنا عابد سندی اجازۃ قال اخبرنا عن عمی
محمد حسین الانصاری عن الشیخ محمد بن محمد بن محمد بن عبد اللہ المغربی عن الشیخ عبد اللہ
بن سالم البصری عن الشیخ محمد بن علاء الدین البابلی عن الشہاب احمد بن خلیل السبکی
عن النجم محمد بن احمد بن علی الغیطی عن القاضی زکریا الانصاری عن الحافظ ابن حجر
عن شرف الدین ابی بکر بن عز الدین بن عبد العزیز بن جماعۃ عن یحیی بن فضل اللہ
العمری عن مکی بن علان انا ابو طاہر السلفی سمعت ابا الفتح ابن مسعود الغزنوی
یقول سمعت ابا الحسن علی بن محمد بن نصر اللبان یقول سمعت ابا القاسم حمزہ بن یوسف
السہمی بجرجان یقول سمعت ابا القاسم عبد اللہ بن محمد بن خلیف البزار بمصر یقول سمعت
محمد بن الحسن بن راشد الانصاری یقول سمعت ابا بکر محمد ادریس المکی وہو وراق الحمیدی
واسم جدہ عمر یقول سمعت عبد اللہ بن الزبیر الحمیدی یقول سمعت سفیان بن عیینۃ یقول
سمعت عمرو بن دینار یقول سمعت عبد اللہ بن عباس یقول سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم
یقول الملتزم موضع یستجاب فیہ الدعاء ما دعا اللہ فیہ عبد الا استجابہا قال ابن عباس فو اللہ
ما دعوت اللہ عز وجل فیہ الا استجاب لی منذ سمعت ہذا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
قال عمرو وانا واللہ ما اہمنی امر فدعوت اللہ عز وجل الا اجابنی منذ سمعت ہذا من ابن
عباس وہکذا قال کل راو یقول عبد الغنی وانا واللہ دعوت اللہ عز وجل فاستجاب لی
واجازنی بہ الشیخ مولانا الحاج خلیل احمد المہاجر الایوبی الانصاری اجازۃ وقال لبعد

سرو اسنادہ وانا اول انی دعوت اللہ عزوجل فاستجاب لی) واخرج سعید بن منصور و البیہقی فی سننہا عن ابی الزبیر عن ابن عباس موقوفاً۔

عمر شریف کے اخیر حصہ میں جبکہ حضرت قدس سرہ نے بذل المجہود کی تالیف سے بلدۃ الرسول میں فراغ پایا تو فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حق تعالیٰ سے تین دعائیں مانگیں تھیں جن میں دو کی قبولیت دیکھ چکا ہوں اور تیسری کا متوقع اور منتظر ہوں۔ ایک دعا یہ مانگی تھی کہ عرب میں امن وامان کی حکومتِ اسلامیہ شرعیہ دیکھ لوں سو الحمد للہ وہ امن وامان آنکھوں سے دیکھا کہ جہاں پہاڑیوں میں قافلوں کا چلنا مشکل تھا اب تنہا آدمی سونا اچھالتا ہوا بے خطر چلتا ہے اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ دوسری دعا یہ تھی کہ بذل المجہود زندگی میں ختم کر لوں۔ سو الحمد للہ فارغ ہو لیا۔ تیسری دعا یہ تھی کہ بجوارِ رسول اس سرزمین میں دفن ہونا نصیب ہو۔ سو توقع ضرور ہے کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ وہ ہی مہینہ بعد اس کا ظہور ہو گیا کہ آپ نے بذل کے ختم سے پورے سات ماہ اور ۲۴ دن بعد یعنی ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ یوم چہارشنبہ کو بعد عصر وصال فرمایا اور قبۂ اہل بیت کے متصل مدفون ہوئے۔ اطاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ۔

میرا غالب خیال ہے کہ یہ تینوں دعائیں ملتزم ہی پر مانگی ہوئی تھیں جن کا شکراً للہ تعالیٰ وتوثیقاً لہذہ الروایۃ الماثورہ اس طریق پر اظہار فرمایا۔ بالخصوص تکمیل بذل المجہود کی دعا کو ماہ شعبان ۱۳۴۳ھ پانچویں سفر حج سے واپس ہو کر آپ نے اس خیال وشوق کو ظاہر فرمایا اور ۱۱ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو بنام خدا افتتاح فرما دیا۔ کام بہت بڑا تھا اور علاوہ اس کے کہ بہت زیادہ علمی قابلیت اور دماغی محنت کو چاہتا تھا۔ کتاب کی ضخامت زیادہ ہونے کے سبب مدت مدیدہ اور زمان کثیر کو چاہتا تھا اور حضرت قدس سرہ کا دماغ علاوہ مجاہدہ وریاضات اور افکار وصدمات وحوادث مختلفہ کے پوری نصف صدی یعنی پچاس برس خدمتِ تدریس میں مشغول رہنے کے سبب بہت زیادہ ضعیف ہو چکا تھا۔ اس لئے بظاہر اسباب اس تالیف کی جس میں بیک وقت متعدد شروح وحواشی کے اقوال مختلفہ وکثیرہ کو مستحضر رکھنے اور کھوٹا

پھر اوپر لکھ کر مشاہیر علماء کے آراء متنوعہ میں حق کو محقق کرنے کی ناقابل برداشت محنت تھی کسی طرح ہمت سہا ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ موت کا استحضار اور لقاء رب کا اشتیاق ہر وقت آپ کے دل کو اُچاٹ بنائے ہوئے تھا اور بار بار آپ کی زبان پر آتا تھا کہ میرے اقران و ہمعصر سب رخصت ہو چکے دیکھئے اس مٹی کو کب تک گھسیٹنا مقدر ہے۔ اگر کبھی شوق کا داعیہ ہوتا بھی تھا تو مدت کا خیال فرما کر آپ خاموش ہو جاتے تھے کہ برسوں میں ختم ہونے والے کام کی امید کون باندھے مگر سفر پنجم سے واپسی پر یکایک خیال کا عزم اور فعل کے درجہ میں آنا اس کی علامت تھی کہ آپ ملتزم پر دعا مانگ کر آئے ہیں اور قبولیت کے اذعان و یقین پر پاپوس کی مشقت اور طول مدت کے واہمہ سے خالی الذہن ہو چکے ہیں۔ ورنہ یوں تو صدہا دعائیں آپ کی قبول ہوئیں اور متوسلین تو اس کے خوب تجربے کر چکے ہیں کہ جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو حضرت سے دعا کی استدعا کرتے اور اس کی فوراً ہی قبولیت کا مشاہدہ ہوتا تھا۔ پس یہ قوت یقین آپ کی ایک مستقل کرامت ہے جس کے سامنے ہزار کشوف و خوارق بھی ہیچ در ہیچ ہیں کہ اس یقین ہی کے حاصل کرنے کو طالبان حق نے سلطنت چھوڑ کر فقر اختیار کیا اور تخت و تاجِ دنیا پر لات مار کر دلقِ گدائی اور صحرا نوردی کو ترجیح دی ہے ؎

خلیل آسا در ملک یقین زن　　　　صدائے لا احب الآفلین زن

شاہ عبد الغنی صاحب مہاجر مدنی سلسلۂ طریقت میں اپنے جد بزرگوار مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کے طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ کے متمسک اور اپنے والد ماجد حضرت شیخ ابو سعید قدس سرہ سے بیعت اور مجاز تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب اور اسناد سلوک و اخذ طریقت ساتویں پشت پر حضرت مجدد صاحب سے اس طرح ملتا ہے۔ شیخ عبد الغنی بن ابی سعید بن صفی القدر بن عزیز القدر بن محمد عیسیٰ بن سیف الدین بن محمد معصوم بن احمد العمری السہرندی قدس اللہ اسرارہم۔

مسلم[1] شریف - ابوداؤد[2] شریف - ترمذی[3] شریف - نسائی[4] شریف - سنن[5] ابن ماجہ اور موطا[6] امام مالک بالاستیعاب آپ نے اپنے والد شاہ ابوسعید سے پڑھی اور بخاری شریف قراءۃً وسماعاً حضرت شاہ اسحٰق[7] سے - شاہ اسحاق صاحب اور شاہ ابوسعید صاحب دونوں حضرات شاگرد ہیں حضرت محدث زمان شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم العمری کے - پس ہر دو سلسلہ سے آپ کی اسناد حدیث تیسری پشت پر حجۃ اللہ البالغہ سے جا ملی ہے -

مشکوٰۃ شریف حضرت شاہ صاحب نے شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ مخصوص[3] اللہ صاحب کو پڑھ کر سنائی اور بعد ہجرت مدینۃ الغراء میں بخاری شریف کا کچھ حصہ تبرکاً شیخ محمد عابد[4] الانصاری السندی ثم المدنی کو پڑھ کر سنایا اور حضرت ممدوح نے جملہ صحاح کی آپ کو اجازت دی اور اپنے ہاتھ سے سند لکھ کر عطا فرمائی - پھر مدینۃ الرسول ہی میں شیخ[5] اسمٰعیل بن ادریس الرومی نے جو کہ مقدونیہ کے مشہور علامہ تھے خود اپنی خوشی سے صحاح کی اجازت کلیہ آپ کو عطا کی - پانچوں اساتذہ کی اسانید بالتفصیل ایک مستقل کتاب کی صورت میں طبع ہو چکی ہیں جس کا نام الیانع الجنی ہے لہذا نقل نہیں کی گئیں - انہیں سلاسل اسناد میں اگر حضرت قدس سرہ کا نام درج کر دیا جائے تو حضرت کے تلامذہ کی اسناد حدیث صاحب الکلام والحکم سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم تک مسلسل ومکمل ہو جائے گی -

اس کے بعد ۱۳۲۲ھ میں جب حضرت قدس سرہ تیسری مرتبہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو حضرت مولانا سید احمد البرزنجی المفتی الشافعیہ ببلدۃ الرسول نے جملہ کتب حدیث اور تمامی فنون معقول ومنقول اور فروع واصول کی آپ کو اجازت دی اور اجازت نامہ لکھوا کر مہر سے مزین فرما کر آپ کے حوالہ کیا - چونکہ بندہ ناچیز اس سفر میں حضرت قدس سرہ کے ہم رکاب اور مولانا برزنجی کی خدمت میں حاضری کے وقت حضرت کے ساتھ تھا - اس لئے خود بھی اس اجازت سے مشرف ہوا جو میرے پاس محفوظ ہے اور اس کا سلسلۂ اسناد نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ حضرت کے تلامذہ اخذ کر سکیں

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي رفع دين الاسلام على سائر الاديان ۔ وجعل شأنه عاليا باصح سند و
برہان ۔ وشيد اعلامه المشهورة الباهرة وآثاره المعروفة المتواترة حتى لم يبق ريب بين ال
الانام الخاص منهم والعام ۔ فى انه الحق المبين ۔ وحبل الله المتين ۔ فطرب عند رواية احاديثه
الحسنة الاسماع ۔ واعترف ارباب النقد الصحيح بقبول وصله والاتباع ۔ واستفاض بنقل
الثقات العدول الاثبات دلائل صدقه ۔ وانكشف الغطا وبرح الخفا ببراهين حقه ۔
فمن اهتدى بهداه الى صراطه المستقيم ۔ فاز بالحظ الاوفى والخير العميم ۔ والصلوٰة والسلام ا
الاكملان مددا الاوفران عددا ۔ على من ارسله الله على فترة من الرسل نوراً مبيناً ۔ يهدى
الى اقوم السبل فكشف الغمة وهدى الامة ۔ واخرجهم من الظلمات الى النور ۔ وفتنة الشياطين
الكفور ۔ وعلى آله وصحبه الذين اقتفوا آثاره ۔ وحفظوا سننه وآثاره ۔ وكل تابع باحسان
وحافظ الدين بالضبط والاتقان ۔ اما بعد ۔ فان اشرف مقامات العبد القرب من المعبود
والتحلى بصفة الحضور والشهود ۔ واعظم وسيلة الى هذا المطلب النفيس الذى به تكون تزكية
النفوس فى القديم والحديث ۔ علم الاسناد والحديث ۔ المشتمل على الحكمة التى من اوتيها
فقد اوتى خيرا كثيراً ۔ وعلى هدى خير العباد الذى من اقتدى به فقد فاز فوزاً كبيرا ۔ فمن ثم
توجهت همته صاحب الفضل والسماحة ۔ والعلم والرجاحة ۔ الهمام الاورع ۔ والشهم السميدع
الفائز من مدارك التقى باوفر نصيب ۔ والحائز من مسالك الهدى للسهم المصيب ۔ ذى
المجد الباذخ ۔ والجد الشامخ ۔ اللوذعى الكامل ۔ والعلامة الفاضل ۔ حضرة جناب الشيخ خليل
احمد بن الشاه مجيد على حفظه الله واوصله الله الى ما يتمناه لنيل هذه الطريقة المثلى ۔ والسبق
الى غاية تلك القصوى ۔ فطلب منى ان اجيزه بما رويناه سماعا واجازة من الاسانيد
المختارة الممتازة وتلقيناه من علماء هذا الشان ۔ واسلافنا الصلحين وسائر الاعيان ۔ فلبينا
دعوته واسرعنا اجابته واجزناه اجازة خاصة وعامة وشاملة تامة بجميع مسموعاتنا ومروياتنا
من الصحاح والحسان فى المسانيد والسنن ۔ العاصمة من رعاها حق رعايتها من الاهواء
والفتن ۔ وسائر المصنفات فى العلوم الشرعية الاصلية والفرعية ووسائلها من الفنون

التی ہہابناذب الادیب - وینظر زبا علامہاحلۃ کل فاضل اریب - کماہو موضح فی اسانید مشایخنا الاعلام - الکاشفین بنور التحقیق حجب الاوہام - عن وجہات مخدرات ہن مقصورات فی الخیام - الذین منہم والدی العلامۃ المحقق الفہامۃ السید اسمٰعیل عن والدہ العلامۃ السید زین العابدین مفتی المذہب الحنفی والشافعی - بمقنع القانع وشافی العی - عن والدہ جمیل المآثر ذی الفضل الباہر السید محمد الہادی عن عمہ الامام العلامۃ السید جعفر عن والدہ العلامۃ ابن فارض زمانہ وجاحظ عصرہ واوانہ السید حسن عن والدہ العلامۃ الآمر بالمعروف والناہی عن المنکر السید عبد الکریم المدفون بجدۃ الشہیر بالمظلوم عن والدہ الامام الاوحد والعلم المفرد العلامۃ السید محمد بن السید عبد الرسول الحسینی الموسوی البرزنجی مجدد القرن الحادی عشر - ذی التصانیف السائرۃ سیر المثل فی البدو والحضر وہو قد اخذ العلم عن جمع کثیر وجم غفیر من اعیان العراق والشام من کل نحریر وہمام ح وعن والدی السید اسمٰعیل المشار الیہ عن شیخ وقتہ الاستاذ المسند الشیخ صالح بن محمد الفلانی العمری عن الشیخ المعمر المحقق المدقق محمد بن محمد العمری الفلانی وعن غیرہ من اعیان عصرہ ح وعن شیخنا العلامۃ السید محمد الموافی الدمیاطی نزیل طیبۃ عن الاستاذین الجلیلین حسن عطار والشیخ ابراہیم الباجوری - وعن غیر ہؤلاء من اعیان عصر المتمیزین وجہابذۃ المبرزین فاجزناہ بجمیع ماتلقیناہ ورویناہ واجازنا بہ اشیاخنا المذکورون وغیرہم - ووصیناہ بالعمل والتقوی والاخلاص فی العلن والنجوی - فان لکل امرئ مانوی - بلغنا اللہ وایاہ من الدیانۃ اعلی النہایۃ - واوفانا وایاہ من الامانۃ علی کل غایۃ - ووفقنا جمیعا لنصر الحق ونصح الخلق و رزقنا سعادۃ الدارین وشفاعۃ سید الکونین وصلی اللہ علی من بہرت آیاتہ وظہرت معجزاتہ سیدنا محمد سید المرسلین وعلی آلہ الطیبین وصحبہ اجمعین والحمد للہ رب العالمین ... مہر

امر بکتابتہ مفتی الشافعیۃ بالمدینۃ المنورۃ سابقاً
السید احمد البرزنجی عفی اللہ عنہ

الحاصل چونکہ حضرت قدس سرہ کو حدیث میں کثرت روایات اور قوت سند کا جو

کہ اس فن شریف کا مایۂ ناز ہے اہتمام تھا اس لئے مشاہیر علماء زمان ہیں آپ کے اساتذہ ہوئے (۱) مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی (۲) مولانا عبد القیوم صاحب بڈھانوی (۳) مولانا الشیخ احمد دحلان المہاجر المکی (۴) مولانا الشاہ عبد الغنی المہاجر المدنی (۵) مولانا السید احمد البرزنجی الطاب اللہ ثراہم وجعل الجنۃ مثواہم۔

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی تو وثوق کے ساتھ نقل فرماتے ہیں اور مجھے بھی غالب یاد اسی طرح ہے کہ ۱۳۲۹ھ میں جب بندہ حضرت سے اجازت لے کر براہ حجاز ریلوے مدینہ منورہ سے دمشق گیا اور وہاں قطب الوقت مولانا السید بدر الدین محدث دام ظلہ کی زیارت کی جو علامہ نووی کے مشہور دار الحدیث کے جانشین۔ اور نہایت متبع سنت یگانۂ وقت مرجع العلماء بزرگ ہیں تو بندہ کو احادیث صحاح اور بعض اوراد مخصوصہ کی انہوں نے اجازت دی اور اجازت نامہ تحریری دستخطی مجھ کو عطا فرمایا۔ واپسی وطن کے بعد جب حضرتؒ سے اس کا تذکرہ ہوا تو حضرت نے بھی شوق ظاہر فرمایا کہ ایسے علامہ سے مجھے بھی روایت حدیث کی اجازت حاصل ہوتی تو بندہ نے ایک مطبوعہ اجازت نامہ جس کے تین نسخے شیخ ممدوح نے چلتے وقت مجھ کو دیئے تھے کہ جس کو اس کا اہل پاؤ اس خالی جگہ میں اس کا نام لکھ کر میری طرف سے دے دینا میں نے حضرت کا اسم شریف لکھ کر حضرت کی نذر کر دیا۔ یا یہ کہ حضرت نے والا نامہ تحریر فرمایا اور شیخ بدر الدین نے اجازت نامہ خود دمشق سے روانہ فرمایا۔ بہر حال اگر یہ واقعہ صحیح ہے جیسا کہ غالب گمان ہے تو یہ سلسلہ اسناد چھٹا ہے جس کو اپنی کتاب سے بہ تبدیل نام نقل کرتا ہوں کہ محفوظ رہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدک اللھم علی متواتر آلائک۔ ونشکرک علی مسلسل نعمائک۔ ونسئلک متصل الصلوات والتسلیمات علی المرفوع من بین المخلوقات وعلی آلہ المشہودۃ اخبارہم۔ واصحابہ المستفیضۃ آثارہم۔ اما بعد۔ فان الاسناد من الدین۔ والآخذ بہ متمسک بالحبل المتین۔ فمن ثم عکف اہل العلم علیہ۔ وتوجہت مطایا ہممہم الیہ۔ ولما کان منہم مولانا الشیخ خلیل احمد بن الشاہ مجید علی

الساکن فی سہار نفور من بلاد الہند وفقہ اللہ تعالیٰ لارشاد العباد۔ وسہل اللہ تعالیٰ لناولہ طرق السداد۔ طلب منی الاجازۃ التی ہی امان عند اقتحام المفازۃ۔ ولست اہلاً ان استجاز۔ وہل یقال بمثل ہذا الجواز۔ الا انہ حسن فی ظنہ۔ اثابہ اللہ تعالیٰ علیٰ قصد الحسن۔ فاجزتہ بالمعقول والمنقول من فروع واصول۔ والاحادیث الشریفۃ والآثار المنیفۃ۔ کما اجازنی بذلک فضلاء العصر وجہابذۃ مصر منہم بحر الفضلاء ومغترف الفحول والنبلاء افضل من عنہ نتلقی۔ الشیخ ابراہیم السقا عن الامام المہذب العلامۃ الشیخ ثعیلب عن العلامۃ الشہاب الملوی ذی النور فی الدیجور۔ عن الامام الشیخ عبداللہ بن سالم صاحب الثبت المشہور۔ وعن العلامۃ الشیخ محمد امیر عن والدہ الشیخ الکبیر وقد حوی ثبتہ الاسانید بالا یحتاج الی مزید۔ فروی صحیح البخاری عن العلامۃ الشیخ علی الصعیدی حال قراءتہ بالجامع الازہر عن الشیخ محمد عقیلۃ المکی عن الشیخ حسن بن علی العجیمی عن ابی العجل الیمنی عن الامام یحیی الطبری قال اخبرنا البرہان ابراہیم بن محمد بن صدقۃ الدمشقی عن الشیخ عبدالرحمن بن عبدالاول الفرغانی عن ابی عبدالرحمن محمد بن شاذان بخت الفرغانی بسماعہ لجمیعہ علی الشیخ ابی لقمان بن مقبل شنابان الختلانی عن محمد بن یوسف الفربری عن جامعہ۔۔ وروی صحیح مسلم عن الشیخ علی السقاط عن الشیخ ابراہیم الفیومی عن الشیخ احمد الفرقاوی عن الشیخ علی الاجہوری عن الشیخ نور الدین علی القرافی عن الحافظ جلال الدین السیوطی عن البلقینی عن التنوخی عن سلیمان بن حمزۃ عن ابی الحسن علی بن نصر عن الحافظ عبدالرحمن بن مندۃ عن الحافظ ابی بکر محمد بن عبداللہ عن مکی النیسابوری عن الامام مسلم۔۔ واوصی المجاز المشار الیہ نظر اللہ تعالیٰ بعین العنایۃ الیہ بمجاہدۃ النفس وتفریغ القلب عن الاغیار۔ وتطہیرہ عن سفاسف ہذہ الدار۔ وبملازمۃ الاذکار الماثورۃ۔ والادعیۃ المشہورۃ۔ والاکثار من الصلوٰۃ والسلام علی خیر الانام۔ مع المشاہدۃ المعنویۃ۔ المنتجۃ للحالات الحسنۃ۔ والمرجو من الشیخ المذکور ضاعف اللہ تعالیٰ لنا ولہ الاجور۔ ان لا ینسانی من دعوۃ صالحۃ حین اللہ تعالیٰ تجارۃ الجمیع رابحۃ۔ وامدنا بالمدد الاسنیٰ وختم لنا بالحسنیٰ اھ العبد الفقیر الیہ تعالیٰ۔

محمد بدرالدین عفی عنہ۔ آمین (مہر)

حفظ قرآن مجید اور اس کی محافظت

ایں نہ عشق است آنکہ در مردم بود — ایں فساد از خوردنِ گندم بود
عشق با مُردہ نہ باشد پائیدار — عشق را باحی و با قیوم دار
عشق ہائے کز پئے رنگے بود — عشق نہ بود عاقبت ننگے بود
عاشقی با مُردگاں پائندہ نیست — زانکہ مُردہ سوئے ما آئندہ نیست
خود توی تر میشود خمر کہن — خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

آہ زمانہ کا انقلاب بھی کیا عجیب تماشا گاہ ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ تو مسلم اللہ والے دنیا کی ہر محبوب و پیاری چیز کو چھوڑ کر دین کے ایک مستحب اور مسنون فعل کی طرف لپکتے اور اس میں جو دشواری و تعب بھی پیش آوے اس کو لذیذ سمجھتے تھے اور آج قدیم الاسلام حضرات دین کی معلومات کو بھی حقیر و بے سود سمجھتے بلکہ کوئی دوسرا طلب علم دین میں پڑ جائے تو اس کو تنگ خیال اور بیوقوف سمجھتے ہیں۔ فیا اسفا۔ نہ یہ بن پڑتا ہے کہ یک سو ہو بیٹھیں اور اتنا عرض کر کے خاموش ہو جائیں ؎

تمہیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی — چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

اور نہ اس کی کوئی صورت سمجھ میں آتی ہے کہ ان کو اللہ و رسول کی سچی محبت و عظمت سے آشنا کر دیا جائے اور پھر عرض کیا جائے کہ ؎

غم دین خور کہ غم غم دین است — ہمہ غمہا فروتر از ایں است
غم دنیا مخور کہ بیہودہ است — ہیچ کس در جہان نہ آسودہ است

عجب پریشانی کا وقت ہے ؎

دوگونہ رنج و عذاب است جان مجنوں را — بلائے فرقتِ لیلیٰ و صحبتِ لیلےٰ

جن کے قلوب ایمان سے خالی ہیں ان سے تو خطاب نہیں لیکن جن حضرات کو مرشدِ

عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے امتی بننے پر مسرت و فخر ہے اُن سے ضرور کہا جائے گا کہ خدارا دنیا کی محبت اور طلب میں اتنے نہ کھپو کہ دین کی تعلیم سے عار و نفرت ہو جائے اور حفظِ قرآن مجید کو جو برکات الہیہ کا سرچشمہ ہے عظمت کی نگاہ سے دیکھو کہ کلام کی عظمت سے صاحب کلام کی عظمت کا پتہ چلتا ہے ؎

چیست قرآں اے کلامِ حق شناس　　رونمائے رب ناس آید بہ ناس
حرف حرفش راست در بر معنئے　　معنئے در معنئے در معنئے !!!!

تم کو اور تمہارے اسلاف کو ساری دنیا پر اس کی بدولت فخر ہے کہ حق تعالیٰ نے تمہارے حوالہ اپنا وہ کلام کیا جس کی حلاوت و طراوت کی نظیر سطح زمین پر نہیں ہے وائے افسوس کہ اب شرفاء اسلام اس کی تلاوت و حفاظت سے بھی مستغنی و بے نیاز ہو جاویں ؎

دنیاء دنی کی یہ ہوس جانے دو　　گلچیں ہو اگر تو خار و خس جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ　　اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

ہر چند کہ زمانہ کی ہوا کم و بیش سب پر اثر کرتی ہے اس لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے والدین بھی قصبہ والوں کے بار بار مشورہ دینے اور خیر خواہانہ صورت پر اصرار کرنے سے متاثر ہوئے اور آپ کو بچپن میں انگریزی اسکول میں بھیج دیا کہ آپ کی فطری ذہانت سے بہت جلد ہر قسم کی دنیوی ترقیات متوقع تھیں۔ مگر قدرت کو آپ سے وہ دینی خدمات لینا تھیں جو انسان کی پیدائش کا مقصود اعظم ہیں اس لئے آپ کا مبارک قلب طفولیت کی کم سمجھی کے زمانہ میں بھی انگریزی تعلیم سے گھبرایا اور روحانی علوم الہیہ کا ایسا جویاں ہوا جیسا نوزائیدہ بچہ پستان مادر کے دودھ کا جویاں ہوتا ہے کہ اس طلب کے لئے نہ اس کو ترغیب کی ضرورت ہے نہ کسی کی رہبری و تعلیم کی حاجت۔ لہذا آپ کا خلقت آشنا دل از خود اس طرف متوجہ ہوا کہ عزیز وطن کو چھوڑ کر پردیس اختیار کریں اور پیرزادے یا ماموں کے لاڈلے بھانجے بن کر نہیں بلکہ ادنیٰ طالب علم بن کر غلامانہ انداز سے استاد کے سامنے بیٹھیں۔ پھر اہلِ وطن اور اقارب

مجنوں کہیں یا دیوانہ کسی کی ایک نہ سنیں ؎

دلا راے کہ داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اسی دیوانگی نے آپ کو گیارہ برس کی عمر میں آغوشِ مادر سے جدا کر کے گوالیار پہنچایا اور اسی شوق و ولولہ نے جبکہ آپ کی عمر کا چودھواں سال شروع ہوا انگریزی چھڑا کر دیوبند پہنچایا۔ یہی علم دین کا احترام اور اس کے حصول میں تعب و تنہائی کا لطف آپ کو سہارنپور لایا کہ ؎

کشند از برائے دے بار ہا !!!!!   خورند از برائے گلے خار ہا !!!

اور یہی اشتیاق آپ کو بیس سال کی عمر میں لاہور لے گیا حالانکہ آپ علوم دینیہ سے فارغ ہوتے ہی مظاہر علوم میں معین المدرسین بنا دیئے گئے اور چار ہی پیسہ یومیہ کا بصورت وظیفہ تقرر ہو کر کار تدریس آپ کے حوالہ کر دیا گیا تھا مگر علم تو سمندر کا پانی ہے کہ جتنا پیو اسی قدر پیاس بڑھے اور عمر نوح بھی اس میں ختم ہو تو ہل من مزید کی صدا بند نہ ہو ؎

رضینا قسمۃ الجبار فینا !!!!!   لنا علم و للجہال مال !!!!

فان المال یفنی عن قریب !   وان العلم باق لا یزال !!!!

مدارس میں ماہ رمضان کی تعطیل ہوا کرتی اور آپ امتحان سے فارغ ہو کر آخر رمضان میں مکان تشریف لے آیا کرتے تھے کہ والدین کی زیارت کے ساتھ ساتھ مبارک مہینہ کے دن روزوں میں اور راتیں تراویح و تلاوت قرآن مجید میں گزار کر سال آئندہ کی دماغی محنت کے لئے تیار ہو جائیں وطن میں حفاظ کی کمی تھی بالخصوص شرفائیں کہ حفظ قرآن مجید کا شوق بھی نہیں رہا تھا اس لئے آپ اور آپ کے چچا زاد بھائی مولوی صدیق احمد صاحب جو دیوبند میں پڑھنے اور پھر حصول علم کے لئے مالیر کوٹلہ چلے گئے تھے محلہ سے دور مسجد میں تراویح پڑھا کرتے تھے۔ جہاں حافظ رحیم بخش نوربافت سنایا کرتے تھے۔ ایک سال بزمانہ طالب علمی آپ رمضان میں سہارنپور رہے اور مولوی صدیق احمد صاحب مالیر کوٹلہ سے وطن آئے

ہوئے تھے کہ دونوں حضرات اپنے ایک تیسرے عزیز مولوی اسحاق بن حمید علی کو کہ وہ بھی طالب علم تھے لے کر حافظ صاحب کے پاس گئے اور درخواست کی کہ امسال ہماری مسجد میں قرآن مجید سنا دیجئے کہ جو لوگ ضعف یا کسل کے سبب یہاں نہیں آسکتے ان کے کان بھی اس کی لذت چشیدہ بن جاویں۔ مگر انہوں نے بے پرواہی کے ساتھ ٹکا سا انکاری جواب دے دیا اور بردا ایتے بار بار اصرار پر انہوں نے تیز لفظوں میں کہا کہ ایسا ہی قرآن سننے کا شوق ہے تو خود حفظ کیوں نہیں کر لیتے۔ حدیث پڑھنے کے لئے تھے۔ قرآن یاد نہیں ہوتا" ان کا یہ کہنا حضرتؒ کو بہت شاق گزرا کہ گویا قرآن مجید کا حفظ کرنا حدیث پڑھنے سے زیادہ مشکل ودشوار ہے اس لئے وہاں تو خاموش ہو گئے مگر تینوں نے مشورہ کیا کہ اس مرتبہ تو جس طرح ہو سکے گزار لو مگر آئندہ سال تینوں دس دس پارے یاد کر کے وطن آدیں کہ ایک شروع کے دس اور دوسرا درمیان کے دس اور تیسرا آخری دس اور اپنی مسجد میں سنا دے کہ یہ احتیاج سوال پھر نہ ہو۔ چنانچہ بعد رمضان اپنے اپنے مدرسہ میں چلے گئے اور مطالعہ کتب وتکرار سے جو وقت بچتا اس میں قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا۔ ہر چند کہ ارادہ دس پارہ کا تھا مگر جب سلسلہ چل پڑا تو آپ کی بڑھنے والی ہمت رکی نہیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ آپ جب آخر رمضان میں وطن آئے تو پورے قرآن مجید کے حافظ بن کر آگئے۔ اور یہی قصہ مولوی اسحاق صاحب کا ہوا مگر افسوس کہ مولوی اسحاق کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ حافظ قرآن بن کر محراب سنانے سے قبل شعبان ہی کے مہینہ میں انتقال فرما گئے۔ مولانا صدیق احمد صاحب قرارداد دس پارے حفظ کر کے آئے مگر جب دیکھا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے اپنی مسجد میں محراب سنائی اور تراویح میں ختم قرآن کا استحباب پورا ادا کر لیا تو آئندہ سال آپ نے بھی پورا کر لیا۔ ادھر ان حضرات کو حافظ قرآن دیکھ کر دوسرے بھائی مولوی انوار احمد صاحب کو حرص ہوئی تو سال آئندہ انہوں نے شروع کیا اور تین سال میں وہ

بھی حافظ قرآن بن گئے کہ محلہ اور آس پاس کی تین مسجدیں ہمیشہ کے لئے انوار قرآنیہ سے معمور و منوّر بن گئیں۔

حضرت نے خود بارہا یہ قصہ نقل فرمایا اور آخر میں یہ لفظ ارشاد فرمائے کہ یاد تو خیر یاد ہی ہوتا ہے لیکن الحمد للہ کچھ دال دلیا ہو ہی گیا۔ حق تعالیٰ کو ایک نعمت عطا فرمانا تھی وہ اس طریق پر عطا فرما دی۔ اس کے بعد حضرت نے اس نعمت کی محافظت کا اس درجہ اہتمام فرمایا کہ گرمی ہو یا سردی اور عسُر ہو یا یسُر کسی حال میں آپ نے کوئی دن اس کی تلاوت مخصوصہ سے خالی نہیں رکھا۔ مشاغل علمیہ آپ کے دن بدن بڑھتے اور تعلیم و تدریس کے ساتھ ارشاد و تلقین کے تعلقات روز افزوں ہوتے رہے اسلئے آپ نے پورے قرآن مجید کا ختم اپنی نماز کا جزو بنا لیا کہ کم از کم سوا پارہ ورنہ دو اڑھائی پارے بعد مغرب صلوٰۃ الاوابین کی چھ رکعت میں پڑھا کرتے جو کبھی سفر اور مرض میں بھی قضا نہ ہوتی تھیں الاّ نادراً۔ اور کبھی ریل میں سفر اور ہجوم سواریاں کی وجہ سے طویل نوافل کا اتفاق سے موقع ہی نہ ملا تو پارہ ہائے قرآن مجید کو بیٹھ کر ضرور پورا فرما لیتے تھے۔ اسی طرح تہجد کی بارہ نفلوں میں دوسرا ختم معمول تھا کہ دو پارے سے لے کر چار پارے تک جتنا وقت اور سکون کے ساتھ جس مقدار میں طبیعت کا لگاؤ پاتے وہ تلاوت فرماتے کہ اس کا بھی اس قدر اہتمام تھا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ گھر تو بہرحال اپنا گھر ہے اور ادائے معمولات کے لئے ہر قسم کا آرام مہیا رہتا ہے مگر میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اسفار میں ایسی اجنبی جگہ پر جہاں یہ بھی معلوم ہونا مشکل تھا کہ پانی کہاں ہے اور مسجد کہاں آپ کے اس معمول کو قضا ہوتے نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ حضرت ؒ جے پور کے سفر میں تھے اور بندہ ہمرکاب تھا۔ گاڑی بعد عشا پہنچی اور میزبان مولوی عبدالغنی صاحب نے کہ وہ بھی شہر سے فی الجملہ اجنبی تھے ایک سرائے میں ہم کو لا اتارا جس کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بُو آ رہی تھی۔ پاس نہ روشنی کا سامان تھا نہ کھانے پینے کا۔ بھوک لگ رہی تھی اور شب کا چوتھائی حصہ گزر چکا تھا کہ

اکثر دوکانیں بند ہوگئی تھیں۔ رفیق سفر میزبان حضرتؒ سے اجازت لے کر روشنی اور کھانے کا انتظام کرنے کو سرائے سے باہر نکلے اور ہم دونوں اندھیری کوٹھری میں ہاتھ سے ٹٹول کر ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ دیر ہوگئی اور چراغ نظر نہ آیا تو طبیعت گھبرائی اور میں نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ نہ بیکار بیٹھے بن پڑتی ہے نہ حضرت کو تنہا چھوڑ کر جائے بن پڑتا ہے ورنہ خود ہی کہیں ٹکریں مار کر موم بتی اور دیاسلائی لاتا۔ حضرتؒ چپ ہو رہے ہے۔ اور تھوڑی دیر اور انتظار فرما کر خود ہی کہا کہ بہتر ہے تم ہی اٹھو اور دیکھو مولوی عبدالغنی کہاں گئے۔ میں اٹھا اور سرائے کے اندھیرے میدان کو پاؤں سے ٹٹولتا ہوا دروازہ کی طرف چلا کہ دروازہ پر مولوی عبدالغنی آتے ہوئے مل گئے اور میں ان کو لے کر واپس ہوا۔ دھکم سکم چراغ جلایا اور ذرا اچھی کسی ہوئی چارپائی دیکھ کر اس پر حضرتؒ کا بستر بچھا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ کھایا گیا کھانا کھایا اور بمشکل سے پانی دستیاب ہوا جس کو پی کر شکرِ حق ادا کیا۔ ہر چند کہ مجھے حضرتؒ کے ساتھ بارہا سفر کا اتفاق ہوا اور خوب جانتا تھا کہ حضرت اپنے معمولات کے بہت ہی زیادہ پابند ہیں مگر آج شب کی کوفت اور کلفت محسوس کر کے اس کا وہم بھی نہ ہوا کہ تہجد کے لئے حضرتؒ کے واسطے پانی اور کم سے کم اتنی صاف جگہ کا انتظام کر دوں کہ حضرت نوافل ادا کر لیں۔ یہ ضرور فکر تھا کہ دیکھئے نماز فجر کس طرح ادا ہو۔ چراغ جس نے کھانے کا ساتھ بھی ٹمٹما کر بمشکل دیا تھا سلام کر گیا اور بجز اس کے چارہ نہ تھا کہ پڑ کر سو رہیں۔ آدھی رات گزر چکی تھی اور بدن کو تعب سفر نے گویا کوٹ دیا تھا اس لئے حضرتؒ بھی لیٹ رہے اور میں بھی کوٹھری کو کھلا چھوڑ کر کہ کچھ تو روشنی نظر آئے پڑتے ہی سو گیا۔ صبح صادق سے گھنٹہ بھر پہلے دفعتاً آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ حضرتؒ کی چارپائی خالی ہے۔ گھبرا کر اٹھا اور باہر آ کر ادھر ادھر دیکھا کہ کہاں تشریف لے گئے مگر کہیں نظر نہ آئے۔ تاروں کی جھلملاہٹ میں ذرا دور ایک مسجد نظر آئی اور میں اس طرف چل دیا۔ شکستہ حال مسجد کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں پر کچھ چوٹ بھی کھائی مگر صحن میں قدم رکھا تو حضرتؒ کی

آواز کانوں میں پڑی کہ اندر گوشہ میں کھڑے ہوئے تلاوت فرما رہے اور اپنے معبود کے سامنے غلامانہ حاضری کا معمول بجا لا رہے ہیں۔ آواز میں گریہ اور رعشہ تھا اور لہجہ میں خوف وخشیہ ملا ہوا حضور میں حیران تھا کہ حضرت نے مسجد کا پتہ کس وقت لگایا اور مطمئن ہو کر چارپائی پر لیٹ رہے کہ خود بھی پانی اور مصلے کا اہتمام کئے بغیر سو گئے۔ بس میزبان کی تلاش میں چند منٹ کے لئے میرا علیحدہ ہونا حضرت کے لئے گنجائش تھی کہ اپنی اصل ضرورت کا پتہ لگا کر آ بیٹھے اور سونے والوں کو سوتا چھوڑ کر اپنے وقت پر اپنے خدا کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ مجھے شرم کے مارے پسینہ آ گیا کہ تف تیری جوانی پر کہ حضرت اس بڑھاپے اور ضعیفی میں اتنے مستعد اور تو عالم شباب میں اتنا کاہل اور کم ہمت۔ آخر اندھیرے میں ٹٹول کر لوٹا اٹھایا اور پھر پانی ڈھونڈتا پھرا کہ کنواں ہے یا حمام کہاں سے پانی لوں اور ہر دشواری پر اس کا اندازہ کرتا گیا کہ یہی دشواری حضرت کو بھی پیش آئی ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ نہ معلوم حضرت کس وقت اٹھے اور کب سے نفلوں میں مشغول تھے۔ اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میرے سامنے کی بھی طویل قرأت سوا پارے سے کم نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد صبح ہو گئی اور جماعت سے فرض ادا کر کے باہر آئے تو شرم کے مارے میری نظریں جھکی ہوئی تھیں کہ نوافل کے لئے اہتمام نہ کیا تھا مگر حضرت کو گویا اس کا وہم بھی نہ تھا کہ آج ادائے معمول میں کچھ دشواری پیش آئی۔ وہی انبساط تھا اور شفقت کے ساتھ پوچھ رہے تھے کہ رات کچھ نیند بھی آ گئی تھی؟ بھئی ہم تو تکیہ پر سر رکھ کر خبر نہ رہی کہ سرائے میں پڑے ہیں یا گھر۔

ایک بار ٹونک کے سفر میں شب کو ۱۱ بجے حضرت کے ساتھ دہلی سے پسنجر میں سوار ہوا تو ہجوم مسافران کی یہ حالت تھی کہ بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ حسب عادت لوٹا بھر کر بنچ کے نیچے ضرور رکھ لیا تھا مگر حیران تھا کہ کیسا وضو اور کیسی نفلیں۔ مگر آخر شب میں حضرت کے اٹھنے کا وقت آیا اور اتفاق سے جھپکی آ کر میری آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں حضرت لوٹا لئے ہوئے ریل کا دروازہ کھول کر وضو فرما رہے ہیں۔ جلدی

سے اٹھا اور حضرت کو وضو کرایا۔ مگر اب پریشان تھا نماز کی جگہ کہاں کروں کہ اجڈ مسافروں کے چار طرف پاؤں اور اسباب پھیلے ہوئے ہیں۔ کسی چیز کو بھی ذرا سر کاؤں گا تو کوئی دھپ رسید کرے گا۔ مگر اللہ رے ہمت و استقلال حضرت نے جگہ نکال ہی لی اور اسی طمانیت کے ساتھ کھڑے ہو کر لمبی لمبی آٹھ نفلوں میں اپنے معمول تلاوت کو پورا فرمایا کہ نہ ہلتا یہ لگا نہ رکاوٹ ہوئی۔

سفرِ حج میں جاتے وقت منیٰ کا قیام تھا اور کچھا کھچ اسباب کے گرد برابر برابر شغدف لگے ہوئے تھے کہ قبیل صبح صادق مطوف آیا اور شور مچایا کہ تیار ہو جاؤ عرفات کے لئے۔ دیکھتا ہوں تو حضرت دو شغدفوں کے بیچ میں گلی تھا جو تنگ جگہ چھوٹی ہے اس میں کھڑے ہوئے اپنے مولیٰ کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول ہیں اور اور پارہ ہائے قرآن مجید کی اس تلاوت کو پورا فرما رہے ہیں جس کا حفظ قرآن کے وقت سے آپ نے التزام کیا تھا۔ مطوف و جمالین نے سب کچھ شور مچایا مگر حضرت کے طویل قیام میں ایک آیت کا بھی فرق نہ آیا۔ تلاوتِ قرآن جس سکون کو چاہتا ہے اس کا حق ادا فرما کر جب آپ نے سلام پھیرا تو اللہ کے شیر پر ایک غصہ کے آثار نمودار تھے اور تند و تیز لہجہ میں آپ نے مطوف سے کہا "تم بھول گئے ہم نے تم سے کیا وعدہ لیا تھا کہ سنت کے خلاف ہم ہرگز نہ کریں گے اور تم نے اقرار کیا تھا کہ جس طرح کہو گے اسی طرح کروں گا پھر قبل طلوع آفتاب کے چلنے پر ہم سے کہنے کا تم کو کیا حق ہے کہ فضول پریشان کر رہے ہو"۔ مطوف نے کہا کہ میں کیا کروں جمال نہیں مانتے جن پر کسی کا زور نہیں اور یہ اونٹ لے کر چل دیئے تو حج فوت ہو جائے گا۔ سنت کی خاطر فرض کو خطرہ میں ڈالنا تو اچھا نہیں"۔ اس جواب پر حضرت کا غصہ تیز ہو گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا ہم نے تم کو مطوف قرار دیا ہے استاذ اور پیر قرار نہیں دیا کہ علمی مشورہ لیں۔ جاؤ اپنا کام کرو ہم شروق آفتاب سے ایک منٹ پہلے بھی نہیں اٹھیں گے کہ ہمارا مال خرچ اور صعوبت برداشت کر کے آنا حج کو بطریق سنت ادا کرنے کے شوق میں ہوتا ہے نہ کہ تمہارے اور جمالوں کے غلام بننے کے لئے۔ جمالوں کو اپنے

اونٹوں کا اختیار ہے ان کا جی چاہے وہ ان کو لے جاویں باقی ہم پر ان کو کوئی اختیار نہیں کہ اٹھنے پر مجبور کریں۔ تم نے ناوقت شور مچا کر ہم کو پریشان کر دیا اور نماز تک نہیں پڑھنے دی اس لئے ہم تم کو بھی آزاد کرتے ہیں۔ اپنے دوسرے حاجیوں کو سنبھالو ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ اللہ کا شکر ہے ہم لُولے لنگڑے نہیں ہیں اور نہ عرفات کچھ زیادہ دور۔ اونٹ چلے جائیں گے تو پیدل بھی انشاء اللہ پہنچ جائیں گے۔ مگر تم یہ چاہو کہ سنت چھوڑ کر تمہارا کہنا مانیں سو اس کی ہرگز ہرگز ہم سے توقع مت رکھو۔

اب مطوّف کے پاس جواب ہی کیا تھا کہ زبان سے ادا کرے خاموش ہو کر چلا گیا اور حضرت نے پھر نیت باندھ لی اور اُسی سکون کے ساتھ تلاوت و نماز میں مشغول ہو گئے۔ حتیٰ کہ صبح صادق ہوئی اور حضرت نے با جماعت نماز پڑھی۔ بعد نماز مطوف و جمالین آئے اور جب کوہ ثبیر پر شعاع شمس چمک اٹھی تو حضرت اپنے شغدف میں سوار ہو گئے۔ اب وہی حضرت تھے اور وہی مطوف و جمال۔ وہی پیار اخلاص تھا اور وہی محبت کے ساتھ بات چیت کہ معمول ایسی حالت میں بھی قضا نہ ہوا اور وقت پر جو غصہ تھا وہ اُسی وقت ختم بھی ہو لیا۔ جمّال کی خاطر مدارات کرتے ہوئے ۱۰ بجے عرفات پہنچ لئے۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ سب سے زیادہ تعب کا اثر مجھ پر جہاز کے سفر میں ہوتا ہے اور درحقیقت میں نے بھی دیکھا کہ جہاز کے لنگر اٹھاتے ہی حضرت کو تکیہ سے سر اٹھانا مشکل ہو جاتا تھا جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مجاہدہ و ریاضت باطنیہ اور تدریس و تالیف کے مشغلہ علمیہ کے مسلسل پچاس سال کی محنت شاقہ نے آپ کے دماغ کو بالخصوص زیادہ ضعیف کر دیا تھا اور اس لئے جہاز کے حرکت کرتے ہی دوران سر میں آپ مبتلا ہو جاتے تھے۔ واقف حال ہونے کے سبب مجھے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ جہاز پر پہنچ کر سب سے پہلے آپ کا بستر بچھا دوں باقی کام پیچھے ہوتے رہیں گے۔ یا یں ہمہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے شب کے نوافل یعنی کبھی بیٹھ کر پڑھے ہوں یا اپنی طویل تلاوت میں کمی کی ہو۔ جہاز میں سناٹا چھایا ہوتا اور چار طرف

سے امداد و استفراغ کی پریشان کن آوازیں آتی رہتی تھیں۔ جہاز کے خلاصی اور خوگر ملازمین بھی چلتے ہوئے گردش جہاز کی وجہ سے مستانہ وار جھومتے اور گر گر پڑتے تھے مگر آپ پہاڑ بنے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں گھنٹہ سوا گھنٹہ اپنے مولا کے سامنے کھڑے ہو کر دو ڈھائی پارے پورے سکون کے ساتھ پورے کر لیا کرتے تھے۔ میں اپنا بستر اس نیت سے حضرت کے قریب ہی بچھایا کرتا کہ آخر شب میں وضو کے لئے پانی دے سکوں مگر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ دفعتہً آنکھ کھلی تو حضرت کو بستر پر موجود نہ پایا اور گھبرا کر اٹھا تو دیکھا کہ ڈولچی لئے ہوئے جہاز کے کنارے کھڑے ہو کر سمندر سے پانی کھینچ رہے ہیں۔ شرم کے مارے ڈوب جاتا اور ڈولچی ہاتھ سے لے لیتا مگر حضرت فرماتے کہ تم کمزور ہو جہاز حرکت زیادہ کر رہا ہے ایسا نہ ہو کہ گر پڑو۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ نماز کا سلام پھیرتے ہی حضرت کو بیٹھنا دشوار ہو جاتا اور اس طرح تکیہ پر سر رکھ دیتے تھے گویا چکر آگیا اور گر گئے مگر یہ ایک دن بھی نہیں دیکھا کہ نفلیں بیٹھ کر بھی پڑھی ہوں یا پاروں کے معمول میں اس عذر کو دخیل سمجھ کر قصار مفصّل پر اکتفا کر لیا ہو۔ جہاز جس وقت سقوطرہ میں پہنچتا جہاں سمندر کی گہرائی حد سے زیادہ ہے یا کسی دن سمندر میں تلاطم ہوتا اور مست ہاتھی کی طرح چنگھاڑنے والی موجیں جہاز کے ساتھ کھیل کرتیں تو جہاز پتہ کی طرح طولاً و عرضاً دونوں رخ ہنڈولے کی طرح ایسی عجیب حرکت کرتا کہ مشاق چلنے والے بھی مخمور مجبور کی طرح گر پڑتے تھے مگر ایسی حالت میں بھی زیادہ سے زیادہ حضرت کے معمولات پر اثر پڑا تو صرف اتنا کہ شاید ڈھائی تین پاروں کی جگہ ایک یا سوا پارہ پڑھ کر تکیہ پر سر رکھ دیا اور باقی تلاوت لیٹے لیٹے پوری کر لی مگر اس کو ہمیشہ دل ترستا ہی رہا کہ کاش حضرت اپنی حالت پر ترس کھا کر کسی دن رخصت پر عمل فرمالیں اور مختصر نفلوں پر اکتفا فرما کر بیٹھ کر ہی ادا کر لیں مگر نہیں۔ عزیمت کی مجسّم تصویر تھی جو بزبانِ حال یہ سبق پڑھا رہی تھی کہ رخصت پر عمل کرنے والے تو ہزاروں دیکھ سکو گے مگر عزیمت کا پتلا ان کمزور ہڈیوں کے زیر زمین چھپ جانے کے بعد نظر آنا مشکل ہو جائے گا

اے دل آں بہ کہ خراب از مئی گلگوں باشی ‌‌‌‌‌‌ بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں ‌‌‌‌‌‌ شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

آپ کی جوان لڑکی ہانی مرحومہ تپ دق میں مبتلا ہوئی اور جب اس کی زندگی سے یاس ہوئی تو آپ اس کو انبہٹہ لے گئے۔ قبیل رمضان مدرسہ کی چھٹیوں میں آپ وطن آئے تو اس کا پیمانۂ حیات لبریز ہوا۔ مرحومہ کی دنیوی زندگی کی سب سے آخری رات آئی تو اُس نے بھی محسوس کر لیا کہ اب دن کی دھوپ یا شب کی چھاؤں دیکھنا نصیب میں نہیں۔ اس لئے مرحومہ نے باپ سے خواہش کی کہ ابّا آج آخری تکلیف اور اٹھالو اور یہ شب میرے پاس بیٹھ کر گزار دو کہ تمہارا چہرہ دیکھتی ہوئی رخصت ہو جاؤں۔ مرحومہ کا محبوب شوہر مجنوں ہو چکا اور اس کے بقید حیات ہوتے ہوئے گویا مر جانے سے اس مرحومہ کے قلب پر ایسا صدمہ بیٹھا تھا کہ یہی بظاہر اس کے تپ کہنہ میں مبتلا ہونے کا سبب ہوا تھا اس لئے حضرت کو اس لختِ جگر کے ساتھ محبت بھی زیادہ تھی۔ آپ کئی راتیں اس کی تیمارداری میں ایسی گزار چکے تھے کہ سونا برائے نام ملا تھا اور یہ تو وہ فیصلہ کن شب تھی جس کے متعلق حضرت بھی سمجھ چکے تھے کہ کل کا دن نورِ نظر کے مٹی میں چھپانے اور کفن دفن میں مشغول ہونے کا ہے اس لئے ماں باپ دونوں اس کے پاس بیٹھ گئے۔ نصف شب گذری تھی کہ سانس میں تغیر پیدا ہو گیا اور سکرات شروع ہو گئی۔ رات کا سناٹا تھا اور حضرت کے لئے یہ جانگداز نظارہ۔ یٰسین شریف پڑھتے تھے اور بیٹی پر دم کرتے جاتے تھے۔ اس حسرتناک منظر میں وہ وقت آگیا جس میں حضرت کا اپنے مولیٰ کے سامنے حاضری دینے اور اس کے کلام پاک کے تین جزو اس کو سنانے کا معمول تھا۔ اس لئے آپ بیوی سے یہ کہہ کر کہ تم ہانی کے سانس دیکھتی رہو میں چند نفلیں پڑھ لوں اٹھ کھڑے ہوئے اور وضو فرما کر اپنے اس شغل میں لگ گئے جس کے پچاس برس سے عادی تھے اس حالت میں بھی آپ حافظہؒ کلام اللہ کی عادت مستمرہ سے غافل نہ ہوئے اور وہی تعداد

پوری فرمائی جس کی عادت تھی۔ ہاں ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے اور اہل سے پوچھتے تھے کہ کیا حال ہے اور جب یہ جواب سنتے کہ ابھی سانس باقی ہیں تو پھر نیت باندھ لیتے اور تلاوت شروع فرما دیتے تھے۔ آخر اِدھر آپ کا معمول ختم ہوا اور اُدھر مرحومہ کے سانس ختم ہو لئے کہ سلام پھیرنے پر جب آپ نے پوچھا کیا حال ہے تو جواب سُنا کہ رخصت ہوئی اور اللہ کو پیاری ہوئی تب آپ انا للہ پڑھ کر جنازہ کے سرہانے آبیٹھے اور اہل سے فرمایا کہ ابھی تو وقت باقی ہے نفلیں پڑھتا ہوں تو پڑھو ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عیال و خانماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہاں رابخشی دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند

بندہ محض عیادت کے خیال سے گھر سے چلا تھا مگر عصر کے وقت جب انبہٹہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ مرحومہ آخر شب میں رخصت ہوئی اور حضرت اس کو دفن فرما کر ابھی واپس ہوئے اور مسجد میں تشریف لے گئے ہیں۔ چنانچہ بندہ مسجد میں حاضر ہو کر حضرت سے ملا تو نہ حضرت کے چہرۂ انور پر حزن کا کوئی خاص اثر نمایاں تھا نہ بیداری شب اور تعب یوم کا کوئی اضمحلال۔ حسب عادت شریفہ مسکرا کر چھاتی سے لگا لیا اور خندہ روئی سے باتیں کرنے لگے۔ اسی طرح آپ کا اکلوتا جوان لڑکا حافظ ابراہیم مرحوم جب مرض الموت میں مبتلا ہو کر سہارنپور آیا تو اس کو کوئی اندرونی تکلیف ایسی تھی جس کے سبب وہ لیٹ نہیں سکتا تھا۔ سات راتیں متواتر حضرت پر ایسی گذریں کہ دن بھر مدرسہ کے مشاغل سے فارغ ہو کر گھر میں جاتے تو پیچھے بیٹھ کر اپنا سینہ مریض کا تکیہ بناتے اور اس کی کمر کو چھاتی سے لگا کر بیٹھ جاتے۔ ماں سے جس نے دن بھر کا تعب اٹھایا تھا فرماتے جاؤ چارپائی پر ذرا کمر سیدھی کر لو۔ چنانچہ وہ لیٹ رہتیں مگر نیند کس کو آتی۔ پھر نصف شب گذرنے پر وہ آجاتیں اور حضرت سے کہتیں کہ دن بھر کے تھکے ہوئے ہو ذرا تم بھی آرام کر لو۔ چنانچہ وہ بیمار کو سہارا دے کر بیٹھ جاتیں اور چند منٹ کے لئے حضرت چارپائی پر لیٹ

جاتے۔ مگر اس حالت میں بھی حضرت کا تہجد اور تلاوت طویلہ کا معمول کبھی نہ چھوٹا اور اس وقت میں جبکہ ماں کا تمیز ہوتا آپ وقت معمول پر چارپائی سے اٹھ کر اپنے خدا کے سامنے حاضری دیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ بھی بخیال عیادت حاضر ہوا تو اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ مرحوم دنیا سے رخصت ہو کر آج عصر کے وقت دفن ہو لیا۔ مدرسہ میں پہنچا تو نماز عشاء ہو چکی تھی اور معلوم ہوا کہ حضرت نے عشاء کی نماز باجماعت ادا فرما کر جب سلام پھیرا تو یوں فرمایا کہ سات شب متواتر جاگنے سے نیند کا اتنا خمار ہے کہ امام کے ساتھ رکوع و سجدہ تو کیا مگر نہ معلوم نماز ہوئی یا نہیں کہ آخر رکعت کی مجھے خبر ہی نہیں ہے۔ یہ فرما کر فوراً مکان تشریف لے گئے اور سو گئے۔ بایں ہمہ آخر شب میں آپ کا معمول ہاتھ سے نہ گیا کہ صبح کو حسب عادت صبح صادق ہوتے ہی حضرت سنت فجر سے فارغ ہو کر مدرسہ میں آ لئے اور مجھے دیکھتے ہی جواب سلام کے بعد معانقہ فرما کر سب سے پہلا لفظ یہ فرمایا کہ مجھے دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز کیوں نہ دے لی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت تشریف لے جا چکے تھے اور میں نے سن لیا تھا کہ حضرت پر متواتر سات شب جاگنے کی وجہ سے نیند کا غلبہ زیادہ ہے ایسی حالت میں حضرت کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ سمجھی اور یہاں آرام سے لیٹ رہا۔ حضرت نے فرمایا ہاں خمار تو بہت تھا مگر کیا حرج تھا تیری آواز پر آجاتا اور پھر سو جاتا۔

یہ چند واقعات ہیں جن سے ان عوارض و حوادث میں حضرت کی صرف استقامت اور محافظت کلام اللہ پر مواظبت کا نمونہ دکھایا ہے جن کے پیش آنے پر اچھے اچھے حفاظ کو فرض نماز کا بھی ہوش نہیں رہتا چہ جائیکہ معمول تلاوت۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تلاوت تنہا ہی نہیں بلکہ ہر امر مستحب و مسنون حتیٰ کہ صف اول اور یمین امام اور تحیۃ المسجد و نوافل قبل العصر و قبل العشاء تک امور میں حضرت کی مواظبت و اہتمام کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والے حیران ہو جاتے تھے۔ برسوں جن حضرات کو خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا وہ استعجاب کے لہجہ میں کہتے ہیں کہ اللہ اللہ حضرت کے معمولات دقیقہ میں ہم نے کبھی تخلف نہیں دیکھا۔ زمانہ نے کروٹیں لیں گردش افلاک نے تغیرات

ظاہر کئے۔ موسم بدلے عمر کے اوقات نے بچپن و جوانی اور کہولت و بڑھاپے کی صورتیں پلٹیں سب کچھ ہوا مگر بر ہوا یا بحر حضر ہوا یا سفر ریل ہوئی یا جہاز اور اونٹ ہوئے یا محمل عسر ہوا یا یسر اور صحت ہوئی یا مرض کسی حال اور کسی نمط حضرت قدس سرہ کے انضباط اوقات اور مواظبت معمولات میں تغیر نہ دیکھا۔ اس استقامت پر ہزاران ہزار حتی کرامات قربان کہ اسی کو اہل دل نے فوق الکرامۃ لکھا ہے۔ میں نے تمامی اسفار میں کٹھن سفر یعنی مدینہ منورہ کے راستے میں حضرت کو ایسا شدید بخار چڑھا ہوا دیکھا کہ بدن پر ہاتھ رکھنا مشکل تھا۔ مگر نماز با جماعت تو کیا قضا ہوتی تہامہ کی رات میں ذرا خنکی آتی تو بخار ہلکا ہو جاتا اور حضرت کا آخر شب کا معمول اُس حالت میں بھی فوت نہ ہوتا تھا ایک مرتبہ سفر جو دھپور میں بندہ ساتھ تھا اور حضرت مولانا تھانوی کا بعد عشاء وعظ ہوا جس سے ایک بجے فراغت ہوئی اور قیام گاہ پر پہنچ کر دو بج گئے۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور صبح صادق میں اتنی دیر تھی جو معمولاً حضرت کی نوافل میں صرف ہوتی تھی کہ ڈیڑھ سوا یا سوا پارہ قرآن مجید پڑھ لیں۔ سنگستانی گرمی کے سبب پتھر کے مکان میں دن کو بھی نیند آنا مشکل تھا اور اگلا سفر ابھی طویل باقی تھا اُس دن البتہ حضرتؒ کو دیکھا کہ قیام گاہ پر پہنچ کر فرمایا اب لیٹ کر اٹھنا مشکل ہے لاؤ نفلیں پڑھ لوں۔ پس تہجد تو قضا ہوئی نہیں مگر جہاں تک میرا اندازہ ہے نصف پارہ پڑھ کر حضرتؒ سو گئے اور باقی تلاوت دن میں پوری فرمائی۔ دنیا میں سب کچھ دیکھا اور اپنی وضع کے پابند ایسے دیکھے جن کو نظیر بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے مگر معمولات نفلیہ کا مجسمہ استقامت ایک ہی دیکھا، جس کی ظاہر بین کو اطلاع ہونے کی بھی کوئی صورت نہ تھی ؎

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند | دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد
زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند | اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

محافظت کلام اللہ کا یہ معمول تو گیارہ مہینہ کے لئے تھا مگر جب رمضان المبارک کا چاند نظر آجاتا جو کہ نزولِ قرآن کا مہینہ اور کثرت تلاوت کلام اللہ کے لئے مخصوص ہے تب تو آپ کی جد و جہد کی کوئی حد ہی نہ رہتی تھی۔ تراویح میں سوا پارہ

سنانے کا کہ قرآن مجید کے ہر رکوع پر رکوع فرماتے اور بیس رکوع روزانہ کے حساب سے ستائیسویں شب کو ختم فرمایا کرتے ہمیشہ آپ کا معمول رہا۔ مظاہر علوم کے مدرس بننے کے بعد آپ مسجدِ مدرسہ میں محراب سنانے کے پابند رہے اور دارالطلبہ بننے کے بعد دو سال وہاں کی مسجد میں محراب سنائی۔ سننے والوں کا ہجوم زیادہ ہوتا اور مشتاق دور دور سے آتے بلکہ بعض حفاظ اپنا سنانا بند کر کے اقتدا کرتے تھے۔ آپ متوسط جہر کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اور صاف صاف پڑھتے کہ ایک ایک حرف اچھی طرح سمجھ میں آتا تھا۔ چونکہ جوانی میں یاد کیا تھا اور نیز پڑھنے میں استغراق بھی ہوتا تھا اس لئے اٹکنے کی نوبت ضرور آتی مگر غلط پڑھنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ دفعتہً زبان رک جاتی یا متشابہ لگتا تو بتلانیوالے جیسا کہ رواج ہے جلدی سے بولتے اور کبھی غلط بھی بتا دیتے تھے جس کو حضرت نہ لیتے اور خود سوچ کر یاد دوبارہ صحیح بتانے والے کے بتانے پر آگے چلتے تھے بایں ہمہ آپ پر کبھی ناگواری کا اثر نہ ہوتا بلکہ سلام پھیر کر تسلی کے طور پر فرمایا کرتے کہ آخر جب حافظ بھولتا ہے تو سامع کو بھی بھولنا ضرور ہے اگر بھول کر کہیں غلط بتا دیا تو تعجب ہی کیا ہے"۔ محراب سنانے کا معمول حضرت کا برس ہا برس قائم رہا مگر عمر شریف جب ستر سال سے متجاوز ہوئی تو محراب سنانے کا تحمل دشوار ہو گیا اور حضرت فرمانے لگے کہ رکوع کرتا ہوں تو خیال ہوتا ہے دوسری رکعت میں کھڑا نہ ہو سکوں گا مگر ہمت کر کے کھڑا ہو جاتا ہوں آخر بیس رکعت اسی طرح پوری ہوتی ہیں کہ ہر رکعت میں گر جانے کا اندیشہ رہتا اور سجدہ سے اٹھ کر کھڑا ہونا پہاڑ پر چڑھنے سے زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے"۔ اس حالت میں بھی آپ دو سال نباہ گئے اور ہمت نہ ہارے آخر جب قوت نے جواب ہی دے دیا تو محراب سنانا چھوٹ گیا مگر اس کے بدلے دوسرے سے سننے اور خالی اوقات میں خود تلاوت کرنے کا شغل بڑھ گیا۔

ماہِ مبارک میں اوّل اشراق سے بارہ بجے تک تلاوت فرماتے اور پھر بعد

ظہر سوا پارہ کسی حافظ کو سناتے تھے۔ چند سال اجراڑہ کے حافظ محمد حسین صاحب نے رمضان حضرت کی خدمت میں گزارا تو یہ سننا ان کے متعلق رہا ورنہ مولانا محمد الیاس یا مولوی زکریا جو بھی نظر پڑتے ان کو سناتے۔ کبھی دونوں کو جُدا جُدا سناتے کہ اسی میں عصر کا وقت آجاتا اور نہ اکثر ایک کے سنانے پر اکتفا فرما کر یہی پارہ دوبارہ خود پڑھا کرتے تھے۔ فرض مغرب سے فارغ ہو کر اوابین میں سوا پارہ حسب معمول قدیم خود پڑھتے اور پھر ایک پارہ کسی کو سناتے اس کے بعد مکان میں کھانا تناول فرماتے اور عشاء کی اذان پر تشریف لاکر تراویح میں محراب سناتے تھے اور جب محراب سنانا چھوٹ گیا تو صحیح اور صاف پڑھنے والے خوش الحان حافظ کا اقتدا فرماتے جن میں اکثر حافظ عبد اللطیف صاحب ہوا کرتے اور کبھی کبھی مولوی محمد الیاس صاحب۔ پھر حسب عادت صبح صادق سے دو گھنٹہ قبل اٹھ کر تہجد میں دو ڈھائی پارہ کی تلاوت فرماتے اور اگر اُس وقت کے لئے کوئی سنانے والا حسب پسند ہوتا تو خود پڑھنے کے بجائے اس کا اقتدا فرماتے۔ جب تک مولانا محمد یحییٰ صاحب حیات رہے تو عشرۂ اخیرہ میں پورا قرآن مجید سنانا بحالتِ اعتکاف ان کے ذمہ رہا اور ان کے بعد مولوی زکریا صاحب یا حافظ عبد اللطیف صاحب جن کو باہمت پایا ان کو لے لیا رمضان میں اگر آپ کو سفر پیش آتا تو حافظ کو جن کے اقتدا میں آپ سننا شروع فرماتے اپنے ساتھ لیا کرتے تھے تاکہ ختم ناتمام نہ رہے اور سلسلہ ٹوٹ نہ جائے۔ غرض ہر مہینہ پانچ چھ ختم کرنے کی آپ کی عادت گیارہ مہینے کی تھی تو ماہ مبارک میں اس کا نصاب دو چند یا سہ چند ہو جایا کرتا تھا۔ اور آخر عمر شریف میں مدینہ منورہ پہنچ کر تو اس معمول میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا کہ ڈاک دسویں دن آتی تھی لہذا یہاں جو کثیر وقت روزانہ جواب خطوط میں صرف ہوا کرتا وہ وہاں تلاوت کے لئے مخصوص ہو چکا تھا۔ اور تعلیق ختم ہونے کے بعد اس کا وقت بھی زیادہ تر تلاوت ہی میں صرف ہوتا کہ مکان کے اندر علیحدہ بیٹھ کر کبھی حفظ پڑھتے اور کبھی قرآن شریف میں دیکھ کر مولانا سید احمد

صاحب اور مولوی زکریا صاحب نے یہ دیکھ کر کہ حضرت تالیف شرح حدیث کی اس درجہ دماغی محنت کے بعد تلاوت کا اس ضعیفی میں طاقت سے بہت زیادہ بار اٹھا رہے ہیں عرض بھی کیا کہ حضرت دماغ کی بھی رعایت کی ضرورت ہے مگر حضرت بلیساختہ فرمایا کرتے کہ اب اس سے کام ہی کیا لینا باقی ہے جو رعایت کروں"۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ضعف کی وجہ سے حافظہ پر اثر پاتا ہوں اس لئے مجھے ڈر ہے کہیں کلام مجید نہ بھول جاؤں اس وجہ سے اس کا اہتمام کرتا ہوں"۔ ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ دماغ چاہے جائے یا رہے مگر کلام مجید تو نہیں چھوٹتا ہے

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو   جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اور اُس آخری رمضان کا تو پوچھنا ہی کیا جو عمر شریف کا آخری رمضان تھا کہ غذا بھی سادہ چائے کا ایک فنجان اور بمشکل آدھی چپاتی رہ گئی تھی۔ تلاوت وسماعت کا مجاہدہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ دیکھنے والے خدام اس ماہِ مبارک کا آخری ہونا سمجھ چکے اور اندازہ لگا چکے تھے کہ یہ فرطِ شوق وغلبۂ اشتیاق یقیناً قربِ وصال اور لقاءِ رب کا مقدمہ ہے۔ یعنی اول صبح کو سوا پارہ حفظ سناتے اور پھر ظہر سے عصر تک مسلسل تلاوت کبھی دیکھ کر اور کبھی حفظ فرماتے۔ بعد مغرب اوابین میں سوا پارہ سناتے اور چونکہ ضعف حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا کہ کھڑے ہو کر نوافل کا پڑھنا بھی مشکل تھا اس لئے کبھی کھڑے ہو جاتے اور کبھی بیٹھ جاتے۔ پھر عشاء کی نماز حرم میں پڑھ کر مولانا سید احمد صاحب کے مدرسہ میں تشریف لاتے اور قاری محمد توفیق صاحب مدرس تجوید کے اقتداء میں تراویح پڑھتے کہ وہ نہایت اطمینان سے دو پارے پڑھتے جن میں عربی پانچ بج جاتے جو یہاں سوا بارہ بجنے کا وقت ہے۔ اس کے بعد قریب ۶ بجے عربی کے سو جاتے تھے۔ مولوی زکریا صاحب کو حکم تھا کہ ۸ بجے مجھے جگا دیا کرو۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ تمام رمضان میں صرف ایک یا دو دفعہ مجھے اس کی نوبت آئی کہ حضرت کی آنکھ اس سے قبل نہ کھلی ورنہ ہمیشہ جب ۸ بجے پہنچا تو حضرت کو یا وضو فرماتے دیکھا یا استنجا کرتے ہوئے۔

چنانچہ حضرت دو پارے اس وقت نفلوں میں سنتے کہ حضرت کو امام نافع کی قرأت کا مل سننے کا شوق تھا۔ اس لئے مدرسہ کے دو طالبعلم ایک ایک پارہ اس قرأت کا سناتے تھے۔ آخری ۲۷ رمضان کی شب میں حضرت کو بخار چڑھ آیا اور بدن میں خدر کا اثر ہوا جس کا سلسلہ وصال تک چلا اور آپ اپنے محبوب لم یزل کے کلام پاک کی تلاوت و سماعت پر اپنی صحت وحیات کو نچھاور فرما کر بقیع الغرقد میں میٹھی نیند جا سوئے۔ فاطاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ۔

اس سے قبل ۱۳۳۸ھ کے سفر حجاز میں چونکہ رمضان کا چاند جہاز ہی میں نظر آ گیا تھا باوجود دوران سر اور غایت تعب کے آپ نے تراویح کا اہتمام فرمایا اور کلام مجید سننا اور سنانا شروع کر دیا۔ کہ مولوی محمد زکریا صاحب سانف تھے اول ۸ رکعت میں حضرت نصف پارہ سناتے اور پھر بارہ رکعت میں مولوی زکریا صاحب پون پارہ سنایا کرتے تھے۔ ۱۰ رمضان المبارک کو مکہ مکرمہ پہنچ گئے تو حضرت نے تراویح ایک قاری صاحب کی اقتدا میں پڑھیں اور اپنا کلام مجید نوافل میں ختم فرمایا۔ اس سفر میں جہاز سے جدہ اترنا عین مغرب کے وقت ہوا اور تکان کا یہ عالم تھا کہ تراویح کا تو کیا ذکر فرض نماز کا بھی کھڑے ہو کر پڑھنا مشکل تھا۔ مگر حضرت نے اس شب میں بھی کچھ تراویح کھڑے ہو کر اور کچھ بیٹھ کر پڑھیں۔ اللہ رے ہمت، آپ کے کمالات حسیہ کا نقشہ اتارنا ممکن مگر اس خداداد نعمت کو کن لفظوں میں ادا کروں جس کے کارناموں نے عقل کو حیران اور زبان کو گنگ بنا دیا۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید   لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

تدریس اور بیعت

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی   تا راہ بین نباشی کے راہبر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق   ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء جبکہ آپ کی عمر انیس سال تھی آپ کے تعلیم دینیات سے

فراغ کا سال ہے جس کی خوشی میں آپ کے والد شاہ مجید علی صاحب نے تمام برادری کو اس طرح مدعو کیا جیسے تقریبات شادی و نکاح میں کیا جاتا ہے اور بڑی فراخ دلی سے سب کو کھانا کھلایا۔ فارغ ہوتے ہی آپ مدرسہ مظاہر علوم میں معین المدرسین بنا دیئے گئے اور آپ کا درس شروع ہو گیا تھا کہ ایک زمانہ تھا جس میں پسر بن کر آپ استاذ کے سامنے بیٹھا کرتے تھے اور اب بحمداللہ وہ وقت آگیا کہ اسی مدرسہ میں آپ پدر بن کر مسند درس پر بیٹھے اور ابتدائی کتابوں کے طلبہ آپ کے شاگرد بنے مگر تحصیلِ ادب کا شوق چونکہ آپ کو بے چین کئے ہوئے تھا اس لئے آپ لاہور چلے گئے اور جب وہاں سے واپسی ہوئی تو آپ کے ماموں مولانا محمد یعقوب صاحب نے اکیس روپیہ ماہوار پر قاموس کا ترجمہ کرنے کے لئے منصوری پہاڑ پر بھیج دیا کہ کسی صاحب نے ترجمہ سے مناسبت رکھنے والے قابل عالم کی آپ سے درخواست کی تھی اور اس کے لئے آپ نے حضرت کا انتخاب فرمایا تھا۔

منصوری پر آپ کے قیام کو چند ماہ گزرے تھے کہ منگلور کے مدرسہ عربیہ میں مدرس کی طلب ہوئی اور آپ کو مدرس اول بنا کر وہاں بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد آپ بھوپال بہاولپور بریلی اور دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے جس کا تذکرہ آئندہ کیا جائے گا اور آخر کار ۱۳۱۴ھ میں جب کہ آپ کی عمر پینتالیس ۴۵ سال کی تھی چالیس روپیہ مشاہرہ پر صدر مدرس ہو کر مظاہر علوم سہارنپور میں تشریف لے آئے جس میں آپ نے پڑھا اور علمی نشو و نما پایا تھا۔ دلدادہ باغبان بن کر اپنے استاذ مولانا محمد مظہر صاحب کے لگائے ہوئے اس باغیچہ کو جس شیفتگی و عشق کے ساتھ آپ نے سینچا نیو لایا اور پانی پہنچایا ہے اس کا اظہار آج خود مدرسہ کی زبان حال کر رہی ہے ؎

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود　　　　که نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

باوجودیکہ آپ درس نظامیہ کے تمامی علوم سے فارغ ہو چکے اور مسند درس پر بیٹھ چکے تھے مگر آپ کی فطرت سلیمہ مغز کے روغن اور بدن کی روح یعنی

اُس معرفت الٰہیہ کی جو یاں تھی جو قال کو حال بنادے اور اُس آبحیات کی پیاسی تھی جو کشت زار ایمان کی آبیاری کرے اور اعمال جوارح کے ایک ایک دانہ کو ستر ستر ہزار بنا کر نکالے۔

غذا ہی ہے جس سے خون پیدا ہو کر حیات و قوت جسمانی مرتب ہوتی ہے مگر غذا کی رغبت وطبعی خواہش ایک دوسری چیز ہے کہ وہ نہ ہو تو جبر و قہر کے درجہ میں غذا کا استعمال چنداں مفید اور پائدار نہیں ہوتا۔ ایک شخص کو معلوم ہے کہ زراعت کا یہ طریق ہے مگر اُس کو کھیتی کرنے سے دلچسپی نہیں ہے لہٰذا یہ علم اس کے لئے کار آمد نہیں۔ اسی طرح علوم شرعیہ حصول نجات اُخروی کے لئے بمنزلہ شرط اور رکن اعظم ہیں مگر اس کے ساتھ ہی جب تک قلب میں آخرت کا یقین اور اس کی لذتوں کے حاصل کرنے کا شوق نہ ہو اس وقت تک اس علم پر بطیب خاطر عمل ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے، کہ پیغمبر کے احسان اُمت پر دو طرح کے ہیں۔ ایک یعلمہم الکتاب کہ وہ راستہ بتاتے اور طریق نجات سکھاتے تھے دوم یزکیہم کہ پاس بٹھا کر قلب میں ایک نور ڈالتے اور عمل کا ایک شوق جس کو دلچسپی کہنا چاہئیے پیدا کرتے تھے۔ کہ عمل کے لئے محرک بن کر حاضر و غائب بحالت عسر و یسر ہر صورت میں بندۂ خدا اور مستقیم الحال بنائے رکھے۔ پس خاگی انڈا ہر چند کہ انڈا ہے مگر اس کے اندرون میں ایک نظر نہ آنے والی ایسی شئے کی کمی ہے جس کے سبب اس میں بچہ بننے کی قابلیت نہیں اور بقاء نسل و سلسلۂ تولید میں اس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ پس آپ عالم تھے اور علم کو صورتِ عمل اور عمل کو صورتِ حال بنانے کے خواہش مند تھے۔

قدرت نے ولایت خاصہ آپ کے نصیب میں لکھی اور شیخ وقت ہونا آپ کے لئے مقدر فرمایا تھا اس لئے اس وقت جبکہ آپ منگلور میں مدرس تھے اس نور کی طلب آپ کے قلب میں پیدا ہوئی جو حرص و ہوا کی ظلمت کو مٹائے اور ایمان میں وہ حلاوت ڈالے جس کے حاصل کرنے کا علم ظاہری وسیلہ اور آلہ ہے اور یہ

طلب اتنی بڑھی کہ رہبر کی تلاش میں آپ کا طائر خیال بار بار پرواز کرتا اور بے چینی کے ساتھ اس کا داعیہ پیدا ہوتا کہ جلد کسی اللہ والے کا دامن پکڑوں جو علم ظاہر کے مقصود تک پہونچائے اور طاعت و بندگی کا ذوق پیدا کرے کہ ہے

گر ہوائے ایں سفر داری دلا — دامن رہبر بگیر و پس درآ
بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق — عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق
گر تو خواہی خرمی و دل زندگی — بندگی کن بندگی کن بندگی:
زندگی مقصود بہر بندگی ست — زندگی بے بندگی شرمندگی ست
جز خضوع و بندگی و اضطرار — اندریں حضرت ندارد اعتبار
ہر کہ اندر عشق یابد زندگی — کفر باشد نزد او جز بندگی
ذوق باید تا دہد طاعات بر — مغز باید تا دہد دانہ شجر

دنیا اور دنیا کی ہر چیز انسان کے لئے بنائی گئی ہے کہ ایک چیز بھی نہ ہو تو کسی نہ کسی انسانی ضرورت میں حرج ضرور واقع ہو جائے گا، مگر انسان دنیا کی کسی چیز کے لئے بھی نہیں بنایا گیا کہ انسان معدوم ہو جائے تو کسی چیز کا کوئی بھی حرج و نقصان نہیں اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اصطبل اور گھاس دانہ کا تمامی سامان گھوڑے کے لئے ہے، گھوڑا صرف آقا کی سواری کے لئے اسی طرح تمامی کائنات زمین و آسمان بحر و بر نباتات و جماد سب انسان کی راحت کے لئے ہے۔ اور انسان محض اپنے خالق برتر کی غلامی و عبادت کے لئے مگر عبادت کے لئے ضرورت ہے دو چیز کی۔ ایک طریق عبادت سے واقفیت جس کا نام علم دین ہے۔ دوم عبادت سے دلچسپی اور شوق و رغبت جس کا نام تزکیہ باطن اور عشق و محبت ہے۔ لیکن اول کا حصول بواسطہ درس و تدریس مدارس علمیہ میں ہوگا۔ اور شریعت نام رکھا جائے گا۔ دوسرے کی تحصیل اہل اللہ کی جوتیاں اٹھانے سے خانقاہوں میں ہوگی جس کو طریقت کہا جائے گا۔ اور

وہی شریعت کی روح اور مغز اور اصل الاصول ہے کہ اس کے بغیر یا باوجود علم کے عمل ہی نہ ہو سکے گا یا ہوگا تو بار آور و مثمر نہ ہوگا اور پائدار بھی ہوا تو بے مزہ اور بے عاشقی و ناپائدار ہوگا۔ جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ علم بلکہ انسانی زندگی کا مقصود اعظم یہی تعلق مع اللہ ہے جو محرک ہوتا ہے علم پر عمل اور احکم الحاکمین کی طاعت و عبادت کا۔

اس مقصود کے حاصل کرنے کو حقیقت آگاہ معرفت دستگاہ منبع البرکات سلطان العارفین مخدوم العالم امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سے بہتر کون تھا کہ مطلب لارشاد ہوتا آپ کا عالم آشکارا ہو چکا اور اہل علم و بصیرت کی جماعت در جماعت دور دور سے آپ کی طرف کھچی چلی آتی تھی۔ آپ کا وطن گنگوہ سے پانچ ہی کوس تھا اور گنگوہ میں آپ کی سسرال بھی تھی کہ اکثر آپ یہاں آتے اور حضرت کی زیارت کیا کرتے تھے۔ آپ یہ بھی لکھتے تھے کہ آپ کے استاذ مولانا محمد مظہر صاحب جن کے تبحر علم اور کمالات قدسیہ کی ایک خاص عظمت آپ کے قلب میں جاگزین تھی گو عمر میں حضرت گنگوہی سے بڑے تھے مگر عقیدت مندانہ حاضر آستانہ ہوا کرتے اور بے اختیار حضرت کے پاؤں پر بوسہ دیکر آنکھوں میں آنسو بھر لایا کرتے تھے۔ حضرت امام ربانی شرماتے اور فرمایا کرتے کہ آپ مجھے کیوں نادم بنایا کرتے ہیں۔ آپ تو مجھ سے بڑے ہیں اور آپ کا ادب و احترام مجھ پر ضروری ہے۔ آپ ایسا کام نہ کیا کریں کہ مجھے شرم آتی ہے۔ مگر حضرت مولانا محبت سے مجبور تھے۔ پھر آپ کے شاگرد رشید مولوی خلیل احمد صاحب کے قلب میں حضرت گنگوہی کی جو بھی عظمت پیدا ہو وہ تھوڑی ہے۔

قافلہ سالار راہ روشن ضمیر — آں رشید احمد شہ برنا و پیر
قطب عالم غوث دوراں بے مثال — گنج عرفاں نور ایقاں خوش خصال
زندہ دل زندہ نفس عالی صفات — تشنگان عشق را آب حیات
ہادی گم گشتگان راہ حق — مجتہد برحق رئیس الفقہ

دل آگاہ از فضل و امداد الٰہ ۔۔ طالباں را مے برد تا پیشگاہ
عقل او زندہ کند مردہ دلاں ۔۔ قلب او روشن کند قلب جہاں
بے نیاز از خلق آں خادم نواز ۔۔ با خدا راز و نیاز دل گداز
گر بگویم تا قیامت نعت او ۔۔ ہیچ آں را مقطع و غایت مجو

اس لئے جس وقت بھی آپ کے دل کو ایک بے کلی محسوس ہوئی اور وہ ایسے راہبر کا جویاں ہوا جس کے ہاتھ میں ایمان کی باگ پکڑا تا صحیح ہو تو فوراً حضرت قدس سرہٗ کا تصور آتا اور آپ کے اضطراب میں سکون پیدا کر جاتا تھا۔ کبھی ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کے قلب میں شیخ بنانے کے لئے حضرت کے سوا کسی دوسرے کا خطرہ بھی گزرا ہو اور سچ یہ ہے کہ اسی توجیہ مطلب نے جو گویا آپ کے لئے وراثت تھی آپ کو آنا خوش نصیب بنایا جس کی تمنا ہوتی ہے کہ کاش یہ نعمت ہم کو بھی نصیب ہو۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء چنانچہ آپ نے اپنے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو کہ حضرت گنگوہی کے استاد زادہ تھے اور حضرت ان کا بہت ہی لحاظ فرماتے تھے اس مقصود کا واسطہ بنایا اور لکھا کہ حضرت گنگوہی سے میری سفارش فرما دیجئے کہ مجھے بیعت کر لیں۔ مولانا نے حضرت امام ربانی کے نام خط تحریر فرما کر حضرتؒ کے پاس بھیج دیا اور وہ خط لے کر آپ گنگوہ حاضر ہوئے۔ حضرت کی غیور طبیعت چونکہ وصال الی اللہ کی عظمت و شان کا لحاظ رکھتے ہوئے اس پر مجبور ہوئی تھی کہ جب تک طالب کے قلب میں سچی طلب نہ ہو اس وقت تک رسمی بیعت بے سود ہے اس لئے طلب کا امتحان فرمایا کرتے اور خداداد حذاقت سے باتوں باتوں میں پتہ چلا لیا کرتے تھے کہ بیعت کا نام مقصود ہے یا کام۔ لہٰذا آپ نے استاد زادہ کا خط پڑھ کر اس طرح رکھ دیا گویا کوئی چیز ہی نہیں اور استغنا کے ساتھ فرمایا کہ میاں تم پیرزادہ ہو خود پیر ہو تمہیں کسی کے مرید ہونے کی کیا ضرورت؟ مگر اللہ رے قلبا کی قابلیت کہ یہ سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور عرض کیا کہ حضرت کیسی پیرزادگی

میں تو اس در کے کتوں کے برابر بھی نہیں بیعت کا حاجت مند ہی نہیں بلکہ سرتاپا احتیاج ہوں اور چھاتی سے لگا لیجئے یا دھکے دیجئے میں تو حضرت کا غلام بن چکا " یہ الفاظ آپ کی زبان سے نکلنا تھے اور حضرت کے چہرہ پر انبساط کی لہر دوڑ گئی کہ آپ نے فرمایا بس بس بہت اچھا اور اس کے بعد فوراً بیعت کر لیا۔ طلبگار باید صبور و حمول ❊ کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

غلام نواز آقا کی محبانہ گرفت نے ہاتھ میں ہاتھ ڈالتے ہی آپ کو محبوب بنا لیا اور آپ یہ عہد کئے ہوئے گنگوہ سے رخصت ہوئے کہ حضرت نے جو کچھ ارشاد فرمایا آئندہ فرمائیں گے اس پر مرمٹوں گا اور جان کھپا دوں گا کہ طلب کا منتہا یہی ہے ؎

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست ❊ آنجا جزانکہ جان بسپارند چارہ نیست

امام ربانی کا مرجع علماء و صلحاء ہونا تو آپ عرصہ سے دیکھ رہے تھے اور آپ کا جامع شریعت و طریقت شیخ ہونا آپ کے لئے عین الیقین بن چکا تھا مگر اب نفس کی بیع تمام ہو جانے کے بعد تو آپ اپنے خریدار کے شیدا بن چکے تھے کہ آپ کا رُواں رُواں پکار رہا تھا ؎

گنگوہ میں اک خدا رسیدہ دیکھا ❊ اللہ کا برگزیدہ بندہ دیکھا
کیا وصف کروں میں اس کا مشتاق ❊ انسان کی شکل میں فرشتہ دیکھا

آپ کے قلب میں محبت کی ایک حرارت تھی جو رگ رگ میں پھیلی جاتی اور اللہ جل جلالہٗ کی طرف توجہ کا ایک میلان تھا جو خون کے ساتھ ملا ہوا سارے بدن میں سرایت کر رہا تھا جس کی بے کیف لذت کے اظہار پر آپ کو قدرت نہ تھی اور اس خواہش میں کہ کاش تمامی امت محمدیہ اس مزہ سے آشنا ہو جائے آپ بزبان حال کہہ رہے تھے ؎

باز از عشق و شوق محبت کے جاں فروش ❊ لیکن کہ جل جلالہٗ سے بیالے پئے دل کو
سیکھیں طریق وصل کہ لئے ہم سے پاک ❊ دل بیچ کر خرید لیں سودا جنوں کا

غرض آستانۂ گنگوہیہ سے آپ ایک لطیف لعل خرچ لے کر واپس ہوئے کہ علم شریعت کے منتہی تھے اور علم طریقت کے مبتدی مدرسہ عربیہ میں آپ مدرس تھے کہ طلبہ کو درس دیتے تھے اور مکتب معرفت کے آپ طالب علم تھے کہ خالق جل جلالہ کی عظمت و محبت کا سبق پڑھا کرتے تھے دن بھر تشنگان علم کو فقہ و تفسیر کا سبق پڑھاتے اور شب کو ذکر الٰہی سے انس و التذاذ حاصل کرتے اور سنسان گھڑیوں میں جبکہ دنیا پڑی سویا کرتی آپ اپنے مولیٰ کے ساتھ رازو نیاز میں مشغول ہو جایا کرتے تھے آپ کے شاگردوں عزیزوں اور آس پاس والوں کو پتہ بھی نہ چلا کہ آپ کس دھن میں لگے ہوئے اور کس سوز و گداز میں مبتلا ہیں سہ

نظر کو کیا خبر پردہ کے اندر دل لگی کیا ہے ۔ کوئی آزاد کیا جانے کسی کی دل لگی کیا ہے

اب یہ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ نے کس ترتیب سے سلوک طے کیا شیخ کی طرف سے کیا کیا تعلیم ہوئی کیا حالات گذرے اور راہ طریقت قطع کرتے میں کیا کیا مناظر آپ کو پیش آئے بجز اس کے کہ حضرتؒ نے ایک بار خود فرمایا مجھے نہ زیادہ واردات پیش آئے اور نہ آخر تک میں سمجھا کہ نسبت سلسلہ کیا چیز ہے بس ایک حالت تھی جو گذر رہی تھی حتی کہ ۱؎ ۱۲۹۷ھ میں جب آپ دوسرے حج کے لئے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے تو حضرت امام ربانی نے مرشد العرب والعجم اعلیحضرت حاجی امداد اللہ شاہ صاحبؒ کی خدمت میں لکھا کہ مولوی خلیل احمد حاضر خدمت ہوتے ہیں۔ حضرت ان کی حالت پر مطلع ہو کر مسرور ہوں گے۔ چنانچہ جب آپ حاضر ہوئے تو اعلیحضرت آپ کی باطنی کیفیت مشاہدہ فرما کر نہایت خوش ہوئے اور جب آپ رخصت ہونے لگے تو چھاتی سے لگایا اور اپنی دستار مبارک سر سے اُتار کر آپ کے سر پر رکھدی۔ امام ربانی کے نام مبارکباد کا خط اور حضرتؒ کے نام کا خلافت نامہ مزین بمہر آپ کے حوالہ فرما کر رخصت کیا۔ حضرت نے اس شاہی عطیہ کو ایک خاص احترام کے ساتھ قبول کیا اور دستار مبارک کو اسی بندش پر جو اعلیٰ حضرت کی باندھی ہوئی تھی جگہ جگہ سوئی سے سی لیا کہ اس کے بل جدا نہ ہونے پائیں اور جب ہندوستان پہنچ کر گنگوہ حاضر ہوئے تو اعلیٰ حضرت کا والا نامہ پیش کر کے

۱؎ بقول الجھو تر جیر لواجہ اور تذکرۃ الرشید میں یہ حج اور حصول خلافت کا سال ۱۲۹۶ھ لکھا گیا ہے مگر حضرت گنگوہیؒ کے مکاتیب سے جو کہ حضرت کے نام بہاولپور گئے ہیں پتہ چلتا ہے کہ یہ سال آپ کے حج کا نہیں بلکہ ۱۲۹۶ھ کو فی الحال ۱۲۸۸ھ

یہ دونوں عطیے بھی امام ربانی کے سامنے رکھ دیے حضرت نے فرمایا مبارک ہو یہ تو اعلیٰحضرت کا عطیہ ہے۔ آپ نے عرض کیا کہ بندہ تو اس لائق نہیں یہ حضور کی بندہ نوازی ہے اور میرے لئے یہ بھی مبارک ہے جو آنحضرت کی طرف سے عطا ہو نیز یہ بھی عرض کیا کہ اجازت نامہ در حقیقت شہادت ہے کسی مسلمان کے ایمان کی لہذا دو مقبول شہادتیں ثبت ہوں گی تو ہر شخص کے نفسی نفسی پکارنے کے وقت بارگاہ خدا میں پیش کر سکوں گا۔" حضرت امام ربانی آپ کے اس حسن ادب سے کہ اصل کمال یہی ہے بہت خوش ہوگئے اور خلافت نامہ پر دستخط فرما کر مع دستار آپ کے حوالہ فرما دیا۔

اس طرح جیسے آپ نے تکمیل علوم شریعت کی دستار فضیلت حاصل کی تھی اسی طرح طریق سلوک طے فرما کر روحانی باپ اور جد امجد کے ہاتھ سے دستار خلافت حاصل فرمائی اور اس نسبت احسانیہ سے مالا مال ہوئے جو کہ مشکوٰۃ قلب رشید کو تھا اور جو سلسلہ رشیدیہ کی شاخ بن کر سلسلہ خلیلیہ چلنے کی بنیاد تھی۔ مگر یہ آپ کا حسن ادب تھا کہ جب تک حضرت امام ربانی حیات رہے آپ نے کسی طالب کو خود بیعت کرنا پسند نہ فرمایا اور اگر کبھی ضرورت اور اصرار ہی کی نوبت بھی آئی تو آپ نے توبہ کرا کے یہ الفاظ کہلائے کہ "بیعت کرتا ہوں میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے خلیل احمد کے ہاتھ پر" ہاں حضرت امام ربانی کی وفات کے بعد آپ کا سلسلہ بڑھا اور اطراف ہند سے آگے نکل کر حجاز تک پہونچا کہ اہل حرمین شریفین نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

قلب میں کیفیات حسنہ اور انوار و تجلیات کا ورود قدرت نے حالانہ محبت کے ساتھ مربوط کیا ہے کہ اس مجاذب کمالات مرید کا اپنے شیخ کے ساتھ وہ تعلق روحانی ہے جس کو حب کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اور حدیث المرء مع من احب میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے باقی اذکار و اشغال اور تعلیم کردہ

اور یادی رکھنا چاہیئے اس کے اذکار بمنزلہ اوزار کے ہیں کہ ان کے بدون بھی چارہ نہیں دیکھو ریل کا چلنا حقیقتاً اس بھاپ پر موقوف ہے جس کو گیس کہا جاتا ہے اور جتنی وہ قوی ہوگی اسی قدر انجن کی رفتار تیز اور قوی ہوگی کہ اس کے بغیر گاڑی ایک قدم بھی نہیں سرک سکتی مگر باین ہمہ پٹری اور پہیوں کی بھی ضرورت ہے کہ اُن کے بغیر رفتار مستقیم و معتاد پیدا نہیں ہو سکتی۔ پھر چونکہ عمل و مجاہدہ امر اختیاری ہی اور کسبی ہے مگر حب الشیخ اور ربط مع الشیخ امر غیر اختیاری اور محض وہبی امر ہے اس لیئے یہ بالکل صحیح ہے کہ جس کو جو کچھ بھی روحانی کمال نصیب ہوا وہ محض فضل خدا سے نصیب ہوا ہے نہ کہ کسب سے مگر اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ عادت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ جو اس کے مقرر کردہ طریق پر چلتا ہے اور مجاہدہ و ریاضت میں اپنے آپ کو ڈالتا ہے وہ اسی کو روحانی کیفیات بخشتا اور اپنے قرب کا مزہ چکھاتا ہے۔ ورنہ اس کی غفلت و بے پروائی جو کہ اس کا امر اختیاری ہے اس کی محرومیت کا سبب بن جاتی ہے پس حضرتؒ کا مجاہدہ عملیہ اتنا کثیر نہیں ہے جتنا آپ کے اکثر معصروں کا مگر وہی امر یعنی حب مع الشیخ نے آپ کے تھوڑے سے عمل پر وہ ثمرہ مرتب کیا جو دوسروں کے کثیر پر بھی مرتب نہیں ہوا۔ اور یہی راز ہے اُمتِ محمدیہ کے اعمالِ قلیلہ پر ان صلات وا جور کے مرتب کرنے میں جو دوسری اُمتوں کے اعمال کثیرہ پر بھی مرتب نہیں ہوئے کہ محبوبیت کے ساتھ نوازے ہوئے پیغمبر کے ساتھ محبت و عقیدت کا تعلق رکھنے والا غلام جذبۂ محبت کی وجہ سے انوار محمدیہ کا وہ انعکاس قبول کرے گا جس سے دوسرے قلوب محروم رہیں گے پس اس وہبی امر اور عطاء و فضل میں کسی کو اس سوال کا کیا موقع کہ فلاں پر کیوں فضل ہوا اور ہم پر وہ فضل کیوں نہ ہوا ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشآء۔

حضرتؒ پر حق تعالیٰ شانہٗ کا خاص فضل تھا کہ بیعت ہوتے ہی آپ کے قلب میں حضرت گنگوہیؒ کی وہ محبت پیدا ہو گئی تھی جس کو دُنیا کی مرغوب سے مرغوب

چیز بلکہ ماں باپ کی محبت کے پیمانہ سے بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور یہی محبت مرقاۃ
حبِ الٰہی کی تھی نیز یہ بھی تھی کہ اس کے بغیر منتہائے مراد کا حصول ناممکن ہے یہی
یہی نہیں کہ آپ ذکر و شغل کی بابت شیخ سے پوچھیں یا دعا و توجہ ہی کی درخواست
کر دیا کریں بلکہ آپ مجبور تھے کہ علوم درسیہ میں جو کچھ اشکال پیش آئے وہ بھی باوجود
استاذ کے موجود ہونے کے بے تکلف حضرت ہی سے پوچھیں اور اس طرح
پوچھیں کہ شاگرد بعض دفعہ سوال پر سوال کرتا ہے مجھے کہ آپ رُکاوٹ دل تنگی
کا نام بھی نہ لیں نیز معاد کے ساتھ معاش کے متعلق بھی ہر جزوی و کلی امر میں مشورہ
باوجود والدین اور دیگر اعزہ و اقارب کے حیات ہونے کے آپ ہی سے لیں
اور اس طرح لیں کہ بیٹے کو اپنی ضعیف بیان کرتے ہوئے باپ سے شرم آئے مگر
آپ اس میں تامل یا تعویق کا خطرہ بھی نہ لائیں۔ بیعت کے بعد آپ کی ملازمت کا
تعلق جہاں بھی ہوا وہ حضرتؒ کے مشورہ ہی سے نہیں بلکہ گویا تجویز اور حکم سے ہوا
اور جہاں بھی آپ جتنی مدت رہے حضرتؒ کے ایماء و اشارہ سے رہے کہ بیمار
پڑے اور آب و ہوا ناموافق ہوئی تو روحانی باپ کو اطلاع ضروری مگر یہ وسوسہ
بھی نہ ہوا کہ صریح حکم یا رضا آئے بغیر ترک ملازمت کا نام لیں اسی طرح جب
حضرتؒ کا ایما کسی جگہ سے علیحدگی کا ہوا تو کبھی خطرہ بھی نہیں گذرا کہ ترک کی وجہ
دوسروں کو کیا بتاؤں گا چنانچہ بہاولپور میں آپ کو طرح طرح کی تنگیاں پیش آئیں
مگر آپ نے جبراً و قہراً نہیں بلکہ طبع کے خلاف کو رضاء شیخ کی حلاوت سے موافق
طبع بنا کر پورے گیارہ برس وہاں گذارے اور ترک ملازمت کا نام نہ لیا اسی
طرح جس وقت آپ کو حکم پہنچا کہ دیوبند چھوڑ کر مظاہر علوم سہارنپور میں جاؤ تو
سب ہی کو حیرت تھی مگر آپ اس خوشی سے آئے جیسے مسافر اپنے گھر آتا ہے
یہ ربطِ قلب اور عظمت و محبت شیخ ہی وہ وہبی عطا تھی جس نے معیت و یکجا نسبت
تامہ پیدا کر کے اسی مخصوص نسبت سے آپ کو مالا مال کیا جو قدرت نے حضرت
امام ربانی قدس سرہ کو نصیب فرمائی تھی رمضان ۱۳۲۷ھ میں آپ نے بحالت

اعتکاف خواب دیکھا کہ خربوزہ تراش کر حضرت امام ربانی کو کھلا رہے ہیں اور لعاب جو اس کے کھانے میں حضرت کے دہن سے گر رہا ہے اس کو اپنی زبان پر لے رہے ہیں۔ حضرتؒ کو خواب سنا کر جب تعبیر پوچھی تو حضرتؒ مسکرائے اور فرمایا تم خود سمجھتے ہو گے آخر نسبت تو ایک ہی ہے۔" اسی طرح ایک بار کسی تذکرہ میں حضرت کی زبان سے بلے اختیار نکلا کہ "ہو بہو وہی مولوی خلیل احمد"۔ دو خط جو حضرت امام ربانی نے آپ کے نام بہاولپور بھیجے اور تیسرا خط جو دیوبند آپ کے پاس بھیجا چونکہ اہل علم کے لئے نتائج مفیدہ پر مشتمل ہیں اس جگہ نقل کرتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ حضرتؒ کو طریق معاش میں بھی عمل کے لئے اعلحضرتؒ کا ایما لینے کی کس درجہ کوشش رہتی تھی جو کہ ثمرہ ہے محبت وعظمت شیخ کا اور مفہوم ہے اس شعر کا ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را — تو دانی حساب کم و بیش را

مدرسہ دینیات جس میں حضرتؒ مدرس تھے جب کالج کے ماتحت ہوا اور علوم فلسفہ و ہیئت داخل ہوئے تو آپ نے اعلحضرتؒ کو اطلاع دی اور جواب اس طرح آیا

مولوی خلیل احمد صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط آیا مدرسہ کے حال سے البتہ تاسف ہونا چاہیئے۔ بندہ کے نزدیک جب اس قدر مشقت اور خلاف وضع تعلیم سپرد کی جاتی ہے ترک کر دینا مناسب ہے۔ سب سے زیادہ یہ بات ہے کہ جب ان لوگوں کا اس میں دخل ہوا تو انجام جانئے کیا کیا ترمیم ہوں گی .... اور جب اس قدر بار گراں سر پر رکھا گیا تو پھر سارے روز و شب شغل دنیا ہی دنیا کا ہوا شغل باطن کو بالضرور نقصان ہوگا .... اس کی کمی کے مقابلہ میں سب ہیچ ہے۔ اگرچہ تالیف تاریخ وسیر بھی عمدہ ہی کام سہی مگر بوجہ دنیا اور مشقت سفر کے ساتھ ہے اور بے اختیاری کی صورت میں روز بروز ترقی ان خیالات فاسدہ کی ہوگا .... ایسی حالت میں پسندیدہ نہیں۔ رزق مقدر ہے پھر تعلیم صدرا خود ناپسند ہے۔ انصاف کرنا چاہیئے کہ اثبات ہیولیٰ وصورت و ابطال جزو اور اقرار قدم ہیولیٰ وصورت سے کیا مطلب ہے؟ ابطال قیامت و اقرار تعدد قدماء وعدم اختیار حق علا شانہ نہیں تو

گیا ہے۔ ان عقائد فاسدہ کو منہ سے نکالنا موجب ظلمت ہے اور پھر دلائل سے ثابت کر کے طلبہ کو اس پر قائم کرنا اور شبہات کو دفع کر کے پختہ کرنا ضروری ہے۔ گو دل میں عقیدہ نہیں مگر کفار کے عقیدہ کا اثبات ہے۔ اگر انجیل کی تعلیم پادریوں کے مدرسہ میں کرے اور عقیدہ بطلان تثلیث وغیرہ ہو تو کیوں برا جانتے ہیں؟ یہاں بھی وہی ہے۔ پہلے زمانہ میں بضرورت ابطال مذہب فلاسفہ اور معتزلہ اس کو پڑھنے کی ضرورت تھی کہ مطلع ہو کر اس کے قواعد کا جواب دیں۔ اب کیا ضرورت ہے بالکل غلط ہے سب جیلہ ہے۔ لہذا اس نوکری کو جائز نہیں جانتا ہوں۔ فقط۔

چنانچہ حضرت ترک پر تیار ہو گئے مگر جب معلوم ہوا کہ حضرت کے سپرد صرف حدیث و تفسیر کے اسباق ہوں گے اور کالج کی ماتحتی محض ضابطہ کے درجہ میں ہے کہ اس کا کوئی اثر آپ کی نشست و برخاست پر بھی نہ پڑے گا۔ تو آپ نے پھر حضرت کو اطلاع دی اور یہ جواب آیا مولوی خلیل احمد صاحب! السلام علیکم آج آپ کا خط آیا اس میں دوسری صورت لکھی ہے۔ اب خلاصۂ جواب یہ ہے کہ جب تک تم دیکھو کہ بالکل خلاف شرع کام نہیں کرنا ہوتا اور طاقت کے قدر کام ہوتا ہے اور تمہارے شغل میں حرج بھی نہ ۔۔۔ تو ترک مت کرو۔ بلکہ اب میں تم کو اختیار کلی دیتا ہوں اور تمہاری رائے پر چھوڑتا ہوں مجھ سے استفسار کی بھی حاجت نہیں۔ جب تک تمہاری طبیعت چاہے کرو اور جب کوئی امر حارج عارض ہو جاوے تو ترک کر دینا۔ غرض بندہ کی طرف سے تم اپنے امور اور مولوی نذیر احمد کے معاملہ میں مختار ہو۔ اگرچہ مشورہ کو منع نہیں کرتا مگر تم کو تکلیف تحریر ہوتی ہے اس لئے یہ لکھے دیتا ہوں۔ لگے علاقہ کا ترک اچھا نہیں ہوتا معاش کی ضرورت میں پھر پریشانی ہوتی ہے۔ اور مسلمانوں کی ریاست کا ہر حال دوسری جگہ سے اچھا حال ہوتا ہے لہذا ترک کرنے میں جلدی مت کرنا اور مولوی نذیر احمد کے واسطے بھی ایسا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فقط۔ چنانچہ آپ رک گئے اور پھر چھ حال تک ترک ملازمت کا نام نہ لیا۔ اسی طرح جب آپ دار العلوم دیوبند میں مدرس

دوم تھے تو دفعتہً حضرت گنگوہیؒ کا والا نامہ آپکے نام پہنچا یا زبندہ رشید احمد عفی عنہ۔

جناب مولوی خلیل احمد صاحب سلمہٗ۔ السلام علیکم۔ مدرسہ سہارنپور کی سرپرستی میرے ذمہ کی گئی اور بہ مجبوری اس امر خیر کو گوارا کرنا پڑا۔ چونکہ ہر طرح اس مدرسہ کی نگرانی میرے ذمہ ہوگئی۔ اس وقت اس کی بہبودی اس ہی امر کو مقتضی ہے کہ آپ فوراً مدرسہ دینیہ سہارنپور کی مدرسی اعلیٰ قبول کرکے فوراً وہاں تشریف لے جائیں اہل دیوبند کو آپ کی مفارقت اگرچہ گوارا نہیں مگر بمقتضائے وقت یہ ہی ضروری ہے لہٰذا آپ اس کی تعمیل میں توقف نہ کریں (مہر) از گنگوہ سہ شنبہ ۱۴ جمادی الثانیہ ۱۳۱۴ھ۔ چنانچہ آپ فوراً سہارنپور آگئے اور پھر اس کو نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ خاکِ گور نے یثرب کی طرف کھینچا اور آپ اس کو اپنے معتمد خدام کے حوالہ فرما کر مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور وہیں کے ہو رہے ؛

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ایک بار فرمایا تھا کہ مُرید بابِ افعال سے ہے جس کی ایک خاصیت سلب مادہ اشتقاق ہے لہٰذا مُرید کے معنی ہیں مسلوب الارادہ یعنی جو ہر امر میں اپنی باگ اپنے شیخ کو دے کر ذاتی ارادہ سے خالی ہو چکا ہو۔ حضرت نے بیعت ہو کر اس مضمون کا حق ادا کر دیا جس کے ثبوت میں مظاہر علوم کا وہ مشہور قصہ پیش کیا جاسکتا ہے جو ۱۹۰۳ء میں پیش آیا اور جو حضرتؒ کی ارادت و غلامی کا ثبوت اور امام ربانی کی کھلی کرامت کا نمونہ ہے کہ حضرت امام ربانی ممبران مدرسہ کے استبداد پر سرکشی سے استعفا دینے پر مجبور ہوئے مگر حضرتؒ کو اجازت نہ دی کہ تعلق ملازمت قطع کریں چنانچہ حضرت باوجودیکہ ممبران مدرسہ کی نظروں میں خار بن کر کھٹکتے تھے ایسے جمے رہے کہ دیکھنے والے طعن کرتے اور غیرت دلاتے تھے کہ کیا دوسری جگہ نوکری نہیں ملتی جو اس ذلت کے ساتھ پڑے ہیں نوبت یہاں تک پہنچی۔ ممبران نے کمیٹی کرکے آپ کو برخاست کر دیا۔ طلبہ اٹھا لئے گئے کتابیں لے لی گئیں ۔۔ مولوی عبد الغنی صاحب کو بلوا لیا گیا کہ حضرتؒ کی جگہ درس کی مسند صدارت پر ان کو بٹھا دیا جائے مگر آپ اپنے شیخ کے حکم کا انتظار کر رہے تھے کہ جاؤں یا رہوں ۔ اول حکم آیا کہ آسکے کا

قصد کرو۔ چنانچہ آپ نے اسباب اور اہل وعیال کو انبہٹہ بھیج دیا۔ مگر فوراً ہی حضرت کا دوسرا حکم پہنچا۔ کہ وہیں ٹھیرے رہو۔ چنانچہ اسی مسرت کے ساتھ اس ظاہری ذلت کو عین عزت سمجھتے ہوئے سہارنپور ہی میں ٹھیرے رہے حالانکہ آپ مدرسہ میں آنا تو کیا مدرسہ کی مسجد میں نماز بھی نہ پڑھ سکتے تھے اور قوی اندیشہ تھا کہ فساد عظیم ہو کر نوبت گرفتاری فریقین کی پہنچے۔ مگر آپ نے اپنی عزت آبرو اور جان سب کچھ شیخ پر نچھاور کر رکھی تھی اس لئے نہ کسی ظاہری خوف کا آپ کو خدشہ تھا نہ لعن طعن اور سب وشتم کا ملال وخیال۔ آپ کا مطمح نظر صرف شیخ کا امتثال اور اشارہ پر چلنا تھا کہ ہو رہے گا جو کچھ ہونا ہوگا ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ ونام کیا　　اور جو خود ناکام ہو اسکو کسی سے کام کیا

قدرت کو منظور تھا کہ ہمیشہ کے لئے مدرسہ مظاہر علوم کو اہل دنیا کے استبداد سے سبکدوش فرمائے اس لئے غیب سے ایسے امر کا ظہور ہوا جس کا کسی کو خواب بھی نظر نہ آیا تھا ممبران مدرسہ وہ باوجاہت اور مقتدر ہستیاں تھیں جن کے سامنے مولوی حبیب احمد اور شیخ عزیز علی ومولوی مشتاق اصحاب ثلاثہ جو کہ حضرتؒ کے حامی بنے ہوئے تھے اس سے زیادہ بااثر نہ تھے جتنی نقار خانہ میں طوطی کی آواز۔ نگران صاحبوں نے سینہ سپر ہو کر حضرتؒ کو مدرسہ میں لا بٹھایا اور باہر چند نوجوانوں کو لاٹھیاں دے کر کھڑا کر دیا۔ کہ کوئی مزاحم ہو تو سر پھوڑ دو۔ پولیس کو اطلاع ہوئی اور صاحب علی انسپکٹر جن کے تشدد کا چاروں طرف شہرہ تھا گاردے کر موقع پر پہنچے۔ ڈانٹا دھمکایا حاضرین کے بیان لئے اور اندر جا کر دیکھا کہ حضرت بیٹھے ہوئے باطمینان سبق پڑھا رہے ہیں۔ معلوم کیا کہ مدرس اوّل کو بلا وجہ معزول کرنے پر یہ شورش ہوئی ہے۔ لہذا فریقین کو مجبور کیا کہ مصالحت کریں اور بالآخر نعیم اللہ خان رئیس اور خود صاحب علی انسپکٹر کو حکم قرار دے کر ہر دو فریق نے ثالثی نامہ پر دستخط کر دئے۔ اُن کی تجویز جو عمر بھر کے لئے مدرسہ کو نااہلوں کے بار احسان سے سبکدوش کر گئی حضرت امام ربانی کی محض کرامت تھی جس کے متعلق ان صاحبوں کا خود بیان ہے

کہ ہم نے جو کچھ لکھا اپنے اختیار سے نہیں لکھا بلکہ کوئی ہم سے لکھوا رہا تھا اور ہم اس کے لکھنے پر مجبور تھے اور وہ یہ ہے کہ مولوی خلیل احمد صاحب کی برخاستگی بلا وجہ ہے لہٰذا منسوخ اولاً ہماری رائے ہیں اس مدرسہ کے سرپرست مولوی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی اور مولوی عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور مولوی اشرف علی صاحب تھانوی ہونے چاہئیں۔

یہ عجیب کرشمہ ہے کہ بحث تھی مدرس کی بحالی یا بیجا علیحدگی پر اور ثالثی کی تجویز یہ ہوتی ہے کہ ممبران سابق سب برخاست اور مدرسہ کا تمامی نظم ونسق آئندہ کے لیے حضرت مولانا گنگوہی کے غلامان وخدام ان کے حوالہ۔

فریقین چونکہ ثالث کی تجویز پر رضامندی کی تحریر دے کر اپنے ہاتھ کٹا چکے تھے اس لئے یہ تجویز صاحب کلکٹر کی منظوری سے باضابطہ حکومت کا فیصلہ بن گئی اور تمامی رجسٹر ہائے مدرسہ ممبران سے لے کر ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۲۰ھ کو سرپرستان جدید کے حوالہ وسپرد کر دیئے گئے۔

خاکساران جہاں را بحقارت منگر   تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

یہ نمونہ تھا دنیوی امور میں آپ کی بے نفسی کا۔ رہے امور دینیہ جس کے دو جز ہیں۔ ایک شریعت اور دوسرا طریقت۔ سو شریعت میں عمل کا درجہ تو بہت بالا ہے آپ کو چونکہ فقہ وحدیث سے طبعاً مناسبت تھی اور اسی کی تعلیم وتعلم میں آپ کو لطف آتا تھا نیز تفقہ کا دت آپ کی مادی شے تھی اور مجتہدانہ حذاقت وفہم آپ کے خمیر میں پلائی گئی تھی اس لئے ہدایہ پر آپ کے شبہات پر شبہات جاتے اور جواب پر جواب آتے کہ جن کا نمونہ تذکرۃ الرشید میں ذکر ہو چکا اور آپ کی اس مبحث میں ساری تجربات کو جمع کیا جائے تو ضخیم کتاب بن جائے۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ بس شبہات کے لیئے آپ جیسا ذکی ہو اور جواب کے لیے امام ربانی جیسا فقیہ کہ آخر حضرت قدس سرہ نے کبھی ایک خط میں تحریر فرما دیا کہ تم شبہات کیا کرتے ہو مسائل کی لِم اور علّت فقہیہ کی کرید کرتے ہو۔ سو یہ کہاں تک نبھے گی" اسی طرح

حدیث کے متعلق اشکالات کی یہ حالت تھی کہ کوئی بے تکلف وجری شاگرد بھی اپنے علامہ اُستاد سے اتنی کنج وکاوش کرے گا جتنی آپ یگانگت کے تعلق سے دلیر بن کر بُرا بھلا سب کچھ اپنے شیخ سے پوچھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ آپ کے ہمعصر علماء کو بھی آپ کی یہ خو معلوم ہو گئی تھی اور وہ نقل کے لئے آپ سے وہ تحریرات طلب کیا کرتے تھے جو لحاظ کی وجہ سے خود نہ پوچھ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے بخاری کے قصہ لدود کی بابت جس میں تذکرہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مرض ذات الجنب سمجھ کر باوجود حضرتؐ کے منع فرمانے کے اہل بیت نے لدود کیا یعنی عود ہندی کو زیت میں ملا کر ایک طرف منہ میں ٹپکایا حضرتؐ نے مواخذہ فرمایا کہ باوجود میرے منع کرنے کے ایسا کیوں کیا؟ تو اہل بیت نے عذر کیا کہ مریض کو دوا گوارا نہیں ہوتی اس لئے حضور کے منع فرمانے کو ناگواریدگی دوا پر حمل کر کے ایسا کر گزرے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا گھر میں کوئی نہ بچے گا جس کے لدود نہ کیا جائے بجز عباسؓ کے کہ وہ لدود کے وقت موجود نہ تھے۔ چنانچہ حضرتؐ کا ارشاد پورا ہو کر رہا کہ تمامی حاضرین بیت کو قبل از موت بادل ناخواستہ لدود کی نوبت پیش آئی" اس حدیث کی حضرتؒ نے توجیہ دریافت کی اور شبہ لکھا کہ حضرتؐ کی رؤف ورحیم ذات نے انتقام کیوں لیا اور امت کی غلط فہمی پر یہ سزائے بددعا کیوں دی؟ حضرت امام ربانی نے جواب تحریر فرمایا۔ مولوی خلیل احمد صاحب مدفیوضکم بعد سلام مسنون مطالعہ فرمائید۔ اس وقت تو ہمت نہ شرح بخاری دیکھنے کی ہے اور نہ بظاہر توقع کہ شروح سے رفع اشکال ہو۔ بندہ جو توجیہ اس مقام کی کرتا ہے یہ ہے کہ منع لدود امر اللہ تعالیٰ تھا اور اصل امر رسول کی امر اللہ تعالیٰ ہی ہوتی ہے اس کے نہ ماننے میں ہتک حرمتہ اللہ تعالیٰ تھی سو یہاں دو امر جمع ہوئے ہیں آپؐ کی تکلیف دہی دوا پلانے میں اور ہتک حرمتہ اللہ تعالیٰ کہ امر رسول امر اللہ ہی ہوتا ہے پس آپ نے بوجہ امر ثانی کے انتقام لیا نہ بوجہ اپنی تکلیف کے۔ اسی واسطے بعد میں فرمایا کہ تم کو منع نہیں کیا تھا کہ مت کرو۔ تو معلوم ہوا کہ خلاف امر کرنا موجب

ہتک حرمۃ امر الرسول تھا۔ کہ وہ ہتک امر اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہ نہ فرمایا لِمَ اٰذیتموني (مجھے تکلیف کیوں دی) باقی اہل بیت کا کراہت مریض جاننا مفید نہیں کیونکہ ہتک حرمت ہو چکا اس فہم سے کیا فائدہ۔ یہ کوئی عذر نہیں تھی کہ شبہ سے درد ہو جاتا بلکہ انتقام ہے کہ خطا میں بھی انتقام لیا جاتا ہے کسی کی خطا اور قصد کچھ معتبر نہیں۔ یہ وہ ہے کہ بندہ اس مقام پر طلبہ سے بیان کرتا ہے اور طلبہ آجتک قبول کرتے رہے ہیں۔ اگر تم ماشاء اللہ ذکی آدمی ہو اگر کوئی شبہ خدشہ کرو گے تو پھر شاید شروح کی طرف رجوع کرتا ہو۔ اور اس سے انتقام الرجال من النساء او بالعکس وغیرہ مسائل لازم آجاتے ہیں۔ نہ یہ کہ یہ واقعہ بھی انتقاماً لنفسہ تھا فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

چونکہ حضرت امام ربانی نے دوبارہ شبہ پیش کرنے کی گنجائش دی اس لیئے اس کے جواب میں ایک طویل تحریر حضرت* کی گنگوہ آئی جس میں اہل بیت کے فعل کو خطاء اجتہادی اور قابل چشم پوشی قرار دے کر متعدد دلائل و استشہادات واقعات کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ انتقام اگر ہتک حرمۃ اللہ کی وجہ سے ہوتا تو حضرت عباسؓ کو معافی نہ ملتی کہ لدود کرانے والے وہی تھے۔ اور گو چچا تھے مگر شرعی حد سے معاف کرنا آنحضرت کا شیوہ نہ تھا۔ لہٰذا اس کے مختصر و جامع جواب پر جو گنگوہ سے گیا اکتفا کرتا ہوں کہ اس سے ذی علم کو انشاللہ کا پتہ چل جائے گا اور وہ یہ ہے۔

مولوی خلیل احمد صاحب سلمہٗ۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ آپ کا خط مشعر صحت مرض پہنچا مسرور کیا۔ بندہ کو چار روز سے بخار موسم تھا۔ آج تخفیف ہے تو جواب آپ کو لکھتا ہوں۔ اجتہاد جیسا نص صریح کے مقابلہ میں درست نہیں ایسا ہی شارع علیہ السلام کے روبرو ممنوع ہے۔ جب مرض موت میں قرطاس پر نزاع ہوا تو قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا استفہموہ ولا ینبغي التنازع عند نبي او کما قال۔ کے یہی معنی تھے کہ کیوں رائے کو دخل دیتے ہو خود پوچھ لو۔ پس شارع منع فرماتے اور تاویل کراہۃ المریض کی جاتے اور استفسار نہ کریں اور اپنی رائے کو

---

* یعنی وضع ۱۲

کراہتہ طبعی فخرِ عالم پر ترجیح دیں ۔ یہ خطاءِ اجتہادی نہیں تھی بلکہ خطاءِ محض تھی ایسے مخطی کو ثواب واحد نہیں کیونکہ یہ محل جوازِ اجتہاد ہی نہیں تھا۔ بلکہ خلافِ ادب ہُوا تھا اگرچہ محبت ہی کے سبب ہو ہو سو اس کو اجتہاد کہنا سراسر بے موقع ہے اور لا یصلین میں شارع تشریف نہیں رکھتے تھے اور نص محتمل دو معنوں کو تھی ۔ لفظ ظاہر نہی کی اور مقصود جلدی سے ۔ وہ محل اجتہاد تھا ۔ وہاں کوئی مانع اجتہاد نہ تھا۔ دونوں نے شارع کا حکم ہی یقین کرکے عمل کیا تھا ۔ اسی واسطے دونوں کی تصویب ہوئی ۔ اس میں اُس میں فرق بیّن ہے ۔ وہاں حارف نہی کا فعل الصلوات یاد تھا کا مضمون موجود تھا یہاں کراہتہ طبعی محض رائے تھی ۔ آپ کا اخبار کہ اس مرض سے نجات نہ ہوگی ۔۔۔ گویا مانع علاج تھا ۔ اور خود علاج مباح امر کہ توکل کامل کے خلاف تھا ۔ گویا عدم توکل کا مضمون ادا کرنا اور غیر خاص فعل بجا لانا خود اس رائے کا مانع موجود تھا فَأَيْنَ هٰذَا مِنْ ذَاكَ ۔ اور ہتک حرمۃ اللہ کے واسطے تعزیر کافی ہے ۔ ایجاب قصاص تو ضرور نہیں ۔ ترک حلق و ترک فسخ حج میں صوم وصال اور ترک کھائی احد میں آپ کا رنج و اظہار ناخوشی خود منقول ہے مگر نہ معلوم آپ کو کیوں غفلت ہوئی پھر یہ کہ انتقام لحرمۃ اللہ لینے کو کہاں سے لازم ہے کہ انتقام لحرمۃ اللہ کو ترک بھی نہیں کرتے تھے حدیث سے اتنا ہی ثابت ہے ۔ کہ اپنے واسطے انتقام نہیں لیتے تھے ۔ اور ہتک حرمۃ اللہ کے واسطے لیتے تھے ۔ نہ یہ کہ ہتک حرمۃ اللہ میں ترک ہرگز نہیں کرتے تھے ۔ سو یہ تقض جڑ سے ہی مرفوع ہے ۔ معہذا ذوالخویصرہ پر غصہ کرنا خود تعزیر ہے اور تعزیر بقدر عصیان کے ہے حضرت عباسؓ کا صائم ہونا مانع لدود کا تھا ناخوشی خود ظاہر ہو چکی تھی ۔ اور معاف کرنا بھی منع نہیں تھا ۔ اور کبراء کو قلیل تنبیہ بھی کافی ہوتی ہے بہرحال یہ سب شبہات غیر محل میں نقطہ ۔

حق تعالیٰ حضرتؒ کی قبر مبارک نور سے بھر دے کہ اس تعلق مع الشیخ سے خود بھی مستفید اور مالا مال ہوئے اور مراسلات علمیہ چھوڑ کر پس ماندگان کو اُن

لطائف و نکات عجیبہ سے بہرہ مند بنایا جو شروح اور کتب سے حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ تحریر مذکور میں ایک دقیق بات یہ معلوم ہوئی کہ کسی اُمتی سے اگر بہ تقاضائے محبت بھی ایسا فعل صادر ہو گا۔ جو شارع علیہ السلام کی طبعی خواہش کے خلاف ہو تو استحقاق سزا سے نہ بچے گا۔ کہ اہل بیت کا لدود کرنا ظاہر ہے کہ غایت محبت اور تادیر حضرت کے سایۂ عاطفت قائم رہنے کے شوق میں ہوا۔ مگر محض اس وجہ سے کہ اس میں محبوبِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے طرزِ طبیعت اور روش کی رعائت قائم نہ رہی، سببِ عتاب بلکہ موجبِ انتقام ہو گیا۔ پھر بعد میں آنے والی اُمت کا کیا پوچھنا کہ کتنا ہی دعوائے محبت کریں مگر حضرت عائشہ و حفصہ و میمونہ جیسی جاں نثار بیبیوں کی محبت کا لاکھواں حصہ بھی نہیں لا سکتے۔ اور یہی وہ آخری سبق تھا جو معلّمِ خلق و راہبرِ عالم کو دُنیا سے رُخصت ہوتے وقت عملاً پڑھانے کی ضرورت تھی کہ عشاق و محبین کو جادۂ اعتدال کی تعلیم دیں اور بتائیں کہ محبت معتبرہ و ناجیہ صرف وہی ہے جو تعمیل حکم کی مجسم تصویر ہو اور جس میں محبوب کے طریق عمل اور طرزِ طبیعت سے ذرہ برابر بھی غفلت نہ ہونے پائے۔ یہ بھی اکابرامت کی رعایت کہیئے یا شفقت محمدیہ کہ منشاء فعل یعنی تقاضاء محبت کی رعایت فرما کر انتقام لے لیا کہ دنیوی تکلیف بمقابلہ سزائے آخرت کے بہت آسان اور یہ تبادلہ حق تعالےٰ کا بڑا فضل و انعام ہے۔ ورنہ مخالفت امر الرسول کی سزا آخرت میں وہ دیتا۔ جس نے اپنے محبوب کی طبیعت کو اپنی رضا کا سانچہ بنا کر بھیجا ہے۔ کیونکہ کسی کو حق نہ تھا کہ محبت رسولؐ کو چھوڑ کر اپنی محبت کے تقاضائے نفس کو متبوع بنائے۔

دوسرا جزو طریقت ہے سو اس کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ طالب و سالک کا شیخ کے زیر حکم اور مسلوب الارادہ ہونا ایسا ضروری ہے جیسا حیات بدنی کے لئے غذا اور چراغ کے لئے تیل ؎

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید　　　که سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

اس مبحث میں حضرت امام ربانی کے بارہ مکاتیب تذکرۃ الرشید کے حصہ

سوم مکاتیب رشیدیہ میں درج کر چکا ہوں ۔ اور صرف پانچ مکاتیب یہاں نقل کرتا ہوں ۔ جو حضرتؒ کے نام بہاولپور گئے ۔ اور حضرتؒ کے پاس تبرکاً اس ذخیرہ میں موجود تھے ۔ جو حضرتؒ نے بکمال شفقت مجھ ناچیز کو عطا فرما دیا تھا ۔ حضرتؒ کے حالات قلبیہ کا اندازہ کرنے کے علاوہ ان مکاتیب میں عام سالکین کے لئے بھی خاص نفع ہے ۔ اس لئے ان کو بجنسہ نقل کرنا مناسب سمجھا اور وہ یہ ہیں :-

(۱) مولوی خلیل احمد صاحب مدظلہم الی اصلہ ۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمانید اپنی عافیت پر شکر حق تعالیٰ کا کرتا ہوں ۔ تمہاری صحت سے اطمینان ہوا اب امور دین و دنیا رضائے حق تعالےٰ پر موقوف ہیں ۔ اپنی طرف سے سعی کرتے رہنا کام بندے کا ہے اور ثمرات و مواہب عطا فرمانا اختیار مولیٰ تعالیٰ شانہ ہے ۔ کسی کے اختیار میں نہیں ذکر پختہ کرنے میں ساعی رہو اور نور منبسط جو محسوس ہو اس کو بغور ملحوظ رکھنا چاہیئے یہاں تک کہ جملہ اشیاء میں ساری معلوم ہونے لگے دفع کرنا نہیں چاہیئے فقط ۔

(۲) عنایت فرمایم مولوی خلیل احمد صاحب دام مجدہم ۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمانید ۔ بخیریت ہوں ۔ آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا ۔ آثار ذکر مبارک ہوں ۔ اور حق تعالیٰ ترقی عطا فرمائے ۔ مقصود ذکر سے حضور مسمّیٰ ہے ۔ جس قدر حضور ہو غنیمت ہے ۔ اور ذکر قلبی وہ ہے کہ بدوں لفظ اسم کے ذات مسمّیٰ کی طرف خیال ہو جیسا کہ غیبوبت ولد میں مثلاً بدوں تصور اسم ذات کے ولد کی طرف دھیان رہتا ہے ۔ فرق اتنا ہے کہ ولد میں صورت بھی غالب اوقات مدنظر ہوتی ہے اور یہاں چونکہ تشکل و صورت سے براءت ہے ۔ لہذا نفس مسمّیٰ کا خیال ہے اس خیال میں اگر کوئی وضع و تشکل مدنظر قلب ہو لاحول سے دفع کرنا چاہیئے کہ ذات حق تعالیٰ نفس وجود ہے نہ قیود زائد سے

دور بینان بارگاہ الست　　　غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

سوائے اس کے جو کچھ ہے سب مخلوق و حادث ہے اور غیر ہے نہ عین ۔ بہرحال

جو کچھ ہے وہ عنایت محض ہے۔ اس کا شکر ضروری ہے۔ فقط مولوی عبدالرحمٰن جیسے رفیق ہمدم کا فوت البتہ موجب حسرت ہے مگر کیا کیجیئے اپنے اختیار میں کچھ نہیں حق تعالیٰ ہم کو بھی باایمان لے جاوے۔ آمین۔ عبداللہ مسان کا بھی انتقال ہوا۔ اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ ۵ محرم کو جناب شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس عالم سے رحلت فرما گئے۔ ایک فرزند ہفت ماہہ چھوڑا۔ حق تعالیٰ ان کو بھی جوار رحمت میں قرب دیوے۔ اور میاں امین الدین صاحب ماموں مولوی محمد قاسم صاحب کے بھی جو سرہند میں تھے فوت ہوئے۔ کیا عجب ہے کہ وہ دخان آندھی جو میاں ظہور احمد نے خواب میں دیکھا نمونہ اس ہی حشر کا ہو یا اور آفات ہیں کہ عالم میں قیامت خیز فتنہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے نجات بجز اسکہ شریعت مصطفوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے التجا اور تمسک کیا جاوے اور کچھ نہیں۔ یہ ہی تعبیر خواب ہے۔ دلائل کا پڑھنا بہتر ہے التزام کرلو۔ فقط

(۴) مولوی خلیل احمد صاحب السلام علیکم۔ آپ کا خط آیا حضور مسمّٰی اور اس کے شکر کے عجز سے بہت بہت فرحت ہوئی۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ اگر ہر بُنِ مو ہزار ہا ہزار زبان ہوجائے اور مدت دنیا ایک ادنیٰ نعمت کا شکر ادا کرنا چاہے نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ہر قصد شکر بھی ایک نعمت عظمیٰ ہے دوبالا مرہونِ منّتِ کبریٰ ہوتا جاتا ہے۔ وہ کون ہے کہ توفیق حضور کا شکر تلقین کرسکے ہاں عجز عن ادائے شکر کو اگر بجائے شکر قبول فرمالیں تو بندہ نوازی سے کیا بعید ہے۔ کہ ایسے نالائق بے بس کو ایسے منعم صمد سے معاملہ ہوا۔ بجز اسکہ ہمہ تن فنا اسپنے کردار سے ہو کر پانی ہوجائے۔ اور شرم اپنے قصور اور اس کے نعمائے سے خاک بن جائے۔ اور کیا کرسکتا ہے۔ بارے شکر ہے کہ آپ کو یہ مقام عطا ہوا۔ اس کا نام یادداشت باصطلاح حضرات نقشبندیہ ہے۔ اب اس یادداشت کے ساتھ حیاء مالک حقیقی کی ہونی ضرور ہے کہ جیسا ہم اپنے کسی بڑے مربّی منعم ذی جاہ کے سامنے کوئی سبک حرکتی خلاف رضا نہیں کرسکتے ایسا ہی معاملہ خلوت میں اپنے اس حاضر ناظر

مولیٰ سے ہونا چاہئے تاکہ حضور مسمّی کا مصداق پورا ہو جاوے کہ اپنی ہر ہر حرکت کو پیشِ نظر اس مالک تعالیٰ شانہٗ جان کر بمیزان شرع کہ قانون رضا ہے ناپ تول کا دھیان رہے۔ اب یہ مراقبہ دائمی کرنا چاہیئے۔ الغرض ہر کام کو بحضور ذات تصور کرنا اور اس کا مرضی و غیر مرضی دریافت کر کے ترک و عمل کرنا چاہیئے۔ اور اس کا ہی نام احسان ہے وفقنا اللّٰہ۔ اور اس عاجز کو بھی بدعائے خیر یاد فرمانا کہ مجھ کو یہ امر نصیب ہو ہیہات عمر خرابی میں گزر رہی اور اصل مقصود میسر نہ آیا ہاں احباب کا حسنِ ظن اگر کارگر ہو جائے تو انا عند ظن عبدی بی کا البتہ امیدوار ہوں۔ درباب نکاح کیا مشورہ دوں۔ اپنے دل کا عزم تو یہ ہے کہ تجرد کے برابر کسی شئے میں راحت نہیں مگر حوائج ضروریہ میں نکاح بھی ہے۔ ایک حاجت کے واسطے صدہا خدشات اٹھانے پڑتے ہیں۔ اگر اس حاجت کا تقاضا نہ ہو تو تجرد سے بہتر تاہل کو نہیں جانتا ہوں مگر ہاں اگر اہل نیت تکثیر امت کا خیال کر کے کرے تو دوسری بات ہے۔ لہٰذا اس امر میں صاف قطعی بات کچھ نہیں لکھ سکتا ہوں۔ تم اپنے حال سے مجھ سے زیادہ واقف ہو۔ قیام گنگوہ کے باب میں جو آپ کی خوشی مجھ کو کیا عذر ہے زیادہ کیا کہوں اس میں مجھ کو کوئی حرج نہیں آپ کے زعم میں اگر آپ کا فائدہ ہے تو بہتر۔ جواب والدین میں بھی اگر مناسب ہو تا رمضان توقف لکھ دو اپنے حال کو خوب غور سے دریافت کر لو۔ فقط

(۴) حامداً و مصلیاً از بندہ رشید احمد عفی عنہ۔ برادرم مولوی خلیل احمد صاحب دام برکاتہم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ نامہ سامی رسید بجوابش دیر شد کہ فرصت نداشتم معاف فرمایند۔ درباب شغل نگارش فرمودہ اند۔ مکرما اصل ذکر یاد داشت را گویند کہ بدوں حرف و صوت یاد چیزے ملازم قلب گردد چنانچہ دوست دوست را در حال غیبوبتہ یاد می آرد۔ و دراصل فطرۃ ہمیں ذکر مالک حقیقی تعالیٰ شانہٗ کہ اصل محبوب است بدل آدمی نہادہ اند۔ مگر بشر دریں عالم بزید و عمرو مشغول شدہ آں محبوب را فراموش ساخت۔ مشائخ برائے اعادہ آں ذکر حیلہا انگیختہ اند پس آنچہ اولاً ذکر ربانی

تلقین مے فرمائید یا بلطائف حرکت ذکرے پیدا می نمایند مقصود از آں ہمون
یادداشت است کہ ایں وسیلۂ آں گردد. بعد ازیں اصل مطلب مے نویسم کہ آں عزیز
را سہ ذکر اولاً گفتہ بودم یکے پاس انفاس اسم ذات دوئیم تحریک قلب بذکر اسم ذات
سوئیم یک ضربے اسم ذات زبانی بملاحظہ اینکہ نورے با اسم ذات از دہن برآمدہ محیط
بدن میشود. پس در ذکر پاس انفاس ایں قدر ملاحظہ افزائید کہ بوقت دخول نفس
با اسم ذات ھو الباطن تصور فرمائید و بوقت خروج نفس با ہو ھو الظاہر ملاحظہ
نمایند. گویا ایں تصورِ با ذکر پیدا آید کہ ذاتِ پاک موجود حقیقی تعالےٰ شانہ در ظاہر و
باطن ذاکر موجود بالذات است اگرچہ ایں تصورِ اوّل بجلوت قائم خواہد گشت مگر بعد
مزاولت بے تکلف جاری خواہد شد انشاء اللہ تعالیٰ۔ و بوقت ذکر جہر ایں قدر افزائید
کہ بجائے نور محیط خود ذات پاک مذکور محیط ذاکر است و مذکور موجود است۔ و ذکر
لطائف اگر ترک فرمودہ اند حاجت ندارد۔ و اگر خیال آں باقی است بعد قیام ایں
تصور دیدہ خواہد شد۔ اکنوں فقط بوقت آں اگر ایں قدر خیال فرمایند کہ مذکور مسمیٰ
بدل موجود است فقط خوب فہمیدہ و بغور فرمودہ مشغول شوند و ہمہ را بہ مذکور حقیقی
اعتماد فرمودہ و التجا بذات پاک او آوردہ بعجز و نیاز بجا آرند و توفیق ذکر اگرچہ
یک لحظہ یابند محض عنایت و فضل مذکور تعالیٰ شانہ پنداشتند. منت آں تعالیٰ
برخود نہادہ شکرہا فرمائید کہ ذکر منشور ولایت است۔ ہر کرا توفیق ذکر خود مے دہند۔
نامۂ ولایت خود بدو مے سپارند. ذاکر را محض ایں قدر لطف حق تعالیٰ کہ فاذکرونی
اذکرکم افادہ فرمود بفخر خویش بس است کہ ایں مضغۂ ناپاک مذکور آں پاک
جناب گردید دیگر چہ می خواہد و کدامی ثمرہ ازیں فائق باشد۔ آرے در ذکرتہ
فی ملاء و ذکرتہ فی نفسی فرقے است پس بعید کہ تا امکان در ترقی ذکرتہ فی نفسی
پویند و دریں ترقی استغاثہ از ہمون مولائے خویش جویند کہ ففروا الی اللہ و لا
ملجاء من اللہ الا الی اللہ فرمودہ اند۔ زیادہ ازیں تاب تحریر ندارم و ایں قدر
راہم از حوصلۂ تنگ خود بعید مے شمارم کہ ایں جملہ از قلم دادم نہ بدل رزقنی اللہ

تعالیٰ وایا کمر بمنہ وایں چند فقرہ را اُس تصوف وطریقہ تصور فرمائید۔ والسلام

(۵) مولوی خلیل احمد صاحب ۔ السلام علیکم ۔ آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا۔ یہاں سب طرح خیریت وشکر ہے۔ تفرقہ یہ ہے کہ آدمی جس کام میں مشغول ہو۔ کوئی شے آ کر اس شغل سے غافل کردیوے۔ دوسری شے میں مشغول بنا دیوے۔ جیسا ابتدا میں ایسا ہوتا ہے کہ جب ذکر شروع ہوتا ہے گاہ حضور ذکر ہے گاہ حضور خلاف ذکر اور خطرہ یہ کہ دوسری شے کا خیال اگر آئے تو اصل شغل کی طرف سے غفلت نہ ہو ..... جیسا مثلاً آدمی اپنے وجود کو جانتا ہے۔ اور باوجود اس علم کے علوم وخطرات دیگر اشیاء کے بھی دل میں اور نظر میں آتے ہیں۔ مگر اصل علم تو زائل نہیں ہوتا۔ اس سے صاف روشن ہوجاتا ہے کہ نفس کو آن واحد میں التفات اشیاء متعددہ کی طرف ہوسکتا ہے تو غرض حضور کے ساتھ خطرہ ہوتا ہے مثال اس کی یہ ہے کہ آب رواں پر خس وخاشاک بھی ہوتے ہیں۔ مگر روانگی آب کو مانع نہیں۔ اور تفرقہ حضور کے ساتھ نہیں ہوسکتا کہ حضور میں جب تفرقہ آیا حضور بند ہوگیا۔ شبہ بتہ ہوگئی۔ گویا کہ آب رواں کو کسی عاجز نے روک دیا۔ یہ سب بندۂ عاجز کی باتیں زبانی جمع خرچ ہے مضامین علمی ہیں۔ عمل سے بے بہرہ ہوں۔ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل وکرم سے یہ حضور عطا فرمایا ہے ملہم غیبی ہے اس کا منتظر ہوں الدال علی الخیر کفاعلہ فرمایا ہے۔ باشد کہ اہلِ خیر کی برکات سے کچھ حصہ مل جائے۔ ورنہ آنم کہ دانم تمہارے ایسے حسنِ ظن سے اندیشۂ ندامت عقبیٰ بھی ہوتا ہے اور انا عند ظن عبدی بی سے توقع بھی بندہ جاتی ہے۔ فقط۔

ایک مرتبہ آپ کو بخار شدید ہوا اور اس تکلیف میں حضور کے اندر ترقی کے ساتھ صورت اتحاد محسوس ہوئی جس کو آپ نے گنگوہ تحریر کیا اور جواب نہ آیا تو ادب سے ساتھ یاددہانی کی۔ اور اس کے ساتھ دوبارہ توبہ وتجدید بیعت کا شوق ظاہر کیا۔ پھر جواب نہ آیا تو پریشانی وحزن ظاہر فرمایا اور آخرت امام ربانی کا یہ جواب آیا۔

مولوی خلیل احمد صاحب ۔ السلام علیکم۔ تین خط آپ کے پہنچے۔ اول خط جو

آیا تو بسبب شدتِ بخار و لرزہ کے بہت تحریر جواب نہ پائی۔ آپ نے اپنے بخار کا حال لکھا تھا اور اس میں ترقی حضور اور حصول صوت احد کا ذکر تھا۔ ترقی حضور البتہ موجب سرور ہے اور صوت احد کوئی ضروری بات نہیں۔ اگر حضور کو مفید ہو۔۔۔۔ تو مضائقہ نہیں ورنہ حاجت نہیں آج تک نہ مجھ کو نجات بخار سے ہوئی نہ مسعود محمود اور ان کی والدہ کو مگر ہاں اس قدر شدت نہیں اور سب کا حال ایسا ہی ہے۔ کہ بخار سے بالکل فراغت نہیں ہوئی۔ اطلاقِ حضور کے یہ معنی ہیں کہ نفسِ حضور خیالی از لحاظ معیت یا احاطہ اور کسی صفت سے ہو۔۔۔۔ کہ اس کے ساتھ کوئی ملاحظہ نہ رہے۔ مگر اطلاقِ حضور کی حاجت نہیں بلکہ لحاظ صمدیت اس کے ساتھ کیا کیا کہ کرتا تا موجب مزید محبت بارگاہ پاک ہو۔۔۔ آپ تجدید بیعت کو لکھتے ہیں، بیعت کے لفظ سے نادم ہوتا ہوں۔ میں قابلِ بیعت نہیں آپ کو خود سے بہتر جانتا ہوں ہر صورت میں بیعت حسنِ عقیدتِ مرید ہوتی ہے المرء مع من احب مگر خیر آپ کے خیال کا چارہ نہیں، آپ کی درخواست بعد ندامت قبول کرتا ہوں۔ فقط ؛

بندہ نے وہ شجرہ بھی دیکھا ہے جو امام ربانی نے بعد اخذ بیعت حضرتؒ کو مرحمت فرمایا کہ بسم اللہ کے بعد سبحانک اللّٰھم وبحمدک اسئلک باسمک اللّٰہ الاعظم وبجاہ سیدنا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ علیٰ ہذا تمام اسماء اولیائے خاندان چشتیہ صابریہ کے آخر حضرتؒ نے قلمی تحریر فرمایا وبجاہ سیدنا و مرشدنا و ہادینا الحافظ الحاج امداد اللہ تھانویؒ ان احمد العبد الضعیف رشید احمد چشتی گنگوہی واخی العزیز مولوی خلیل احمد انبہٹوی۔ پھر دعائیہ رباعی کے بعد یہ مطبوعہ عبارت ہے وارزقھما محبتک ومعرفتک وحفظا وامرا من برکاتھم وکمالاتھم وزدھما ذوقا وشوقا الی لقائک یا ارحم الراحمین وصلے اللہ تعالےٰ علیٰ سیدنا محمد وعلے آلہ واصحابہ وبارک وسلم

شاہا ز کرم برمن درویش نگر — بر حال من خستہ و دل ریش نگر
ہر چند نیم لائق بخشائشِ تو — برمن منگر بر کرمِ خویش نگر

یہ اُن شجرات میں سے تھا جو اعلحضرت نے مکہ مکرمہ سے گنگوہ بھیجے تھے کہ امام ربّانی اپنے متوسلین کو تمام لکھ کر عطا فرمائیں۔ چنانچہ حضرت قدس سرہٗ نے ان کو تبرکاً اپنے پاس رکھ چھوڑا اور جب چوتھے حج کو تشریف لے جانے لگے تو مکاتیب متبرکہ کے ساتھ بندے کو عطا فرمایا تھا کہ حفاظت سے رکھوں۔ مگر بندے نے اپنے کو حق حفاظت سے عاجز پاکر واپسی کے بعد حضرت کے حوالہ کر دیئے تھے۔ اور اب یہ حضرت کے نواسہ داماد مولوی مسعود کے پاس محفوظ ہیں۔

حضرت کے والد ماجد شاہ مجید علی صاحبؒ حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے بیعت تھے اور ایک مرتبہ طفولیت میں حضرت کو بھی اپنے والد کے ساتھ کاندھلہ جاکر حضرت مولانا کی زیارت اور محض برکت کے لئے بیعت کرنے کا اتفاق ہوا کہ اس وقت آپ بیعت کی حقیقت اور مقصود کو بھی نہ سمجھتے تھے۔ مگر اس برائے نام بیعت کی عظمت بھی آپ کے قلب میں اس قدر تھی کہ جب کبھی آپ کاندھلہ تشریف لے گئے تو حضرت مولانا کی صاحبزادی بی امۃ الرحمٰن کی خدمت میں ان کے مکان پر ضرور حاضر ہوئے اور دیر تک مستمدانہ و معتقدانہ طریق پر بیٹھے۔ بی امۃ الرحمٰن جن کو اُبّی کے نام سے پکارا جاتا تھا مولوی محمد یحییٰ صاحبؒ مولانا محمد الیاس صاحب کی حقیقی نانی ہوتی تھیں جن کا چند سال ہوئے حال ہی میں وصال ہوا ہے۔ مرحومہ اپنے رشید لائق سُنّت باپ کی مجسم یادگار اور اپنے خدا کی اتنی عبادت گزار تھیں کہ ضروریات بشریہ کے علاوہ ہمہ وقت نوافل و اذکار اور تلاوتِ قرآن و تسبیح و تہلیل میں گزرتا تھا ان کے معمولات و وظائف معلوم کرنے کا تو اتفاق نہیں ہوا صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ ہر وقت اپنے مصلے پر بیٹھی ذکر و تلاوت میں مشغول رہتی تھیں۔ کہ کسی سے بات کرنا بھی ان کو گراں گزرتا تھا۔ کھانا جب تیار ہو جاتا تھا تو ماما کھانا برتن میں لا کر ان کے پاس رکھ جاتی تھی کہ جب فرصت پائیں کھالیں۔ اور جب برتن خالی دیکھے تو اٹھا کر لے جائے۔ مگر ہاں مولانا محمد یحییٰ صاحب نے ان کی بیٹی اپنی والدہ کے معمولات ایک مرتبہ بیان فرمائے جن کو سُنکر میں تو حیران ہو گیا کہ عورت

تو عورت ہی ہے اگر یا ہمت مرد بھی سال دو سال اس کا نباہ کرلے تو بڑی مردانگی ہے۔ پھر صاحب اولاد عورت اور امور خانگی کی سرپرست منتظمہ کا آخر عمر تک اس پر مواظبت کرنا تو استقامت کا وہ بڑا نمونہ ہے جس سے نہ دیکھنے والوں کو ان کے نانا مولانا مظفر حسین صاحب کی استقامت وعبادت...... زہد وقناعت اور خوف خشیت کا پتہ چلتا ہے اور وہ معمولات روز مرہ کے یہ ہیں۔ درود شریف پانچ ہزار۔ اسم ذات اللہ پانچ ہزار بسم اللہ الرحمن الرحیم انیس سو۔ یا مغنی گیارہ سو۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ گیارہ سو۔ اللہ الصمد گیارہ سو۔ لا الہ الا اللہ بارہ سو۔ یا حی یا قیوم دو سو۔ حسبی اللہ ونعم الوکیل پانچسو۔ سبحان اللہ دو سو۔ الحمد للہ دو سو۔ لا الہ الا اللہ دو سو۔ اللہ اکبر دو سو۔ استغفار پانچسو۔ افوض امری الی اللہ سو۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل سو۔ رب انی مغلوب فانتصر سو۔ رب انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین سو۔ اور لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین سو مرتبہ۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی ایک منزل روزانہ تلاوت کا معمول تھا کہ حافظ قرآن تھیں۔ اور مانع نسوانی حائل نہ ہوتا تو ہر ہفتہ پورا قرآن مجید ختم کرلیتی تھیں۔ فرحمہا اللہ رحمۃ واسعۃ۔

مولوی محمد یحیی صاحب کاندھلوی کے ساتھ حضرت کو محبت کا جو بے نظیر تعلق تھا وہ دیکھنے والوں پر مخفی نہیں کہ وطن چھوڑ کر حضرت امام ربانی کی خدمت میں محبوب اور بلنکار بارگاہ بن کر بارہ سال رہے اور وصال کے بعد حضرتؒ سے تجدید بیعت فرمائی کہ مجاز طریقت بنے اور ان کی وجہ سے ان کے بھائی مولوی محمد الیاس صاحب اور صاحبزادہ مولانا محمد زکریا صاحب بھی حضرتؒ کے ایسے لاڈلے رہے کہ صلبی اولاد کی ان کے مقابلہ پر کوئی حقیقت نہ تھی۔ نیز کاندھلہ کے مولانا محمد جلیل صاحب وحافظ ریاض الاسلام وغیرہ کو حضرت کے ساتھ مریدانہ ومحبانہ خاص تعلق تھا۔ اس لئے حضرت کو کاندھلہ تشریف لانے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا۔ مگر کتنا ہی وقت کم کیوں نہ ہو میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ بی دمّی کے پاس حاضر ہوئے بغیر کاندھلہ سے چلے گئے ہوں۔ آپ بڑے اہتمام سے جاتے

اور پردہ ڈلوا کر دیر تک مکان میں بیٹھے اور فرمایا کرتے تھے کہ آج مولوی ذکریا اور مولوی الیاس کہہ دیں کہ ہماری وجہ سے کاندھلہ کے ساتھ تعلقات ہیں ہمارا تعلق تو اس گھرانہ کے ساتھ بچپن سے ہے کہ مجھے لڑکپن میں اپنے والد مرحوم کے ساتھ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کی زیارت اور بیعت ہوئی ہے۔ بی امی کی عمر طویل ہوئی اور انہوں نے نواسوں کی اولاد کو بھی دیکھا۔ اخیر عمر میں بصارت اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی تھیں اور مرض الموت میں تین سال کامل صاحب فراش رہیں مگر نہ قلبی ولسانی ذکر اللہ میں فرق آیا اور نہ صبر و رضا بر قضا میں کمی لاحق ہوئی۔ جس مریض کو تین سال مرض اسہال میں اس طرح گذریں کہ کروٹ بدلنا بھی دشوار ہو اس کے متعلق یہ خیال بے موقع نہ تھا کہ بستر کی بدبو دھوبی کے یہاں بھی نہ جائے گی، مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ غسل کے لئے چارپائی سے اتارنے پر جو کپڑے نکالے گئے جو نیچے رکھ دیئے جاتے تھے تو ان میں بدبو کی جگہ خوشبو اور ایسی نرالی مہک پھوٹتی تھی کہ ایک دوسرے کو سنگھاتا اور ہر مرد و عورت تعجب کرتا تھا چنانچہ بغیر دھلوائے ان کو تبرک بنا کر رکھ لیا گیا۔

ہر چند کہ عدم بلوغ کی بیعت محض حصول برکت کے لئے ہوتی ہے مگر جس درجہ کی بھی ہو چونکہ حضرت کو اس سلسلہ سے روحانی وابستگی ہوئی اس لئے مولانا مظفر حسین صاحب کے مختصر حالات جو مرحوم کے پرنواسہ مولوی احتشام الحسن سلمہٗ نے قلمبند کر کے بھیجے ہیں بجنسہٖ درج کرتا ہوں۔

حضرت مولانا مولوی مظفر حسین صاحبؒ مولانا محمود بخش صاحبؒ کے صاحبزادے اور حضرت مفتی الٰہی بخش صاحبؒ کے بھتیجے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے مولوی مظفر حسین صاحب بن مولوی محمود بخش بن مولوی حکیم شیخ الاسلام بن حکیم قطب الدین بن شیخ عبدالقادر بن شیخ محمد شریف بن مولوی محمد اشرف بن جمال محمد شاہ بن بابن بن بہاء الدین بن شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل بن شیخ قطب شاہ۔

ابتدائی تعلیم حضرت مفتی صاحبؒ سے حاصل کی لیکن تعلیم پوری نہ فرمانے پائے تھے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس دار فانی سے دار البقا کی جانب رحلت فرمائی اس لئے بقیہ تعلیم ظاہری و باطنی دہلی میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے پوری فرمائی جو کہ شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے نواسے اور شاگرد رشید تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ مہاجر مکی سے بھی شدید تعلق تھا اور آپ انہیں سے مرید بھی تھے۔ سلسلہ درس و تدریس نہ تھا۔ ایک سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے کبھی کبھی مسجد میں اور کبھی کبھی مستورات میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ایک گاڑھے کا کرتہ پاجامہ نیلی لنگی یہ آپ کا لباس تھا میری دادی صاحبہ یعنی صاحبزادی صاحبہ حضرت مولانا صاحبؒ فرماتی تھیں کہ ایک بار میں نے موٹی ململ کا کرتہ حضرت کے لئے سیا۔ اوّل تو زیب تن فرمانے سے انکار کیا بعد میں میری خوشنودی کو پہنا۔ مگر جمعہ کی نماز پڑھ کر فوراً اتار دیا۔ اور فرمایا کہ میرے گاڑھے کا کرتہ دیدو۔ اس میں عجب سدا ہوتا ہے۔ سواری پر کبھی سوار نہ ہوتے پیدل سفر کرتے تھے۔ اور سامان سفر لوٹا لنگی لکڑی، شکیزہ ہوتا تھا۔ جہاں شام ہوجاتی تھی وہیں شب بسر فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شام ایک ایسے گاؤں میں ہوئی جہاں سب ہندو تھے۔ کوئی مسلمان نہ تھا۔ وہاں والوں سے کہا کہ رات کو رہنے کے لئے کوئی جگہ بتا دو تو ایک شخص نے گاؤں کے باہر کوئی پیر بتادیا۔ آپ کے پاس روٹی تھی۔ اس کو نوش فرمایا۔ اتفاقاً وہی شخص رات کو کسی کام کے لئے جنگل میں آیا تو حضرت کو قرآن پڑھتے سنا تمام شب بیتابی سے گزاری اور صبح کو حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ رات جو تو پڑھ رہا تھا وہ جلدی سے مجھے بھی پڑھادے۔ اس کے بعد آپ کو اپنے گھر لے گیا اور وہاں اس کے بچے بیوی وغیرہ سب مسلمان ہو گئے۔ ایک مرتبہ آپ کا جلال آباد یا شاملی گزر ہوا ایک مسجد ویران پڑی تھی وہاں نماز کے لئے تشریف لاکر پانی کھینچا وضو کیا مسجد میں جھاڑو دی۔ بعد میں ایک شخص سے پوچھ کر یہاں کوئی نمازی نہیں؟ اس نے کہا کہ جی سامنے خاں صاحب

کا مکان ہے جو شرابی اور رنڈی باز ہیں۔ اگر وہ نماز پڑھنے لگیں تو یہاں اور بھی دو چار نمازی ہو جائیں۔ آپ اُن خانصاحب کے پاس تشریف لے گئے تو رنڈی پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اور نشہ میں مست تھے۔ آپ نے خانصاحب سے فرمایا کہ بھائی خاں صاحب اگر تم نماز پڑھ لیا کرو تو دو چار آدمی اور جمع ہو جایا کریں اور مسجد آباد ہو جائے گی۔ خاں صاحب نے کہا کہ میرے سے وضو نہیں ہوتی اور نہ یہ دو بُری عادتیں چھوٹتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بے وضو ہی پڑھ لیا کرو اور شراب بھی پی لیا کرو۔ اس پر اُس نے عہد کیا کہ میں بغیر وضو نماز پڑھ لیا کروں گا۔ آپ وہاں سے تشریف لے گئے اور کچھ فاصلہ پر نماز پڑھی اور سجدہ میں خوب روئے ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت آپ سے دو ایسی باتیں سرزد ہوئیں جو کبھی نہیں ہوئیں اوّل یہ کہ آپ نے شراب اور زنا کی اجازت دے دی۔ دوسرے یہ کہ آپ سجدہ میں بہت روئے۔ فرمایا کہ سجدہ میں میں نے جناب باری سے التجا کی تھی کہ اے رب العزت کھرانتو میں نے کر دیا۔ اب دل تیرے ہاتھ میں ہے" ان خانصاحب کا یہ حال ہوا کہ جب رنڈیاں پاس سے چلی گئیں تو ظہر کا وقت تھا اپنا عہد یاد آیا۔ پھر خیال آیا کہ آج پہلا دور ہے لاؤ غسل کر لیں کل سے بغیر وضو پڑھ لیا کریں گے۔ غسل کیا پاک کپڑے پہنے اور نماز پڑھی بعد نماز باغ کو چلے گئے عصر اور مغرب باغ میں اسی وضو سے پڑھی۔ بعد مغرب گھر پہنچے تو طوائف موجود تھیں۔ اوّل کھانا کھانے گھر میں گئے۔ بیوی پر جو نظر پڑی تو فریفتہ ہو گئے۔ ان کی شادی کو سات سال ہو گئے تھے۔ اور آج تک نہ کبھی بیوی کے پاس گئے اور نہ اس کی صورت دیکھی تھی۔ فوراً باہر آئے رنڈی سے کہا کہ آئندہ میرے مکان پر نہ آنا۔ اور خادم سے کہا کہ بستر اگھر میں بھیج دو۔ سنا ہے کہ ان خانصاحب کی ۲۵ سال تک کبھی تہجد کی نماز قضا نہیں ہوئی۔

ایسے ہی ایک مرتبہ گڑھی پختہ تشریف لے گئے۔ ایک خانصاحب سے نماز کے لئے کہا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے داڑھی چڑھانے کی عادت ہے اور

وضو سے یہ اتر جاتی ہے آپ نے فرمایا کہ بغیر وضو پڑھ لیا کرو۔ خاں صاحب نے کچھ روز بغیر وضو نماز پڑھی پھر خیال آیا کہ ایک مولوی کے کہنے سے تو نے بغیر وضو نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اور اللہ و رسولؐ کے حکم سے باوضو نہیں پڑھی جاتی۔ اس کے بعد ہمیشہ باوضو نماز پڑھنے لگے۔

آپ نے سات حج کئے اور پیدل۔ ایک مرتبہ حج سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ پانی پت سے چل کر شب کو کسی گاؤں میں سرائے کی مسجد میں قیام فرمایا اور آخر شب میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ اتفاق سے رات کو سرائے میں چوری ہو گئی۔ بھٹیاری نے کہا کہ ایک شخص مسجد میں ٹھہرا تھا اور صبح کو چلا گیا ضرور وہی چور ہے لوگ تعاقب کے لئے آئے اور جھنجھانے کے قریب آ کر پکڑ لیا۔ اور کہا کہ تھانے چلو آپ نے فرمایا کہ جھنجھانے کے تھانہ میں نہ لے چلو اور کہیں چلو اس پر ان لوگوں کو اور بھی شبہ ہوا اور وہ جھنجھانے ہی کے تھانے میں لے گئے۔ اور ایک سپاہی کے حوالہ کر دیا جس نے حوالات میں آپ کو بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد قصبہ کے لوگوں نے دیکھا اور تمام قصبہ میں شور ہو گیا۔ عوام بہت مشتعل ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ تھانہ دار کی بدمعاشی ہے اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ تھانہ کو لوٹنا چاہتے تھے۔ تھانے دار خواجہ احمد حسن تھے جو میرے دادا مرحوم کے دوست تھے۔ اور مولوی صاحب سے خوب واقف تھے۔ بہت مشکل سے جان بچا کر تھانے آئے اور مولوی صاحب کو حوالات سے نکالا اور واقعہ کی تحقیق کی پھر لوگ اس پانی پت والے آدمی کی جان کے درپے ہو گئے جو آپ کو پکڑ کر لایا تھا۔ آپ نے خواجہ احمد حسن سے فرمایا کہ اس کی جان کے تم ذمہ دار ہو اس کے ساتھ دو تین آدمی کر دو جو اس کو بخیریت پانی پت پہونچا دیں۔

ایک مرتبہ کاندھلہ تشریف لا رہے تھے ایک شخص مل گیا اس سے دریافت فرمایا کہ کہاں جاؤ گے؟ جواب دیا کہ کاندھلہ مولوی مظفر حسین کے پاس۔ اس کے پاس سامان تھا اور آپ خالی ہاتھ تھے۔ آپ نے اس سے سامان لیکر اپنے سر پر رکھ لیا کاندھلہ آ کر جب اسے معلوم ہوا کہ یہی مولوی صاحب ہیں تو بہت پشیمان ہوا۔ آپ

نے فرمایا کہ اس میں حرج کیا تھا میں خالی ہاتھ تھا اور تم بوجھ لئے ہوئے آ رہے تھے۔
آپ محتاط بہت زیادہ تھے کبھی مشتبہ مال نہ کھاتے تھے اور اگر بھولے سے یا غلطی سے کھالیتے تو فوراً قے ہو جاتی تھی۔

زمانہ طالب علمی کا قصہ ہے کہ آپ نے کئی سال روٹی سالن سے نہیں کھائی دریافت کرنے پر فرمایا کہ دہلی کے اکثر سالنوں میں کھٹائی پڑتی ہے اور آموں کی بیع ناجائز طریق پر ہوتی ہے اس لئے میں سالن نہیں کھاتا۔ آپ بجز اپنے گھر کے اور کسی کے یہاں دعوت وغیرہ میں تشریف نہ لے جاتے تھے ابتداءً قاضی جی اور متولی جی کے یہاں کھانا تناول فرمایا کرتے تھے۔ قاضی جی اور متولی جی کے والد کے انتقال کے بعد اُن کے یہاں بھی کھانا کھانا چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ بعد پھر شروع کر دیا اور بغیر بلائے خود تشریف لے گئے۔ دریافت کرنے پر فرمایا کہ پہلے تم نابالغ تھے اس لئے میں تمہارے مال سے پرہیز کرتا تھا اب تم بالغ ہو گئے اس لئے مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔

ایک مرتبہ مولوی نور الحسن صاحب کے پاس تشریف لے گئے انہوں نے کچھ دام اپنے صاحبزادے مولوی محمد ابراہیم صاحب کو دئیے کہ خود جا کر ان کا سامان کھانے کے لئے لائیں تاکہ کچھ گڑبڑ نہ ہو۔ کھانا تیار ہوا اس میں فیرینی بھی تھی جس کے کھاتے ہی قے ہو گئی۔ مولوی نور الحسن صاحب بہت پریشان ہوئے۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ جو دودھ مولوی محمد ابراہیم صاحب لائے تھے۔ وہ گر گیا تھا۔ پھر دودھ باورچی حلوائی کے یہاں سے ادھار میں لے آیا تھا۔

بہت زائد منکسر المزاج تھے ہر ایک کام خود کیا کرتے تھے۔ بلکہ دوسروں کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ عادت شریفہ تھی کہ اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا کرتے تھے اور جو جو گھر اپنے اقارب کے تھے ان میں تشریف لے جاتے اگر کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہوتو پوچھ کر وہ لا دیتے بیسہ اُس زمانہ میں کم تھا جو شئے آتی تھی وہ غلہ کی آتی تھی۔ آپ غلہ کبھی کرتے کے پلے میں لے جاتے اور کبھی لنگی میں۔

ایک دفعہ رام پور تشریف لے گئے ایک عورت حاضر خدمت ہوئی اور عرض کیا کہ میرا خاوند مجھے خرچ نہیں بھیجتا آپ نے اس کا پتہ دریافت فرمایا اور وہاں سے فیروز پور تشریف لے گئے اور اس کے خاوند کو تلاش کر کے ہدایت کی کہ آئندہ خرچ ہمیشہ بھیجا کرو۔

بیوہ کے نکاح کو سخت معیوب سمجھا جاتا تھا آپ کو فکر ہوئی کہ اس رسم کو توڑنا چاہیئے اسی فکر میں تھے کہ مولوی ابوالقاسم صاحب صاجزادہ حضرت مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اُن کو اوّلاً ترجمۂ قرآن شریف پڑھنے کی ترغیب دی انہوں نے ترجمہ شروع کیا پھر ایک موقعہ پر انہیں نکاح ثانی کی ترغیب دی۔ اس پر انہوں نے کہا کہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے آپ نے فرمایا کہ تم شہید ہو گی۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اگر تم نکاح کر لو میں تیار ہوں مگر میں اور تم دونوں مارے جائیں گے۔ آپ نے تھوڑی دیر سکوت فرمایا اور پھر اقرار فرمالیا اور ایک موقعہ پر دو چار آدمیوں کے سامنے مخفی طور سے نکاح ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد حمل ٹھہر گیا کسی کو نکاح کی خبر نہ تھی ہر جگہ زنا کا شور مچ گیا۔ تھانہ بھون والے چڑھ آئے۔ لڑکی والے کی طرف سے اعلان تھا کہ جو کوئی شخص مولوی مظفر حسین صاحب کا سر اتار کر لا دے گا اس کو ایک ہزار روپیہ ملے گا۔ آپ کاندھلہ سے دہلی تشریف لے گئے۔ اتفاق کی بات کہ ان کی والدہ سخت علیل ہو گئیں قاضی صاحب یعنی ان کے والد بہت پریشان ہوئے ہر قسم کا علاج کیا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جب بالکل مایوس ہو گئے تو ایک فقیر ملا اور کہا کہ حافظ صاحب صاحب سے یہ کہلا دو کہ اچھی ہو جا پھر اچھے ہونے کا میں ذمہ دار ہوں۔ سب لوگ حافظ صاحب کے سر ہو گئے وہ انکار کرتے تھے فضیا نے حافظ صاحب کی بہن تھیں بہت اصرار پر آپ نے فرمایا کہ کاندھلہ سے اپنی لڑکی بی رحمت کو بلا لو تب کہوں گا۔ اوّل تو بہت پس وپیش ہوئی بعد میں مجبوراً بلانا پڑا۔ ان کے پہنچتے ہی خود بخود صحت شروع ہو گئی۔ اب مولوی مظفر حسین صاحب بھی دہلی سے تھانہ بھون تشریف لے گئے۔

کیرانہ میں ایک رافضی عورت تھی۔ آپ نے انہیں اہل السنۃ والجماعۃ ہونے کی ترغیب دی انہوں نے کہا کہ اگر آپ نکاح کریں تو میں توبہ کر لوں گی۔ آپ نے منظور فرمایا یہ بھی بیوہ تھیں۔ انہوں نے کہا کہ جب موقع ہوگا میں خط لکھوں گی تم آکر لے جانا۔ محرم کے موقعہ پر جب سب عورتیں قصبہ سے باہر تازیے دیکھنے گئیں تو ان کا پرچہ مولوی صاحب کے پاس آیا جس میں یہ نشان تھا x آپ نے میرے دادا مولوی محمد صادق صاحب اور چند آدمیوں کو ڈولی لے کر کیرانہ بھیجا اور یہ رات کو ۱۱ بجے کیرانہ جا کر ان کو لے آئے۔ جب کیرانہ والوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے تعاقب کیا۔ یہاں سے بھی ان کی اعانت کو لوگ گئے مگر مولوی محمد صادق ان کے ہاتھ نہ آئے اور بخیر کاندھلہ پہنچ گئے۔ ان محترمہ نے حضرت کو بہت سخت تکالیف پہونچائیں۔ مگر آپ سب سہتے تھے۔ اکثر رات کو دروازہ بند کر لیا کرتی تھیں اور حضرت دروازے کے باہر لنگی بچھا کر نماز میں وہ وقت گزارا کرتے تھے۔ ایک رات کے تین حصے فرمایا کرتے تھے۔ اول حصہ میں دوسری بیوی کو جو بیوہ تھیں ترجمہ قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔ دوسرے میں صاحبزادیوں کو ترجمہ پڑھایا کرتے تھے تیسرا حصہ کیرانہ والی بیوی کا تھا جس میں ان کے یہاں جا کر تہجد پڑھا کرتے تھے۔

آپ نے چھ حج پیدل کیے جس میں ایک مولوی محمد یعقوب صاحب کے ساتھ اور ایک ہمراہ اہل وعیال۔ بعد میں مولوی محمد یعقوب صاحب کا خط آیا کہ تم یہاں چلے آؤ اس خط کو مولوی نور الحسن صاحب نے چھپا لیا۔ جب آپ کو معلوم ہوا تو فوراً روانہ بیت اللہ ہو گئے۔ یہ روانگی ۱۳ جمادی الثانیہ روز شنبہ ۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔ ابھی مکہ معظمہ نہ پہنچے تھے کہ اسہال کا مرض لاحق ہو گیا۔ مکہ مکرمہ میں ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ صاحب سے فرمایا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ مدینہ منورہ میں موت آوے مگر بظاہر اب میری موت کا وقت قریب آگیا آپ مراقبہ کیجئے۔ انہوں نے مراقبہ کے بعد فرمایا کہ نہیں آپ مدینہ منورہ پہونچ جائیں گے۔ کچھ روز کے بعد آپ اچھے ہو گئے اور اگلے ہی روز مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے۔ مدینہ منورہ پہونچنے میں ایک

منزل باقی تھی کہ آپ پھر بیمار ہو گئے اور ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۵ مئی یوم جمعہ ۱۸۶۶ء کو انتقال فرمایا اور نزدیک قبر حضرت عثمانؓ مدفون ہوئے۔ کرتہ، پاجامہ لنگی، لوٹا، مشکیزہ آپ نے چھوڑا حسب وصیت لوٹا اور مشکیزہ بیت المال میں داخل کر دیا گیا۔ لنگی مریدین میں تقسیم کر دی گئی اور کرتہ پاجامہ صاحبزادیوں کے پاس بھیج دیا جس میں پاجامہ معتقدین میں تقسیم کر دیا گیا اور کرتہ مبارک موجود ہے۔ فقط محبت ایک مخفی چیز ہے جس کی اطلاع دوسروں کو صرف اس کے اثرات وثمرات سے ہو سکتی ہے کہ محبوب کی اتنی عظمت قلب میں ہو کہ حاضر و غائب ہر حال اس کا لحاظ مساوی رہے پس حضرت کے قلب میں اپنے شیخ امام ربانی کی جو محبت تھی اس کی حقیقت بجز اللہ عالم الغیب کے کسی کو معلوم نہیں۔ ہاں اس کے اثرات جو کبھی کبھی کسی واقعہ پر ظاہر ہوتے تھے ان پر حیرت ہوا کرتی اور وہ متوسلین کو عملی سبق پڑھایا کرتے تھے۔ کہ روحانی برکات حاصل کرنا ہوں تو اللہ سے دعا کرو کہ ایسا تعلق مع الشیخ نصیب ہو جائے۔ حضرت امام ربانی کے وصال پر بندہ بھی حضرتؒ کے پاس گنگوہ حاضر تھا۔ ہر چند کہ اس سانحۂ عظمیٰ پر آپ صبر ورضا کی مجسم تصویر تھے مگر ایسے مبہوت کہ گویا آپ کا بال بال چشم گریاں بنا ہوا ہے۔ حضرتؒ کا جنازہ سہ دری میں تھا آپ خانقاہ میں ایک سکوت طویل کے ساتھ ایک طرف بیٹھے ہوئے چپکے چپکے تلاوت قرآن میں مشغول تھے اور غلبۂ حزن میں جب کوئی آنسو آنکھ سہار نہ سکتی تو کنارۂ چادر سے آپ پونچھ لیتے تھے۔ وصال کے بعد حضرت کے متوسلین جب آپ کی طرف بالطبع رجوع ہوئے تو آپ کی عجیب کیفیت تھی نہ ان کو چھوڑتے بن پڑتا تھا کہ چھوٹے بھائی تھے اور شفقت کے محتاج اور نہ ان کی یہ درخواست آپ کو شیخ کی یاد تازہ کر کے رلائے اور بے چین کئے بغیر رہتی تھی، مولوی عبدالعلیم خاں بہونگامی نے جب اس قسم کی درخواست حادثہ کے قریب ہی آپ کی خدمت میں بھیجی تو دیر کے بعد حضرتؒ کا یہ جواب آیا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عرصہ دو ماہ کا ہوا کہ گرامی نامہ صادر ہوا تھا بغفت

ندامت ہے کہ اس کے جواب میں تاخیر ہوئی۔ زمانہ سفر قریب تھا اور طبع مضمحل تھی پھر کچھ علیل رہا۔ بالجملہ بسبب وجوہات جواب نہ لکھ سکا جس تعلق سے آپ نے خط لکھا اسی تعلق کے واسطے سے میں مستدعی ہوں کہ معاف فرمائیں گے۔ آپ نے ذکر کے بارے میں مشورہ فرمایا۔ میں کس قابل ہوں کہ مشورہ دوں۔ خدام حضرت میں مجھ روسیاہ سے زیادہ کوئی بھی نالائق نہ ہوگا۔ بتیس ۳۲ سال کا عرصہ حضور کی خدمت و حیات کا گذارا اور کچھ نہ کیا۔ کیا خبر تھی کہ یہ روز سیاہ دیکھنا پڑے گا۔ کیا معلوم تھا کہ حضرت عالم قدس کو رخصت ہو جائیں گے۔ اور میں تیہ کار آپ کے بعد دنیا میں بیٹھا رہوں گا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ وصبر جمیل۔ بالجملہ حیران ہوں کہ کیا عرض کروں پھر اگر عرض نہ کروں تو کیونکر نہ کروں۔ تعلقات سے کیونکر قطع نظر کردں۔ ذکر کے بارے میں جہاں تک اس وقت میرے خیال میں ہے کہ ذکر جہر آپ کو زیادہ نافع ہے۔ گو اس قدر نہ ہو کہ موجب تکلیف ہو۔ علاوہ اس کے ذکر خفی کرنا بھی مضائقہ نہیں۔ اس وقت معذور ہوں تعین نہیں کر سکتا۔ بوقت ملاقات مفصل عرض کروں گا۔ والسلام

خلیل احمد عفی عنہ از سہارنپور سہ شنبہ ۴ جولائی ۱۹۰۶ء

دوسرے خط میں یہ حزن وغم بے اختیار بزبان قلم ان لفظوں میں ظاہر ہوا کہ:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ مع استفتا پہنچا۔ جواب ارسال خدمت ہے۔ باقی امور کا کیا جواب دوں بجز اس کے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت نے کمر توڑ دی۔ میں تو دل سے کہتا ہوں۔ ؎

سُنے کون ہائے صدائے دل ملے کس سے آہ شفا دل ❊ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم خدام کارہ ہیں یا ناکارہ آپ اور تمام خدام حضرت رحمۃ اللہ کے خادم ہیں انشاء اللہ کسی کام سے عذر نہیں۔ فقط خلیل احمد عفی عنہ

حضرت کے متوسلین کو جس طرح آپ نے یتیم اور چھوٹا بھائی سمجھ کر آغوش شفقت میں لیا اور چھاتی سے لگایا اسی طرح حضرت کی وفات کے بعد حضرت کے متعلقین اور رشتہ داروں کو اپنے خون شریک عزیزوں سے زیادہ پیارا اور محبوب سمجھا صاحبزادہ

حضرت مولانا حکیم مسعود احمد صاحب مدظلہم کسی مریض کا علاج کرنے سہارنپور تشریف لاتے تو حضرتؒ خادمانہ طور پر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ایک مرتبہ مودبانہ درخواست کی کہ مہمانی قبول فرمائیں اور مدرسہ کو قیام سے نوازیں صاحبزادہ صاحب نے منظور فرما لیا تو حضرت کو اتنی خوشی ہوئی کہ عرصہ تک اپنے مخلصین سے بے اختیار فرمایا کرتے کہ صاحبزادہ صاحب نے بندہ کی درخواست قبول فرما کر شرف میزبانی بخشا ؛

صاحبزادی صاحبہ سے حضرت کو خصوصی تعلق تھا کہ ماشاء اللہ ہر قسم کے کمالات روحانیہ سے مالامال ہونے کے باوجود وہ حضرت کو پیر کی جگہ سمجھتی تھیں اور حضرت ان کو اپنی بڑی بہن سمجھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کچھ مستورات نے حضرت سے بیعت کی تو مخدومہ صاحبزادی صاحبہ نے بھی رومال تھام لیا اور بیعت ہوگئیں کہ اس وقت حضرتؒ کو علم بھی نہیں ہوا مگر باوجود اس کے حضرت ان کی اس درجہ عزت فرمایا کرتے تھے کہ ماں زندہ ہوتیں تو بس اس سے زیادہ نہ کر سکتے۔ وہ سہارنپور تشریف لاتیں تو حضرت مدرسہ سے فارغ ہوتے ہی باہتمام مکان پر جاتے اور جب تک مخدومہ کا قیام رہتا حضرت پر مسرت۔ کا وہ عالم طاری رہتا گویا حضرت امام ربانی تشریف لے آئے۔ گھر بار سب ان پر چھوڑ کر مطمئن ہو جاتے اور کوئی بات اہل کی طرف سے حضرت سے دریافت بھی کی جاتی تو بے ساختہ فرماتے بہن تشریف رکھتی ہیں۔ ان سے پوچھو اور جو وہ فرمائیں وہ کرو کہ ان کے ہوتے ہوئے مجھ سے کسی بات کے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے " حضرت مخدومہ سفر حج کو تشریف لے گئیں تو دہلی تک حضرتؒ نے مشایعت فرمائی اور پھر اتفاق سے حضرت بھی شریک حج ہوگئے تو مکہ مکرمہ پہنچ کر مخدومہ کی تمامی ضروریات اپنے ذمہ رکھ کر مدنی سفر میں خادمیت کا وہ حق ادا کیا کہ خود شغدف اٹھا کر اونٹ پر لادتے اور سیڑھی پکڑ کر مخدومہ کو سوار کراتے اور جب تک وہ بآرام سوار نہ ہو جاتیں حضرت اپنے اونٹ پر سوار نہ ہوتے تھے ؛

حضرت امام ربانی کے ہمشیرہ زادہ مولوی محمد ابراہیم صاحب ایک بار اپنے لڑکے کو مدرسہ میں داخل کرنے کے لئے سہارنپور لائے جو ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے اور قواعد مدرسہ کی رُو سے اُن کے وظیفہ کا مدرسہ متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ وہ تشریف لائے تو حضرت نے بغلگیر ہو کر غایت احترام کے ساتھ ان کو بٹھایا اور لڑکے کو مہتمم صاحب کے پاس بھیجدیا کہ داخل کر لیا جائے۔ مہتمم صاحب نے درخواست پر جواب لکھدیا کہ قواعد مدرسہ کے خلاف ہے اور وظیفہ مدرسہ سے نہیں دیا جا سکتا۔ حضرتؒ چپ تھے کہ نہ مدرسہ کا قاعدہ کسی کی رعایت میں توڑا جا سکے اور نہ ہمشیرزادہ شیخ کی صعوبت سفر اور خواہش سے چشم پوشی کی جا سکے۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب کو مہتمم صاحب کا یہ رُوکھا جواب ناگوار گذرا اور یہ دیکھکر کہ پھر حضرت نے بھی اس کی تردید نہ کی زیادہ غصہ آیا کہ واپسی پر آمادہ ہو گئے اور حضرت سے کہا کہ مجھے اجازت دیجئے میں پنجاب جانے والی اسی گاڑی سے جاؤں گا۔ حضرتؒ خود ہی پریشانی و فکر میں تھے۔ شیخ کے بھانجے کا رنج و غصہ دیکھکر اور پریشان ہوئے۔ آخر یہ فرمایا کہ مولانا ابھی گاڑی میں دیر ہے۔ ذرا مجھے اجازت دیجئے کہ مکان پر ہو آؤں۔ غرض مکان پر جا کر کھانا تیار ہونے کا تقاضا کیا اور پھر خدا جانے کہاں تشریف لے گئے کچھ دیر بعد خوشی خوشی مدرسہ میں آئے اور اسی درخواست کی پشت پر یہ لکھکر کہ پانچ روپیہ مرسلہ پیشگی جمع کر کے میری ذمہ داری پر طالبعلم مذکور کو مدرسہ میں داخل کر لیجئے۔ درخواست اور روپیہ لڑکے ہی کے ہاتھ مہتمم صاحب کو بھیجدیا اور مولوی ابراہیم صاحب سے فرمایا کہ حضرت آپ تو میرے آقا کے ہمشیرزادہ ہیں آپ کا تو کتا بھی اگر آئے تو اس کے لئے آنکھوں کا فرش کر دوں۔ میں تو پریشان تھا کہ آپ کو راضی کرنے کی کیا صورت کروں سو خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے انتظام فرما دیا اطمینان رکھیئے عزیز کا خرچ خوراک ہر مہینہ مدرسہ میں داخل ہوتا رہے گا اور اب عرض ہے کہ کھانا تیار ہے دل چاہے کچھ قیام فرمائیں ورنہ کھانا کھا کر اسٹیشن کی طرف لے جائیں۔ مولوی ابراہیم صاحب لکھتے ہیں کہ اس وقت میں سمجھا کہ شیخ کی محبت و عظمت کیا چیز ہوتی ہے اور آپ کو قدرت نے

اس کا حظ وافر کتنا عطا فرمایا ہے۔ الحاصل لڑکپن کی پرانی نام بیعت کا جب یہ احترام تھا کہ آپ حضرت حامی مرحومہ کی آستانہ بوسی کو فخر سمجھتے اور ان کے نواسوں مولانا محمد یحییٰ صاحب و مولانا محمد الیاس صاحب کو اپنی اولاد سے زیادہ پیارا سمجھتے رہے تو آستانہ گنگوہیہ کی عظمت کا کیا پوچھنا کہ جو کچھ بھی آپ کو ملا وہ اسی دربار دُربار سے ملا۔ آپ کا رُواں رُواں اپنے محسن و مربی شیخ کا ممنونِ احسان اور گویا بزبانِ حال اس شعر کا وردر کھتا تھا ؎

باغبان خانہ ات آباد ثنا خوانِ توام چوں صبا باد فروش گل ریحان توام

میں نے حضرت امام ربانی کے خطوط بہاولپور بریلی وغیرہ حضرتؒ کے نام گئے دیکھے ہیں کہ سب بیرنگ ہیں اور کسی پر بھی ٹکٹ نہیں۔ یہ صرف اس لئے کہ گو محصول دو چند دینا پڑے مگر شیخ کی تحریر جو گویا مولے کا پتہ ہے دوسرے کے ہاتھ نہ پڑے۔ اور بحفاظت آپ ہی کو پہنچے۔۔۔ اور جب آپ سہارنپور چلے آئے کہ گنگوہ کا دروازہ تھا تب تو گنگوہ جانے والا کوئی شخص بھی ایسا نہ چھوڑا جس کے ہاتھ عریضہ اور زبانی سلام غلامانہ نہ پہنچایا ہو۔ گنگوہ اس وقت میں مرجع خلائق بنا ہوا تھا اور آپ کا دل چاہتا تھا کہ آستانہ شیخ پر حاضر ہونے والے آتے اور جاتے آپ ہی کے پاس ٹھیریں ادھر اعلیحضرت کو آپکے ساتھ محبت زیادہ تھی کہ جو مہمان براہ سہارنپور آتا اس سے پوچھا کرتے کہ خلیل احمد اچھی طرح ہیں اور ان سے مل کر بھی آئے یا نہیں؟ اس لئے ہر چند کہ مدرسہ شہر کے ایک گوشہ میں تھا مگر حضرت کے خاص متوسلین اہتمام کر کے مدرسہ آتے اور حضرت ہی کے پاس قیام کرتے تھے۔ مدرسہ سے اس وقت حضرت کو چالیس روپیہ ماہوار ملتے تھے اور فتوحات و نذر و ہدایا کا سلسلہ بھی نہ تھا۔ اکثر حضرت بسلسلہ مہمانداری مقروض رہتے اور تنگی کے ساتھ گذر کیا کرتے مگر برادرانِ طریقت کی مدارات سے آپ کے قلب کو جو فرحت پہنچتی تھی وہ ہر فکر و عسر کو دابے لیتی تھی گنگوہ سہارنپور سے بائیس میل تھا اس لئے دن کو یا رات کو گنگوہ سے آنے والے مدرسہ میں اکثر بغیر اطلاع اور نا وقت آتے تھے اکثر ایسا ہوا کہ آپ ان کے لئے کھانا لیئے گھر

میں گئے تو معلوم ہوا کہ بی بی بچوں سے زائد نہیں ہے اور نہ گھر میں آٹا دال ہے کہ پکا لیا جائے مگر گھر والے بھی آخر آپ ہی کے گھر والے تھے اس لئے سارا کھانا یا ہر مہمانوں کے لئے آجاتا اور بی بی اور دونوں لڑکیاں صرف پانی پی کر سو جایا کرتی تھیں۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں دلداری کے لئے مہمانوں کے ساتھ بیٹھ تو جاتا تھا مگر پھر خیال آتا کہ بچیوں نے کچھ کھایا نہیں اس لئے میں بھی بھوکا اٹھ جاتا تھا۔ بایں ہمہ گنگوہی مہمانوں سے دل تنگی کا تو کیا ذکر آپ کے اصرار اور مخلصانہ محبت کی وجہ سے مہمانوں کا آنا دن بدن بڑھتا ہی رہا۔ اگر کوئی بالا بالا چلا جاتا تو آپ کو رنج ہوتا اور شکوہ فرمایا کرتے کہ مجھ سے مل کر کیوں نہ گئے۔ پھر کھانا ہی نہیں بلکہ مہمانوں کی ہر ضرورت کا پورا کرنا آپ اپنا فرض سمجھتے۔ حتیٰ کہ ان کی روانگی نا وقت ہوتی تو لاٹھی لے کر ان کے ساتھ چلتے کہ راستے میں کتا بلی پریشان نہ کرے۔ ایک مرتبہ بندے کو صبح نماز کے وقت جانے والی ریل پر سوار ہونا تھا تو حضرت قبل فجر لاٹھی لے کر تشریف لے آئے اور ہر چند بندہ نے اصرار کیا کہ حضرت تکلیف نہ فرمائیں مگر حضرت نے نہ مانا اور یہ فرمایا کہ باتیں کرتا چلوں گا ذرا دل بہلا رہے گا اور دونوں کی نماز بھی با جماعت ہو جائے گی ساتھ ہو لئے سپاہیانہ انداز پر لاٹھی ہلاتے ہوئے اسٹیشن پر آئے۔ وہاں دونوں نے جماعت کر کے نماز پڑھی اور جب میں ریل میں بیٹھ گیا تب حضرت پیدل ہی مدرسہ واپس ہوئے۔

پائے در زنجیر پیش دوستاں ‌ ‌ بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

نکاح اور اولاد

حضرت قدس سرہ کا رشتہ مصاہرت قصبہ گنگوہ کے انصاری خاندان سے وابستہ ہے کہ شاہ حسن عسکری شہید کی جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک حضرت کے عم بزرگوار شاہ حبیب محمد صاحب کو منسوب ہوئیں جو کہ مولانا صدیق احمد صاحبؒ کی والدہ تھیں۔ اور دوسری صاحبزادی جن کا نام الٰہی بیگم

تھا۔ گنگوہ میں شاہ عبدالرحمٰن بن مولانا شاہ حبیب اللہ گنگوہی سے بیاہی گئیں شاہ عبدالرحمٰن صاحب کی تین صاحبزادیاں ہوئیں جن میں ایک حضرت مولانا حکیم اسمٰعیل صاحب گنگوہی کے نکاح میں آئیں اور ان کے بطن سے فخر خاندان مولانا مولوی حکیم سعید احمد صاحب تولد ہوئے جو آج اپنے باپ کے برابر میں سچے جانشین اور بمبئی کے مشہور طبیب ہیں۔ دوسری صاحبزادی کا شاہ محمد صادق صاحب سجادہ نشین انبہٹہ سے رشتہ ہوا اور تیسری صاحبزادی جن کا نام انبیا بیگم تھا حضرت قدس سرہ کے نکاح میں آئیں۔ ان بہنوں کے دو بھائی تھے۔ شاہ مظہر حسین اور مولانا حکیم فخرالحسن صاحب کہ ثانی الذکر کی یادگار حضرت مولانا حافظ فیض الحسن صاحب مدظلہٗ ہیں جن کا شمار حضرت قدس سرہ کے خلفاء میں ہے اور اپنے موقع پر تذکرہ ہوگا؛

۱۲۸۹ھ میں جبکہ حضرت قدس سرہ کی عمر کا اکیسواں سال شروع تھا اور آپ تعلیم سے فارغ ہوکر ملازم ہو چکے تھے۔ لڑکی والوں کا آپ کے والدین پر تقاضا ہوا کہ عقد نکاح سے فراغ پاؤ چنانچہ تاریخ مقرر ہوگئی اور بارہ چودہ اعزہ کی بہت مختصر و سادہ برات چار یا پانچ بہل میں سوار ہوکر انبہٹہ سے گنگوہ روانہ ہوئی حضرت امام ربانی قدس سرہ نے خطبۂ نکاح پڑھکر ڈھائی ہزار روپیہ مہر قرار دے کر اپنے روحانی بیٹے کا عقد کیا۔

۱۲۹۰ھ میں حق تعالیٰ نے آپ کو فرزند عطا فرمایا جن کا نام محمد ابراہیم رکھا گیا اور دو نام تاریخی تجویز ہوئے ظفر علی اور ناظر الحق۔ ڈھائی سال بعد شروع ۱۲۹۳ھ میں لڑکی پیدا ہوئی جن کا نام منیر النساء رکھا گیا اور ان کے ڈھائی سال بعد ۲۰ ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ میں دوسری لڑکی پیدا ہوئی۔ مگر بحکم قضا و قدر یہ ولادت ماں اور بیٹی دونوں کے لئے عالم آخرت کا بلاوا تھی کہ صرف تین دن زندہ رہ کر اول معصومہ نے دنیا کو الوداع کہا اور اسی روز والدۂ محترمہ بلسوئے عالم آخرت روانہ ہوگئیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

دُنیا عجیب گھر ہے کہ غمی اور خوشی توام اور انقلابِ احوال اس کے لیئے لازم ہے۔ قدرت کے یہی تصرفات جو حوادث و واقعات کہلاتے ہیں انسان کے ضبط و استقلال کی کسوٹی اور مسلمان کے تعلق مع اللہ اور ایمان بالغیب کا امتحان بنتے ہیں کہ انسان کی ابنائے جنس کے ساتھ محبت بھی فطری بات ہے اور کوئی اس کی تبدیلی میں کوشش بھی کرے تو شریعت اس کو ممنوع و حرام قرار دے کر مجبور کرتی ہے کہ قدرت کا مقابلہ کر کے فرعون نہ بنو۔ بایں ہمہ شریعت چاہتی ہے کہ ان تمامی تعلقات کی ناپائیدارت و انقطاع کو ہر لمحہ یاد رکھو تا کہ حی و قیوم خدا کے ساتھ انس و محبّت کے تعلق کا مقابلہ نہ کر سکیں اور صبر و رضا کی مضبوط رسّی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ یہی حوادث اور محبوب چیزوں کا فراق قلب میں وہ شکستگی پیدا کرتا ہے جو نفس امّارہ کی شوکت کو مضمحل اور عالمِ آخرت سے غفلت و نسیان کو زائل کرتا ہے۔ اس لیئے یوں بھی حق تعالیٰ کی ایک نعمت عظمیٰ ہے کہ جو کیفیت مستحسنہ ہزاران ہزار برس کے مجاہدہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی وہ حوادث پر صبر اور تصرفات الٰہیہ پر رضا و تسلیم کے صلے میں ایک لمحہ کے اندر نصیب ہو جاتی ہے ؎

صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

اس لیئے حضرتؒ کے لیئے جس طرح اتباعاً للسنہ حق تعالیٰ نے یہ مقدر فرمایا تھا کہ بی بی کے ساتھ کمال انس و محبت ہو کہ عفت و پاک نظری کے لیئے لازمہ بشریت ہے۔ اسی طرح یہ بھی آپ کی پیدائش سے قبل طے فرما دیا تھا کہ اس کی دنیوی مفارقت و موت کا صدمہ بھی آپ کو پیش آئے اور ابتداء سلوک میں مجاہدۂ عظمےٰ کے قائم مقام بن کر آپ کی لطیفۂ رُوح کو درجۂ علیا پر پہنچا دے لہذا جو بیتی آنا تھا وہ پیش آیا کہ پانچ سال کے اندر وصال و فراق اور بقاء و جدائی کے دونوں منظر آپ کی نظر سے گذر گئے۔ نکاح بھی ہو گیا اور لڑکا و لڑکی بھی پیدا ہو لیئے اور وہ عفت مآب خاتون جس کا وجود آپ کے لیئے طبعی سکون و انس کا سبب تھا انبہٹہ کی زمین میں مستور بھی ہو گئی ؎

حالِ دنیا را بہ پرسیدم من از فرزانہ گفت یا خوابے است یا بادے است یا افسانہ
باز گفتم حالِ آنکس گو کہ دل در وے بہ بست گفت یا غولے است یا دیوے است یا دیوانہ

بی بی بچے والدین برادران اور اقارب و احباب کے تمامی تعلقات کی نوعیت جدا اور ہر ایک کی مفارقت و موت کا صدمہ ایک نرالا طریق رکھتا ہے جس کی بنا پر رحمٰن و رحیم خدا نے ہر ایک پر صبر کا ثمرہ بھی جدا اور اجر و ثواب کی نوعیت بھی علیحدہ مرتب فرمائی ہے پس آپ کی شانِ عظمت جس نے بلا قصد و ارادہ آپ کے کتبہ کو ظہور آثار سے بہت پہلے آپ کا نام خلیل احمد لکھنے پر مجبور کیا تھا اس کو مقتضی تھی کہ ایک وقت میں مونس و غمگسار بی بی اور نیز نور نظر و لخت جگر بچہ کی مفارقت پر آپ کی تسلیم و رضا کا امتحان لیا جائے اس لئے تین ہی دن میں دونوں سانحے پیش آئے اور حق تعالےٰ نے اس فضل و کرم نے جو ہمیشہ اپنے مقبول بندوں کا حامی و پشت پناہ بن کر خود ہی امتحان لیتا اور خود ہی ان کو سنبھالتا تعلیم دیتا رہبری فرماتا اور کامیاب بناتا ہے آپ کو بھی سنبھالا کہ رضا بر قضا میں فرق نہ آنے پایا ؎

ذوقے چناں ندارد بے دوست زندگانی بے دوست زندگانی ذوقے چناں ندارد

ادھر نوزائیدہ شیر خوار بچی کی موت طبعًا موجب حزن ضرور ہوئی کہ ثمرۃ الفواد رخصت ہوا مگر قلبًا سید طمانیت ہوئی کہ وسیلہ مغفرت اور ذخیرہ آخرت بنی۔ اُدھر مجسم صلاح و اطاعت بی بی کا فراق جن کے ساتھ محبت نے ایک خاص شغف و غلبہ لے لیا تھا دوسرے نوع کے صدمہ و حزن کا سبب بنا مگر ساتھ ہی یہ مسرت ملی ہوئی تھی کہ مرض اختناق میں مرنا شہادت ہے اور وہ نفوس جن کو آج یا کل آخر ایک دن دنیا کا چھوڑنا ضروری ہے زہے نصیب کہ آخرت کی کٹھن منزل کو بسہولت طے کر جائیں اور ایسے زمانہ میں کہ شہادت کبریٰ کا حصول دشوار ہے شہادت صغریٰ حاصل کر کے اپنے رب سے جا ملیں۔ بتواتر و ملحق دو قسم کے انتہائی دو صدموں پر آپ نہایت محزون و مغموم ہوئے اور کیوں نہ ہوتے کہ آخر بشر تھے اور بشر بھی متبع سنت رقیق القلب۔ چنانچہ آپ کی قلمی بیاض میں آپ کے ہاتھ کی لکھی ایک تحریر اور بی بی کی تاریخ وفات

میں آپ کے تصنیف کئے ہوئے دو شعر ملے جو آپ کے اس رنج و غم اور ساتھ ہی صبر و استرجاع مسنون کا پتہ دیتے ہیں جس کو کوئی دیکھنے والا دیکھ نہ سکا تھا۔ اور وہ یہ ہے۔

تاریخ پنجم ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ والدہ برخوردار ابراہیم بمرض احتباس بجوار رحمت حق پیوست۔ انا للہ ۔ الیہ راجعون ؁

اجل کردہ جانانہ را منفصل — شدم از فنور الم مضمحل
خلیل از غمش گشت غمگین و گفت — بتاریخ او داغ بر جان دل
۱۲ ھ ۹۵

ہر چند کہ آپ شاعر نہ تھے اور ان دو شعار کے سوا کبھی آپ کی تصنیف کا کوئی شعر دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا مگر کسی حادثہ کا طبعی تاثر بسا اوقات قوت و غلبہ پاکر وہ کام لے لیتا ہے جس کا دوسرے وقت ظہور مشکل ہوتا ہے اس لئے آپ کی ذہین و ذکی طبیعت نے بی بی کی وفات پر یہ اشعار موزون کرادیئے جس کا مادۂ تاریخ تعمیہ و تخرجہ کے بغیر بلا کمی و بیشی یک حرف داغ بر جان دل شاعرانہ مذاق سے بھی
۱۲ ھ ۹۵
ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے ؏

چونکہ صبر و رضا کی حقیقت یہ ہے کہ صدمہ کا اثر ضرور ہو کہ انسان ہے پتھر یا دیوار نہیں مگر حکم الٰہی سے غفلت اور حد شریعت سے تجاوز کسی امر میں بھی نہ ہونے پائے اس لئے آپ اگر بی بی کی مفارقت پر محزون تھے جس کے صدمہ کو اُن کی دو یادگاریں ہر وقت یاد دلاتی تھیں جن میں ایک کی عمر پانچ سال کی تھی اور دوسری کی عمر ڈھائی سال کی۔ تو اس کے ساتھ ہی آپ اُن کی پرورش کے لئے ہر اس صورت کے لئے تیار تھے جو غیب سے ظاہر ہو۔ چنانچہ مرحومہ کی وفات کو ایک سال نہ گزرا تھا کہ آپ کے والدین نے جن کا سایۂ عاطفت آپ کے سر پر اس وقت تک قائم تھا آپ کے عقد ثانی کی تجویز کی اور آپ اس پر بھی اسی طرح راضی ہوئے جس طرح عقد اول پر راضی ہوئے تھے کہ ت

بدزد و صاف ترا حکم نیست دم درکش — کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

۱۲۹۷ھ میں آپ کا دوسرا نکاح انبہٹہ میں حاجی نظام الدین صاحب کی لڑکی مسماۃ منیر النساء کے ساتھ دو ہزار مہر پر منعقد ہوا جس کو انہوں نے چند ہی روز بعد معاف فرما دیا تھا۔ ممدوحہ کا پہلا نکاح شیخ سراج الدین مرحوم سے ہوا تھا اور قبل عرصہ میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ حق تعالیٰ نے ان کو شیخ وقت کی زوجیت۔ کا احترام نصیب فرمایا اور طرفین سے اس اتباع سنت کا ظہور ہوا جس میں موجودہ اور آئندہ بہت کچھ مجاہدے پیش آئے اور ہر ہر قدم پر ثبات و استقلال کے کارنامے ترقیات مراتب کا سبب بنے ممدوحہ بحمداللہ مدینہ منورہ میں بقید حیات مقیم ہیں اور دعا ہے کہ تا دیر بعافیت جسمانیہ و روحانیہ قائم رہیں کہ بڑی خوبیوں والی خاتون ہیں۔ یہ نکاح حضرت گنگوہی کے مشورہ سے ہوا کہ حضرتؒ کے والد نے کنبہ کی پانچ لڑکیوں کے نام لکھکر حضرت کی خدمت میں گنگوہ بھیجدیئے کہ ان میں جس کو انتخاب فرمائیں وہاں سلسلہ جنبانی کی جائے۔

مرحومہ کے انتقال پر دونوں بے ماں کے بچے اپنی دادی کی تربیت میں آئے مگر ان کے لئے یہ سایہ بھی تا دیر قائم رہنا مقدر نہ تھا اس لئے کچھ عرصہ بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا تو لڑکے کو آپ کے چچازاد بھائی مولوی انوار احمد اپنے ساتھ تھانہ بھون لے گئے اور قرآن شریف شروع کرا دیا۔ لڑکی جو اپنے بھائی سے ڈھائی سال چھوٹی تھیں۔ زیادہ تر اپنی نانی کے پاس گنگوہ رہیں اور کچھ مدت اپنی پھوپھی کے پاس اور کبھی انبہٹہ آکر اپنی مادر کے پاس رہتی تھیں۔ مگر جہاں بھی رہتیں حضرتؒ ان کی خورد و نوش کا اہتمام فرماتے اور ضروریات کے قابل خرچ اپنی استطاعت کے موافق پہونچاتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی عمر پندرہ سال کی ہوئی اور حضرتؒ نے اپنے چچازاد بھائی محمد تقی بن محمد علی کے صاحبزادے مولوی محمد ایوب صاحب کے ساتھ ۲۸ اکتوبر ۱۸۹۱ء مطابق ربیع الاول ۱۳۰۹ھ میں نہایت سادہ طریق پر ان کا عقد کر دیا کہ رسومات مروجہ میں کوئی رسم عمل میں نہ آئی۔

مولوی محمد ایوب صاحب حضرت کے بھیجے تھے اور مکان سے دیوار بہ دیوار۔ اوّل ابتدائی کتابوں سے فارغ ہو کر عربی شروع کی اور ڈھائی سال مدرسہ اسلامیہ میرٹھ میں تعلیم پاتے رہے۔ اکتوبر ۱۸۸۶ء میں بہاولپور چلے گئے اور آخر اپریل ۱۸۸۹ء کو لاہور کے اورینٹل کالج میں داخل ہو کر علوم مشرقیہ کے امتحانات کی سند حاصل کرنے میں لگ گئے ۱۸۹۶ء میں کئی امتحان کی ڈگریاں حاصل کر کے مختار کاری کا امتحان دے دیا اور اب ڈیرہ غازی خاں میں وکالت کر رہے ہیں۔ صاحبزادی صاحبہ کی اولاد ہوئی مگر آٹھ مہینہ سے زیادہ کوئی بچہ زندہ نہ رہا۔ البتہ ۴ اگست ۱۹۰۹ء کو جو لڑکی پیدا ہوئی اور عطیہ نام رکھا گیا وہ بحمد اللہ زندہ اور مولوی مسعود علی راجپوری سلمۂ کے نکاح میں آکر اس وقت دو بچوں کی ماں ہے حق تعالیٰ حضرت صاحبزادی صاحبہ کی عمر و صلاح میں برکت بخشے کہ اس وقت حضرت کا سلسلۃ الانساب انہیں سے چل رہا ہے ورنہ حضرت کی باقی تمام اولاد حضرت کی حیات میں دُنیا سے رخصت ہو چکی اور لاولد یا صاحب اولاد ہو کر مع اپنی اولاد کے سب یکے بعد دیگرے عالم آخرت کو سدھار چکے۔

والدہ عطیہ چونکہ زیادہ تر نانی کے پاس رہیں اور بے ماں ہونے کی وجہ سے لاڈ پیار ہوا اس لئے قرآن شریف پڑھنے کی نوبت نہیں آئی مگر صاحب اولاد ہونے کے بعد اس طرف توجہ کی اور قرآن شریف پڑھا۔ البتہ محمد ابراہیم چونکہ مردانہ تربیت میں تھے اس لئے اوّل قرآن شریف حفظ کیا اور اس کے بعد ان کو حضرت نے اپنے ساتھ لے لیا کہ بریلی و دیوبند کے قیام میں وہ حضرت کے ساتھ رہے اور عربی شروع کرادی ہر چند کہ حضرت نے بہت کوشش کی کہ تکمیل ہو جائے مگر مقدر کا مقابلہ کون کرسکتا ہے حافظ ابراہیم کا دل پڑھنے سے اُچاٹ گیا اور مشکوٰۃ شریف و شرح وقایہ سے آگے نہ بڑھ سکے آخر حاجی محمد علی انبہٹوی نے جن کے قلب میں مسلمان بچوں کی بے علمی و بے ہنری کا ایک خاص درد تھا پنشن لینے کے بعد جب وطن میں نقشہ نویسی کا مدرسہ کھلوایا تو حافظ ابراہیم بھی اس میں داخل ہو گئے اور فارغ ہو کر فاضلکا میں اپنے

بہنوئی مولوی محمد ایوب صاحب کی سعی سے بیس روپیہ مشاہرہ پر محکمہ نہر میں ملازم ہو گئے اور چند روز بعد داروغہ نہر ہو کر چالیس روپیہ ماہوار پر فیروز پور چلے گئے۔ ان کی پہلی شادی مئی ۹۷ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ میں حضرت کے چچازاد بھائی مولانا صدیق احمد صاحب کی صاحبزادی صفیہ خاتون سے ہوئی مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی تب دوسرا نکاح ۱۳۲۹ھ میں منشی محمد شفیع صاحب نانوتوی کی دختر سے ہوا۔ مگر اس عقد کے کچھ ہی مدت بعد صفیہ خاتون کا انتقال ہو گیا اور پھر چند ماہ بعد ۱۳۳۰ھ میں بعمر ۳۸ سال خود حافظ ابراہیم مرحوم نے دنیا کو الوداع کہہ دیا اور اس طرح پر حضرت کی نرینہ اولاد کا بالکل خاتمہ ہو گیا فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرتؒ کو اپنی اولاد سے خاص شفقت تھی خصوصاً لڑکی سے کہ ان کی ذرا ذرا بات کا خیال رکھتے تھے۔ وہ خود فرماتی ہیں کہ بچپن میں ایک مرتبہ میرے سر میں کیڑے پڑ گئے تھے اور میں کسی کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیتی تھی۔ حضرتؒ پیار چمکار کر مجھے اپنی گود میں لٹا لیا کرتے اور سر منڈواتے اور کیڑے نکالا کرتے تھے۔ کوئی دوسرا میرے سر کو ہاتھ لگاتا تو میں بے چین ہو جایا کرتی مگر حضرت جب اپنے ہاتھ سے نکالتے تو مجھے تکلیف نہ ہوتی بلکہ آرام ملا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ میرے کپڑے نہیں بنتے میں تنہا کوٹھے کے اندر جا کر پلنگ پر لیٹ رہی اور کہنے لگی (گمیاں آگئیں پاجامے سب پھٹ گئے) گریبان آگئیں اور پاجامے سب پھٹ گئے۔ حضرتؒ نے کہیں یہ لفظ سن پائے اور اسی وقت بازار جا کر کپڑا خریدا اور میرے کپڑے بنوائے۔

حضرتؒ کو اپنی مرحومہ اہلیہ کے انتقال کے بعد ان کے اعزہ کی دلدہی کا بہت زیادہ خیال رہتا اور آپ جب گنگوہ حاضر ہوتے تو اپنی خوشدامن کی خدمت میں بھی ضرور جایا کرتے تھے۔ مولوی فاروق احمد صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت کی خوشدامن میرے والد مولانا صدیق احمد صاحب کی حقیقی خالہ تھیں مگر مجھے علم نہ تھا۔ کیونکہ حضرتؒ کی اہلیہ کے انتقال پر میں پیدا بھی نہ ہوا تھا۔ ایک مرتبہ لڑکپن میں مجھے

حضرتؒ کے ساتھ گنگوہ جانے کا اتفاق ہوا تو حضرت اپنی خوشدامن کے پاس تشریف لے گئے۔ واپسی میں مجھ سے دریافت فرمایا میاں فاروق تمہاری دادی صاحبہ نے مجھ سے پردہ کیوں نہیں کیا؟ میں چُپ ہو رہا تب حضرت نے فرمایا کہ ابراہیم کی والدہ ان کی بیٹی تھیں۔

موجودہ اہل سے حضرتؒ کی تین لڑکیاں ہیں۔ جن میں چھوٹی لڑکی جس کا نام زبیدہ رکھا گیا تھا۔ چار ہی سال کی عمر میں مبتلائے ہیضہ ہو کر دنیا سے رخصت ہوئی۔ ما ں دو لڑکیاں ام ہانی اور سلمیٰ جوان اور صاحب اولاد ہوئیں۔ ام ہانی کا میاں محمد یامین سے عقد ہوا مگر کچھ ایسا نسوانی مرض لاحق ہوا کہ جو بچہ پیدا ہوتا وہ مردہ چوہے کی طرح ایسا پیدا ہوتا تھا گویا رحم مادر میں کسی نے شکنجہ میں کس دیا۔ چند سال بعد شوہر دفعتہً مجنوں ہو گیا اور اس صابرہ عفیفہ لڑکی کو طرح طرح کی جسمانی و روحانی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔ آخر اندر ہی اندر حزن و غم سے گھُٹ کر دق ہو گئی اور ۲۶ شعبان ۲۹ھ مطابق ۱۷ اگست ۱۱ء کو انبہٹہ میں انتقال ہو گیا۔ دوسری لڑکی سلمیٰ کا عقد مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب سے ہوا جو اس وقت حضرت کے قائم مقام ناظم مدرسہ مظاہر علوم ہیں۔ مگر وہ بھی طرح طرح کے امراض کا شکار رہی اور آخر گلے میں انجیر نکلے جن کا یکے بعد دیگرے دو مرتبہ لدھیانہ لے جا کر اپریشن کرایا گیا۔ مگر آخر اس کو بھی دق لاحق ہوئی اور چند ماہ کی ایک بچی خدیجہ نام چھوڑ کر وہ بڑی بہن سے پہلے ہی ربیع الثانی ۲۸ھ مطابق ۔ ار جون ۱۰ء میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔ تین مہینہ بعد ۷ ار جب ۲۸ھ کو معصومہ خدیجہ نے بھی اپنی ماں کا ساتھ دیا اور اس طرح پر تین سال میں جوان اولاد کے متواتر تین صدمے حضرت کو لا [illegible] پڑے کہ سب سے پہلے سلمیٰ نے بعمر بائیس ۲۲ سال انتقال کیا اور اگلے سال ام ہانی رخصت ہو انبہٹہ میں مدفون ہوئی۔ اور تیسرے سال سب سے بڑے اور اکلوتے لڑکے حافظ ابراہیم مرحوم نے سہارنپور کے گورستان کو اپنا مدفن بنایا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس صلے میں کہ آپ کی نسبی اولاد دنیا سے اٹھی حق تعالیٰ نے آپ کی روحانی اولاد کو [illegible] از

بیش بنا دیا کہ آپ کا روحانی علمی و عملی فیضان اور شریعت و طریقت کے مستفیدین تلامذہ و مریدین ہزارہا کی تعداد میں شرقاً و غرباً پھیلے جو آپ کے مبارک نام اور آپ کی پاکیزہ مرشدانہ سوانح کو قیامت تک یاد رکھیں گے ؎

اولاد سے تو یہی کہ دو پشت چار پشت
رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق

سفر حج و زیارت بلدۃ الرسول

۱۲۹۳ھ میں حضرت قدس سرہ با جازت امام ربانی مدارس ہو کر بھوپال تشریف لے گئے جس کی صورت غالباً یہ ہوئی کہ مولانا جمال الدین مدار المہام شوہر والیہ ریاست سکندر جہاں بیگم حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد تھے اور چاہتے تھے کہ استاد زادہ مولانا محمد یعقوب صاحب کو تین سو روپیہ ماہوار پر ریاست میں بلا کر حق خادمیت ادا کریں۔ مگر مولانا مرحوم اس وقت اکابر ملت کی تجویز سے دارالعلوم دیوبند پر تیس روپیہ ماہوار پر مدرس اوّل ہو چکے اور اجمیر کی یک صد روپیہ ماہوار کی ملازمت اور بریلی کی انسپکٹری مدارس کو خیر باد کہکر اس فقیرانہ مخلصانہ درسگاہ کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف فرما چکے تھے۔ اس لئے آپ نے بھوپال جانے سے انکار کر دیا اور مولوی جمال الدین صاحب کو لکھا لا حاجۃ فی نفس یعقوب الا قضاھا یعقوب کی دلی حاجت جو کچھ تھی وہ پوری ہو چکی کہ بقدر ضرورت معاش کے ساتھ اہل اللہ کا قرب اور علمیہ دینیہ خدمت نصیب ہو گئی لہذا اب کہیں آنے جانے کا خیال نہیں۔ مدار المہام جب آنحضرت کی طرف سے مایوس ہوئے تو اسی پر اکتفا کیا کہ اپنی تجویز سے کسی ہونہار عالم کو بھیجدیں۔ مولانا انوار احمد صاحب کا بیان ہے کہ غالباً حضرت کے بھوپال جانے کی یہی تقریب ہوئی کہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے اپنے بھانجے کا انتخاب فرمایا اور حضرت قدس سرہ نے اپنے مرشد و مربی روحانی حضرت امام ربانی سے اجازت لے کر پچاس روپیہ ماہوار پر بھوپال کا سفر اختیار کیا۔

ہر چند کہ آپ کا قیام اور خورد نوش کا انتظام مدار المہام کی کوٹھی میں تھا جس کا نام موتی محل تھا مگر آپ کو اُن اضلاع کا چھوڑنا جن میں انوار و تجلیات کی موسلادھار بارشیں برستی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے تھے بہت ہی شاق ہوا اور اس کے ساتھ ہی وہاں کی آب و ہوا نے ناموافقت کی کہ صحت درست نہ رہی اس لئے آپ گھبرائے اور حضرت سے اجازت چاہی کہ مستعفی ہو کر وطن آجائیں ادھر حضرت امام ربانی کو بھی دل سے پسند نہ تھا کہ اپنے خواص کو اپنے سے اتنا دُور رکھیں کہ ایک بار آنے میں چار دن کا وقت اور چالیس روپیہ کا خرچ ہو اس لئے فوراً یہ جواب لکھا۔

برادرم مولوی خلیل احمد صاحب مدفیوضہم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمائید۔ آج خط آیا حال معلوم ہوا درصورتیکہ ہوا وہاں کی آپ کو موافق نہیں تو ترک وہاں کا ضروری ہے کہ اس جگہ کا کہ ہوا ناموافق ہو۔ ترک کرنا بحکم حدیث ثابت ہے مگر چونکہ معاش کا قصہ نازک ہے لہذا جب تک دوسری جگہ سامان نہ ہو جاوے ترک مناسب نہیں۔ اس واسطے چندے قیام وہاں کا مناسب ہے۔ مُراد آباد میں آپ کی طلب بہت رہی۔ اب وہاں مولوی عبدالحق پوری آ گئے ہیں مگر جیسا چاہیئے ویسا کام ان سے نہیں ہوتا۔ اگر مناسب ہوا وہاں یا دوسری جگہ کہ تدبیر اس کی کرتا ہوں تجویز ہو کر مطلع کروں گا انشاءاللہ تعالیٰ۔ فقط ۸ ربیع الاول ۹۳ھ روز جمعہ ؁

اس حکم کی تعمیل میں حضرت قدس سرہ بھوپال میں ٹھہرے رہے حتی کہ موسم حج آیا اور بماہ شوال آپ کو اپنے نواح وطن سے کچھ لوگوں کے ارادۂ سفرِ حج کی اطلاع ملی۔ ہر چند کہ آپ غیر مستطیع تھے اور آپ پر حج فرض نہ تھا لیکن صفا کیش دل میں زیارت بیت اللہ و بیت الرسول کا فطری طور پر شوق رکھتے تھے اور مشتاقانِ سفرِ عرب کی خبر سُن کر اس میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا اس لئے آپ کے قلب میں اس کا داعیہ ہوا کہ کاش امسال مجھے بھی حج نصیب ہو اور کسی طرح میں بھی حرمین شریفین کی حاضری سے بہرہ یاب ہو جاؤں چنانچہ آپ نے اوّل اپنے آقائے روحانی کو لکھا اور پھر

دنیوی آقا کی خدمت میں درخواست دی کہ "ازراہ اقبال ریاست بھوپال کا طریق عمل یہ ہے کہ جو ملازم حج کو جائے اس کو رخصت بلا وضع اور ان چند ماہ سفر کی تنخواہ پیشگی دے دی جاتی ہے لہٰذا آپ بھی عنایت فرمائیں تاکہ میں حج کر آؤں"۔ چونکہ آپ کی ملازمت سرکاری ملازمت نہ تھی اس لئے رئیس نے قانون ریاست کا تحمل تو نہ کیا مگر کچھ تنخواہ پیشگی دے کر رخصت منظور کر لی۔ آپ ناکافی روپیہ لے کر وطن آئے مگر حصول رخصت میں دیر ہوئی تو آکر دیکھا کہ جانے والے حجاج جا چکے اور اب آپ تنہا ہیں کہ سفر کرنا چاہیں تو اکیلے جائیں تنہائی و ناتجربہ کاری اور طوالت سفر آپ کو پریشان ضرور کرتی تھی مگر آپ کا شوق اور آپ کا توکل آپ کے قدم کو آگے بڑھا رہا تھا اس لئے آپ نے ہمت نہ ہاری اور آپ اپنے مرشد اور والدین سے اجازت لے کر دو سالہ لڑکے اور سہ ماہہ بچی کو اللہ کے سپرد کر کے وطن سے تنہا روانہ ہو گئے۔

بمبئی پہنچ کر آپ کو معلوم ہوا کہ تمامی احباب پہلے جہاز میں سوار ہو چکے اور اب بحری سفر بھی تنہا کرنا پڑے گا۔ اس پر بھی آپ ہراساں نہ ہوئے اور جانے والے جہاز کا ٹکٹ خرید کر سوار ہو گئے۔ اپنے اس سفر کا ایک بار آپ نے خود تذکرہ فرمایا کہ جہاز بندر سے چلا تو مجھے دوران سر شروع ہوا اور پورے تین دن چکرا اور قے میں گذر گئے کہ کھانے کی خواہش بھی نہ ہوئی۔ مگر چوتھے دن جب ذرا طبیعت کو سکون ہوا تو بھوک معلوم ہوئی اور میں نے ایک دیگچی میں مونگ کی کھچڑی نکال کر پکنے کے لئے چولھے پر رکھی۔ پکانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ دیکھا تو پانی اوپر آ گیا اور دال گل گئی مگر چاول جوں کے توں۔ نمک اس قدر تیز کہ منہ تک نہ لے جائی جا سکے۔ خاموش ہو کر اپنی جگہ آ بیٹھا اور دیگچی کو ایک طرف رکھ دیا۔ بھوپال کے قریب کے ایک نواب صاحب بھی اسی جہاز میں حج کو جا رہے تھے (جن کا نام آپ نے لیا مگر مجھے یاد نہیں رہا) میری عمر کا اس وقت چوبیسواں سال اور شباب کا زمانہ تھا۔ اتفاق سے ان کا اس طرف گذر ہوا اور مجھ پر نظر پڑی تو پوچھنے لگے صاحبزادے تمہارے ساتھ کون ہے؟

میں نے برجستہ جواب دیا کہ اللہ۔ یہ سن کر وہ خاموش چلے گئے اور اپنی جگہ پہونچ کر مجھے بلایا۔ میں گیا تو انہوں نے میری دعوت کی اور فرمایا کہ صاحبزادے تم کھانا ہمارے ہی ساتھ کھایا کرو۔ میں نے کہا کہ یوں تو کھاتے ہوئے شرم آتی ہے ہاں کوئی خدمت مجھ سے لیجئے تو انکار نہیں وہ ذرا سوچے اور پھر مجھ سے پوچھا کہ تم کو لکھنا آتا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں آتا ہے اور لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا۔ میرا خط دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور کسی کتاب کا مسودہ ان کے ساتھ تھا اس کو خوشخط نقل کرنے کے لئے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے روزانہ کی کارگزاری صفحات کی تعداد میں مقرر کر لی اور کھانا ان کے ساتھ کھانے لگا۔ خالی بیٹھے کا مشغلہ بھی مجھے ہاتھ آگیا اور پکانے کی مصیبت سے بھی نجات مل گئی۔ چند روز بعد جدہ کا بندر نظر آیا اور میں نے نواب صاحب سے کہا کہ یہاں کشتیوں کے ملاح اسباب کی چھین جھپٹ میں بہت پریشان کرتے ہیں اور اسباب ضائع ہو جاتا ہے لہٰذا یہاں کا انتظام میرے سپرد کر دیجئے۔ چنانچہ اول میں نے سارے اسباب کو یکجا کرایا اور ملازمین کو اس کے چار طرف کھڑا کر دیا کہ کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیں۔ میں نے اپنا مختصر اسباب بھی اسی میں شامل کر دیا اور چونکہ مجھے عربی آتی تھی اس لئے ملاحوں کے جہاز پر حملہ کرتے وقت میں نے علیحدہ جا کر ایک ملاح سے عربی میں باتیں کر کے پوری کشتی کا کرایہ طے کر لیا اور اس کو اسباب دکھا کر ملازمین سے جو اسباب کا احاطہ کئے کھڑے تھے کہہ دیا کہ عدد شمار کر کے اس کو دے دو اور اس کے علاوہ کسی کو پاس نہ آنے دو۔ چنانچہ اول سارا اسباب بحفاظت تمام کشتی میں پہونچ گیا اور پھر ہم سب اطمینان کے ساتھ جہاز سے اتر کر اسی کشتی میں آ بیٹھے۔ نواب صاحب میرے حسن انتظام پر بہت مسرور اور ممنون ہوئے کیونکہ دوسرے حجاج کی پریشانیاں اور نقصان دیکھ رہے تھے کہ چار طرف گمشدگی اسباب کا شور مچ رہا اور مسافر بلبلا رہے ہیں۔ جدہ شہر میں داخل ہو کر میں نے اصل مسودہ اور اس کی خوشخط نقل نواب صاحب کو پیش کر کے اجازت چاہی کہ مجھے آزاد فرما دیں۔ ہر چند نواب صاحب نے اصرار کیا کہ میں تم کو تا واپسی وطن علیحدہ نہیں کر سکتا مگر میں نے کہا

کہ یہاں میں نوکری کے لئے نہیں آیا۔ اللہ کے گھر حاضر ہو کر بھی بندگانِ خدا کا غلام بنا رہا تو حاضری کا لطف ہی کیا ملا۔ چونکہ دروازہ پر پہونچ گیا ہوں اس لئے اب تو کوئی صورت ہی نہیں کہ تعمیل ارشاد کر سکوں۔ غرض نواب صاحب سے رخصت ہو کر اونٹ پر تنہا سوار ہو کر چل دیا اور مکہ مکرمہ میں تو گویا میرا گھر تھا کہ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب تشریف رکھتے تھے۔ اس لئے سیدھا حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور دونوں وقت پکی پکائی کھانے لگا۔ سارا وقت حرم شریف میں اعلیحضرت کے پاس گذارتا اور اطمینان کے ساتھ طواف اور نمازیں مشغول رہتا۔ حج سے فارغ ہو کر قافلہ کے مدینہ منورہ چلنے کا وقت آیا اور چار طرف یہ افواہ پھیلی کہ راستہ مامون نہیں اور جان و مال ہر قسم کا خطرہ ہے تو اعلیحضرت حاجی صاحبؒ نے مجھ سے فرمایا کہ مولوی خلیل احمد کہو کیا ارادہ ہے۔ سنتا ہوں کہ مدینہ منورہ کے راستہ میں امن نہیں ہے اور اس لئے حجاج بکثرت واپس وطن جا رہے ہیں"۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میرا مقصد تو مدینہ طیبہ کا پہنچنا ہے کہ موت کے لئے جو وقت مقرر و مقدر ہو چکا وہ کہیں بھی نہیں ٹل سکتا۔ اور اس راستہ میں آجائے تو زہے نصیب کہ مسلمان کو اور چاہیئے کیا۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے یہاں تک پہونچا دیا۔ اب اگر موت کے ڈر سے مدینہ طیبہ کا سفر چھوڑوں تو مجھ سے زیادہ بدنصیب کون"۔ یہ سن کر اعلیحضرت کا چہرہ خوشی کے مارے چمکنے لگا۔ اور فرمایا بس بس تمہارے ایسے ہی رائے ہے کہ ضرور جاؤ اور انشاء اللہ تعالیٰ پہونچو گے"۔ چنانچہ میں حضرت سے رخصت ہو کر مدینہ منورہ روانہ ہوا اور جس طمانیت و راحت کے ساتھ پہونچا وہ میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ تقریباً دو ہفتہ حاضر آستانہ رہا اور پھر بخیریت تمام وطن پہونچ کر حضرت امام ربانی کا قدمبوس ہوا۔

سفر حج سے واپس آکر حضرت نے بھوپال کا ارادہ نہیں کیا کہ وہاں کی آب و ہوا ناموافق تھی اور مرشد سے بُعد جسمانی بھی زیادہ تھا۔ لہذا چند روز وطن میں رہ کر آپ بماہ جمادی الاوّل ۱۲۹۴ھ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے مدرسہ اسلامیہ

واقع جامع مسجد میں مدرس ہو کر چلے گئے۔ مگر وہاں بعض مبتدعین مخالف اور بر سر پرخاش ہو گئے جس کی اطلاع آپ نے حضرت امام ربانی کو دی اور ترک تعلق کا قصد کیا۔ مگر حضرت نے آپ کو روکا اور یہ خط بھیجا۔

مولوی خلیل احمد صاحب دام فیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کے نامہ سے ورود کیا حال معلوم ہوا۔ قصہ جدیدہ سے کچھ آپ وحشت نہ کریں۔ عالم میں مخالف وموافق دونوں ہوتے ہیں آپ اپنا کام کئے جائیں اگر مخالف بر سر پرخاش ہیں موافق بر سر نگہداشت ہیں۔ جب تک ہو اپنی طرف سے ترک مت کرو۔ ہدیہ اطفال کا اور ہدیہ ورثہ اطفال کا لینا جائز ہے کچھ اندیشہ نہیں۔ پہلے خط میں لکھنا سہو ہوا تھا۔ فقط مکرر اس شکایت کی رفع اور تکذیب میر قادر علی سے اگر مناسب ہو کسی کی زبانی کرا دیجو گو نافع نہ ہو۔ اپنی طرف سے سب کو راضی رکھنا بہتر ہے۔ شاید کچھ نافع ہو جائے قال اللہ تعالیٰ فبما رحمۃ من اللہ لنت لہم الخ مگر اس فرقہ کا راضی ہونا متوقع نہیں۔ خصوصاً صاحب واعظ ان کے ترغیب دینے والے دورہ کرتے ہوں۔ فقط والسلام۔ روز جمعہ ۱۶ جمادی الثانیہ ۱۲۹۴ھ (۲۹ جون ۱۸۷۷ء)

آپ نے تعمیل حکم شیخ میں ارادۂ واپسی فسخ کیا اور رفق ونرمی کا برتاؤ فرما کر تدریس میں مشغول رہے مگر اہل سکندرآباد کے لئے آپ کے فیوض سے مستفید ہونا مقدر نہ تھا اس لئے ایسی صورتیں پیش آئیں کہ آپ وہاں نہ رہ سکے اور آخر باجازت امام ربانی آپ وہاں سے مستعفی ہو کر وطن چلے آئے۔ بماہ شوال بزرگان ہندوستان کے اس قافلہ نے بیت اللہ کا قصد کیا جس کی نظیر نہ گذشتہ زمانہ میں نظر آئی نہ آئندہ نظر آنے کی توقع کہ نقلاب ہدایت کے نیرین حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما سالار قافلہ ہوئے اور صدہا مسلمان جنہوں نے بھی اس مقدس قافلہ کی اطلاع پائی ساتھ ہو گئے۔ حضرتؒ کے استاذ مولانا محمد مظہر صاحب اور آپ کے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول ومولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند و

مولانا محمود الحسن صاحبؒ بھی ہمراہ ہوئے اور گویا ہندوستان اہل اللہ سے خالی ہو گیا۔ ہر چند کہ حضرتؒ بھی تڑپے کہ حزب اللہ کی ہمرکابی نصیب ہو مگر آپ کو سفر حج سے واپس ہوئے چند ہی مہینے ہوئے تھے اور زاد راہ کا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے حضرت امام ربانی نے آپ کو اجازت نہ دی تھی۔ اس لئے آپ راضی برضا ہو کر بیٹھ رہے اور یہ سال آپ کا بحالت حزن مفارقت شیوخ وطن ہی میں گذرا کہ آپ کہیں ملازمت پر نہ جا سکے۔

ربیع الاول ۹۵ھ میں یہ حضرات واپس ہندوستان آئے اور وہ انوار وتجلیات جن کے سمندر پار جانے سے ہندوستان میں اندھیرا چھا گیا تھا دوبارہ نظر آئیں اور ضلع سہارنپور گویا از سر نو آباد ہوا۔

مولوی شمس الدین صاحب چیف جج بہاولپور نے دیوبند حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں ایک قابل مدرس کی طلب کے متعلق درخواست بھیجی جس میں بہت کچھ اوصاف کی قید تھی کہ نوجوان ہو نہایت ذکی ہو ہر فن میں متبحر ذی وجیہ ہو خلیق و منتظم ہو کہ طلبا کا اتالیق بن سکے اپنے علم پر عامل اور مجسم صلاح ہو کہ صورت سے نیک روی کا سبق لیا جا سکے وغیرہ وغیرہ مگر چونکہ حضرت مخدوم سفر حج میں تشریف لے گئے تھے اس لئے جب ۹۵ھ میں واپس تشریف لا کر مدرسہ کا کام سنبھالا تو اس درخواست کو بھی دیکھا اور حضرتؒ کو تجویز فرمایا کہ بہاولپور تشریف لے جاویں حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے عذر بھی کیا کہ جن شرائط کا مدرس ان کو درکار ہے مجھ میں مطلق نہیں پائی جاتیں مگر حضرت مولانا نے فرمایا میاں رہنے بھی دو لکھنے والے یوں ہی لکھا کرتے ہیں اور اہل علم اپنے کو یوں ہی سمجھا کرتے ہیں۔ تم کو اپنی نا قابلیتی یہیں نظر آتی ہے کہ سر پر بڑے موجود ہیں باہر جا کر دیکھو گے تو اتنا بھی کسی کو نہ پاؤ گے اس وحشت کو دور کرو اور اللہ کا نام لے کر چلے جاؤ۔ بالآخر حضرت مولانا اور حضرت امام ربانی کی رائے متفق ہو گئی اور میں تیس روپیہ ماہوار پر مدرس ہو کر بہاولپور چلا گیا۔ اخیر سال ۵ ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ

کو آپ کی اہلیہ کا بمرض احتباس انتقال ہوا اور آپ بہاولپور سے وطن آئے مگر چند روز قیام فرما کر بچوں کی تربیت کا انتظام کر کے واپس تشریف لے گئے اسی قیام بہاولپور میں آپ کو دوسرے حج کا اتفاق ہوا جس کی صورت غالباً یہ ہوئی کہ مولوی شمس الدین صاحب نے حج کا ارادہ فرمایا اور اپنے ساتھ آپ کو بھی لے جانا چاہا کہ ان کے بچوں کی تعلیم آپ کے متعلق تھی اور آپ کا قیام بھی انہیں کے مکان پر تھا جس کی وجہ سے اُن کو آپ کے ساتھ ایک خاص نسبت تھی اور آپ سے بہتر رفیق جو باقاعدہ ادا مناسک کرادے دوسرا ملِ بھی نہیں سکتا تھا۔ ادھر آپ کے کانوں میں یہ خبر پہونچی کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ اور مولانا محمد یعقوب صاحب امسال پھر حج کا ارادہ فرما رہے ہیں۔ چونکہ پہلے سفر میں حرمانِ ہمرکابی کا قلق آپ کے دل پر تھا اس لئے آپ کو مولوی شمس الدین صاحب کی یہ درخواست نعمت الٰہیہ معلوم ہوئی اور آپ نے اپنا شوق اور مفصل حال امام ربانی کو لکھکر حکم قطعی طلب کیا جس کے جواب میں حضرت کا بماہ شعبان ۱۲۹۷ھ یہ خط پہونچا۔

عنایت فرمائیم مولوی خلیل احمد صاحب دام فیوضہم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا۔ سر میں چونکہ ضعف بہت ہو گیا ہے۔ لہٰذا وہ کیفیت بھی کم ؑ میں کمی پذیر ہے کہ اب دس بجے سے بارہ بجے تک رہتی ہے۔ بہر حال ایسا مرض ؑ قریب ازالہ کے ہے مطمئن رہیں۔ مولوی شمس الدین کے حال و مزاج پر جو آپ کو طمانیت ہے اور بظن غالب وہ ایسے ہی ہیں تو اُن کے ساتھ جانے میں کیا اندیشہ ہے۔ بندہ کی رائے ہے کہ آپ قصد فرمائیں۔ مگر تاہم کچھ اس قدر خرچ اپنے پاس رہنا چاہیئے کہ اگر خدانخواستہ کوئی صورت دیگر پیش آجاوے تو احتیاج نہ پڑے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کفیل حجاج فوت ہو گیا یا مزاج کی مخالفت پیش آئی جس سے افتراق ہوا تو ایسی صورت میں بہت پریشانی ہوتی ہے۔ اور یہ سب تدبیر ظاہر ہے کہ جس کا استعمال ممنوع نہیں ورنہ ہوتا وہ ہی ہے جو رضائے اللہ تعالےٰ شانہٗ ہے۔ اب بندہ کا حال سنو کہ فرض نہیں کہ خواہ مخواہ لے کی ہو دے۔ ہاں بھلے کام

ؑ یعنی کمیت و مقدار

کی دل میں خواہش ہے لیکن ضعفِ جسم سے ضعفِ ہمّت بھی ہے اس واسطے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر اس وقت پر ہمّت ہو جاوے اور سامان بھی مقدر ہو دے تو کیا تعجب ہے ورنہ کچھ صورت نہیں لہٰذا اس وقت تک عزم نہیں۔ غلط افواہ مشہور ہے۔ مولوی محمد یعقوب صاحب کا عزم مجھ کو معلوم نہیں۔ ہاں تمہاری والدہ و ہمشیرہ اور اہلیہ مولوی صاحب مرحوم سُنا ہے کہ حج کا عازم ہیں۔ نقصان مالی معلوم ہوا حق تعالیٰ آپ کو اور بہت کچھ دیوے گا۔ اگر سارق کو بُرا نہ کہا جاوے تو بہتر ہے کہ پُورا اجر ملے۔

مولوی نذیر احمد صاحب۔ السلام علیکم۔ جو کلمات کہ انداز سے بڑھ جاویں اس کا کہنا اور لکھنا گو تمہاری عقیدت سے ہو مگر مجھ کو موجبِ ندامت کا ہوتا ہے۔ مولوی خلیل احمد کو بھی القاب اعلیٰ لکھنے سے چند بار منع کیا ہے۔ بہتر کلمات وہ ہیں جو اپنی قدر کے موافق ہوویں۔ مشہور یہاں یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد اپنی والدہ کے ساتھ حج کو جاویں گے۔ مولوی محمد یعقوب صاحب کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ یکم شعبان یہاں بھی بروز شنبہ ہی قرار پائی۔ یہاں بارش بکثرت ہے۔ فقط۔ رشید احمد

اس والا نامہ سے آپ کو امید بندھی کہ والدہ و ہمشیرہ اور ان کے ساتھ محرم بن کر آپ کے بھائی مولوی نذیر احمد ضرور جائیں گے اور امام ربانی کی تشریف بری بھی متوقع ہے۔ اور غیب سے سامان ہوا کہ مولوی شمس الدین تمام اخراجات کے کفیل ہو رہے ہیں لہٰذا آپ نے سفر بیت اللہ کا قصد کر لیا اور اپنی جگہ امام ربانی کے بھانجہ مولوی الطاف الرحمٰن صاحب کو تجویز کر کے اُن کو بھی بُلا لیا اور اس تمنا و شوق کے پے در پے عرائض بھیجنے لگے کہ کاش حضرت کا عزم پختہ ہو جائے اور ادھر کا بی نہیب ہو۔ مگر افسوس کہ آپ کے لئے حج مقدر تھا لیکن شیخ کی معیت سفر اب بھی مقدر نہ تھی کہ حضرت نے اپنے فسخ عزم کی "ین اس وقت جب کہ سارا سامان سفر درست ہو گیا اس طرح اطلاع دی۔

مولانا خلیل احمد صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کے خط تسری پہونچے اور آخر خط

سے مع الخیر پہونچا عزیزم مولوی الطاف الرحمٰن کا بھی معلوم ہوا یہاں ہر طرح خیریت ہے اور اپنا حال بھی بدستور ہے۔ اگرچہ پہلے عزم سفر میں تردد شک کے درجہ کا تھا مگر اب اپنی کیفیت غالب پر غلبہ عدم سفر کا معلوم ہوتا ہے۔ تجربہ یوں معلوم ہوا کہ اگر دوپہر کو قیلولہ نہ ہووے تو ... نہ رہتی ہے اگر غذا میں ناموافق کا اتفاق ہوتا ہے تو اگلے روز تک اس کا اثر رہتا ہے۔ اور جو شب کو جاگنا ہو جاتا ہے تو درد سر ہونے لگتا ہے۔ ایسا ہی تھوڑے سے تغیر میں طبع متغیر و مکدر ہو جاتی ہے۔ سو ایسی حالت میں صعوبت سفر کا تحمل بظاہر دشوار معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اب غالب عدم حضور خدمت حضرت مرشدنا فہم میں آرہا ہے۔ ادھر سب دوست خیر خواہ مشورہ اقامت دے رہے ہیں۔ شیخ عبدالعزیز خاں ہنوز مریض ہیں۔ ان میں بھی ہمت سفر نہ رہی تو بہرحال اب اپنا فسخ عزم ظاہر کر کے اس قدر لکھتا ہوں کہ بدعاء خیر مجھ کو بھی یاد کرنا مواقع اجابت میں اگر یاد آجاؤں اور حضرت مرشدنا کے جو کیفیات مشہور و مسموع تم کو ہوئیں بیان کر کے عذر حاضر نہ ہونے کا کر دینا۔ اگر زندگی رہی تو سال آئندہ دیکھئے کیا پیش آوے۔ بمقدر سے سب مجبور ہیں تدبیر کی کیا پیش رفت ہوتی ہے۔ فقط والسلام۔ مولوی الطاف الرحمٰن کو سلام و تحیات پہونچے۔ مولوی شمس الدین صاحب کو بھی سلام علیک فرمادیں۔

چنانچہ یکم اکتوبر ۱۸۸۰ء مطابق ۲۵ شوال ۱۲۹۷ھ سے آپ کی رخصت سفر حج محسوب ہوئی اور مولوی الطاف الرحمٰن صاحب نے آپ کی جگہ کام کیا۔ مگر مولوی الطاف الرحمٰن صاحب کو حضرت امام ربانی کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ وہ اس مفارقت بعیدہ کو گوارا نہ کر سکے اور ایک مہینہ بمشکل نباہ کر گنگوہ چلے آئے۔

اُس وقت حضرت امام ربانی نے مولانا انوار احمد صاحب انبہٹوی کو ان کی جگہ بہاولپور بھیج دیا۔ حتی کہ پانچ ماہ بعد مارچ ۱۸۸۱ء میں حضرت عرب سے واپس بہاولپور اپنی جگہ تشریف لائے اور مولوی انوار احمد صاحب کو وطن رخصت کیا۔

یہی وہ مبارک سفر ہے جس میں اعلیحضرت قدس سرہٗ کا خلافت نامہ آپ کو

ملا اور عمامہ مطہرہ فرقِ اقدس پر رکھا گیا کہ ہر دو عطیہ آپ نے اپنے مرشد مُطاع کے سامنے رکھ دیئے اور پھر جب وہ حضرت کی طرف سے عطا قرار پلٹے تو اُن کو سر آنکھوں پر رکھ لیا۔

قیام بہاولپور اور مناظرہ

مولوی شمس الدین صاحب چیف جج بہاولپور ایک علم دوست اور دینیات سے مناسبت رکھنے والے شخص تھے جو اپنے بچوں کو علوم دینیہ کی تعلیم دلانا چاہتے تھے چونکہ وسیع النظر اور سمجھدار شخص تھے اس لئے قابل معلّم کی طلب میں دار العلوم دیوبند کی طرف رجوع کیا کیونکہ سمجھتے تھے کہ دعوے کرنے والے ہر جگہ مل سکتے ہیں مگر کام کرنے والا عالم و معلّم بجز فلاح سہارنپور کے اور کہیں ملنا دشوار ہے چنانچہ حضرت قدس سرہ ۹۵ھ میں بہاولپور روانہ ہوئے اور جج صاحب کے مکان پر پہنچکر ابھی اسباب بھی ٹھکانے سے نہ رکھا تھا کہ جج صاحب نے ملاقات کی اور انہوں نے اپنی قابلیت کا سکہ جمانے اور آپ کی ذکاوت جانچنے کے لئے آپ سے علمی سوالات شروع کر دیئے۔ حضرتؒ نے ایک بار خود فرمایا کہ سوالات تفسیر اور قرآن کے متعلق تھے چنانچہ میں جواب دیتا رہا مگر جب میں نے دیکھا کہ سوالات سے کسی طرح پیچھا نہیں چھوٹتا تو میں نے بھی دو آیتیں قرآن مجید کی پیش کیں کہ اُن کا باہمی تعارض ہونیکی کیا صورت ہے؟ بس میرا یہ سوال کرنا تھا کہ جج صاحب نے پہلو بدلا اور علمی سوالات چھوڑ کر میرے حالات دریافت کرنے لگے۔ اور اس کے بعد مجھے قیام کی جگہ بتا کر ساری ضروریات کا انتظام کر دیا۔ میں ان کے بچوں کو پڑھاتا رہا۔ مگر ریاست کے ایسے ہی قصے ہوتے ہیں کچھ دنوں بعد مولوی شمس الدین صاحب برخاست ہو گئے اور میری تنخواہ دس روپیہ کر دی۔ پردیس میں اتنی قلیل تنخواہ پر رہنا بھی مشکل تھا مگر مروت تقاضا بھی نہ کرتی تھی کہ زیادہ کا مطالبہ کروں یا کہیں پر چھوڑ کر چلا آؤں۔ اتفاق سے فرمانروائے بہاولپور نواب صادق محمد خان صاحب عباسی چہارم کی والدہ ماجدہ

کا انتقال ہو گیا اور ان کے ایصال ثواب کی غرض سے چند مدارس دینیہ ریاست کی طرف سے جاری کئے گئے جن میں ایک مدرسہ خاص بہاولپور میں کھولا گیا۔ اور باقی مدارس ڈیرہ اور چاچڑاں چشتیاں اور احمد پور وغیرہ میں بہاولپور کے مدرسہ کے لئے کوئی عمارت چونکہ مقرر نہ تھی اس لئے مولوی محمد حسین صاحب وزیر ریاست نے اس مدرسہ کے لئے مولوی شمس الدین کا مکان ہی تجویز کر کے میرا تقرر بیس[۲۰] روپے مشاہرہ پر کر دیا کہ مدرسہ کے ساتھ جج صاحب کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی چلتا رہے اور ان کے دس روپیہ ملا کر میری تنخواہ کے تیس روپے پورے ہو جائیں مگر چند ماہ بعد جج صاحب دس روپیہ ماہوار بھی نہ دے سکے اور اس وقت وزیر صاحب نے کہ مجھ پر خاص نظر عنایت رکھتے تھے میری تنخواہ مدرسہ سے تیس[۳۰] روپے کر دی۔

آخر ۱۸۷۹ء میں نواب صادق محمد خاں صاحب کو اختیارات حکمرانی عطا ہوئے اور اس موقع پر دربار مسند نشینی کی یادگار میں لاٹ صاحب کے نام پر جنہوں نے بہاولپور آکر فرمانروا کے اختیارات کا اعلان کیا صادق ایجرٹن اسکول کھولا گیا اور اس اسکول کے متعلق شعبۂ دینیات قائم رہا کہ یہ مدارس ایصال ثواب بھی اسی کے ماتحت بنا دیئے گئے اور اس طرح پر ان مدارس کا تمام نظم ریاست کے محکمۂ تعلیم کے ہاتھ چلا گیا۔

چنانچہ اس وقت سے حضرت کا تعلق ملازمت باقاعدہ ریاست سے متعلق ہوا اور اوّل آپ تیس[۳۰] روپیہ ماہوار پر صدر مدرس دینیات رہے اس کے بعد جون ۱۸۸۱ء میں ترقی ہوئی اور پچاس روپیہ ماہوار پر افسر مدارس دینیات مقرر ہو گئے پھر اسی کے فرائض انجام دیتے رہے حتی کہ گیارہ سال پورے ہونے پر جولائی ۱۸۸۹ء مطابق ذی قعدہ ۱۳۰۶ھ میں آپ نے بہاولپور چھوڑ دیا اور حضرت امام ربانی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ کے بعد مولوی نور الدین مرحوم کا اس جگہ ۳ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو تقرر ہوا یہی مدرسۂ دینیات ہے جس میں اس وقت آپ کے بھتیجے مولانا فاروق احمد صاحب سلمہ خلف مولانا صدیق احمد صاحب لکھ رہے

شیخ الحدیث فائز ہیں ۔ حضرت کے قیام بہاولپور کے متعلق حضرت کے ایک مخلص شاگرد رشید مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عزیز بہاولپوری نے مختصر حالات قلمبند فرما کر بھیجے ہیں ۔ جن کو بجنسہٖ درج کرنا مناسب معلوم ہوا ۔

(رقم زدۂ ذلہ ربائے خوان خلیل خاکسار محمد عزیز الرحمٰن عزیز بہاولپوری)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں جس طرح منطق و کلام کے علوم عقلیہ کی تعلیم ہوتی تھی اُسی طرح فقہ اور حدیث اور تفسیر کا درس مکمل ہوتا تھا ۔ نصاب تعلیم دینی وہی نظامی نصاب تھا ۔ جو اُن دنوں تمام ہندوستان کے اعلیٰ مدارس میں رائج تھا ۔ حضرت رح جس شفقت اور محبت کے ساتھ طلبہ کی تعلیم میں مصروف رہتے تھے اس کا اندازہ کچھ وہی خوش نصیب کر سکتے ہیں جن کو اس درس میں شمولیت کا شرف حاصل رہ چکا ہو ۔

راقم کو بھی یہ عزت حاصل ہوئی ہے میں دیکھتا تھا کہ پروانوں کی طرح طلبہ حضرت رح کے شیدا تھے ۔ بعض طلبہ تو تمام وقت تعلیم تک درس میں موجود رہتے اور جو سبق بھی پڑھایا جاتا وہ اس میں شامل ہو جاتے ۔ ان کا منشا صرف آپ کے فیض صحبت اور تربیت عام حاصل کرنے کا ہوتا تھا ۔

زیادہ تر حضرت رح کا وقت درس حدیث میں صرف ہوتا تھا اور حضرت رح کو ہزاروں حدیثیں اور بالعموم صحاح کے احادیث کی سندات تک بر زبان یاد تھیں اور کسی ایک مسئلہ کے متعلق حضرت اپنے حافظہ سے تمام علمی اور مذہبی معلومات کو یکجا بیان فرما دیتے تھے اور یہ ایک خاص ملکہ تھا جو حضرت علیہ الرحمۃ کو قدرت نے عطا فرمایا تھا ۔

عوام پر حضرت رح کے تقدس کا اس قدر اثر ہوتا تھا کہ بے ساختہ تعظیم کے لئے مجبور ہو جاتے تھے مجھے کئی دفعہ حضرت رح کے ساتھ بازار میں سے گزرنے کا اتفاق ہوا تھا ۔ مسلمانوں کا کیا ذکر ہے ہندو دکانداران بھی حضرت رح کی تعظیم کے لئے سر قد کھڑے ہو کر سلام کرتے تھے جس محلہ میں حضرت رح کا قیام رہتا اس محلہ کے پیر و برنا چھوٹے بڑے سب پابند صوم و صلوٰۃ ہو جاتے ۔ اور چھوٹے چھوٹے روز مرہ کے عبادات اور معاملات کے مسائل محلہ کے ناخواندہ لوگ بھی صحت کے ساتھ بتلا سکتے تھے ۔

محلہ کی جس مسجد شریف میں نماز ادا فرماتے تھے اُس میں محلہ کے بوڑھے آدمی بھی تلاوت قرآن کرتے ہوئے نظر آتے تھے مجھے حاجی اللہ صاحب مرحوم کی مسجد میں ایک ستر سالہ نیلگر میاں ولی محمد صاحب مرحوم کا اپنی توتلی زبان سے سورہ عبس و تولی کا تلاوت کرنا اس وقت بھی دل آویز تصور میں آرہا ہے۔

میاں اللہ وسایا صاحب ٹھٹھار اس وقت بھی قریبًا نوّے سال کی عمر میں موجود ہیں جنہوں نے اذان کی صحت الفاظ کا ایسا سچا سبق حضرت علیہ الرحمۃ سے سیکھا تھا کہ اس وقت تک وہ اُن کے الطاف و مکارم کے تذکرہ سے رطب اللسان ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ بہاولپور میں اگرچہ اشاعت علم دین میں ہمہ تن مصروف رہے لیکن اہل بہاولپور کی کم فہمی اور بد ذوقی کے جذبات کو ہمیشہ لا علاج مرض ظاہر فرماتے رہے اور اس لحاظ سے حضرت کی طبیعت کبھی مطمئن نہ ہوئی۔ بالعموم یہ فرمایا کرتے کہ اہل بہاولپور کو میری علمی خدمت سے فائدہ اٹھانے کی رغبت نہیں ہے بلکہ بعض اوقات تو ہمدردی کے رنگ میں مایوسی کا اظہار اس طرح بھی فرمایا کرتے تھے کہ بہاولپور میں علم دین میں ماہر ہونا کسی شخص کی قسمت میں نہیں معلوم ہوتا۔

حضرت کے دس سالہ قیام بہاولپور میں اگرچہ بہت لوگوں نے درس کا استفادہ کیا لیکن آج تک آپ کے کسی شاگرد نے مشعل علم کو روشن رکھنے میں کامیابی حاصل نہیں کی اور کوئی دینی مدرسہ کامیاب نہیں ہوا میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی حضرت کی پیشین گوئی کا نتیجہ ہے آپ کے شاگردوں کی فہرست میں مولوی احمد دین۔ قاضی غوث بخش۔ مولوی محمد محسن۔ سید عبید اللہ شاہ۔ مولوی فیض احمد۔ مولوی سراج الدین احمد پوری۔ مولوی شمس الدین احمد پوری۔ سید فتح شاہ سکنہ ظاہر پیر۔ قاضی خان ساکن خانقاہ گل محمد افغان۔ مولوی کریم بخش۔ سید زمان شاہ خیر پوری۔ مولوی میر محمد جلد ساز۔ سید عالم شاہ۔ احمد مولوی احمد بخش پلیشنر سپرنٹنڈنٹ توشہ خانہ وغیرہم کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان متبحر بزرگوں میں سے کسی ایک نے درس کا شغل اختیار فرمایا ہو۔

اس مختصر فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی شہرت علمی اور کشش روحانی

کے سلسلہ میں افغانستان و ڈیرہ غازی خان تک کے لوگ بھی بہاولپور میں جمع ہو گئے تھے۔ مولوی احمد دین۔ سید زمان شاہ۔ سید عالم شاہ اور مولوی اللہ بخش اس بھی زندہ موجود ہیں۔

اخلاق و عادات کے متعلق مجھے اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ حضرتؒ کا تمام زندگی کا مقصد اشاعت و تعلیم اخلاق نبوی صلے اللہ علیہ وسلم تھا اگر کسی شخص کو کسی فعل یا ترک فعل کے متعلق کوئی حدیث یاد نہ ہو تو وہ حضرتؒ کے عمل کو دیکھ کر حدیث کا مضمون حاصل کر سکتا تھا۔

بہاولپور کے بوڑھے بوڑھے نیک دل اہل بصیرت مسلمان اس وقت تک یہ کلمات دہراتے ہیں کہ حضرتؒ کے عہد مبارک میں دینداری اور اسلام کے صحیح مسلک پر چلنے کا پورا موقعہ اور اسوۂ حسنہ موجود تھا اسکے بعد پھر وہ نظارہ کبھی نہیں دیکھا گیا ایجرٹن اسکول ترقی کرتے کرتے کالج بن گیا اور مدرسہ دینیات کو بھی ترقی کے منظر نصیب ہوئے کوشش کی گئی کہ حضرتؒ تعلیم کے وقت کرسی پر تشریف رکھا کریں اور طلبہ بنچوں پر بیٹھکر پڑھیں۔ مگر حضرتؒ نے اس امر کو گوارا نہ فرمایا اور وہی مؤدبانہ طریق برابر جاری رکھا۔ جو علماء سلف کا رائج تھا۔

ایک دفعہ بہاولپور کے ایک افسر اتہار نے حضرتؒ کی مع خدام افطاری کے لیے دعوت کی اور اس موقعہ پر صاحب دعوت نے تمام اعیان وارکین ریاست کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور فواکہۃ جمع کیئے اور کرسیوں پر نشست کا انتظام تھا۔ کھانے اور پینے کا تمام سامان میز ول پر سجا ہوا تھا اکثر مدعو شدہ اصحاب اور ارکین آچکے تھے اور اپنے اپنے موقعہ پر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرتؒ تشریف لائے۔ انتظام نشست کو دیکھکر ایک طرف دری پر بیٹھ گئے جو زمین پر بچھی ہوئی تھی اور فرمایا کہ اسلام میں کھانے پینے کا طریق یہی ہے کہ فرش پر بیٹھکر کھایا جائے۔ میز و کرسی کی ضرورت نہیں پھر کس کی ہمت تھی کہ کرسی پر بیٹھا رہے لہذا تمام صاحبان حضرتؒ کے گرد آبیٹھے اور ایک خلاف سنت فعل سے حضرتؒ کے عمل نے سب کو محفوظ کر لیا

حضرت کو اپنے شاگردوں اور ارادت مند عزیزوں کا ہر جگہ خیال رہتا تھا آخری ایام میں جبکہ حضرت مدینہ طیبہ میں تھے تو وہاں سے بھی اس ناچیز غلام اور دامن گرفتہ کو خاص محبت نامہ سے یاد فرمایا اور ارشادات روحانی سے ممتاز فرماتے رہتے تھے۔ منقول۔

مولوی نظام الدین صاحب ایک عالم فقیہ بہاولپور میں مشہور تھے حضرت کی علمیت وذکاوت کا شہرہ سن کر ایک مرتبہ شرح وقایہ لے کر آئے اور کہا مجھے استفادہ کے طور پر کچھ دریافت کرنا ہے اور شرح وقایہ کھول کر ایک جگہ ترکیب دریافت کی اور دوسری جگہ شبہۃ الفعل اور شبہۃ المحل کے متعلق دریافت کیا کہ اول الذکر کا کیوں نہ اعتبار کیا اور ثانی الذکر کو معتبر کیوں مانا؟ حضرت فرماتے تھے کہ اس سے قبل نہ میں نے دونوں کا فرق معلوم کرنے کی طرف توجہ کی تھی۔ اور نہ شرح وقایہ پڑھائی تھی۔ اس لئے ذرا تامل کیا اور پھر ان کو جواب دیا کہ فعل حادث پر دلالت کرتا ہے اور محل استقرار پر لہٰذا شبہ محل کا اعتبار ہوا اور شبہ فعل کا اعتبار نہیں ہوا۔ اس کے بعد مجھے فکر ہوئی کہ نہ معلوم جواب درست ہے یا غلط اس لئے مولوی شمس الدین صاحب کے کتب خانہ میں کہ ان کو ہر فن کی کتب جمع رکھنے کا شوق تھا شرح وقایہ کے متعدد حواشی تلاش کئے اور ایک حاشیہ میں بعینہٖ یہی جواب نکل آیا جو میں نے دیا تھا۔ مولوی نظام الدین صاحب سے آپ کی علمی استعداد کے متعلق کسی نے دریافت کیا تو فرمانے لگے علم تو بہت زیادہ نہیں کہ ابھی تو عمر ہیں مگر تیز اور سمجھدار البتہ بہت ہیں۔ حضرتؒ اپنی طرز اسلاف اور وضعداری میں نہایت پختہ تھے کہ کوئی بڑی سے بڑی ہستی آپ کو روک نہ سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء میں جب شعبۂ دینیات کا تعلق ایجرٹن کالج سے ہوا تو تعلیم کے لئے کالجوں کے دستور کے موافق میزیں اور کرسیاں بچھائی گئیں۔ مگر حضرتؒ نے اس کو قبول نہ کیا اور صاف انکار کر دیا کہ شعبۂ دینیات پرنسپل کی ماتحتی میں ہو اس سے مجھے بحث نہیں مگر پڑھانے کے لئے مجھے کرسی پر اور پڑھنے کے لئے طلبہ کو بنچوں پر بیٹھنے کے لئے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ اسی وقت آپ کے لئے درس گاہ میں دری کا فرش اور اس پر قالین بچھایا گیا اور آپ بطریق اسلاف اس پر بیٹھ کر درس دیتے رہے۔ ایک مرتبہ لارڈ ڈفرن کالج دیکھنے آئے اور ان کو معلوم ہوا کہ یہاں عربی مدرسہ بھی ہے چونکہ اس کو عربی سے دلچسپی تھی اس لئے حضرت کے کمرہ کی طرف بھی آیا وہاں دری کا فرش تھا اور کسی نے کہہ دیا تھا کہ یہاں مذہبی تعلیم ہوتی ہے۔ اس لئے جوتے

پہن کر اندر جانا منع ہے ، لہٰذا دروازے پر کھڑا ہو گیا ۔ حضرت دروازے تک تشریف لائے اور باتیں ہونے لگیں ۔ آخیر میں اس نے پوچھا کہ آپ نے کہاں تعلیم پائی ہے ۔ یہ سوال کچھ ایسے طرز پر تھا جو حضرتؒ کو ناگوار گذرا ۔ اور مدرسۂ دیوبند اس وقت گورنمنٹ کی نظروں میں ایک خاص رنگ رکھتا تھا اس لئے غصہ کی وجہ سے آپ کی آواز بھرا گئی اور آپ نے جوش کے ساتھ فرمایا کہ میرا سلسلۂ تلمذ دیوبند کے ساتھ وابستہ ہے ۔

مولوی احمد الدین صاحب حضرتؒ کے پرانے شاگرد ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں اس وقت ضلع ڈیرہ غازی خاں میں پڑھا کرتا تھا کہ حضرت کے تبحر علمی کی شہرت سنی اور اس لئے میں حدیث شریف حضرت سے پڑھنے کے لئے بہاولپور آیا اس وقت آپ کے متعلقہ اسباق میں جلالین شریف ترمذی شریف اور توضیح تلویح تھی ۔ چنانچہ حاضر خدمت ہوا اور شرف تلمذ سے بہرہ یاب ہوا ۔ انہیں کا بیان ہے ایک بار حدیث کا سبق ہو رہا تھا کہ آپ پر غنودگی طاری ہوئی جو دیر تک رہی طلبہ کی خاصی تعداد موجود تھی ، سب کو اس وقت نیند کا تعجب بھی ہوا مگر تھوڑی دیر بعد حضرتؒ بیدار ہو گئے اور فرمایا الحمد للہ اس وقت دربار نبوی میں حاضر تھا اور دیر تک باتیں ہوتی رہیں مسائل حدیث شریف پیش تھے ۔

مدرسۂ دینیات جس کے آپ صدر مدرس تھے جب ریاست سررشتۂ تعلیم کی ماتحتی میں آ گیا تو اتفاق سے ایک شیعہ مذہب سید چراغ شاہ آپ کے افسر ہو گئے اور چونکہ اپنے آپ کو مذہبی امور کا واقف و متبحر سمجھے ہوئے تھے ۔ اس لئے جب حضرتؒ مدرسہ کے کسی کام کی خاطر ان کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ مذہبی فقہ جعفریہ کے اہلسنت پر اعتراضات شروع کر دیتے اور حضرتؒ ان کو جواب دیتے رہتے تھے ۔ جب حضرت نے دیکھا کہ ان کی عادت ہی یہ ہو گئی تو بعض لوگوں کی معرفت آپ نے ان سے کہلایا کہ میرا آپ کا معاملہ ہے افسری اور ماتحتی کا اور میں دینی معاملہ میں آپ کی رعایت نہ کروں گا ۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ اس معاملہ میں گفتگو نہ فرمایا کریں لیکن انہوں نے

اس طرف توجہ نہ کی اور آخر آپ نے میرزا ابراہیم علی صاحب وزیر اعظم کی خدمت میں اپنا استعفا پیش کر دیا۔ وزیر صاحب نے وجہ دریافت کی تو آپ نے صاف کہدیا کہ سید چراغ شاہ صاحب مذہبی چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آتے اور مجھے انکی افسری کے سبب ضروریات مدرسہ کے لئے اُن کے پاس جانا ضرور ہے جواب دوں تو اُن کی طرف سے مضرت دنیا کا اندیشہ اور خواب دوں تو دینی نقصان اور منصب کے خلاف ہے اس لئے یہی مناسب معلوم ہوا کہ عزت آبرو کے ساتھ علیحدگی اختیار کر لوں۔" وزیر صاحب نے آپ کو چراغ شاہ کی ماتحتی سے نکال لیا اور استعفا نامنظور کر کے آپ کو اپنے کام پر بحال رکھا اس طرح پر آپ تعلیم کے مشغلہ میں مطمئن و دل نہاد ہو گئے مگر چراغ شاہ کو آپ سے دشمنی بڑھ گئی اور وہ آپ کو نقصان پہنچانے کی فکر میں رہنے لگے ادھر چونکہ مذہبی چھیڑ چھاڑ سے آپ کی تیز طبیعت اس طرف متوجہ ہو چکی تھی لہذا آپ نے خارج وقت میں کتب شیعہ کا مطالعہ شروع کر دیا اور پھر رد شیعہ میں ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا نام "ہدایات الرشید" رکھکر طبع اور شائع کر دیا کہ چراغ شاہ بھی اس کو دیکھ کر چراغ پا ہو گئے۔ یہ بے نظیر کتاب اس مبحث میں حضرتؒ کی بہترین یادگار اور اس کی چٹکیاں لینے والی دلچسپ عبارت آپ کی نوجوان طبیعت کا نمونہ ہے جو اس وقت نایاب ہے اور قیمتاً اس کا کوئی نسخہ بھی دستیاب نہیں ہو سکتا۔

اسی اثنا میں ایک اور واقعہ پیش آگیا کہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کے پیر صاحب نے اپنے مرید کی بیوی کو گھر میں رکھ لیا اور اس کا مقدمہ انہیں ڈائرکٹر کی عدالت میں گیا کہ وہ جیف جج بھی تھے مثل برائے تحقیقات و حکم شرعی مدرسہ دینیات میں حضرت کے پاس بھیج دی گئی اور وہ پیر صاحب اس زعم میں کہ مجوز ان کا مرید اور حضرت کا افسر ہے خود حضرتؒ کے پاس آئے اور دوسروں کو سفارشی بھی لائے کہ ان کی جاہ کا لحاظ بھی رکھا جائے۔ مگر حضرتؒ نے اس معاملہ میں گفتگو ہی کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ تحقیق کے بعد جو حکم شرعی ذہن میں آئے گا اس کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شرعی ذمہ داری ہے اس میں کسی کی رعایت و جنبہ داری حرام ہے۔ اس پر

پیر صاحب بہت ناراض ہوئے اور جج صاحب سے طرح طرح کی شکایات کر کے ان کو بھڑکایا۔ ابھی یہ شورش فرو نہ ہوئی تھی کہ ایک اور فتنہ کھڑا ہوا کہ حضرتؒ تعطیل رمضان میں وطن گئے ہوئے تھے آپ کے پیچھے براہین قاطعہ یہاں پہونچی اور اگلی آگ میں چنگاری کا کام دے گئی۔ دشمنوں کو آپ کے خلاف شور مچانے کا موقع ملا اور عوام و خواص میں طرح طرح کی بدگوئی و عناد کا پھیلاؤ ہونے لگا۔ بالآخر فرمانروائے بہاولپور کی خدمت میں بھی یہ عرضداشت پیش کر کے کہ مولوی خلیل احمد بد دین اور کافر ہے اور براہین میں حق تعالیٰ کو نعوذ باللہ کاذب کہتا ہے اس پر آمادہ کیا کہ ان مسائل میں مولوی خلیل احمد صاحب سے مناظرہ کرایا جائے۔ چنانچہ حضرتؒ کو ریاست کی طرف سے ایام تعطیل ہی میں دعوت مناظرہ دی گئی اور بذریعہ رجسٹری شدہ خط آپ کو جلد بہاولپور بلایا گیا۔

مشورہ کے لئے حضرتؒ گنگوہ حاضر ہوئے اور آخر یہ طے پایا کہ یہاں سے مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی، مولانا عبدالحق صاحب پوری اور مولوی محمد مراد صاحب وغیرہ کو ساتھ لے کر بہاولپور جانا اور مناظرہ ضرور کرنا چاہیئے کہ انشاءاللہ فتح اہل حق کی ہے۔ چنانچہ آپ ان حضرات کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے اور جس وقت ملتان پہونچے کہ اس وقت بہاولپور کا یہی راستہ تھا تو بعض لوگ بہاولپور کے ملے اور انہوں نے ڈرایا کہ نواب بہاولپور با اختیار فرمانروا ہیں اور ان کو لیگا مشتعل ہے کہ انہوں نے طے کر لیا ہے کہ ان ہندوستانی مولویوں کو توپ سے اڑا دیا جائے یہ سن کر اول تو باقتضاء بشریت کچھ اضطراب ہوا مگر آخر یہی قرار پایا کہ شہید ہونا اس سے بہتر ہے کہ اظہار حق سے فرار کرنے والے کہلائیں۔ لہٰذا حسبنا اللہ ونعم الوکیل کہہ کر آگے روانہ ہو گئے اور بہاولپور پہونچ کر نواب صاحب کو اطلاع دے دی کہ ہم مناظرہ کرنے کے لئے آ گئے ہیں اور ہر طرح مستعد و تیار ہیں۔ چنانچہ ۲ جون ۱۸۸۹ء مطابق ۱۲ شوال ۱۳۰۶ھ کو نواب صاحب کی کوٹھی میں اول تحریری اور پھر تقریری مناظرہ چار دن ہوا اور نواب صاحب کے پیر غلام فرید صاحب حکم قرار

پائے۔ مناظرہ کی مفصل روداد ایک مستقل کتاب ہو جائے گی اور یہاں سوانح حضرت میں صرف یحیٰی درج ہیں وہ دلیرانہ طرز ظاہر کرنا ہے جس کی وجہ سے آپ سید المناظرین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس لئے اخبار نظام الملک مرادآباد مطبوعہ ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ کی وہ تحریر شائع کرتا ہوں جو ایک منصف شریک مناظرہ نے مولوی غلام دستگیر قصوری کی اس تحریر کے جواب میں شائع کی جس کی سرخی یہ تھی ۔

خلیل احمد عمدا را گفت کاذب + دلیل آورد از خلف المواعید

اور بجائے اس کے کہ حکم کی طرف سے باقاعدہ فیصلہ جو تحریر و تقریر فریقین سے منتج ہوا شائع ہوتا یا ادھر کے تحریری و تقریری دلائل کا جواب بحوالہ کتب معتبرہ دیا جاتا بہاری تحریر کا خلاصہ یہ تھا کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی بھی جو کہ مشہور و معروف وہابی اور رئیس غیر مقلدین ہے یہی کہتا ہے کہ مولوی خلیل احمد اس کا چیلا ہے لہٰذا کافر اور وہابی ہے " اس تحریر پر طلبا کے اور نام کے مولویوں اور مساجد کے اماموں اور واعظوں کے دستخط کرا دئے تھے جس سے عوام سمجھیں کہ ریاست کے سلمنے مولوی تکفیر پر متفق ہیں۔ اس تحریر ذیل سے فہیم شخص مسائل مختلفہ فیہا کی ابحاث فریقین کو بالاجمال سمجھ سکتا ہے کہ مباحثہ مسائل خلف وعید بشریت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وسعت علم ملک الموت و شیطان مجلس میلاد مروجہ اور رسم فاتحہ مروجہ کے متعلق تھا جن کی تفصیل براہین قاطعہ میں مذکور ہوئی ہے ؛

مولانا صدیق احمد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب تحریری مناظرہ کے لئے سوالات ہمارے پاس آئے تو ہم نے ایک ایک سوال بانٹ لیا اور اعلمیت کا مسئلہ میرے حصہ میں آیا جس وقت ہمارے جوابات گئے اور فریق ثانی کے علماء نے دیکھے تو ہم نے وہاں کے معتبر آدمیوں سے سنا کہ کہتے تھے جوابات بہت زور کے اور کافی شافی ہیں لہٰذا مناظرہ کا رخ بدل لنا اور تحریری کو تقریری بنانا چاہیئے کہ رعب حکومت مانع تکلم ہوا اور تقریر میں بھی صرف امکان کذب کو لیا جائے کہ اس میں گنجائش ہے اور عوام کے بھڑکنے کا بھی اچھا موقع ہے " چنانچہ ۱۸ جون سہ شنبہ کو اُسی کوٹھی

پر اراکین سلطنت اور خواص ملک جمع ہوئے اور غلام دستگیر نے اپنی بلا بیچارے سلطان محمود کے سر ڈال دی کہ صبح سے ۱۲ بجے دوپہر تک مولانا خلیل احمد صاحب کی وہ شیرانہ گفتگو ہوئی جس کو سُن کر سارے حکام اور وکیل و بیرسٹر بھی دنگ ہوگئے چنانچہ تحریر ذیل میں سب بالاجمال مذکور ہے :۔

(ضمیمہ اخبار نظام الملک مراد آباد مطبوعہ ۲۵ اگست ۱۸۸۹ء)

(از مردان شریک جلسہ)

غلام دستگیر ار کافرم خواند — چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمان گفتمش اندر مکافات — دروغے را جزا باشد دروغے

حامداً و مصلیاً اُن حضرات کی خدمت میں جن کو فہم و انصاف خداداد حصہ ملا ہے عرض ہے کہ فتوای مندرجہ صادق الاخبار بہاولپور مورخہ ۱۱ جولائی ۱۸۸۹ء جس کے سوال و جواب کی تالیف مولوی غلام دستگیر قصوری کے فہم و قلم سے ہوئی ہے آپ صاحبوں نے بھی ملاحظہ فرمایا ہوگا اور اس کی صحت و غلطی پر اطلاع پائی ہوگی لیکن چونکہ میں مولوی خلیل احمد صاحب کا ہم عقیدہ اور بہاولپور کے مناظرہ میں شریک تھا اس لئے مختصراً میری بھی گذارش سن لیجئے۔ خلاصہ مضمون فتوی یہ ہے خلیل احمد اور اس کے ہم عقیدہ اہل سنت سے نہیں فرقہ وہابیہ اسمٰعیلیہ سخت بے ادبوں سے ہیں جن سے ہندوستان وغیرہ میں غیر مقلد اور نیچری شاخیں نکلی ہیں۔ اہل اسلام اہل سنت و جماعت کو ان سے اجتناب واجب ہے) بحمد اللہ تعالیٰ جب ہم عقائد اہل اسلام اہل سنت پر ثابت القدم راسخ الجنان ہیں اور نہایت وثوق اور ان پختہ دلائل سے ثابت کرتے ہیں جن کی مخالفین میں سے کوئی تردید نہیں کر سکتا کہ ہمارے اعتقادات سراسر مطابق اعتقادات اہل سنت ہیں تو ہم کو اس کی کچھ شکایت نہیں کہ مولوی غلام دستگیر اور ان کے اتباع ہم کو اہل سنت سے خارج بتلائیں یا کافر فرمائیں کیونکہ اول تو یہ سنت قدیمہ ہے کہ اہل حق اور اہل اللہ کے اس قسم کے لوگ دشمن ہوا ہی کرتے ہیں اور حق کہنے والوں کو بُرا کہا ہی کرتے ہیں یہ کوئی نیا طریقہ نہیں جیسے علماء ربانیین کی فہرست ہاتھ میں لے کر اول سے آخر تک دیکھ جاؤ کوئی ایسا نہ نکلے گا جو ان کی زبان

طعن اور سہام لعن سے بچا ہو۔ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم بلکہ جملہ صحابہ و اہل بیت و ازواج مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو خیال کر لیجئے اور دیکھئے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسے لوگوں کی طعن و ملامت اور لعن و مذمت سے محفوظ رہا ہے؟ ائمہ مجتہدین کے ساتھ ان لوگوں کی زبان نے کیا کیا کچھ سلوک کئے۔ خصوصاً امام الائمہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو کیا کچھ سب و شتم کیا۔ اولیاء امت کی کہاں تک نوبت پہونچائی جس نے زبان سے کچھ حق نکالا جھٹ اُس کی تکفیر کی۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور امام غزالی۔ اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانی اور ابو مدین مغربی وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا حال دیکھ لیجئے کہ اُن کی کہاں تک توہین و تکفیر کی محدثین اُمت کو دیکھ لیجئے اُن کے ساتھ انہوں نے کیا مہربانیاں فرمائیں۔ امام بخاری کے ساتھ کیا کیا۔ نسائی کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ ان سب کو رہنے دو انبیاء صلوات اللہ علیہم کے حالات کو دیکھ لو کہ ان کے ساتھ انہوں نے کیا کیا۔ دور کیوں جاتے ہو حضرت فخر عالم سید وُلد آدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی حال احادیث میں ٹٹول کر دیکھ لو اور نہیں تو قرآن شریف میں ہی تلاوت فرما لو حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتا ہے وکذٰلک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضہم الی بعض زخرف القول غرورا ولو شاء ربک ما فعلوہ فذرہم وما یفترون ط اور تو اور خدا تعالیٰ سے بھی تو نہ چوکے پھر اگر ہماری حق گوئی اور اتباع سُنت نبوی پر اُنہوں نے ہم کو بھی کچھ فرمایا تو ہم کو ہرگز کچھ شکایت نہیں۔ بلکہ ہمارا فخر ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ ہم کو ہمارے آباء معنوی کی میراث ملی اور ہمارے مخالفوں نے اپنے آبائے روحانی کی ارث کو اختیار کیا ع

میراث پدر خواہی علم پدر آموز

الحمد للہ ثم الحمد للہ رضینا قسمۃ الجبار فینا۔ دوسرے یہ کہ بحکم احادیث صحیحہ ثابت ہے کہ یہ کلمہ وہ کلمہ ہے جو قائل کی طرف ہی عود کیا کرتا ہے جبکہ وہ شخص جس کے حق میں کہا گیا ہو اس کا مستحق نہ ہو چنانچہ ارشاد ہے فقد باء بہ احدہما اور بحمد اللہ تعالیٰ نہ جماعت اہل سنت و جماعت سے ہم جدا ہیں نہ دائرۂ اسلام سے خارج اور نہ ہمارا

کوئی عقیدہ عقائد اہل سنت کے مخالف تو یہ سب سب وشتم اور تضلیل وتکفیر مولوی غلام دستگیر کی طرف ہی لوٹتی ہے اور بموجب حدیث صحیح کے وہی اس تمام طعن ولعن کا مورد قرار پاتا ہے نہ ہم تیسرے یہ کہ اس تکفیر وتضلیل میں تمام متکلمین اور سب فقہاء محدثین جو عموم قدرت باری تعالیٰ کے قائل ہیں شامل ہو گئے۔ پس جب ہم اُن کو اپنا پیشوا سمجھتے ہیں تو اگر وہ بھی گمراہی میں پڑے ہیں تو ہم بھی سہی مرگ انبوہ جشنے دارد " تو جب غلام دستگیر نے سب اکابر اہل سنت کو اہل سنت سے خارج کر دیا تو اس اہل سنت ہونے سے جس کو غلام دستگیر تسنن کہتا ہے ہم بھی تحاشی کرتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ مفتی کون؟ غلام دستگیر۔ اور مسئلہ کونسا؟ عموم قدرت باری تعالیٰ۔ سبحان اللہ یہ منہ اور مسور کی دال، خدا کی قدرت کہ مسئلہ قدرت میں اور غلام دستگیر ہماری تکفیر کرے۔ قیامت آئے جب وہ موٹے موٹے اور ظاہر ظاہر مسائل سمجھنے سے عاجز ہے تو ایسے باریک مسائل میں اس کی فہم نارسا کیونکر رسائی پا سکتی ہے۔ یہ غلام دستگیر وہی غلام دستگیر ہے جو چند روز ہوئے ریاست بہاولپور کی میونسپل کمیٹی میں محرر تھا۔ آج آپ علامۃ الدہر بن بیٹھے۔ اس کی ہمیشہ کی عادت ہے کہ ایسی ہی چالاکیوں سے کارروائی کیا کرتا ہے جو علماء کی شان کے علاوہ عوام اراذل سے بھی نہایت بعید ہیں۔ مناظرہ بہاولپور کا صحیح صحیح قصہ جو ایک بڑے مجمع کثیر اور جم غفیر میں ہوا اول ان معتبر لوگوں سے سن لیجئے جو اس میں شریک تھے اور دیکھئے کہ اس میں حضرت کی کیسی گت ہوئی۔ پھر اس فتوے کو صادق الاخبار میں درج کرایا ہے اس کے مطابق کیجئے۔ آپ کی ایمانداری واضح ہو جائے گی مناظرہ بہاولپور کا حال اس وقت مجملاً اور مختصراً عرض کرتا ہوں۔ مولانا خلیل احمد صاحب وسط رمضان سخت موسم گرمی میں نہایت عجلت اور تقاضہ کے ساتھ بتحریک غلام دستگیر مناظرہ کے لئے بہاولپور بذریعہ تار برقی وخطوط رجسٹری طلب ہوئے۔ ۲۱ رمضان کو مع رفقاء وہاں پہونچے۔ وہاں پہونچنے پر جوش مناظرہ تو فرو ہوا لیکن غلام دستگیر اور اس کے رفقاء کی آتش عناد نے دوسری طرح اشتعال پایا۔ جب ان مکر اور حیلوں میں ناکامی رہی تو ۳ شوال کو پہلا جلسہ مناظرہ جناب میاں صاحب میاں

غلام فرید صاحب مرشد حضور سرکار عالی دام اقبالہ و ملکہ کی کوٹھی میں منعقد ہوا تمام ارکین ریاست جمع ہوئے فریقین بالمقابل بیٹھے۔ ہماری طرف سے شرائط مناظرہ پیش ہوئیں کل تیرہ شرطیں تھیں۔ منجملہ ان کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ فریقین کی تقریریں قلمبند ہوا کریں جو مجلس میں بالاتفاق منظور ہوئی اور ایک یہ بھی شرط تھی کہ جو منصف اور حکم مقرر ہو وہ علوم عقلیہ و نقلیہ فرعیہ و اصلیہ میں مزاولت تامہ رکھتا ہو اور اس پر فرض ہوگا کہ فریقین کے دلائل پر بدلائل شرعیہ فیصلہ لکھے جس فریق کے دعوے یا دلیل کی تصحیح کرے بدلائل کرے اور جس کی تغلیط کرے بدلائل تغلیط کرے۔ بلادلیل اس کا قول ہرگز قبول نہ ہوگا۔ غلام دستگیر کہتا تھا کہ جناب میاں صاحب منصف و حکم ہیں اس شرط کی کیا حاجت ہے۔ کیا تم پیر صاحب کے حکم ہونے سے منکر ہو؟ مولانا خلیل احمد صاحب کہتے تھے کہ ہاں ہم کو پیر صاحب کے ادنیٰ خادم کا منصف ہونا قبول ہے مگر بشرطیکہ فیصلہ بدلائل شرعیہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ اس موقع میں تو پیر صاحب کی منصفی پر اس قدر زور ڈالتے ہو اور ان مسائل میں جن میں تم خود میاں صاحب کے مخالف ہو ان میں جناب میاں صاحب کی منصفی کو منظور نہیں کرتے۔ بعد شرائط غلام دستگیر نے تحریری مناظرہ کو مناسب وقت سمجھ کر سات اعتراضات پیش کیے جو ساڑھے آٹھ ورق پر لکھے ہوئے تھے اور چاہا کہ مجلس میں پڑھ کر سنائے۔ مولانا نے کہا کہ مجلس وعظ نہیں ہے مجلس مناظرہ ہے۔ مناظرہ تحریری ہوگا یا تقریری اگر تحریری مناظرہ ہے تو اسی مجلس میں وقت مقرر پر تحریری سوال و جواب کیجئے اور زبانی ہے تو زبانی سوال کیجئے زبانی جواب لیجئے اس سے تو غلام دستگیر نے انکار کیا اور پڑھ کر سنانے پر اصرار کیا۔ آخر مولانا نے کہا اچھا اگر آپ سناتے ہیں تو ہم کو اجازت ہو کہ ہم اعتراض کریں گے اس کو بھی منظور نہ کیا۔ مولانا نے کہا کہ اس صورت میں ہمارا بیٹھنا فضول ہے۔

چنانچہ ارکین نے اس کو منظور فرمایا اور کہا کہ آپ جائیں بعد میں آپ کے پاس بھیج دیئے جائیں گے۔ آپ چار روز میں جواب لکھ دیں۔ مولانا نے یہ قبول کیا اور کہا کہ مجلس

میں ہمارے جواب بھی اسی طرح سنائے جائیں گے۔ اس کو اراکین نے قبول فرمایا اور
ہم چلے آئے چار روز کے عرصہ میں اجمالی اور تفصیلی جوابات لکھے۔ مجموعہ کی تعداد تقریباً
چار سو پندرہ ۱۵ جز تھی پانچویں روز دوسرا جلسہ منعقد ہوا۔ چونکہ تفصیلی بات زیادہ
بسیط تھے اس لیئے اراکین نے اجمالی جوابات کو سننا قبول کیا۔ لیکن غلام دستگیر
مجلس میں نہیں آیا اور عذر کیا کہ جب انہوں نے ہمارے سوالات نہیں سُنے تو ہم
اُن کے جوابات نہیں سُنتے۔ مولانا نے کہا کہ ہم نے تو اس لیئے نہیں سُنے تھے کہ ہم کو
اعتراض کرنے کی اجازت نہ تھی۔ جب ہم آپ کو اعتراض کرنے کی اجازت دیتے ہیں
تو ان کو اب کیا عذر ہے۔ اراکین نے بھی اس پر بہت زور دیا کہ غلام دستگیر مجلس میں
شریک ہو مگر غلام دستگیر ایسے کاہے کو تھے مجلس میں نہ آنے پر نہ آئے۔ مگر مولانا نے
اپنا اجمالی جواب مجلس میں خوب دھڑلے کے ساتھ پڑھکر سنایا اور بعد اختتام پکار کر
کہہ دیا کہ جس کا دل چاہے اس پر اعتراض کرے ہم جواب دیں گے۔ علماء نواح بہاولپور
نے غلام دستگیر کے معاونین مولوی عبدالرشید۔ مولوی غلام نبی۔ مولوی سلطان محمود
مولوی الہ بخش وغیرہم سب شریک جلسہ تھے۔ مگر کوئی کچھ نہ بولا۔ بعض اراکین کی طرف
سے اصرار ہوا کہ یہ جوابات میاں صاحب کے حوالہ کردو۔ چونکہ وہ صرف مسودہ تھا اس
لیئے مولانا نے یہ کہا کہ تا وقتیکہ ہم اس کی نقل نہ کرلیں۔ اُس کو ہم نہیں دے سکتے
اور بڑی خیر ہوئی کہ وہ تحریر نہیں دی تھی ورنہ باقی مناظرہ کے اوراق کی طرح
اس سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے اور بجز افسوس کے کچھ نہ ہاتھ آتا۔ غرض اُس
وقت مولانا اپنی تحریروں کو سنانے کے بعد واپس لے کر چلے آئے اور پانچ روز
کی مہلت اراکین نے عنایت کی کہ اس عرصہ میں نقل کرکے جوابات دے دو
چھٹے روز جواب بعد نقل بھیج دیئے۔ اب غلام دستگیر نے سوچا کہ معاملہ دگرگوں ہو
گیا۔ اس تحریر طویل الذیل کا سمجھنا اور جواب لکھنا تو درکنار اس کا اوّل سے آخر تک
پڑھنا ہی دشوار ہے۔ آٹھ ورق پر سوال تو کتنے ایام کی جانکاہی میں کھینچ کر کے لکھے
تھے پھر اس تحریر کے جواب لکھے جائیں تو مہلت کا عرصہ درکار ہے۔ اس لیئے دوسری چال

پہلے اور زبانی مناظرہ ٹھہرایا۔ مولانا نے بلا اصرار قبول کیا۔ تیسرا جلسہ زبانی مناظرہ کے لئے منعقد ہوا۔ تمام اراکین جناب میاں صاحب کی کوٹھی میں جمع ہوئے۔ فریقین بالمقابل بٹھلا دیئے گئے۔ فریقین کی تقریریں لکھنے کے واسطے بمنظوری اراکین مولوی عبدالمالک صاحب مدرس کالج بہاولپور مقرر ہوئے۔ مولانا نے مولوی غلام دستگیر سے کہا کہ سوال کیجئے تو کہتے کیا ہیں کہ مجھ کو تو جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکا۔ اب میں کچھ نہیں کہتا۔ ہاں مولوی سلطان محمود کچھ سوال کریں گے۔ معلوم ہوا کہ اب غلام دستگیر میدان مناظرہ سے بلطائف الحیل گریز کیا چاہتا ہے۔ اس لئے مولانا نے کہا کہ اصل متخاصمین میں اور آپ ہیں۔ میں صرف آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔ دوسرے کسی کے سوال کا میں جواب نہیں دوں گا۔ اگر آپ کے معاونین میں سے کوئی سوال کرے گا تو میرے رفقاء میں سے اس کا کوئی جواب دے گا۔ ہاں اگر مولوی غلام دستگیر اقرار کرلے کہ میں سوال کرنے سے عاجز ہوں تو پھر جس کا دل چاہے سوال کرے میں ہی جواب دوں گا۔ اس پر بہت کچھ جھلائے تو یہی خیال کیا کہ اب بھی شاید کچھ غیرت آجائے گی اور سوال کرے گا مگر توبہ توبہ سوال کے نام سے اس کا مرغ روح ہوا ہوا جاتا تھا کبھی کہتا تھا کہ حضرت میاں صاحب کا ارشاد ہو تو سوال کروں۔ کبھی بدحواسی میں کہتا تھا کہ مولوی سلطان محمود صاحب ارشاد فرمائیں تو سوال کروں۔ اور اراکین اس کے اس گریز و اغماض سے زچ بچ تھے۔ آخر جب تمام اہل حل و عقد نے اس کو مجبور کیا تو پھر درویش بجان درویش سوال کے لئے تیار کرنے لگا۔ پہلے کچھ دیر تک دعا مانگی (شاید جان بچنے کے لئے ہوگی) حق کے غلبہ کی دعا پر تو ہم نے بھی آمین کہی۔ پھر بستہ کھول کر کچھ کاغذات نکالے اور اُس مناظرہ کی بابت اعتراض کیا جو لاہور میں ۱۹ رمضان المبارک سنہ ۱۳۰۶ھ کو مولوی عبداللہ ٹونکی مدرس یونیورسٹی کے ساتھ مولانا محمود حسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کا ہوا تھا۔ جس کا صحیح خلاصہ یہ تھا کہ مسئلہ امکان کذب کی بابت مولوی عبداللہ سے تذکرہ ہوا انہوں نے کہا میرے نزدیک اس کا قائل دائرہ

اہل سنت سے خارج ہے دلیل طلب کی گئی تو شرح مواقف کا حوالہ دیا جو بحث صفت کلام باری میں مذکور ہے اس پر کچھ امتناع بالذات اور بالغیر کی بابت ذکر چھیڑا تو اس پر مولوی عبداللہ نے کہا کہ مجھ کو مناظرہ منظور نہیں ہے۔ تب یہ کہا گیا کہ یہ محض تحقیق مسئلہ ہے اور مناظرہ نہیں۔ اس سے آپ ناخوش نہ ہوں اور یہ کہا گیا کہ خود شارح مواقف امکان کذب کی تصریح کر دے تب بھی آپ قبول کریں گے؟ اس کو تسلیم کیا۔ چنانچہ شرح مواقف کی عبارت صفحہ ۷۰۹ کی ان کو دکھلائی گئی اس کو دیر تک دیکھا کئے دیکھکر مطلق اس میں چون وچرا نہ کی اور اس کو قبول کر لیا اور کوئی عبارت کسی کتاب مسلم الثبوت وغیرہ کی اس کے مقابلہ میں پیش نہیں کی بلکہ سوائے شرح مواقف کے ذکر کے اور نام تک بھی کسی کتاب کا نہیں آیا۔ اس کی بابت غلام دستگیر نے اپنے سوالات میں غالباً لکھا تھا کہ مولوی عبداللہ نے مسلم الثبوت کی عبارت پیش کر کے خلیل احمد وغیرہ کو ساکت کر دیا۔ اس پر مولانا نے تفصیلی جوابات میں لکھا تھا کہ یہ محض خلاف واقع اور جھوٹ ہے۔

تو اس جلسہ میں غلام دستگیر نے مولوی عبداللہ کے دو خط نکالے اور دیر تک پڑھتے رہے اور کہا کہ دیکھو جناب مفتی عبداللہ صاحب خود تحریر فرماتے ہیں تو میری طرف جھوٹ کو نسبت کرنا خلیل احمد کا محض جھوٹ اور خیانت ہے۔ حالانکہ یہ نہ سمجھے کہ اس صورت میں کذب ان کے مقتدا مولوی عبداللہ کی طرف منسوب ہوگا۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تفصیلی جوابات میں تحفۂ اثنا عشریہ کی عبارت کی نقل میں غلطی کاتب سے نیست کی جگہ است لکھا گیا تھا تو اس پر تحفۂ اثنا عشریہ نکال کر دکھلایا اور کہا کہ دیکھئے خلیل احمد نے نقل میں خیانت کی۔ ان دونوں اعتراضوں کے بیان میں ایک بڑا وقت صرف کیا جس سے تمام اراکین اور سب حضار مجلس مکدر و منغص ہوئے۔ اور حنیف جج صاحب نے غلام دستگیر کو فرمایا بھی کہ اصل مسئلہ میں سوال کرنا تھا کوئی حدیث کوئی تاریخ کوئی منسوخ بیان کرنا تھا۔ اس کے بعد مولوی غلام دستگیر صاحب کی زبان تحریف سے مناظرہ کی بابت کچھ نہ نکلا۔

جب مولانا نے دیکھا کہ تمام اراکین متفق ہوئے تو تھوڑا سا اور غلام دستگیر سے بابت سوال تقاضا کر کے اور تا بدرواز ہ پہونچا کر اور اُس کا عجز و انکشاف کر کے کہا کہ خیر اب میں کہتا ہوں کہ جو شخص سوال کرے گا اُس کا جواب دُوں گا۔ چنانچہ مولوی سلطان محمود ساکن تلیہڑی مناظرہ کے لئے منتخب ہوئے اور مناظرہ کے لئے بالمقابل بیٹھے۔ یہاں سے بانتظام جناب مرزا چندو دہ خاں صاحب مشیر مال عال مولوی عبدالمالک نے تقریریں لکھنی شروع کیں۔ سلطان محمود نے سوال کیا کہ خداوند تعالیٰ کی نسبت اتصاف امکان کذب کے ساتھ آپ کا کیا عقیدہ ہے؟ مولانا نے کہا کہ ممتنع بالذات۔ سلطان محمود نے کہا۔ آپ کی تحریر کے مخالف ہے مولانا نے کہا ہرگز نہیں ہے آپ نے ہماری تحریر کو سمجھا نہیں۔ سلطان محمود نے کہا تشریح کیجیئے۔ مولانا نے کہا کہ صدق اور کذب صفت کلام ہے اور کلام باری تعالیٰ نفسی ہے اور لفظی نفسی جو صفت قدیمہ ہے اُس میں کذب ممتنع بالذات ہے اور کلام لفظی میں ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے۔ آپ کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ کہا ممتنع بالذات طرفین سے دلیل کا مطالبہ ہوا۔ سلطان محمود تو اپنے اثبات مدعا کے لئے کیا دلیل بیان کرتے ہیں۔ مولانا نے آیت ولو شئنا لبعثنا فی کل قریۃ نذیراً الخ پڑھی جس کی تفسیر میں امام رازی نے تفسیر کبیر میں خدا تعالیٰ کی قدرت مثل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر لکھی ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ خلاف معلوم اور خلاف اخبار مقدور ہے جو کہ مستلزم امکان کذب کو ہے۔ سلطان محمود نے کہا کہ لو فرض کے واسطے ہے اور فرض محالات کا بھی جائز ہے۔ مولانا نے کہا کہ میرا استدلال لو سے نہیں ہے بلکہ مشیت سے ہے۔ سلطان محمود نے کہا قدرت اوصاف مشترکہ میں مراد ہے اور اوصاف خاصہ میں مثل پر قدرت نہیں ہے۔ مولانا نے کہا کہ آدم میں صفت اولیت خاص ہے اور شیطان میں بد ترین ہونا وصف خاص ہے تو اُن کے مثل پر بھی قدرت نہیں۔ اسی طرح ہر ایک فرد کی مثل پر قدرت نہیں؟ تو کہا ہاں۔ اور دوسرے امر کا معارضہ کبیر کی دوسری عبارت سے کیا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ خلاف معلوم اور

خلاف اخبار مقدور ہے اور یہ بھی غالباً اُسی جلسہ میں کہا گیا کہ اگر خلافِ علم مقدور نہ ہو تو لازم آوے کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ کو کسی چیز پر قدرت نہ ہو کیونکہ موجودات اور معدومات ممکنہ کا وجود و عدم ایک وقتِ معلوم تک ہے اس سے پیشتر نہ موجود کا معدوم کرنا اور نہ معدوم کا موجود کرنا مقدور ہو تعالیٰ عن ذالک اور نیز عبارت مکتوبات شیخ یحییٰ منیری کی کہ انبیاء کے دوزخ میں ڈال لینے پر قدرت میں لکھی ہے پڑھ کر سنائی۔ شاید غلام دستگیر شیخ کی نسبت تکفیر کرے گا اور کہے گا کہ انہوں نے انبیاء کو دوزخی کہا۔ چونکہ ایک بجے کا وقت قریب آگیا تھا جلسہ برخاست ہوا تیسرے روز پھر چوتھا جلسہ منعقد ہوا۔ چونکہ سلطان محمود پہلے مناظرہ کا ڈھنگ دیکھ چکا تھا اس لیئے اُس روز اُس نے چاہا کہ مبحث کو بدلے۔ مگر خلاف داب مناظرہ چلنے نہ دیا گیا۔ اور گو تیسرے جلسہ کے خاتمہ پر سلطان محمود پر جواب دہی باقی رہتی تھی تو آج اس پر جواب دینا لازم تھا مگر مولانا نے شروعاً اثبات مدعا کے لیئے از سر نو دلائل پیش کیئے اور وہ کل تین دلیلیں تھیں۔ پہلی دلیل یہ تھی۔ کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ کلام نفسی میں کذب ممتنع بالذات ہے لیکن کلام لفظی میں ممکن بالذات ہے کیونکہ کلام لفظی وہ ہے جو مرکب الفاظ سے ہو اور جو مرکب الفاظ سے ہو وہ حادث ہے اور جو حادث ہے وہ ممکن ہے۔ وہ بحکم آیت اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔ داخل تحت قدرت ہے تو کلام لفظی باقسامہ داخل تحت قدرت ہے۔ پھر ہر ایک مقدمہ کا ثبوت شرح عقائد نسفی سے کر دیا۔ اس دلیل کو سُن کر جو کیفیت سلطان محمود اور اس کے رفقاء غلام دستگیر وغیرہ کی ہوئی تھی وہ قابل دید تھی۔ بہرکیف اُس کے جواب میں ساکت محض ہوئے اور اس دلیل کو کسی طرح نہیں توڑ سکے۔ گھبرا کر یہ کہا کہ ہم شکل اول نہیں جانتے۔ امکان کذب کو کسی کتاب سے ثابت کیجئے۔ مولانا نے چند بار پکار کر یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ صاحبوں میں سے کوئی میری دلیل کے کسی مقدمہ کو باطل کر دیں گے تو میں اپنی دلیل سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ مگر کوئی کچھ نہ بولا۔ دوسری دلیل یہ تھی کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ اب ہم پوچھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو اس

کے خلاف پر قدرت ہے کہ نہیں، وہ مشرک کو بخش سکتا ہے یا نہیں، جناب میاں صاحب نے فرمایا ہاں بخش سکتا ہے۔ تو مولانا نے کہا کہ یہی امکان کذب ہے۔ اس پر سلطان محمود اور غلام دستگیر باتفاق بولے کہ خدا تعالیٰ مشرک کو نہیں بخش سکتا ہے۔ اور غلام دستگیر نے جلدی سے جلالین منگائی اور ادھر اُدھر لوٹ پوٹ کر اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے اور کتاب رکھدی۔ مولانا نے کتب کلامیہ سے مشرک کی مغفرت کا مقدور ہونا ثابت کر دیا۔ آخر جب کچھ بن نہ پڑا تو گھبرا کر کہنے لگے کہ اس سے آپ نے فعل میں کذب ثابت کیا اور دعویٰ اثبات کذب فی القول تھا۔ مولانا نے کہا سبحان اللہ یہی تو اس قول ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ میں جو کہ جملہ خبریہ ہے کہہ رہا ہوں۔ کہنے لگے نہیں صاحب آپ تو کذب فی الفعل ثابت کرتے ہیں۔ اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے جواب کس حالت میں آدمی سے صادر ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہا کہ امکان کذب کتاب سے ثابت کیجئے۔ جب مولانا دو قوی دلیلوں سے اپنا مدعا ثابت کر چکے تھے تو اب اُن پر لازم نہ تھا کہ موافق فرمائش کے بھی ثابت کرتے مگر تبرعاً یا یہ خیال کہ آپ کے دل میں حسرت اعتراض باقی نہ رہ جاوے اس لئے اس کو منظور کر کے تیسری دلیل شرح مواقف سے پیش کی یعنی وہ عبارت جو صفحہ ۷۰۹ مطبوعہ نولکشور پر مذکور ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شارح معتزلہ و خوارج کی طرف سے اعتراض کرتا ہے کہ امکان کذب فی الخبر اور خلف فی الوعید لازم آتا ہے اور وہ محال ہے۔ پھر اُس کا جواب دیتا ہے قلنا لا نسلم استحالته کیف وہما من الممکنات التی یشملہما قدرة اللہ تعالیٰ یعنی ہم اُس کا استحالہ تسلیم نہیں کرتے کیونکہ کذب فی الخبر اور خلف فی الوعید اُن ممکنات سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی قدرت شامل ہے۔" اس کے جواب میں سلطان محمود نے دو کتابوں کی عبارتیں پیش کیں جن کو وہ شرح عقائد جلالی اور اُس کا حاشیہ ابوالحسن شہید کہتے تھے غالباً اُن کا مضمون یہ تھا کہ کذب نقص ہے اور نقص خدا پر محال ہے تو قول سید شریف ممنوع ہے۔" مولانا نے کہا کہ اولاً یہ اعتراض سید شریف پر وارد نہیں ہوتا کیونکہ سید شریف بحث کلام میں تصریح کر چکے ہیں کہ قبح فی الفعل جس سے معتزلہ اُس

کے امتناع پر استدلال کرتے ہیں اور نقص فی الفعل میں کچھ فرق نہیں ہے۔ تو نقص فی الفعل سے اہل سنت کا اس کے امتناع پر استدلال کرنا اصول اہل سنت کے خلاف ہے۔ دوسرے باہم مطابقت بھی ہو سکتی ہے کہ دوانی کا قول کلام نفسی پر محمول ہو اور سید شریف کا قول کلام لفظی پر جہاں تک میرا حافظہ شہادت دیتا ہے اس تقریر کا کوئی جواب ان کی طرف سے نہیں دیا گیا۔ یہاں تک فریقین کی تقریریں قلمبند ہوتی رہیں۔ چونکہ ۱۲ بجے کا وقت آ گیا تھا اراکین نے اٹھنا چاہا۔ اٹھتے اٹھتے سلطان محمود نے اعتراض چہارم کی تقریر کی لیکن وہ لکھی نہیں گئی کیونکہ وہ محض غل اور شور میں ہوئی تھی۔ چند منٹ ہو کر مجلس برخاست ہوئی اور پھر کوئی مناظرہ نہیں ہوا۔ یہ مجملاً بہاولپور کے مناظرہ کا نقشہ ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم بعد میں جوابات اجمالی اور تفصیلی بھی شائع کریں گے۔ لیکن یہ بلفظہ مناظرہ جس طرح تحریر ہوا تھا اس لئے ہم نہیں لکھ سکے کہ جو مناظرہ مولوی عبدالمالک صاحب لکھتے تھے ہم نے اسکی نقل لینے کی درخواست بخدمت جناب میر ابراہیم علی صاحب و جناب سید غلام مرتضیٰ شاہ صاحب کی تھی۔ اور انہوں نے ہم کو اس کی نقل کی اجازت دے دی تھی اور وہ کاغذات سرکاری طور پر بتوسط جناب مرزا چندو خاں صاحب جناب میاں صاحب کی خدمت میں محفوظ رہتے تھے۔ اور جناب سید غلام مرتضیٰ شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ کل صبح کو کسی کو بھیج دینا نقل کر کے دے جائے گا۔ دوسرے روز مولانا خود مع چند طلبہ دولت خانہ پر بخدمت جناب شاہ صاحب گئے اور نقل کے لئے کہا۔ جناب شاہ صاحب نے براہ مہربانی اسی وقت آدمی بھیج کر جناب میاں صاحب کے ایک خلیفہ کو بلایا اور کاغذات مناظرہ کے لانے کے واسطے حکم کیا۔ چنانچہ وہ گیا اور واپس آ کر یہ جواب لایا کہ جناب میاں صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس کاغذات نہیں ہیں خلیل احمد کا آدمی بچتا تھا اسی کے پاس ہوں گے۔" میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آیا واقعی یہ میاں صاحب کا ہی جواب ہے بلکہ کچھ عجب نہیں یہ بیچ میں حضرت غلام دستگیر ہی کی کارروائی ہو۔ بہرکیف اس وقت سے مایوسی ہوئی کہ وہ تحریرات غائب غلہ ہوئیں ہمارے

ہاتھ نہ آئیں گی۔ تو اب ہم کو شکر کا بڑا موقعہ ہے کہ بدون نقل جوابات اجمالی اور تفصیلی حوالہ نہیں کر دئیے گئے تھے ورنہ وہ بھی اسی طرح غائب غلہ ہوتے لیکن یہ تو سب جانتے ہیں کہ مولوی عبدالمالک نے سرکاری طور پر مناظرہ کو لکھا تھا جس کے منتظم جناب مرزا جندوڈہ خاں صاحب تھے پھر اگر وہ خود ہی اس کو شائع کر دیں تو بہتر ہے تاکہ تمام ہندوستان میں ہر ایک کو معلوم تو ہو جائے کہ حقیقت کس کی جانب ہے اور مناظرہ میں غلبہ کس کو ہے؟ مگر جس میں اُن کی مغلوبیت ثابت ہو اُس کو تو وہ کیونکر شائع کر سکتے ہیں۔ لیکن الحمد للہ اہل عقل کے نزدیک اُس کا چھپا لینا اور غائب کر دینا بہ نسبت اظہار کے زیادہ صریح دلیل مغلوب ہونے کی ہے لو کانوا یعقلون یہی وجہ ہوئی کہ غلام دستگیر نے صادق الاخبار میں کیفیت مناظرہ کا نام تک نہ لیا اور نتیجہ مباحثہ کے نام سے فتوے شائع کرایا چہ خوش کجا مباحثہ؟ کجا یہ فتوے کجا اس کا نتیجہ مباحثہ ہونا کجا اظہار حق؟ عجب امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی امثل ہے ع

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا ۔ الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا

یہ خیال کیا ہوگا کہ اُن کے دلائل کا جواب جن کے مقابلہ میں سر مجلس جواب نہیں آیا تھا اس موقع پر بھی نہ بن پڑے گا تو اب مناظرہ کا ذکر کرنا اپنے مدعا میں کھنڈت ڈالنا ہے اس لئے اُس کا نام ہی نہ لو۔ رہا یہ کہ اگر یہ فتوے جس پر جناب میاں صاحب کی تصدیق ہے اگر بالفرض اُن کی طرف سے ہی سمجھا جائے اور خیال کیا جائے کہ یہ اُن کی طرف سے فیصلہ ہے تو تاوقتیکہ یہ فیصلہ حسب شرائط بدلائل صحیحہ مدلل نہ ہو اور تمام دلائل کا مفصل جواب نہ ہو ہرگز قابل اعتبار کے فیصلہ نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ خود دلائل مرقومہ غلط ہوں۔ اس صورت میں میاں صاحب کی تصدیق کافی نہیں کیونکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جناب میاں صاحب کو دھوکہ دے کر دستخط کرالئے گئے۔ سوالات میں طرح طرح کی چالاکیاں کی ہیں۔ دلائل میں بہت کچھ خرافات بھری ہے پہلی دلیل جو تمام رسائل میں جاری کی یہ ہے کہ یہ مسئلہ موافق [illegible] مولوی اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ کے ہے یہ خود واہیات اور پوچ ہے ان کی موافقت و مخالفت کو بتلانا

وحقیقت میں کچھ دخل نہیں ہے وہ خدا کے بھی وحدہ لا شریک لہ ہونے کے قائل ہیں تو اس کا بھی انکار کیجئے، چوری و شراب خوری و جہل و ظلم سے معارضہ بھی کم فہمی سے ناشی ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ غلام دستگیر کے نزدیک خدا کی قدرت کا بندہ کی قدرت سے زائد ہونا اور خدا کے مقدورات کا بندہ کے مقدورات سے زائد ہونا ضروری نہیں حالانکہ یہ کلیہ مسلّمہ اہل کلام ہے جو مقدور العبد ہے وہ مقدور اللہ ہے۔ اگر اس کا انکار کرتے ہو تو خود اہل سنّت سے خارج ہو۔ ہم تحقیقی جواب دیتے مگر خوف طوالت سے ترک کرتے ہیں اور صاحب معتقد المنتقد نے جو یہ خرافات بکی کہ قال کبیرهم کذبه واتصافه سبحانہ بهذه النقیصة لیس محالا بالذات الخ محض افترا اور کم فہمی ہے۔ ہرگز کوئی اتصاف بالنقیصہ کا قائل نہیں ہوا من ادعی فعلیہ البیان۔ شرح فقہ اکبر کی عبارت ومنها ان وصف اللہ تعالٰی بالقدرة علی الظلم الخ ثبوت مدعا میں بے سمجھی پر دال ہے ظلم کا تحقق اللہ تعالٰی کے حق میں ممکن نہیں۔ تو عقلاً محال ہوا تو اس کا امکان بھی عقلاً ممتنع ہوا لیکن کذب کا محال عقلی ہونا ممتنع ہے بلکہ وہ محال شرعی ہے اور محال شرعی کے امکان کو محال عقلی کہنا بجز غلام دستگیر جیسے علامۃ الدہر کے کسی دوسرے عاقل کا تو کام نہیں ہے۔ لیجئے آپ کے دلائل کی تو ترکی تمام ہوئی اب کہیئے اہل سنّت سے تم خارج ہو یا ہم؟ انصاف کی آنکھیں اگر ہوں تو ذرا ملاحظہ کیجئے غلام دستگیر کے مقتدا مولوی مفتی صدر الدین اور امام رازی وغیرہ امکان نظیر فخر عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے قائل ہیں۔ کیوں صاحب پھر وہ بھی اہل سنّت سے خارج ہیں؟ مماثلت نفس بشریت کی تردید میں تفسیر کبیر کی عبارت سے استدلال سراسر خبط ہے۔ کبیر کی عبارت ہمارے ہرگز مخالف نہیں ہم قبول کرتے ہیں کہ تواضعاً ارشاد فرمایا بایں ہمہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نفس بشریت میں مماثلت ہے کیونکہ بالاتفاق انسان اور بشر کلی متواطی ہے اور جزئیات میں عوارض کا فرق یقیناً ہے۔ انبیاء تو انبیاء رہے عوام میں بھی باعتبار عوارض زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کوئی عورت کوئی مرد کوئی صاحب خصائل حمیدہ کوئی صاحب اوصاف ذمیمہ کوئی اندھا کوئی بینا،

جبان گونگا۔ کوئی بینا مرد شجاع بلیغ۔ کوئی ولی اللہ کوئی کافر۔ لیکن یہ فرق بعوارض نفس انسانیت میں برابر ہے کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی قلل انداز نہیں سمجھتا اور اُس کو کلی مشکک نہیں کہتا۔ چنانچہ اگر ولی اللہ کافر کو کہے کہ میں تجھ جیسا ہوں یا بینا اندھے کو کہے یا جبان شجاع کو کہے یا مرد عورت کو کہے تو باعتبار نفس بشریت کے واقعیت پر محمول ہوگا اور باعتبار عوارض کے تواضع پر۔ پس آپ نے ہمارا مطلب نہیں سمجھا اور نہ تفسیر کبیر کا ہی مطلب سمجھا اسی طرح تیسرے جواب میں بھی تنقیص شان حضرت فخر عالم صلے اللہ علیہ وسلم ہماری طرف نسبت کرنا جہالت ہے۔ ہمارے کلام اور ہمارے اعتقاد میں افضلیت فخر عالم صلے اللہ علیہ وسلم جمیع مخلوقات سے ثابت و محقق ہے۔ لیکن ہاں ہم حضرتؐ کو حق تعالیٰ کی کسی صفت میں شریک نہیں کرتے اور بعلم محیط عالم الغیب نہیں جانتے۔ اگر اس لئے ہم اہلِ سُنّت سے خارج ہیں تو ایسا اہلِ سُنّت ہونا غلام دستگیر اور اُس کے رُفقاء کو ہی نصیب رہے ؎

کار شیطان میکند نامش ولی ۔ گر ولی اینست لعنت بر ولی

خود آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتا کہ غیر کو خدا تعالیٰ کی صفت میں شریک کرتا ہے تو خدا تعالےٰ کی تنقیص شان نہ ہوئی؟ مگر مبتدعین زمانہ کے نزدیک خدا تعالیٰ کی تنقیص کچھ چیز ہی نہ ہو۔ علاوہ ازیں یہ غلام دستگیر اپنے سوالات میں امکان کذب کو مورد لعنت اللہ علی الکاذبین کا قرار دیتا ہے جس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ معاذ اللہ تمام انبیاء تمام اولیاء تمام شہداء تمام اقطاب وابدال بلکہ خود بھی مورد لعنت اللہ علے الکاذبین کے ہیں تو کیا سب کو ملعون بنانا تنقیص اور توہین شان رفیع اُن کی نہیں ہے۔ غلام دستگیر کے پیر و مرشد مولوی غلام محی الدین صاحب اپنے حلیہ میں فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک کو ایک جانور کی گردن کے مماثل و مشابہ فرماتے ہیں " بنوع گردن آہو مثال " تو پھر تمہارے پیر نے بھی توہین و تنقیص شان کی۔ اُن کو بھی اہلِ سُنّت سے نکالو۔ یہ تھے ادریا کجویں اور چھٹے جوابات ہیں ہمارا مدعا صحیح نقل کیا نہ کوئی دلیل ذکر کی تو ان کا اس موقع پر ذکر کرنا خود لغو ہے مگر

اس قدر لکھنا ضرور ہے کہ عموماً مجلس میلاد مبارک کی حرمت کو ہماری طرف نسبت کرنا محض جھوٹ اور افترا اور بہتان ہے۔ باقی جن امور محدثہ کو ہم نے ناجائز کہا ہے اگر کچھ حوصلہ ہے تو اُن کا استحسان ثابت کرے۔ پھر کالم صفحہ ۴ سطر ۶ میں لکھتا ہے۔ (ناحق اُن کی غیبت اور بہتان پر کمر باندھلی) اسی صفحہ کے اسی کالم کی سطر ۲۳ و ۲۴ میں لکھتا ہے (اور ان کی غیبت اور بہتان بندی کریں) لفظ غیبت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عیوب اُن میں موجود ہیں اور بہتان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ عیوب ان میں موجود نہیں۔ لیکن اگر ان عیوب کو ان میں جانتے ہو۔ مگر غیبت سمجھ کر اُن کا ذکر منع کہتے ہو تو تمہارے تمام محدثین پر یہ اعتراض ہے ورنہ غیبت کہنا غلط ہے اور اگر بعض کی نسبت غیبت اور بعض اخیر کی نسبت بہتان کہنا مراد ہے تو ذرا تفصیل فرمایئے کہ کون سے عیوب کی نسبت غیبت ہے اور کون سے کی نسبت بہتان۔ پھر بایں ہمہ روایات کا اعتراض قائم۔ اور یہ بھی خیال ہے کہ ماشاء اللہ بڑے عالم ہیں غیبت اور بہتان کو عجب نہیں ایک ہی سمجھے ہوں اور عطف تفسیری ہو۔ پھر اب ذرا اُن لوگوں کا حال بھی سن لیں جن کو غلام دستگیر نے عوام کے فریب دینے کے لئے علماء ظاہر کیا اور ان سے جس فتوے پر دستخط کرا لئے اوّل جناب میاں صاحب کہ بچپن میں کچھ کتابیں صرف و نحو کی پڑھی تھیں پھر فقیری کی طرف متوجہ ہوئے اب محض خاندانی درویش ہیں مولوی عبد الرشید بسبب شدت ضعف اور کثرت امراض کے ان کی فہم ہی سلیم نہیں پھر مسائل دقیقہ معقولیہ و کلامیہ سے محض ناآشنا۔

میاں نبی بخش اویسی کہ عربی عبارت تک نہیں پڑھ سکتے۔ میاں احمد دین اویسی کہ ابتدا میں ناقص طالب علمی کی تھی اب وہ بھی سالہا سال سے نہ رہی محمود اویسی محمد دین۔ یہ دونوں چھوٹے بھائی میاں احمد دین کے ہیں۔ یہ بیچارے طلبہ کی بھی شمار میں مشکل ہو سکتے ہیں۔ غلام نبی یہ مولوی عبد الرشید سے بھی بدرجہا کم ہیں۔ حافظ غلام مصطفے اخان۔ غلام دستگیر کے پیر بھائی خفیہ صورت مگر منیہ اور قدوری سے زیادہ نہیں جانتے اور معتبر ذریعہ سے سنا گیا تھا کہ اپنے صاحبزادہ کی رعایت میں

جھوٹی شہادت دلوانے تک پر آمادہ تھے۔ حکیم عبدالحق پیر فرتوت بجز طبابت کے علوم معقولیہ و دینیہ سے اجنبی۔ قادر بخش واعظ علوم عربیہ سے جاہل محض اور اہیں پر طماع و لالچی۔ غوث بخش۔ سراج احمد۔ سید زمان شاہ۔ انہوں نے بخوف جبر و اکراہ دستخط کئے جب دیکھا کہ مولوی گل محمد اور سید علی اور شاہ عالم نکالے گئے پھر تحقیقات مسائل دقیقہ میں ان کی استعداد محض ناکافی۔ غلام احمد۔ عزیز الدین گھڑی ساز۔ محمد امین فارسی خوان کہ ان کی استعداد عربی ہرگز ایسی نہیں جو کتاب سے ایسے مسائل سمجھ سکیں۔ یہ حال ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اس پر دستخط کئے ہیں۔ اگر کسی کو شک ہو تو ان کا حال دیکھ لے۔ میں حیران ہوں کہ مولویوں کا تمام خاندان باقی تھا۔ نور احمد۔ سعید اللہ۔ فیض احمد۔ فضل احمد۔ سعید اللہ۔ کریم اللہ۔ ادہر مفتیوں کا خاندان ادھر محمد امین کا خاندان۔ حکیم عبدالحق کا خاندان۔ ان سب کے دستخط کیوں نہ کرا لیے اور زیادہ وثوق و اعتبار بڑھتا۔ بلکہ جب دستخط کے واسطے علم شرط نہیں رہا تو دستخط کنندوں کی مستورات کے دستخط کیوں نہ کرا لیے۔ پر اس علامہ دستگیر کی ہمیشہ کی چالاکی ہے کہ دھوکہ دہی کے واسطے ایسا ہی کیا کرتا ہے۔ پھر اس میں تو ایک یہ بھی کاریگری کی ہے کہ بعض دستخطوں میں جعل اور تحریف بھی ہوئی ہے۔ مثلاً سنا ہے سراج احمد نے لکھا تھا "میں بسبب کثرت مشاغل کتب متعلقہ مسائل متنازع فیہا کو نہیں دیکھ سکا۔ چونکہ معاملہ دین نازک ہے لہذا مجملاً لکھتا ہوں کہ جس شخص کے عقائد مخالف عقائد اہل سنت کے ہیں وہ مذہب باطل پر ہے (العبد سراج احمد)" پس یہ حال اس کے فتوے کا ہے اور یہ کیفیت اس کے تصدیق کنندوں کی ہے۔ پھر اس سے دینی کو حج بیت اللہ کے برابر بلکہ راجح کہتا ہے۔ ہاں اس وجہ سے تو بیشک حج بیت اللہ پر راجح ہے کہ ستر روپیہ کی رقم ہاتھ لگ گئی۔ یہ نعمت تو لاکھ حج مبرور سے بھی اُس کے نزدیک بڑھ کر ہوگی۔ اس پر وہ مثل صادق آتی ہے خسر الدنیا والاخرۃ۔ سبحانک وبحمدک اشہد ان لا الٰہ الا انت اتوب الیک۔ اس تحریر میں ہم نے بہت سے مدارج کا مجمل بیان کیا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ کسی وقت ہم اس کو تفصیل سے ظاہر کریں گے بلکہ عجب نہیں یہ مسئلہ پولیٹیکل ہو جائے

اور غلام دستگیر ہم کو مجبور کرے کہ ہم گورنمنٹ کو اس طرف متوجہ کریں۔ فقط

فن مناظرہ بالخصوص ردّ روافض ورد بدعات میں حضرت کو ید طولیٰ تھا۔ آپ کی عادت نہ تھی کہ خود مناظرہ کی دعوت دیں یا چھیڑ چھاڑ کریں۔ مگر جب دوسرے فریق کی طرف سے وزن دیا جاتا تو اس وقت آپ شیر بن کر سامنے آتے اور مخالف کو چھوٹوں بھی یہ کہنے کا موقع نہ دیتے کہ مناظرہ سے بھاگ گئے۔ فریق مخالف نے آپ کی ضروریات وقتیہ اور تنگی و دشواری حالات مشغول کر اس کی تدبیر کی کہ اس وقت آپ مناظرہ نہ کر سکیں گے اور علی قرار کا الزام لگا کر اپنے معتقدین میں اپنی کامیابی کا شور مچانا نصیب ہوگا۔ مگر آپ نے ہمیشہ اس جال کو سمجھا اور موقع ہی نہ دیا کہ آپ کی حقانیت پر کوئی دھبہ آئے۔ ایک مرتبہ آپ سفر حج سے واپس آرہے اور اہل راندیر کے اصرار پر ایک دن کے لئے راندیر ٹھہر گئے۔ چند مبتدعین نے جو کہ پہلے سے ٹھہرے ہوئے تھے اس شب ملا جس کی صبح کو آپ چلنے والے تھے شور مچایا کہ مناظرہ کر لو۔ ہر چند کہ آپ چار مہینے سے سفر کا تعب اٹھا رہے تھے۔ اہل وعیال کا ساتھ تھا۔ وطن پہونچنے کی عجلت تھی۔ روانگی کی اطلاع آپ جگہ جگہ دے چکے تھے اور یہی فریق مخالف کی نیت تھی کہ مناظرہ کی دعوت پر لامحالہ جواب دیں گے کہ دوسرا وقت مقرر کرو۔ مگر آپ نے کسی ضرورت کی پروا نہ کی اور پہلی ہی تحریک پر کہلا بھیجا کہ وطن کی روانگی ملتوی کرتا ہوں اور منظور ہے شرائط میں بھی دیر لگانا نہیں چاہتا۔ جو شرط چاہو طے کرو اور میں کل صبح ۸ بجے جائے موعود پر پہنچ جاؤں گا۔" ادھر آپ نے احباب کو رفع انتظار کے لئے خطوط بھیج دئے چنانچہ بندہ کے نام بھی یہ خط آیا۔ مکرم مولانا مولوی عاشق الٰہی صاحب مدفیوضکم۔ السلام علیکم۔ آج ۲۰ ربیع الاول ۱۳۲۴ھ کو قصد روانگی یہاں سے تھا۔ مگر یہاں کے مبتدعین کی تحریک سے مولوی ظہور الحسن رامپوری نے دعوت مناظرہ دی لہذا آیندہ روانہ ہونے کے لئے آج قیام کیا۔ چنانچہ بحمد اللہ مبتدعین ذلیل ہوئے۔ اب کل ۲۱ ربیع الاول ۱۳۲۴ھ یوم چار شنبہ ۷ بجے فجر کو یہاں سے پنجر میں روانگی ہوگی اطلاعاً عرض کیا گیا۔ فقط و السلام خلیل احمد عفی عنہ از راندیر۔

صبح حسب وعدہ جب آپ مقام مناظرہ پر پہونچے تو میدان خالی تھا اور وہ گمشدہ

انتظار کے بعد معلوم ہوا کہ فریق مخالف کا تورات ہی سے پتہ نہیں۔ چنانچہ آپ منبر پر آ گئے
اور دیر تک مسائل اختلافیہ کی تقریر کی اور یہ بھی فرمایا کہ ابھی وقت پر موقوف نہیں جس
وقت بھی میری ضرورت ہو میں مستقل سفر کر کے حاضری کے لئے تیار ہوں۔

مولوی فاروق احمد صاحب انبہٹوی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ سفر حج کو جاتے
ہوئے راستہ میں مولوی دیدار علی الوری کی طرف سے آپ کو عین اُس وقت دعوت مناظرہ
دی گئی جبکہ آپ جہاز میں سوار ہونے کو تیار تھے۔ آپ کے رفقاء نے جواب دے دیا کہ اس
وقت تو گنجائش نہیں کہ جہاز تیار اور آخری ہے البتہ واپسی پر مناظرہ ہوگا۔ مگر آپ نے
سُنا تو بے ساختہ فرمایا کہ نہیں نہیں ہم تیار ہیں۔ کل کو ہم قیام کریں گے اور صبح کو مناظرہ
ہوگا۔ مولوی صاحب سے کہا کہ مقام اور مباحث مناظرہ آج طے کر لیں۔ اور رفقاء کی
طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ مولوی صاحب مناظرہ کرتے ہیں تو ہمیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ حج
بشرط زندگی دوسرے سال کر لیں گے۔ یہ بھی تو ایک دینی کام ہے۔ یہ جواب سُن کر فریق
ثانی پر اوس پڑ گئی اور کوئی میدان مناظرہ میں نہ آیا۔ حضرت چند روز قیام فرما کر
بمبئی روانہ ہو گئے۔ حالانکہ جہاز کی تاریخ روانگی گذر چکی تھی مگر اتفاق سے جہاز کو
چار دن کسی غیر معمولی عذر سے ٹھیرنا پڑ گیا اور آپ اس پر سوار ہو کر عرب پہونچ گئے۔

تقریر اور تحریر دونوں قسم کے مناظرہ میں آپ کو ملکہ تامہ تھا مگر اخیر عمر میں ضعف
دماغ کی وجہ سے آپ طویل تقریر پر قادر نہ رہے تھے اس لئے اپنے کسی خادم یا دوست
کو مناظر بنا کر کھڑا کر دیتے اور خود پاس بیٹھ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اخیر نومبر ۱۹۲۰ء کو امروہہ
میں جو مشہور مناظرہ روافض کے ساتھ ہوا اس میں مولانا عبد الشکور صاحب کو مناظر بنا کر
آپ نے کھڑا کیا اور خود جلسہ کے پورے وقت میں پاس بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ اثناء تواریخ
مناظرہ یعنی ۳۰ نومبر مطابق ۱۸ ربیع الاول آپ کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب
قدس سرہ کے سانحہ انتقال کی اطلاع ملی مگر آپ میدان مناظرہ کو صرف اس لئے نہ چھوڑ
سکے کہ فریق مخالف فرار پر محمول کر کے مخلوق پر اپنا رنگ جمائے گا۔ آخر جب فریق مقابل
خائب و خاسر ریل میں سوار ہو لیا تب آپ امروہہ سے چلے۔

اسی طرح اہل کوہ لینڈھور نے ایک مرتبہ آپ کو قادیانیوں سے مناظرہ کے لئے بلایا تو آپ فوراً روانہ ہو گئے اور مولوی محمد یحییٰ صاحب سہسرامی کو کہ مدرسہ کے مدرس تھے مناظر بنا کر کھڑا کیا اور خود پاس بیٹھے رہے۔ اس تحریری مناظرہ میں چونکہ وسعت تھی اس لئے رعشہ کی وجہ سے خود لکھنا دشوار تھا کاتب کو پاس بٹھا کر جامع مانع تحریر لکھوا کر بھیج دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے مولانا عبدالشکور صاحب اڈیٹر النجم کو یہ تحریر بھیجی اور باوجودیکہ آپ خصوصی طور پر مخاطب نہ تھے مگر احقاق حق کے لئے مضطرب ہو کر از خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی کہ النجم میں شائع کر دیں۔

حامداً و مصلیاً۔ از بندہ خلیل احمد عفی عنہ بگرامی خدمت مکرم و محترم مولانا مولوی عبدالشکور صاحب دامت مکارمکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ۔ آپ کے اخبار میں ایک عرصہ سے جناب سید مصطفیٰ حسین صاحب شیعی کے سوالات اور اُن کے جوابات شائع ہو رہے ہیں۔ یہ حاضر کا النجم دیکھکر مجھ کو بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ میں بھی اس بحث میں شامل ہوں۔ شاید میری قسمت یاوری فرمائے اور مجھ ناچیز کی گذارش حضرت سید صاحب کے لئے تشفی بخش ہو کر سید صاحب کے رجوع الی الحق کا سہرا میری ہی تحریر کے سر بندھے۔

لہٰذا بذریعہ النجم اول سید صاحب کی خدمت میں نہایت ادب کے ساتھ مستدعی ہوں کہ جناب نے تبدیل مذہب کے متعلق اہل سنت کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ اگر مجھکو تشفی بخش جواب ملیگا تو میں سُنی ہو جاؤنگا۔ اور اہل تشیع سے فرمایا تھا کہ میرے سوالات کا آپکی طرف سے اگر تشفی بخش جواب نہ ملیگا تو میں سُنی ہو جاؤنگا۔ اگرچہ اہل سنت کا جواب بھی تشفی بخش نہ ہو۔

امر اول کے متعلق التماس ہے کہ جس قدر جوابات لکھے گئے وہ تشفی بخش تھے یا نہیں اگر تشفی بخش تھے تو حسب وعدہ تبدیل مذہب کا اعلان شائع فرما دیجئے اور اگر تشفی بخش نہیں ہوسکا اور آپ اپنے وعدہ تبدیل مذہب پر سچے دل سے ثابت قدم ہیں اور یہ وعدہ محض سرسری نہیں ہے تو میں خدمت عالی میں ملتجی ہوں کہ اس دفعہ پھر مکرر اپنا وعدہ تبدیل مذہب براہ بندہ نوازی اس عنوان سے النجم میں شائع کرا دیجئے کہ میں سید مصطفیٰ حسین شیعی گورنمنٹ آف انڈیا وارڈس خدا تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر بلا تورِیہ و تقیہ سچے دل سے اقرار کرتا ہوں کہ اگر اہل سنت میں سے کسی نے میرے سوالات

کا جواب تشفی بخش دیا تو میں فوراً سنی ہو جاؤں گا۔

اور امر دوم کے متعلق یہ مضمون شائع فرمادیں کہ میں جو سوالات خدمت میں علماء شیعہ کے اس سے پیشتر جواب کے لئے پیش کر چکا ہوں اور عرض کر چکا ہوں کہ اگر تشفی بخش جواب نہ ہوا تو سنی ہو جاؤں گا حضرات ابھی تحریر جواب میں عجلت نہ فرمادیں تاوقتیکہ میں اس کے بعد دوسری دفعہ اپنے سوالات شائع نہ کردوں۔

بندہ ناچیز اپنی تحریر کے آخر میں چند سوالات بھی مبحث خلافت کے متعلق بشوق لکھے گا۔ بجائے اپنے ان سوالات کے وہ سوالات جو میں پیش کروں گا اپنے شیعہ علماء کی خدمت میں بھیج کر جواب تشفی بخش مانگیں اور تحریر فرمادیں کہ اگر جواب تشفی بخش نہ ہوئے تو میں بحلف شدید وغلیظ بلا تقیہ و تورّیہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں سنی ہو جاؤں گا۔ اگر غیر تشفی بخش واقعی ہونے کی صورت میں اپنے وعدہ سے ذرا بھی انحراف کروں تو مجھ پر اس جھوٹ اور عہد شکنی کی پاداش میں خدا تعالیٰ قوی وعزیز کی وہ لعنت ہو جو ابلیس و یزید اور تمام اشقیاء پر ہو چکی ہے یا قیامت تک ہونے والی ہے۔

اگر حضور نے میری ناچیز استدعا کے موافق اعلان شائع کر دیا تو بحول اللہ وقوتہ میں پوری سعی کروں گا کہ آپ کے سوالات کے تشفی بخش جواب پیشکش کروں اور مجھ کو حسب وعدہ صادقہ امام علیہ السلام پورا یقین ہے کہ مجھ کو میرے پروردگار کی طرف سے مزید تائید تلقین ہوگی اور علماء فریقین انشاء اللہ تعالیٰ بے اختیار کہہ اٹھیں گے کہ یہ جواب تشفی بخش ہے اور اگر آپ نے حسب استدعا نیازمند یہ اعلان شائع نہ فرمایا تو اجتماعاً جو اس کا شرمناک نتیجہ پیدا ہوگا وہ آپ خود دیکھ لیں گے۔ جناب مولانا عبدالشکور صاحب از راہ بندہ نوازی سید صاحب کے اس اعلان کو خاص طور پر اہمیت کے ساتھ اپنے اخبار میں شائع فرمادیں اور دیگر اخبارات میں بھی درج کرا کر تمام دنیا کو اس مناظرہ کی طرف متوجہ فرمادیں۔ اور اس عاجزانہ تحریر کو اپنے اخبار کے کسی گوشہ میں جگہ دے کر بندہ کی عزت افزائی فرمادیں۔ فقط۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ ابتدا میں تقریری مناظرہ سے میری طبیعت ڈرتی اور نا

بالخصم کے سامنے بیٹھکر مرعوب ہو جایا کرتی تھی۔ میں نے اپنے حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ایک صحابی کا قصہ حدیث میں آتا ہے کہ وہ گھوڑے پر سوار نہ ہو سکتے تھے۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دُعا دے کر اُن کو گھوڑے پر بٹھایا تو اس کے بعد وہ اعلے درجہ کے شہسوار ہو گئے" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ کے تصرفات اُمور طبیعیہ پر بھی اثر کرتے ہیں۔ لہذا حضرت میرے لئے دُعا فرما دیں کہ میرا ضعف قلب جاتا رہے اور میں مناظرہ کے وقت خصم سے مرعوب نہ ہوں" آپ فرماتے تھے کہ اس کے بعد وہ ضعف قلب ایسا رفع ہوا کہ کیسا ہی بڑے سے بڑا مولوی کسی اہل باطل کا سامنے آیا مگر مجھے اتنا بھی معلوم نہ ہوا جتنا ایک سمجھدار شاگرد سامنے بیٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور مناظرہ کے لئے دل بہت ہی کھل گیا الحاصل بہاولپور کا مناظرہ اس شان سے ختم ہو لیا کہ حضرت غیر ملکی بھرے مجمع میں ایسے زور سے تقریر فرما رہے تھے جیسے شیر دھاڑتا ہے اور آخر فریق ثانی کے بیان کئے ہوئے مقدمہ کی آپ نے گرفت فرما کر باواز بلند کہا کہ یہ عین مذہب معتزلہ ہے اللہ کی شان کہ آپ ہم کو معتزلہ بنا رہے تھے تو ہم ہی معتزلہ بن گئے ع

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

یہ سن کر سارا مجمع مبہوت ہو گیا اور مناظر کو آدھ گھنٹہ ساکت بیٹھے گذر گیا۔ سید چراغ شاہ جو بڑا ہوا لئے کمرہ میں ٹہل رہے تھے بار بار دانت پیستے اور رانوں پر ہاتھ مار رہے تھے کہ افسوس مقابلہ کے لئے کوئی ہندوستانی نہ ہوا کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے یہ خفت و ندامت آپ کے ساتھ مزید عداوت کا سبب بن گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو استعفاد دینے پر مجبور کیا گیا۔ آپ خود ہی بہاولپور سے بیزار تھے یہ تو صرف احقاق حق کا قصہ تھا کہ خود مختار ریاست میں دشمنوں کی قوت کا اندیشہ کئے بغیر آپ مناظرہ کے لئے چلے آئے تھے۔ لہذا آپ نے استعفاد دے دیا۔ مگر چند افسروں کی وہ دلی کدورت جو دینی معاملات میں آپ کی طرف سے بڑھ گئی تھی آپ کو جسمانی تکالیف پہنچانے کی تحریک کر رہی اور اس سے اُن کو غافل بنائے ہوئے

تھی کہ ع دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است ۔ آخر دنیا نے اس کو دیکھا اور سن لیا کہ فرعون بادشاہ مصر ہو کر موسیٰ علیہ السلام کا کبھی بال بیکا نہ کر سکا ۔ چنانچہ تھانیدار کے نام حکم آیا کہ آپ کو گرفتار کر لیا جائے مگر خود تھانیدار ہی نے اس وقت جبکہ آپ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے آپ کو اس کی اطلاع دے دی ادھر آپ کے ایک دوست مولوی احمد کتب فروش احمد پوری نے اس خفیہ کارروائی سے مطلع ہو کر آپ کے پاس یہ آیت شریفہ لکھ کر بھیجی ان الملأ یأتمرون بک لیقتلوک فاخرج انی لک من الناصحین ۔ چنانچہ آپ شب ہی میں روانہ ہو کر اسٹیشن پر آئے اور آخر شب میں جو گاڑی روانہ ہوتی تھی اس پر سوار ہو گئے ۔ مولانا محبت علی صاحب وغیرہ اکثر احباب آپ کو اسٹیشن پر پہنچانے کے لئے ساتھ آئے ۔ اگرچہ بعد میں حکام کو اطلاع پہنچنے پر ان سے باز پرس ہوئی مگر انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور آپ کے بعد عرصہ تک وہ حضرات ریاست میں ملازم و عہدہ دار رہے ۔

بریلی کا قیام

آپ کا بہاولپور سے آنا تھا کہ جگہ جگہ سے آپ کی طلب شروع ہو گئی ۔ اسی اثناء میں حافظ محمد جعفر خان صاحب بریلوی جو نہایت ہی متبع سنت بزرگ تھے گنگوہ حاضر ہوئے اور حضرت امام ربانی کی خدمت میں اپنے مدرسہ مصباح العلوم کے لئے مدرس اول تجویز کرنے کی درخواست کی کہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے بمعیت مولانا یعقوب علی خان صاحب بریلوی کہ شاہ اسحاق صاحبؒ کے شاگرد تھے و مولانا محمد احسن صاحب نانوتوی کہ اس وقت عربی کالج بریلی کے پروفیسر تھے ۱۲۸۵ھ میں حافظ جعفر خان صاحب کی کوٹھی واقع بازار کلاں کے حصہ زیریں میں اس مدرسہ کا افتتاح فرمایا اور مصباح التہذیب عرف مصباح العلوم اس کا نام رکھ کر مولوی قادر علی صاحب دہلوی کو مدرس اول قرار دیا تھا ۔ چند مدرسین کا تغیر تبدل ہونے کے بعد ایک سال طلبہ کا زیادہ ہجوم ہوا تو شیدائے سنت حافظ جعفر خان صاحب نے

خود گنگوہ جانا ضروری سمجھا اور امام ربانی نے حضرتؒ کو چالیس روپیہ مشاہرہ پر مدرس
اوّل بنا کر بریلی بھیجدیا۔

حافظ محمد جعفر خاں صاحب کپڑے اور گوٹہ وغیرہ کی تجارت کرتے اور تاجرانہ متمولانہ
خوشحالی کے ساتھ دینی نعمتوں سے بھی مالامال تھے کہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی
مہاجر مدنی قدس سرہٗ سے بیعت اور نسبت مجددیہ کے عاشق وشیدا ہونے کی وجہ سے
تمامی بزرگان سلسلہ کے ساتھ عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ مصباح العلوم کا علمی صدقہ
جاریہ آپ ہی کے نامۂ اعمال میں درج ہے کہ بریلی کی زمین میں حق کی تخم ریزی کے
لئے آپ نے اپنی جان ومال کھپا دینا فخر سمجھا۔ حضرتؒ کا قیام بھی اسی کوٹھی کے اوپر
شرقی رویہ کمرہ میں تھا جس کے نیچے مدرسہ اور بازار کے رُخ اگلے حصہ میں دکانات تھیں
حضرتؒ اپنے ساتھ صاحبزادہ حافظ محمد ابراہیم کو لے گئے تھے کہ اُن کی تعلیم وتربیت
کا انتظام بغیر اس کے مشکل تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ حافظ جعفر خاں صاحب کا بہت
ادب واحترام فرمایا کرتے کہ بڑوں کے دیکھنے والے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی حافظ
صاحب مرحوم حضرتؒ کا اتنا احترام فرمایا کرتے تھے کہ گویا پیر ہیں۔ اس لئے جب
تک حضرتؒ کا قیام بریلی میں رہا دونوں وقت حضرت کا اور صاحبزادے کا کھانا حافظ
صاحب کے مکان سے آتا رہا۔ چندہ بھی قلیل تھا اس لئے حضرت کی تنخواہ کے کفیل
بھی حافظ جعفر خاں صاحب ہی تھے۔ حضرتؒ کے بریلی تشریف لانے سے مدرسہ مصباح
العلوم کے تنِ مُردہ میں جان پڑ گئی اور طلبہ واراکین مدرسہ سب ہی حضرت کے علم و
فضل اور خُلق ودیانت کے معتقد ہو گئے۔ مدرسہ کے آمد وخرچ کا حساب بھی حضرتؒ
کے حوالہ تھا۔ مگر فراہمی چندہ اراکین مدرسہ اور حافظ صاحب کے بڑے صاحبزادہ علی
احمد خاں مہتمم مدرسہ کا کام تھا۔ ہر چند کہ حضرتؒ کو مختلف علوم وفنون کی متوسط اور بڑی
کتابیں پڑھاتے ہوئے پندرہ سال گذر لئے تھے مگر شب میں اُس کتاب کا مطالعہ
جس کا سبق صبح کو پڑھانا تھا گویا حضرتؒ کی عادت ہو گئی تھی۔ چنانچہ بریلی تشریف
لاکر بھی مغرب سے عشاء تک حضرت کتاب دیکھتے اور بعد نماز عشاء کھانا تناول

فرما کر تھوڑی دیر بعد پھر مطالعہ میں مشغول رہتے اس کے بعد سو جاتے اور آخر شب میں اٹھکر تہجد پڑھا کرتے۔ نماز فجر کے بعد تلاوت اور وظائف میں مشغول رہتے اور اشراق کے بعد مدرسہ میں تشریف لے آتے تھے۔ گرمی میں دس بجے تک اور موسم سرما میں ۱۱ بجے تک صبح کو دورہ حدیث اور بعد ظہر کے عصر تک فقہ کا درس دیتے تھے۔ دوپہر میں کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر قیلولہ فرمایا کرتے اور اسی درمیان میں جو وقت ملتا صاحبزادہ محمد ابراہیم کو پیار و شفقت کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے۔

حضرتؒ کا طرز تعلیم بہت ہی پیارا تھا کہ طلبہ کو نہ مارتے تھے نہ جھڑکتے تھے نہ ان کی فہم سے بالا تقریر کرتے اور نہ نفس مطلب سے زیادہ غیر ضروری بات بیان فرماتے۔ خندہ روئی و مسکراہٹ کے ساتھ پڑھاتے اور کوئی طالب علم واہی شبہات یا کجی کے سوالات کرتا تو بے رخی کے ساتھ ٹال دیتے اور نرمی کے ساتھ نصیحت فرما دیا کرتے تھے کہ اصل مطلب سمجھنے کی کوشش کرو اور زوائد کے پیچھے نہ پڑو کہ اس سے علم میں بے برکتی ہوتی ہے۔ مطالعہ دیکھنے کی طلبہ کو زیادہ تاکید فرماتے اور عبارت پڑھنے میں صرف و نحو کی رعایت پر بہت نظر رکھتے تھے۔ غلط اعراب پر ٹوکتے اور زور ڈالتے کہ خود ہی طالب علم تصحیح کرے تاکہ قواعد صرف و نحو کا عملی اجراء ہوتا رہے۔ پڑھانے کے ساتھ طلبہ کی صورت وضع اور عملی حالات پر بھی نظر رکھتے اور خلاف شرع بات پر سختی سے ٹوکتے اور یوں فرمایا کرتے تھے کہ ابھی سے آزاد ہو گے تو پڑھ لکھ کر خود بھی ڈوبو گے اور دوسروں کو بھی ڈبو دو گے۔ علم سے مقصود ہے عمل، پس علم کے ساتھ ساتھ عمل کی پوری عادت ڈالو کہ پھر اس عادت میں لذت و حلاوت پیدا ہو۔ یہ خیال کہ عالم بن کر عمل کر لیں گے محض شیطانی خیال ہے۔ شریعت نے تو دس برس کے بچے کو مار کر نماز پڑھانے کا حکم دیا ہے۔ حالانکہ ابھی اس پر نماز فرض نہیں ہوئی۔ کیونکہ جب تک پہلے سے عادت نہ ہو بالغ ہوتے

ہی نماز کا پابند بن جانا دشوار ہے اور طالب علم تو بہر حال عمل کا مکلف بلکہ مقتدا بننے کا وقت قریب ہونے کے سبب عمل میں پختہ ہونے کا زیادہ ضرورت مند ہے اس لیئے جتنی کوشش علم کی ترقی اور پڑھے ہوئے کے محفوظ رکھنے میں کی جائے اس سے زیادہ عمل کی رغبت اور پابندی شریعت کو ہر قدم پر ضروری سمجھنے میں کی جائے کہ مقتدا بن کر آزاد وطبع کا یک دم مقید بننا بہت دشوار ہے۔ اور بیسیوں کو خوار و خراب ہی ہوتے دیکھا ہے جو طالب علمی کے اس زمانہ کی قدر نہیں کرتے جس میں تمام رحمت الٰہیہ کا ان پر نزول ہوتا اور فرشتے ان کے قدموں میں اپنے بازوؤں کا فرش بچھاتے ہیں۔

ایک وقت تھا کہ طلبہ کسی قابل ذی استعداد مدرس کے جویاں تھے اور یہ وہ زمانہ آیا کہ مدرس کو ذکی و سمجھدار طلبہ کی طلب ہوئی اور جیسے محنتی طالب علم آپ چاہتے تھے ویسے وہ نہ مل سکے تو آپ کو وحشت ہوئی کہ ایسے مدرس میں علمی ترقی نہیں ہوسکتی اور آپ نے گنگوہ لکھا کہ کسی ایسی جگہ بھیج دیجئے۔ جہاں میری علمی ترقیات متوقع ہوں۔ نیز مدرسہ میں مدرس فارسی کی ضرورت تھی اس کی تجویز کے لئے بھی آپ نے حضرت کی خدمت میں لکھا چنانچہ یہ جواب آیا۔ از بندہ رشید احمد عفی عنہ۔ گرامی قدر مولوی خلیل احمد صاحب مدفیوضہم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمانید۔ آپ کا پہلا خط آیا تو چونکہ کوئی مدرس فارسی ذہن میں نہ تھا۔ جواب میں تامل ہوا۔ یہ دوسرا خط آیا اور عزیز ابراہیم حسن بھی پہنچا۔ تو وہ کہتا ہے کہ کتب فارسیہ کو محنت کر کے پڑھاؤں گا اور مڈل پاس کیا ہے۔ وہ میری ہمشیرہ زادہ کا پسر ہے۔ اکثر پنجاب میں رہا اور وہیں گھر بنا لیا اس واسطے آپ واقف نہیں اب وہ بتقریب اپنے نکاح کے کہ کیرانہ میں عقد ہوا ہے گنگوہ آیا تھا۔ اگرچہ اس کی رائے تحصیل علم دین کی ہو رہی ہے مگر بسبب نکاح کے معاش کا فکر ہوا ہے۔ لہذا اچھا ہے کہ بریلی میں رہے اور کچھ آپ سے بھی پڑھے۔ اگر وہ وہاں ہو گیا تو میری خوشی ہے۔ مگر اس قدر خیال

رہے کہ اس کی قلیل خلاف مرضی پر سرزنش نہ ہو۔ اور زیادہ پر مجتاز ہو ، موقوف کر دینے میں رنج نہ کروں گا۔ فقط۔ طلبہ کی شکایت بجا ہے مگر اس زمانہ میں ایسے ہی طلبہ ہیں۔ "زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز" صبر کر کے پڑھاتے جاؤ اور ترک میں جلدی مت کرو۔ جب یاس ترقی سے ہو جائے اس وقت جو کچھ مقدر ہے ہو جائے گا مولوی محمود حسن کی صحت سے سرور ہوا۔ سلام مسنون ان کو اور حافظ احمد حسن اور حافظ محمد جعفر خاں اور شیخ محمد حسن وغیرہم کو فرمادیں۔ سبق سولہویں شوال سے شروع ہو گئے۔ ہر قسم کے طلبہ یہاں بھی ہیں۔ فقط۔

ہر چند کہ براہین قاطعہ کے متعلق یہاں بھی بہت کچھ شور مچا ہوا تھا مگر کسی کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ مدرسہ میں آ کر آپ سے ان مسائل کی بابت سوال کرے یا مناظرہ کی دعوت دے۔ بلکہ آپ کا دل چاہتا تھا کہ بھرے مجمع میں کوئی مناظرہ ہو جائے مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔

حافظ جعفر خاں صاحب کے منجھلے صاحبزادے حافظ حضور احمد خاں جو حضرت کی قیام گاہ کے کمرہ مقابل غربیہ میں رہتے تھے تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا یعقوب علی خاں صاحبؒ نے جو کہ مولوی احمد رضا خاں کے والد مولوی نقی علی خاں کے استاد اور شاہ اسحاق صاحب دہلوی کے شاگرد خوش عقیدہ بزرگ تھے ایک مرتبہ حضرتؒ سے فرمایا کہ مسئلہ امکان کذب جو عموم قدرت کا مرادف ہے عوام تو عوام معمولی مولویوں کی سمجھ سے بھی باہر ہے۔ عالم ذکی و متبحر ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس مسئلہ کو آڑ بنا کر بدعتی ملاؤں نے عوام کو خلجان میں ڈال دیا۔ اور اہل حق کی طرف سے بدگمان بنا کر بھڑکا دیا۔ یہ مسئلہ آپ کو لکھنا نہ چاہیے تھا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرت آپ کیا فرمائیں گے شاہ اسمٰعیل صاحب شہید کے متعلق جنہوں نے شرک و بدعت کا کھول کھول کر بیان فرمایا جس کی بدعتیوں میں آج تک شورش برپا ہے؟ یہ سن کر مولانا مسکرائے اور خاموش ہو گئے۔

یہ ایک شبہ ہے جو اکثر دیندار طبیعتوں میں بھی پیدا ہو جاتا اور وہ مخالفین کی

شورش سے محزون و مصدوم ہو کر مخلصانہ و محبانہ درجہ میں کہہ دیا کرتے ہیں کہ آخر اس مسئلہ کی باوجودیکہ اس کے حق ہونے میں کلام نہیں مگر بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ فتنہ برپا ہو گیا۔ مگر بات یہ ہے کہ اوّل تو کسی کو یہ علم نہیں کہ فلاں بات کا اظہار سبب فتنہ ہو جائے گا۔ اور فلاں بات پر کوئی شورش نہ ہوگی۔ کہ مغیبات کا علم حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوم از خود ایک امر کی اشاعت میں اور کسی مستفتی کے استفتا پر جواب دینے میں بہت فرق ہے کہ امر دوم میں عالم پر اظہار حق ضروری ہے ورنہ صحابہ کی شان میں لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم۔ ایک بے محل قول ہوگا جس کا مقتضا یہ ہے کہ اہل حق سے ایسے امور کا صدور ضرور ہوگا جس پر مخالفوں کی طرف سے ملامت ہو اور ان کا ثبات قدم جانچا جائے گا کہ اس کی پروا نہ کریں۔ پس کس کی طاقت ہے کہ لائم کو ملامت سے روکے اور کون صاحبِ حق ایسا ہے جو اس ملامت سے خائف ہو کر کلمۃ الحق سے باز رہے۔ سوم عادت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ دنیا کی نظروں میں کیسی ہی غیر ضروری بات ہو مگر اہلِ حق سے اس کا صدور ہو کر رہے گا تاکہ موافق و مخالف دودھ اور پانی بن کر جدا ہو جائیں۔ پھر اس ابتلاء سے جو ایک ہی وقت میں کسی عالم حقانی و شیخ ربانی کی خدا پرستی و مخلوق پرستی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عوام و متبعین کے اخلاص و شائبہ ہوائے نفس دونوں کا امتحان لینے کے لئے بسبب ارشاد کا جزو لاینفک ہو کر تجویز کی گئی ہے کون بچ سکتا یا قدر کا مقابلہ کر کے کون اس سے روبراہ ہو سکتا ہے؟ چہارم جو قابل غور اور تحقیقی امر ہے وہ یہ ہے کہ شورش و مخالفت کا مدار عناد و کبر پر ہے نہ کہ کسی مسئلہ پر۔

پس جن لوگوں کی طبیعت میں کسی کی طرف سے اپنی بڑائی کے زعم میں عناد و حسد ہوگا وہ اس بات پر بھی شور مچائے گا جو کسی طرح بھی شور کے قابل نہ تھی۔ اور جس کو عقیدت ہوگی وہ بڑی سے بڑی بات پر بھی خلاف یا انکار نہ کرے گا بلکہ گرانی تک نہ لائے گا۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سیدھے سادے کھلے دعوے پر کہ کوئی معبود نہیں بجز اللہ کے سرزمین عرب میں فتنہ و فساد کی وہ

آگ مشتعل ہو گئی تھیں تب بارہ برس تک عالم کو حیرت ناک منظر دکھایا، اور سیدنا ابوبکر
صدیق رضی کو یہ سنکر بھی حیرت نہ ہوئی کہ آپ ایک لمحہ کے اندر بایں جسد مکہ سے بیت
المقدس تشریف لے گئے اور پھر ساتوں آسمان اور جنت و دوزخ کی سیر اور تمامی
عالم بالا کی سیاحت سے فارغ ہو کر اپنے بستر پر تشریف لے آئے کہ اس قصہ
معراج پر دوسرے ہنستے مذاق اُڑاتے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے تھے
مگر حضرت صدیق کو تعجب اور شک بھی نہ تھا کہ یہ سیر و سیاحت طویلہ قلیل زمانہ میں
خواب تھی یا حقیقت؟ پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت صدیق عرض
کرتے کہ یا رسول اللہ بات تو بالکل حق ہے مگر اس کا اظہار مناسب نہ تھا کہ آپ
کمال کے متعلق ایک امر ہے جس کے اظہار سے خواہ مخواہ شورش ہو گی" تو میرے
خیال میں حضرت صدیق اس مشورہ میں خیر خواہ نہیں بلکہ خاطی قرار پاتے اور صاف
جواب یہ ہوتا کہ مخالف و معاند کے قلب سے عداوت کا نکالنا میرے بس کی بات
نہیں اور قبل از وقوع معلوم کرنا کہ اس پر یہ نتیجہ مرتب ہوگا اللہ عالم الغیب ہی
کے لئے مخصوص ہے۔ اور میں اس کا مکلف بھی نہیں کہ معاندین کی رعایت ملحوظ
رکھکر اپنی ناموس کو محفوظ رکھنے کی فکر کروں کہ ایسی شورش سے تو مخالفین نے
اللہ رب العالمین کو بھی نہیں چھوڑا اور یہ بعوضہ و عنکبوت کا قرآن مجید میں ذکر آیا
تو کہہ اُٹھے بھلا ان حقیر جانوروں کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ برتر کو شرم نہ آئی کہ
بالرفیع و اعلیٰ ذات ہو کر ایسے خسیس و دنی کا ذکر شروع کر دیا۔ پس جب اللہ عالم
الغیب نے مخالفین کی شورش کو جان بوجھکر استغنا فرمایا بلکہ یہ مصلحت و خوبی
مرتب فرمائی کہ اس تذکرہ سے خدا پرست و نفس پرست اور دوست و دشمن کا
دنیا کو پتہ چل گیا تو میں کون کہ اللہ اپنے موافقین اور مخالفین کو یا مخلصین و منافقین
کو ممتاز و متمیز کرنے کے لئے مجھے آلہ کار بنائے اور میں مصلحت بینی کا عذر پیش کر دوں
ہاں دوستوں کی رعایت کہ اُن کے فہم سے زیادہ بار ان پر نہ ڈالا جائے اور وہ
کسی فتنہ میں نہ پڑیں اباحت کے تحت میں داخل ہے مگر بشرطیکہ اس کا علم ہو اور

نیت بھی بخیر ہو۔

یہیں اصل بحث کسی کلام کے حق یا باطل ہونے میں کرنا مضائقہ نہیں مگر جب اس کا حق ہونا واضح ہو جائے تو اب یہ الزام کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہ تھی گویا اپنے کو مصلحت بین اور اہل حق کو دور اندیشی سے بے بہرہ سمجھنا ہے جو سوء ادب اور ضعف عقیدت سے خالی نہیں کرت

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

آج سیدنا آدم سے لے کر اس وقت تک جتنے بھی ان گنت اللہ والوں کی فہرست مرتب ہو گی ان میں غالباً ننانوے (۹۹) فیصد ہوں گے جن کو مخالفین کی شورش کا یہ فتنہ پیش آیا پھر کس کس کو کہا جائے کہ فتنہ سے بچنا فرض تھا اور غیر ضروری بات کا اظہار کر کے عوام میں شور مچوانا اور سب و شتم کروا کے دوستوں کا دل دکھوانا مناسب نہ تھا کہ یہ بھی محبوب کی ایک ادا ہے اور محب کا کام کہ برضا اس کے سامنے گردن جھکائے ست

صبر کن در کار خضر اے بے نفاق تا نگوید خضر رو ھذا فراق

ہذہ سنۃ اللہ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔

حافظ امیر اللہ صاحب بریلوی ایک صاحب تھے جنہوں نے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ ایک شیعہ سے اختلافی مسائل میں ان کی کچھ گفتگو ہو گئی اور وہ پریشان ہو کر بریلی کے نامی علماء کے پاس آئے کہ ان سوالات کا جواب دیا جائے۔ حافظ سردار احمد بریلوی لکھتے ہیں کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب کی طرف سے ان کو جواب ملا کہ ہاں جواب تو ممکن ہے مگر ایک ہزار روپیہ ہونا چاہیئے۔ حافظ صاحب نے فرمایا آخر جواب کے لئے اتنی کثیر رقم کی کیا ضرورت ہے؟ تو معلوم ہوا کہ ان کی مذہبی کتابیں خرید کر مطالعہ کی جائیں گی اس وقت جواب لکھا جائے گا۔ بغیر اس کے جواب ممکن نہیں ہے" اختلاف عقائد کے سبب ان کو حضرت کے ساتھ مناسبت نہ تھی مگر مجبور بادل ناخواستہ

وہ مصباح العلوم میں آئے اور حضرتؒ سے مسائل مسئولہ کا تذکرہ کیا۔ حضرتؒ نے جواب نور الکلمہ دیئے اور یہ فرما کر کہ اس بحث ہی کا انشاء اللہ خاتمہ کر دوں گا مطرقۃ الکرامہ کی تالیف شروع کر دی جس کا حصہ اول طبع ہو کر شائع اور اب نایاب ہو چکا۔ حضرتؒ اس تمنا و انتظار میں کہ کاش علماء شیعہ اس کا جواب دیں چالیس برس گذار کر عالم قدس کو سدھار لئے مگر اس کا برائے نام بھی اب تک جواب نہیں ہوا۔ حافظ امیر اللہ صاحب جوابات دیکھکر حیران رہ گئے اور جب تک زندہ رہتے اس کا اعتراف کرتے رہے کہ حضرت اپنے وقت کے علامہ ہیں کم و بیش دو سال حضرتؒ نے بریلی میں قیام فرمایا اور آخر حضرت امام ربانی نے آپ کے لئے دار العلوم دیوبند کا قیام تجویز فرما کر آپ کو لکھدیا کہ گو تنخواہ میں دس روپیہ کا تنزل ہے مگر تمہاری علمی ترقی کا لحاظ کر کے اس کو پسند کرتا ہوں۔" حضرتؒ کو کمی بیشی کا خیال کیوں ہونے لگا تھا جب کہ آقائے روحانی کا مشورہ تھا آپ کے لئے تو بڑی دولت مرشد کی رضا و خوشنودی تھی اور اس صورت میں تو شیخ کا قرب جسمانی اور مرکز علوم کی خدمت کا وہ روحانی اغتفاظ بھی شامل تھا جس کا شوق مدت سے آپ کے قلب میں جوش زن تھا اس لئے آپ روانگی دیوبند کے لئے تیار ہو گئے اور ظاہر کر دیا کہ میں دیوبند جا رہا ہوں یہاں کے لئے مدرس تجویز کر لو۔

اہل بریلی خصوصاً حافظ جعفر خاں صاحب کے رنج و ملال کا کیا پوچھنا کہ اس قیام میں وہ لوگ حضرتؒ کے عاشق و فریفتہ ہو گئے تھے اور حضرتؒ کو بھی ان مصاحبوں کے ساتھ بالخصوص حافظ جعفر خاں صاحب سے بچہ بچہ کے ساتھ اتنا انس تھا کہ ان کے گھر کو اپنا گھر اور ان کے بچوں کو اپنے بچے سمجھتے تھے اس لئے حضرتؒ کو بھی مفارقت کا رنج تھا مگر مصالح دینیہ اسی مفارقت کو مقتضی تھے۔ لہٰذا حافظ جعفر خاں صاحب بھی حضرت امام ربانی کی تجویز کو پختہ سمجھ لینے کے بعد خاموش ہو گئے مگر یہ ضرور کہا کہ روانگی سے قبل آپ خود

بھی اپنی جگہ کسی کو بٹھاتے جائیں کہ مدرسہ کا کام بند نہ ہو اور آپ کی تجویز آپ ہی کے قیام کا حکم لے کر ہمارے سروں کا تاج بنی رہے مگر اب مدرس کی تنخواہ پچیس روپیہ ہو گی کہ چالیس روپیہ حضرت ہی کے لئے مخصوص تھے حُسنِ اتفاق سے مولوی سید محمد عمر صاحب ولایتی بہ تلاشِ روزگار آنولہ سے بعض صاحبوں کی سفارش لے کر انہیں دنوں میں حافظ جعفر خان صاحب کے پاس آئے اور جناب حافظ صاحب نے ان کو حضرت کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرتؒ نے اُن سے باتیں کیں اور پرکھ لیا کہ خوش عقیدہ ذی استعداد اور نیک طبیعت عالم ہیں اس لئے پچیس روپیہ ماہوار پر ان کو راضی و دل نہاد پا کر حافظ جعفر خان صاحب سے فرمایا کہ مبارک ہو آپ کی خوش نصیبی ہے کہ گھر بیٹھے کام کا مولوی مل گیا۔ چراغ لے کر ڈھونڈتے تو پچاس روپیہ میں بھی ایسا شخص نہ ملتا۔ یہ غیبی سامان ہے اس کو نعمت الٰہیہ سمجھ کر قدر کرو۔ چنانچہ آپ مولانا ممدوح کو اپنی جگہ بٹھا کر آخیر سنہ ۱۳۰۳ھ میں بریلی سے روانہ ہوئے اور دارالعلوم دیوبند میں مدرس بن کر تشریف لے آئے۔

ہر چند کہ آپ کا تعلق ملازمت مدرسہ سے قطع ہو گیا مگر آپ کے قلب کو مدرسہ و اہلِ مدرسہ سے تا زیست ایسا تعلق رہا کہ اس کی ترقی و آبادی سے خوش ہوتے اور جب اراکین و ممبران کے باہمی نزاع یا کسی امر میں مدرسہ کو نقصان پہنچانے والے اختلاف کو سنتے تو رنجیدہ و مغموم ہوا کرتے تھے۔ نیز اہلِ حق کے ساتھ انس و محبت اور اتباع کی طرف کشش اور رغبت کا جو تخم آپ نے بریلی کی زمین میں ڈالا اور دو برس اس کو سینچا اور بڑھایا تھا وہ ضائع ہونے والا نہ تھا اس لئے آپ بھی کبھی کسی نہ کسی حیلہ سے بریلی آ کر اپنی پیدا کردہ کھیتی کو دیکھ جایا کرتے تھے اور دعا فرمایا کرتے تھے کہ بدعات کی ظلمت دور ہو اور سنت کا نور چمکے چنانچہ آخر وہ بار آور ہو کر رہا۔ پھولا پھلا اور مہکا ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

حافظ محمد جعفر خاں اور ان کے خاندان کو جن کے مکان پر حضرت نے دو سال رہائش رکھی تھی دینی نعمت سے مالا مال ہونا مقدر تھا اس لئے وہ تخم محبت جو حضرتؒ

ان کی زمین قلب میں ڈال آئے تھے آخر اپنا رنگ لایا اور ان کے دو پوتے مولوی محمد فاروق و مولوی محمد اسحاق مرحوم سہارنپور دیوبند رہ کر فارغ التحصیل اور حضرتؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوگئے۔ مولوی محمد اسحاق مرحوم تو حضرت کے اتنے گرویدہ تھے کہ طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے بھی وطن کا رُخ کرنا پسند نہ آیا اور سفر و حضر کے خادم بن کر حضرت کی خدمت میں رہ پڑے بلکہ ان کو تو اپنا مرنا بھی حضرت کے قدموں ہی میں بھلا معلوم ہوا اور انہوں نے اپنی قبر کے لئے سہارنپور سے بہتر کسی زمین کو نہ سمجھا۔ چنانچہ مرحوم کے بھائی حافظ سردار احمد لکھتے ہیں کہ بھائی مرحوم تپ کہنہ میں مبتلا ہو کر والدہ محترمہ کے بلانے پر بریلی چلے آئے اور علاج ہونے لگا مگر مرض میں کمی نہ ہوئی بلکہ دن دونی رات چوگنی ترقی شروع ہوگئی۔ لیکن جوں جوں مرض بڑھتا تھا وہ دل مرحوم کو سہارنپور واپس جانے کا شوق بڑھتا تھا۔ آخر جب انہوں نے دیکھا کہ جس سے بھی کہتا ہوں وہ جواب دیتا ہے کہ جب تک صحت نہ ہو جائے سہارنپور جانا مناسب نہیں تو وہ اپنے مرض کو چھپانے اور افاقہ وصحت ظاہر کرنے لگے۔ آخر ایک دن مجھ سے فرمایا کہ بھائی مجھے ایک حصہ تو بیماری ہے اور دس حصہ یہاں کی ظلمت بدعات اور لوگوں کا متبع سنت نہ ہونا روحانی کو دق ہے جس سے میں اندر ہی اندر گھلا جاتا ہوں۔ اگر مجھے تم سہارنپور بھیج دو گے تو امید ہے حضرت کے قدموں میں پہنچ کر مجھے آرام ہو جائے گا اور آرام نہ بھی ہوا تو خاتمہ بخیر ہو کر آخرت کا آرام تو ضرور ہی ملے گا۔ مختصر یہ کہ انہوں نے کسی کی نہ سنی اور آخر وہ سب عزیزوں کو آزردہ خاطر چھوڑ کر سہارنپور چلے گئے وہاں پہنچ کر اعزہ کی تسلین کے لئے اپنے افاقہ اور بصحت ہونے کے خطوط لکھتے رہے حالانکہ ان کی ہڈیوں تک پہنچ جانے والا بخار اندر ہی اندر گھاس میں چنگاری کا کام دے رہا تھا۔ آخر بارہ تیرہ دن بعد حضرتؒ کا گرامی نامہ دادا صاحب کے نام آیا کہ اسحاق کی حالت ٹھیک نہیں ہے اور ان کے پاس ہر وقت ایک آدمی رہنے کی ضرورت ہے لہذا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ سردار احمد کو بھیج دو کہ اپنے ساتھ مولوی اسحاق کو لے لے

جائیں ۔ چنانچہ میں روانہ ہو کر سہارنپور مدرسہ میں اس وقت پہنچا جبکہ عصر کی نماز ہو چکی تھی اور بھائی اسحاق سہ دری کے ستون سے کمر لگائے باہر ہی بیٹھے تھے مجھے دیکھ کر تعجب سے کہنے لگے کہ خیریت تو ہے تم کیوں آئے میں تو اپنی حالت کا کوئی خط لکھا نہیں تھا۔ میں نے کہا ہاں تم نے تو نہیں لکھا مگر حضرت کا گرامی نامہ پہنچا کہ میں اگر تم کو بریلی لے جاؤں ۔ یہ سُنکر بالکل خاموش ہو گئے اور چہرہ پر حسرت برسنے لگی ۔ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت نے دادا صاحب کی خیریت دریافت فرما کر مجھ سے کہا کہ مولوی اسحاق سے مِل لئے ؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں مل لیا۔ فرمایا پھر کس گاڑی سے روانگی کا قصد ہے ؟ میں نے عرض کیا جو گاڑی حضرت کے نزدیک مناسب ہو۔ فرمایا کل دن کے دس بجے کی گاڑی سے چلے جاؤ۔

بعد مغرب بھائی مرحوم جو اب تک اسی قلق وحسرت میں گھِر رہے تھے مجھ سے فرمانے لگے بھائی کیا واقعی تم مجھے بریلی لے جاؤ گے ؟ میں نے کہا ہاں حضرت کا یہی حکم ہے اور دس بجے دن کی گاڑی طے ہو گئی ۔ فرمایا اچھا حضرت سے کل شام تک ٹھہرنے کی اجازت لے لو۔ میں نے کہا کہ حضرت سے مراجعت کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتا۔ یہ سُنکر عزیز نے قلق کے ساتھ اتنا کہا میری آرزو تو یہ تھی کہ میری مٹی یہیں عزیز ہوا اور حضرت میرے جنازہ کی نماز پڑھائیں اور پھر خاموش ہو گئے ۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو جان شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

مولوی اسحاق مرحوم کو درحقیقت حضرت کے ساتھ عشق تھا اور اسی نے ان کو یہ جوان موت خوشگوار بنا دی تھی کہ وہ مرنے کے متمنی تھے مگر شیخ کے قدموں کے نیچے ۔ اور یہی ان کی آخری زندگی کا منتہائے مراد تھا ۔

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

محب کو ایسی موت اگرچہ وہ جوان مرگ ہو بیاری معلوم ہوا کرتی اور وہ اس کو لقاء محبوب حقیقی کا واسطہ سمجھکر اس کی آرزو کرتا اور کہا کرتا ہے ۔

خرم آں روز کہ از منزل ویراں بردم راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بردم

نذر کردم کہ گر آید بسر این غم روزے — تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

مگر سچی محبت کا ثمرہ محبوب کی صرف اطاعت ہے لہذا مرحوم کی تمنا حسرت سے بدل گئی اور دل سمجھ گیا کہ بہتر ہے آخر بریلی بھی کچھ دور نہیں کبھی تو تشریف لانا ہو ہی جائے گا راضی برضا ہو گئے ۔

کشتۂ عشق کہ دارد دل گداز و حسرت بدل ہمدم — بجنازہ گر نہ آئی بمزار خواہی آمد

بعد مغرب کہنے لگے دل چاہتا تھا کہ آج حضرت اپنا پس خوردہ کھلا دیتے کہ پھر خدا جانے نصیب ہو یا نہ ہو۔ مگر کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ خدا کی شان اتنا کہنے سے قبل حضرت کے مکان سے پیالہ آیا اور آدمی نے کہا کہ یہ حضرت نے اپنا بچا ہوا کھانا مولوی اسحاق کے لئے بھیجا ہے کہ رغبت ہو تو کھا لیں۔ مگر اس وقت مرحوم پر غشی طاری تھی لہذا اس کو رکھ دیا گیا اور اسی حالت میں عشاء کی نماز ہو گئی تھوڑی دیر بعد ان کو افاقہ ہوا اور میں نے ان کو حاجت ضروری سے فارغ کرا کے وضو کرایا اور انہوں نے اپنے حجرہ میں عشاء کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد کھانا مانگا اور حضرت کا پس خوردہ رغبت کے ساتھ کھا کر ضروری اسباب سفر کے متعلق کہتے سنتے رہے۔ تکان کی وجہ سے مجھ پر نیند کا غلبہ تھا اس لئے ۱۲ بجے انہیں کے پاس فرش پر لیٹ رہا۔ مگر مرحوم کو پیاس زیادہ تھی اس لئے ذرا ذرا دیر بعد اٹھ کر ان کو پانی یا عرق گاؤزبان پلاتا رہا اور پھر سو گیا تقریباً صبح کے ۴ بجے تھے کہ میری دفعۃً آنکھ کھلی اور میں نے بھائی کو آواز دی۔ جواب نہ پایا تو میں پلنگ پر گیا اور دیکھا کہ طلسم عالم ہستی کا عقدہ کھل رہا ہے اور عزیز بسوئے عالم قدس کوچ کر رہا ہے میں نے بآواز کلمہ طیبہ پڑھنا شروع کیا کہ ایک معمولی سی ہچکی آئی اور بجائے بریلی کے سفر آخرت شروع ہوا اور ختم بھی ہو لیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس وقت مجھ پر جو کچھ گزری اس کو کیا بیان کروں کہ یہ واقعہ ہے

موت پر کچھ بس اگر چلتا کسی کے ہجر میں — میں تو کیا کوئی نہ ہوتا شرمسار زندگی

صبح کو حضرت تشریف لائے اور تھوڑی دیر میں مسلوب شہید کو نہلا کر اور سفید پوشش پہنا

کر دارالطلبہ میں لار کھا گیا۔ حضرت نے نماز جنازہ پڑھائی کہ جان نثار کی دلی آرزو بر آئی اور ۹ بجے سے قبل دفن سے فارغ ہو لئے

پھر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے ۔ کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

پھر حافظ سردار احمد بھی جو کہ آزاد طبیعت رکھتے تھے بیعت کے خواہشمند ہوئے مگر حضرت نے انکار فرما دیا کہ تم متبع شریعت نہیں ہو۔ مگر جب انہوں نے وعدہ کیا کہ عمل کروں گا تو حضرت نے بیعت فرما لیا اور بھائی کی جگہ دین کی دولت اور شیخ ہی کی محبت لے کر وہ تیسرے دن اپنے گھر واپس آ گئے کچھ عرصہ کے بعد ان کے دیگر عزیزوں نے اور خود حافظ جعفر خاں صاحب اور ان کے بیٹوں حافظ ظہور، حافظ عمر احمد، منشی جمیل احمد اور مستورات کنبہ نے بھی حضرت کا باقاعدہ دامن پکڑا اور بیعت ہو کر داخل سلسلہ ہوئے اللہ کی شان ہے کہ بریلی کی زمین سے وہ لوگ پیدا ہوئے جن کو سنائیں کشش نے سہارنپور پہنچایا اور خود سہارنپور کی مٹی سے پیدا ہونے والے بعض نفوس اس دولت علیہ سنیہ سے محروم بلکہ مخالف و معاند رہے۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم ۔ ز خاک مکہ ابوجہل این چہ بوالعجبی است

پھر آپ کا یہ فیضان باطنی اسی خاندان تک محدود نہیں رہا بلکہ آگے بڑھا اور جس مرتبہ بھی آپ کو کسی ضرورت سے بریلی تشریف لے جانے کا اتفاق ہوا کچھ نہ کچھ اہل بریلی بدعات سے تائب اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوتے رہے

محمد یٰسین خاں ایک تعلیم یافتہ شخص محکمہ آبکاری کے انسپکٹر تھے وہ بریلی سے چل کر سہارنپور حاضر ہوئے اور کچھ پڑھنے کے لئے وظیفہ دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا بغیر بیعت کے فائدہ تام نہ ہو گا اور نفس و شیطان و اشتغال دنیا اس نیک کام سے باز رکھا کرتے ہیں یہ جامع الفاظ کچھ ایسے دل پر بیٹھے کہ فوراً درخواست بیعت کی مگر حضرت نے تامل فرمایا اور استخارہ کرنے کا حکم دیا۔ استخارہ کے بعد جب انہوں نے عرض کیا کہ الحمد للہ ارادہ میں پختگی اور بیعت کی ضرورت کو زیادہ محسوس پاتا ہوں تو آپ نے داخل سلسلہ فرما لیا اور ارشاد فرمایا کہ تمہاری نوکری جائز اور تنخواہ حلال ہے۔

ہے کہ شراب کے ساتھ کسی نوع کا تعلق بھی مسلمان کو جائز نہیں۔ اس سے بچنا ضروری ہے کہ رازق حق تعالیٰ ہے اور رزق کا وعدہ فرما چکا ہے جس میں تخلف نہ ہوگا چنانچہ حاضری کے وقت ان کو بیعت کا خیال بھی نہ تھا مگر تائب ہوئے اور ایسے تائب ہوئے کہ نوکری سے مستعفی ہو کر خود مع اہل وعیال کے خورد ونوش کی تکلیف مدت تک اٹھائی مگر جس کو حرام سمجھ لیا تھا اس کے پاس نہ گئے۔ اب بچوں کو پڑھانے کے مختصر معاوضہ پر قانع اور ذکر وشغل میں دلدادہ طریق پر عامل ہیں خود لکھتے ہیں کہ بیعت کے بعد رات ہی کو تہجد کے لئے اٹھا تو ہاتھوں میں ایک ایسا برقی اثر پاتا تھا جس سے ہاتھ ٹوٹے جاتے تھے اور تہجد پر مداومت کا یہ پہلا سبق تھا کہ اس اندرونی لذت کو کوئی نظیر نہ ملتی تھی۔

چند ماہ بعد سنہ ۱۳۴۰ھ میں انہوں نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص ان سے جدا ہو رہا ہے اور ان کی جدائی ان پر اس درجہ شاق ہے کہ رو رہے ہیں اور اتنی آہ و بکا کر رہے ہیں کہ کلیجہ نکلا جا رہا ہے۔ صبح کو حضرت کی خدمت میں خواب لکھ کر بھیجا تو حضرت کا جواب آیا عجب نہیں تعبیر یہ ہو کہ میرا ارادہ عنقریب سفر حج کا ہے اور میں عربستان جا رہا ہوں۔ یہ معلوم کر کے کہ حضرت بیت اللہ کا عزم فرما چکے حضرت کی ہمرکابی و معیت کا شوق ان پر غالب ہوا اور آخر قدرت نے سامان سفر ان کے لئے باسانی مہیا کر دیا کہ وہاں صرف عزم اور پختگی کی جانچ ہوتی ہے ورنہ خزانہ غیب میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ چنانچہ حضرت کے ہمرکاب یہ بھی روانہ ہوئے اور اس دولت حج وزیارت سے جس کا کبھی وسوسہ بھی نہ گذرا تھا مالا مال ہو کر صفر سنہ ۱۳۴۱ھ میں [illegible] واپس آگئے۔

مدرسہ مصباح العلوم میں نظم کی کچھ خرابیاں پیش آنے پر اصلاح کے لئے شروع سنہ ۱۳۴۲ھ میں حضرت کو بریلی تشریف لانا پڑا اور اس مرتبہ حضرت کا قیام پرانے شہر میں حافظ حاجی محمد نعمان صاحب سوداگر چوب کے مکان پر ہوا کہ حافظ جعفر خاں صاحب کے عزیز تھے اور ان کے مکان پر ہر قسم کی راحت کا سامان مہیا۔

تھا۔ چند ہی روز قبل ان کی بھوپھی نے خواب دیکھا تھا کہ ایک براق آیا جس پر یہ سب لوگ سوار ہو گئے۔ مگر خاں صاحب کی بڑی لڑکی رہ گئے کہ وہ سوار نہیں ہوئیں اور ان کے بھائی نے کہا کہ یہ پھر سوار ہو جائیں گی۔ اس خواب پر یہ خوش نصیب خاندان خود بخود کسی مقبول خدا شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہونے کا مشتاق بن چکا تھا کہ حضرت کے بریلی پہنچ کر قدرتی طور پر انہیں کے مکان پر قیام کا سامان فراہم ہوا۔ صبح ڈاک سے حضرت اترے تو خاں صاحب کے صاحبزادے صدیق احمد خاں موٹر لئے ہوئے موجود تھے کہ ان کو حافظ جعفر خاں صاحب نے بذریعہ تار اطلاع دے دی تھی۔ چنانچہ حضرتؒ نے نماز فجر با جماعت اسٹیشن پر پڑھی اور موٹر پر سوار ہو کر خاں صاحب کے مکان پر تشریف لائے۔ وہ دن مدرسہ کی امداد اور رفع نزاع باہمی میں گزارا اور اگلے دن یہ تمام خاندان مرد و زن حضرت سے بیعت ہوا۔ مگر لڑکی رہ گئے کہ وہ اپنی سسرال تھی اور ہر چند اس نے کوشش کی کہ گھر آ جائے مگر نہ آ سکی۔ واپسی سہارنپور کے وقت خاں صاحب نے سو روپیہ کا نوٹ حضرتؒ کی نذر کیا مگر حضرت نے قبول نہ فرمایا اور کہا کہ مجھے جو تنخواہ مدرسہ سے ملتی ہے وہ خرچ کو کافی ہو جاتی ہے لہٰذا اس کی حاجت نہیں۔ اگر ضرورت ہوگی تو پھر منگا لوں گا اس وقت معاف کرو۔

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ بیعت کرنے پر حضرت کی خدمت میں اگر نذر پیش کی گئی تو حضرت نے کبھی قبول نہیں فرمائی کہ صورتاً توبہ کرانے کا معاوضہ بن جاتا ہے اور اس رسم کے مشابہ ہے جو آج کل دنیا دار پیروں میں چل رہی ہے ہاں اس کے بعد اُنس و محبت کا تعلق پیدا ہو کر اگر کوئی قلیل سے قلیل ہدیہ بھی پیش کرتا تو مسنون طریقہ پر آپ اسے بخوشی قبول فرماتے چنانچہ سہارنپور سے تو کیا طلب فرماتے حضرت نے اس بارے میں حافظ جعفر خاں صاحب کی سفارش بھی قبول نہ فرمائی اور خرچ کو روانہ ہو جانے پر جب خاں صاحب مرحوم نے بذریعہ منی آرڈر بطور ہدیہ پچیس روپیہ دہلی روانہ کیا تو آپ نے قبول فرما لیا کہ اس کا محرک تعلق محبت تھا جو کہ للہ تھا۔

علالت و ہلم ہے اور اس کا مذکر تناول شکلی ملد کی وجہ سے ممنوع و قبیح ہے۔ غرض جب
حضرت کسی مقام میں تصفیہ کے لئے باقاعدہ حکم ہو کر جاتے تو کسی نوع کی مالی اعانت
سے آپ کو گرانی ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ مجھے خوب یاد ہے سہارنپور میں دو شخصوں نے کہ
دونوں کو حضرت سے پرانا تعلق تھا آپ کو سرپنچ بنایا تو آپ نے منظور فرما کر بعد
مغرب کا وقت سماعت تصفیہ کے لئے مقرر فرما دیا۔ ایک فریق نے کہ ان کو حضرت
سے زیادہ بے تکلفی تھی عرض کیا کہ پھر کھانا بھی حضرت وہیں تناول فرمائیں۔ آپ نے
تبسم فرمایا آج کی حاضری دوسری نوع کی ہے آج تو بالکل ایسا ہی تمہارے گھر کا نوالہ
نہیں ہے یوں بہتیری دفعہ کھایا ہے اور آئندہ بھی کھاؤں گا۔ مدرسہ مظاہر العلوم اس
وقت دیوبند کی سرپرستی میں تھا اور حضرات دیوبند نے اپنی سفر سے معذوری کا اظہار
کر کے خود بخود تجویز کیا تھا کہ سہارنپور سے حضرت کو بنا دو باوجود اس کے
حضرت نے حد تقویٰ کی بھی پابندی فرمائی کہ حافظ جعفر خاں کو دیوبند واپس بھیجا کہ
میرے استعفا کی تحریر لے آؤ چنانچہ جب دیوبند سے یہ تحریر پہنچی کہ آپ ہماری
طرف سے استعفا منظور کر جائیں اور آپ کا فیصلہ بھی لیتینہ ہمارا ہی فیصلہ ہوگا۔ تب
حضرت نے بریلی کا سفر منظور کیا اور اس وقت بھی یہی احتیاط فرمائی کہ مدرسہ کے کسی
ممبر یا رکن کی دعوت منظور نہ کی۔ ان حضرات کی بیعت کا قصہ بھی اسی سفر میں پیش آیا
اس سے یہ بھی نہیں ہدیہ سے فلانہ میں اس کمال تقویٰ کا اثر بھی شامل ہو جس کو حضرت
دل میں لئے ہوئے اور کسی سے اظہار نہ فرمایا کرتے تھے۔ بہرحال ایک یا دو دن کے قیام میں
بہت سے اہل بریلی کے اور لوگ بھی داخل سلسلہ ہوئے اور حضرت بعد نماز مغرب حافظ
علی احمد امام مسجد کے گھر کہ انہوں نے حضرت کے ساتھ [illegible] کھانا
کھانا تناول فرما کر واپس سہارنپور آگئے

بریلی میں حضرت کے متوسلین سے مجھے زیادہ واقفیت نہیں مگر حافظ محمد عمران
اور حاجی محمد خاں صاحب کے خاندان کو تو دیکھا ہے کہ ماشاء اللہ بچہ بچہ کے قلب میں
محبت کا نقش جما رہتا ہے خود ان کے سر [illegible] سے [illegible] اور [illegible] رہا ہے [illegible] جیسے

شہر میں ان شیدایان سنت کا وجود جن کو طرح طرح کے ابتلا بھی پیش آئے ایک نعمت الہیہ ہے کہ دہلی بریلی ہے جس سے حضرت پر صدائے تکبیر بلند ہو رہی ہے اور اسی بریلی کے باشندے ایسے ہیں جن کا دل باوجودیکہ چند گھنٹے حضرت رح سے آشنا ہوا ہے مگر آج حضرت رح کو رو رہا اور زبان بیساختہ پکار رہی ہے ؎

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی — کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

قلوب میں تصرف کرنے والے خدائے ذوالجلال کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ اہل حق کا وجود کسی کے لئے وسیلۂ رحمت ہے اور کسی کے لئے آلۂ نقمت و زحمت یضل بہ کثیرا ویہدی بہ کثیرا ؎

ہمچو قبطی خون بود آں آب نیل — آب باشد پیش سبطی جمیل
جادہ باشد بحر ز اسرائیلیاں — غرق گہ باشد ز فرعون عوان
باد زیر عادیاں گرز و تبر — لیک بر ہود و بر قومش ظفر
گلستاں باشد براہیم نار — لیک بر نمرود باشد زہر مار
بر سمندر باشد آتش خانماں — لیک باشد بہر کرماں زیاں
نزد عاشق درد و غم حلوا بود — لیک حلوا بر خساں بلوا بود

حضرت رح کے ہاتھ پر بیعت ہونے کا فوری ثمرہ یہ ہوا کہ حاجی محمد خاں صاحب جن پر عرصہ دراز سے حج فرض تھا اور ارادہ بھی کرتے تھے مگر کامیاب نہ ہوتے تھے آیندہ ہی رجب ۱۳۴۵ھ میں عازم ہو گئے اور یک لخت تمامی مشاغل و ضروریات کو پس پشت ڈال کر حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے پچاس ہزار روپیہ خرچ کیا اور اس بشاشت و فراخ دلی سے کہ جس دوست بلکہ امام مسجد بنگالی طالب علم نے بھی خواہش کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلئے تو بجز بہت اچھا کے کچھ جواب نہ دیا چنانچہ گھر کے لوگ تو بیوی بڑا لڑکا لڑکی اور بہو صرف چند ہی تھے باقی احباب اور ملازمین سب ملا کر باقی سترہ نفر ہوئے جنہوں نے اس خوش نصیب بزرگ کی دریادلی سے متمتع ہو کر حج و زیارت کا وہ نفع اٹھایا ہے کہ جس کے لئے ہزاروں مسلمان ترستے ہیں

ہیں اور نصیب نہیں ہوتا۔

اسی سفر میں آپ کی لڑکی بھی ساتھ گئی اور جب سب لوگ مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت کے قریب مکان کرایہ پر لے کر مقیم ہوئے کہ خدمت میں حاضری مستورات کی آسان ہو تو لڑکی بھی بیعت ہوئیں جو اس وقت محروم رہی تھی اور اس طرح پر اس خواب کی تعبیر پوری ہوئی جو دو سال ہوئے ان کی بھاوج نے دیکھا تھا۔ حضرتؒ کے آخیر دور میں اس خاندان کے لیے آخری زیارت مقدر تھی کہ یہ سامان ہوا اور یہ لوگ کافی مدت حضرت کی خدمت میں قیام کر کے بعافیت جسمانی و ترقیات روحانی وطن واپس آئے۔ چند ہی ماہ کے بعد حضرت کے وصال کا تار آگیا اور وہ چیز ہی نہ رہی جو مقناطیس بن کر آہن قلوب کو کھینچا کرتی تھی ۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد   روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

یہ میں نے خاص طور پر دیکھا ہے کہ حضرت کو اپنے متوسلین کے متعلق حج کا خاص اہتمام رہتا اور جن پر حج فرض ہوتا ان کو تو خاص تاکید کے ساتھ فرمایا ہی کرتے کہ فریضہ حج ادا کرنے میں غفلت و سستی نہ کرو کیا خبر ہے موت کب اور کس وقت آجائے نفل حج کے لیے بھی کوئی خیال ظاہر کرتا تو حضرت اس کو پختہ فرما دیتے اور اجازت ہی نہیں دیتے بلکہ روانگی سے قبل اس سے ملنے جاتے کچھ نہ کچھ ہدیہ پیش فرماتے اکثر دہلی تک مشایعت کرتے اور رخصت کے وقت متضرعانہ لہجہ میں دعا کی اس طرح درخواست کیا کرتے تھے کہ مواقع اجابت میں مجھے بھی یاد رکھنا بالخصوص یہ دعا کہ حق تعالیٰ اس مٹی کو یثرب کی مٹی میں شامل فرمائے کہ یہی منتہائے مراد ہے۔ آج پچیس برس ہوئے کہ سنہ ۲۱ھ میں جب پہلے سفر حج کو بندہ حجاز روانہ ہونے لگا تو حضرتؒ باوجودیکہ ایام زمانی بیمار تھے اور مجھے حضرت کے ساتھ اس وقت یہ نیازمندانہ خصوصی تعلق نہ تھا مگر حضرت رخصتی ملاقات کے لیے بڑھ کر تشریف لائے اور مکہ مکرمہ میں میرے پاس حضرت کا جو خط پہنچا اس کے یہ جگر سوز الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں۔ عزیزم مجھے بھول نہ جانا۔ گو سیہ کار اس قابل نہیں مگر ہوں پیشے

کہ مدینہ منورہ کی مٹی میں ملنا نصیب ہو بس اسی دعا کی ضرورت ہے کہ حق تعالیٰ اہلیت بخشیں کرچہ اور رسول نصیب فرمائے ؎

چو یا حبیب نشینی و بادہ پیمائی　　　　بہ یاد آر محبان بادہ پیمارا

مجھے وہ مضمون ہمیشہ یاد رہا تھی کہ آپ اپنی مراد کو پہنچے اور کانوں نے سن لیا کہ حضرت عالم قدس کو سدھار کر جنت البقیع میں دفن ہوئے باوجود آپ کے کوہ استقلال ہونے کے عشق رسول کی آگ آپ کی رگ رگ میں اتنا اثر کر گئی تھی کہ آپ نے بارہا عرب کا سفر صرف اسی شوق و آرزو میں کیا کہ ہر مرتبہ آپ کی ہجرت کا شور عوام کی زبانوں پر چھا گیا آخر جب وقت آیا تو وہ پورا ہو کر رہا اور وہ آتش فراق بلقائے محبوب ٹھنڈی ہوئی جس نے آپ کو صرف ایک دروازے کا بنا رکھا تھا مجھے خوب یاد ہے آپ مولانا تھانوی کا وعظ بڑے شوق سے سنتے اور کبھی کبھی فرمایا کرتے کہ مجھے تو مولانا کے وعظ میں اس شعر پر بڑا مزہ آتا ہے ؎

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے　　　　چہ کنم کہ چشم بدخو نکند بکس نگاہے

یہ بھی میں نے دیکھا ہے کہ آپ جب اس شعر کو سنتے تو چہرے کا رنگ بدل جاتا اور وجد کی کیفیت آپ پر طاری ہوتی جس کو آپ ضبط فرما جایا کرتے۔

اسی کا اثر تھا کہ آپ اپنے دوستوں کو حج و زیارت کی خاص طور پر ترغیب دیتے اور چاہتے تھے کہ سب اس آستانہ محب و محبوب کے والہ و شیدا بنے ہوئے دنیا سے اٹھیں۔ اس اہتمام کے بیسیوں واقعات میری نظر سے گزرے جن میں ایک نمونہ حافظ ریاض الاسلام کاندہلوی کا ہے کہ ان پر حج فرض تھا مگر اس کے ادا میں بہت ہی کچھ موانع ان کو پیش تھے مگر جب حضرت نے قطعی حکم فرما دیا کہ تم کو ضرور جانا چاہیے کہ آج دم نکل گیا تو کوئی عذر بھی اللہ کے ہاں قابل سماعت نہ ہوگا تو یہ پختہ ہو گئے اور پھر ایسے پختہ ہوئے کہ ہر چند زور دیا گیا کہ اس سال ملتوی کردو مگر یہ نہ مانے اور سب قصوں کو پس پشت ڈال کر مع اہلیہ و خویش اقارب کے کہ ان پر بھی حج فرض تھا روانہ وار حج و زیارت کر کے واپس وطن آ گئے۔

حکیم عبدالغنی صاحب مقیم غازی آباد نے جو کہ اکثر حضرت کے معالج رہتے تھے آپ کی علالت سُنکر آخری زمانہ میں مدینہ منورہ ایک نسخہ لکھکر بھیجا تو آپ نے اسی کو حیلہ بناکر حاضری حرمین شریفین کی ان کو اس طرح ترغیب دی کہ خط لکھا۔

السلام علیکم۔ علاج کی صورت یہ ہے کہ امسال آپ حج کا ارادہ کریں اور رجب میں روانہ ہوکر پہلے مدینہ منورہ حاضر ہوں اور یہاں وہ تین مہینے قیام کرکے میرا علاج کریں اور پھر مکہ مکرمہ جاکر حج کرکے وطن واپس ہو جائیں۔ یہ ترکیب علاج کی ممکن ہے۔ ورنہ غیر ممکن۔ والسلام

مجھے جہاں تک علم ہے حضرت کے متوسلین میں ایک بھی ایسا نہ ہوگا جس پر حج فرض ہوا ہو اور وہ ادا نہ کر آیا ہو۔ ہاں ایسے بکثرت ہوں گے جو دو تین بلکہ چار پانچ مرتبہ اس نعمت سے مالا مال ہو آئے کہ بیت اللہ و بیت الرسول کی مخلصانہ زیارت اور قلیل وقت کی بھی محبانہ حاضری نفع روحانی میں اولیاء اللہ کی انجمن صحبت سے کم نہیں جس کے متعلق مولانا روم لکھتے ہیں ؎

صحبت نیکاں اگر یک ساعت است — بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

یک زمانہ صحبتے با اولیاء — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

الحاصل یہی نہیں کہ بریلوی خاندان نے دخول سلسلہ کی صرف برکت پر اکتفا کیا ہو بلکہ حامد یار خاں اور صدیق احمد خاں نے اکتساب بھی شروع کیا اور بحمد اللہ واردات اور انوار و تجلیات سے کامگار ہوئے۔ دونوں کی بیبیاں اور ہمشیر بھی اپنے معمولات یومیہ پر باوجود نسوانی ضعف و موانع اور طرح طرح کی مشغولیت خانہ داری کے ایسی پابند ہوئیں کہ دوسروں کو اُن سے سبق ملا۔ ایک مرتبہ حامد یار خاں نے شکایت لکھی کہ ذکر میں وہ لذت نہیں آتی جو پہلے آتی تھی اور اس لئے مراقبت دشوار ہے تو حضرتؒ نے فوراً جواب دیا۔

عنایت فرمایم حامد یار خاں صاحب سلمہ۔ السلام علیکم۔ عنایت نامہ پہنچا۔ بغور سنو۔ مقصود اصلی ذکر ہے خواہ طبیعت لگے یا نہ لگے۔ پراگندہ و منتشر ہو یا مجتمع اپنے معمولات کو ہر حال میں پورا کرنا چاہیئے۔ یہ غلط راستہ ہے کہ ذوق و شوق ہو تو ادا

پورے کئے جائیں ورنہ پورے نہ کئے جائیں ۔ ذوق وشوق نہ مقصود ہے نہ اختیاری امر ہے جو اپنا کام ہے وہ کئے جائیں ۔ اور جو تعلق ہے اس کو اسی کے سپرد رکھیں بدون دل بستگی کے ذکر پر مداومت زیادہ مفید اور موجب اجر ہے ۔ ذوق وشوق کے ساتھ ہر شخص کام کیا کرتا ہے مگر عبدیت اسی وقت معلوم ہوتی ہے کہ بلا ذوق وشوق بھی ذکر پر مداومت کی جائے ۔ عزیزی صدیق احمد صاحب کو بعد سلام مسنون مزاج پرسی کریں ۔ انشاء اللہ دو چار روز میں بخار کی شکایت رفع ہو جائے گی صحت کی بھی اطلاع فرمائیں ۔ فقط السلام ۔ خلیل احمد از سہارنپور ۲۵ ربیع الثانی ۴۴ھ

اکثر ذاکرین کو یہ مرحلہ پیش آتا ہے کہ شروع شروع قلب کو ایک حظ والتذاذ آتا ہے اور بعد میں خواہ عادت ہو جانے کے سبب یا غذا میں طبعی یا شرعی بے اعتدالی یا اختلاط ناجنس کی وجہ سے یا اللہ پاک کی طرف سے غلامی وعبدیت کے جانچنے کے لئے وہ لذت یک دم معدوم ہو جاتی ہے ۔ جس کا اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ کام سے اپنے باز نہ آئے اور سبب کو تلاش کر کے اس کی تلافی کرے نہ یہ کہ ذکر کو بے نفع سمجھ کر چھوڑ دے ۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ جیسے آقا اگر انعام دیتا رہا تو کام کیا اور کسی دن ہاتھ روک لیا تو نوکر نے بھی کار خدمت چھوڑ دیا ۔ ایسے خود غرض مزدور کی آقا کے دل میں محبت کیسے ہو سکتی ہے ۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

پھر یہ انعام کیا تھوڑا ہے کہ اپنے ذکر کی توفیق بخشی ورنہ کس کی مجال ہے کہ بغیر اس کی اجازت کے شاہی دربار میں حاضر ہو سکے ۔ لہذا اس کی توفیق کا ہر وقت طالب رہے

حافظ محمد حسین اجراڑوی نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت کیا کروں اخلاص نصیب نہیں ہوتا ۔ فرمایا بھائی یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ کی توفیق پر ہے بندہ کا اس میں کیا چارہ ۔ بہر حال کام سے باز نہ آئے جتنا کچھ ہو جائے توفیق الٰہی سمجھ کر شکر ادا کرے ہمت بلند رکھے اور دروازے سے چپکا رہے کہ کبھی تو دیکھے ہو مایوس نہ ہو ۔

اگر چہ دور افتادم بایں اُمید خورسندم ۔ کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد
ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت تہجد کو آنکھ نہیں کھلتی فرمایا بھائی ہمت کرو کہ کوئی کام دنیا کا ہو یا دین کا بغیر ہمت کے نہیں چلتا۔ اور دیکھو کہ کسی معصیت کی سزا تو نہیں ممکن ہے کھانے پینے میں بے احتیاطی ہوئی ہو یا قولی وفعلی کوئی گناہ صادر ہوا ہو۔ اگر ایسا ہے تو ضرورت ہے توبہ و استغفار کے اضافہ کی کہ ذکر پھر ذکر بڑھایا جائے نہ یہ کہ ذکر ہی چھوڑ دیا جائے کیونکہ ہے

ہر چہ بر تو آیدت ظلمات و غم ۔ آں ز بیباکی و گستاخی ست ہم
غم چو بینی زود استغفار کن ۔ غم بامر خالق آمد کار کن

اور نیز یہ تصرفات ہیں متصرف حقیقی کے جن سے اس کی کائنات کا کوئی ذرہ بھی خالی نہیں اور یہ جو کہ اس کا کوئی فعل کیسا ہی نفس کو ناگوار کیوں نہ گزرے حکمت سے خالی نہیں لہذا یہ معالجہ ہے اور مریض کو کوئی حق نہیں کہ طبیب کی دوائے تلخ سے منہ پھیرے ہے

چونکہ قبض آید تو در وے بسط بیں ۔ تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں
چونکہ قبضے آیدت اے راہرو ۔ آں صلاح تست آئیں دل مشو

بہر حال راہرو کا یہ کام ہے کہ اپنے کام کی دھن میں لگے اور مزہ و بدمزگی کو پس پشت پھینکے ہے

کار کن کار بگذر از گفتار ۔ کاندریں راہ کار آید کار

محب کی نگاہ طالب التذاذ نہیں ہوتی بلکہ اس کا مطمح نظر صرف رضائے محبوب ہے جس حال میں دیکھے وہی نعمت اور اس میں لذت ہے

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ۔ کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

شریعت کو جو کہ رضاء خالق جل شانہ کا سانچہ و معیار ہے اتنا مضبوط تھامے کہ جان قفس تن سے نکل جائے مگر یہ وصال محبوب کی رسی ہاتھ سے چھوٹے دم نکلے مگر محبوب کا نام لیتا ہوا نکلے ورنہ سلوک اور اللہ کی طلب کا نام نہ لے کہ یہ

ہر جا کہ اختصار میبایدکرد — یک کار ازین دو کار میبایدکرد
یا تن برضائے دوست میبایدداد — یا قطع نظر زیار میبایدکرد

صدیق احمد خاں نے ایک مرتبہ تہجد کی پابندی نہ ہونے کا آپ سے شکوہ کیا تو آپ کا مدینہ منورہ سے جواب آیا۔

عنایت فرمایم صدیق احمد خاں صاحب سلمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپ کا خط پہنچ کر موجب مسرت ہوا۔ آپ کے والدین اور متعلقین خیریت سے کل یہاں پہنچ گئے۔ اب انشاءاللہ تعالیٰ آٹھ دس روز میں یہاں سے واپسی ہوگی اور انشاءاللہ بخیریت پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ تم کو بھی یہ دولت نصیب فرمائے۔ تم نے لکھا کہ نماز تہجد نہیں ہوتی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تم کو ہمت اور توفیق دے۔ بات یہ ہے کہ ہر کام ہمت سے ہوتا ہے۔ جب آدمی آرام طلبی میں پڑ جاتا ہے اور دنیوی لذات کی طرف مائل ہو تو کوئی کام دینی اور دنیوی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہمت کر کے کام کرو اور اپنے گھر میں بھی میری طرف سے دعا کہو اور نیز تم کو چاہیئے کہ اپنی اہلیہ کے ساتھ اخلاق کا معاملہ کیا کرو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خیرکم خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی[1] فقط والسلام اور دوسرے خط میں اس طرح تعلیم فرمائی کہ جب انسان کسی ایک کام میں مشغول ہوتا ہے تو دوسرے کی طرف مشغولی کم ہو جاتی ہے۔ خصوصاً دین اور دنیا باہم متضاد ہیں۔ دنیا میں انہماک بشوق لقاء اللہ سے مانع ہوتا ہے۔ اور اس کے چھوٹنے کے لیے تو ایک بہانہ چاہیئے لہٰذا نہایت رغبت کے ساتھ اپنے وظائف و اوراد میں مشغول ہو جائیں حق تعالیٰ مدد فرمائیں گے۔ فقط والسلام

سید شمس الحسن گلاوٹھی سب اوورسیر ریاست ریواں نے جب عدم حصول واردات پر تاسف لکھا تو حضرت کا یہ والانامہ گیا جس کے مختصر و جامع الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں :۔

---

[1] تم میں بہترین وہ ہے جو اپنے اہل کے ساتھ خوش معاملہ ہو اور میں خود اپنی اہل کے ساتھ بہترین خوش معاملہ ہوں

عنایت فرمایم سید شمس الحسن صاحب سلمہ ۔ السلام علیکم ۔ عنایت نامہ پہنچا ۔ مژدۂ عافیت طمانینت بخش ہوا ۔ اور بحمد اللہ میں بھی مع متعلقین بخیریت ہوں ۔ الحمد للہ کہ ذکر بارہ تسبیح آپ کا استقلال کے ساتھ جاری ہے مگر آپ کی حسرت اس پر کہ حالات وواردات سے طبیعت عاری ہے موجب افسوس ہے حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ نعمت کیا کچھ کم ہے کہ اس نے اپنے لطف وکرم سے آپ کو مداومت ذکر بارہ تسبیح کی عطا فرمائی ہے ۔ ذکر منشور ولایت ہے جس کو ذکر کی توفیق دی گئی گویا فرمانِ ولایت اس کو مل گیا ۔ حالات وواردات نہ مقصود ہیں اور نہ ہر ایک کو پیش آتے ہیں ۔ یہ تو بچوں کا ایک کھیل ہے اور اس کی تمنا فضول ہے ۔ لہٰذا آپ اپنی حسن حالت پر حق تعالیٰ شانہٗ کا نہایت شکر ادا کریں اور اس نعمت عظمےٰ کو حقیر نہ سمجھیں کیونکہ شکر نعمت موجب مزید نعمت ہے اور ناشکری موجب سلب نعمت ہے ۔ حق تعالیٰ شانہٗ ناشکری سے بچائیں ۔ فقط والسلام خلیل احمد سہارنپوری یکم شعبان ۱۳۴۴ھ

دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور

دار العلوم دیوبند ہندستان بلکہ اس صدی میں دنیا کی وہ مشہور اسلامی درسگاہ ہے جس کی چار دانگ عالم میں خداداد شہرت کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں ۔ گذشتہ صدی میں قطب العالم مولانا سید احمد صاحب بریلویؒ کا مع اپنے مجاہدین گروہ کے جب اس بستی پر گذر ہوا تو آپ نے خوش ہو کر یوں فرمایا تھا کہ یہاں علم کی بو محسوس ہوتی ہے ۔ قدرت کے ہاتھوں اس ادراک معنوی کا اس طرح ظہور ہوا کہ ۱۵ محرم سنہ ۱۲۸۳ھ کو اس مدرسہ کی بنیاد پڑی اور یہ درسگاہ جو آئندہ چل کر روس وچین اور تبت و بخارا تک کے طالبان علوم کا مرجع بننے والی تھی چھتہ کی مسجد میں مختصر مکتب کی صورت میں قائم ہوئی کہ ملا محمود صاحب پندرہ مشاہرہ پر مدرس اول قرار پائے اور بستی کے اکیس (۲۱) طلبہ نے عربی پڑھنا شروع کیا ۔ اخیر سال میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول ہو کر تشریف لائے کہ اول بیس روپیہ تنخواہ ہوئی اور کچھ عرصہ کے بعد تیس روپیہ ہو گئی ۔ مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس دوم و مولانا ملا محمود صاحب مدرس سوم بنائے گئے

گئے اور نہ نام اہتمام شاہ عبد الغنی صاحب کے خلیفہ راشد مولانا رفیع الدین صاحب کے ہاتھ میں دیا گیا۔ سرپرست امام ربانی حضرت مولانا گنگوہی تجویز ہوئے اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اگرچہ ظاہری خدمت کا نام اپنے لئے پسند نہ فرمایا مگر مدرسہ کی اصل روح رواں آپ ہی کا وجود با جود تھا کہ علوم دینیہ کا شیوع آپ کی منتہائی مراد اور مدرسہ کی ترقیات آپ کے تن کے لئے گویا حیات تھی۔

قدرت نے کچھ ایسے مقبولین مخلصین افراد کو ایک جگہ جمع فرما دیا تھا جس کی نظیر شاذ و نادر دنیا نے کم دیکھی ہو اور انہیں نائبین رسالت کی توجہات کا اثر تھا کہ ایسے نازک زمانہ میں جبکہ مدرسہ جاری کرنے کا نام لینا بھی دشوار تھا سال ختم ہونے سے پہلے ہی بنارس و پنجاب اور کابل کے طلبہ جمع ہو گئے کہ امتحان کے وقت طلبہ کی تعداد اٹھتر تھی پھر جب طلبہ کی کثرت ہوئی تو مسجد قاضی کے متصل مکان کرایہ پر لیا گیا اور ۱۲۹۱ھ میں مدرسہ کے لئے مکان تجویز ہو کر ۱۲۹۳ھ میں یہ بنیاد رکھی گئی جہاں اب مدرسہ ہے اس کے بعد تو اس منبع سے علوم اسلامیہ کے وہ چشمے جاری ہوئے جس نے اطراف و اکناف عالم کے تشنگان کتاب اللہ و کتاب الرسول کو سیراب کر دیا اور دنیا کی کوئی سمت باقی نہیں رہی جہاں اس کی تعلیم کا سلسلہ نہ پہنچ گیا ہو۔

انقلاب چونکہ ہر جزو عالم کے ساتھ ایسا لگا ہوا ہے جیسے روح کے ساتھ بدن اس لئے اس کو بھی حوادث اور زلازل پیش آئے ۔ ۴ ربیع الاول ۱۲۹۷ھ میں جبکہ مدرسہ کی عمر کا چودھواں سال تھا حضرت قاسم العلوم نے بمرض ضیق النفس دنیا کو الوداع کہا اور پانچ سال بعد ۱۳۰۲ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے بمرض ہیضہ اپنے وطن نانوتہ ضلع سہارنپور میں درجہ شہادت حاصل کیا اور آخر میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ چلے گئے۔ اور آخر وصال فرما کر اپنے شیخ کے متصل قبہ عثمانی کے باہر مدفون ہوئے ۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ اس مدرسہ کے سابقین اولین طلبہ میں تھے کہ ۸۲ھ میں آپ نے کنز الدقائق اور میبذی و مختصر معانی کا امتحان دیا اور

سنہ ۱۲۸۵ھ میں ہدایہ، مشکوٰۃ اور مقامات وغیرہ کے امتحان میں شریک ہوئے پھر سنہ ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب اپنے فخرِ زمانہ استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے پڑھیں جو اس وقت میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع کی خدمت تصحیح قبول فرمائے ہوئے تھے آخر فارغ ہو کر سنہ ۸۸ھ میں اسی مدرسہ کے معین المدرسین بنے اور ۱۹ ذیقعدہ سنہ ۹۰ھ کو آپ کی دستار بندی ہوئی اور سنہ ۹۲ھ میں آپ مدرس چہارم قرار دیئے گئے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کی وفات کے بعد مولانا سید احمد صاحب دہلوی جو بالخصوص فنون ریاضیہ میں امام وقت تھے چالیس روپیہ مشاہرہ پر مدرس اول قرار پائے اور ملا محمود صاحب تیس روپیہ پر مدرس دوم۔ اس وقت حضرت شیخ الہند بمشاہرہ تیس روپیہ پر مدرس سوم ہوئے اور آپ کی جگہ مولوی عبد العلی صاحب مدرس چہارم بنائے گئے۔ دو ہی سال گذرے تھے کہ ملا محمود صاحب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اس انقلاب میں حضرت مولانا مدرس دوم بنا دیئے گئے مگر اسباق آپ کے متعلق صحاح ستہ اور بڑی کتابوں کے رہے سنہ ۹۵ میں جب مولانا سید احمد صاحب بعض مصالح سے بڑی تنخواہ پر بھوپال تشریف لے گئے تو باتفاق آراء آپ کو اسی چالیس روپیہ مشاہرہ پر مسند صدارت پر بٹھایا گیا اور مولوی عبد العلی صاحب مدرس دوم بنائے گئے۔ تین سال گذرے تھے کہ مولوی عبد العلی صاحب بھی تشریف لے گئے اور اب حضرت امام ربانی کی دوربین نظر نے حضرت رحمہ کا انتخاب فرما کر آپ کو بریلی سے بلا بھیجا۔ آپ سنہ ۱۳۰۸ھ میں تیس روپیہ مشاہرہ پر دار العلوم دیوبند کے مدرس دوم قرار پائے۔ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۹ھ سے آپ کی تنخواہ تینتیس روپیہ اور محرم سنہ ۱۳۱۲ھ سے سینتیس روپیہ کر دی گئی۔ آپ چھ سال وہاں رہ کر ۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۱۴ھ کو روانہ ہوگئے اور آپ کی جگہ مولوی عبد العلی صاحب تشریف لائے جو مدرسہ مراد آباد میں مدرس اول تھے

حضرت شیخ الہند عمر میں حضرت سے ایک سال بڑے تھے کہ آپ کی ولادت سنہ ۱۲۶۸ھ میں بمقام بریلی ہوئی جبکہ آپ کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب بسلسلۂ ملازمت مع اہل و عیال وہاں مقیم تھے۔ اس ہم عمری کے ساتھ بچپن میں کچھ دنوں ہم سبق اور ہم مکتب ہونے کا اتحاد رہا اور پھر ایک شیخ کے دامن گرفتہ اور پیر بھائی ہونے کے تعلق

نے تو اس یگانگت کو ایسا شیریں بنا دیا گویا ایک جان اور دو قالب بن گئے۔ سید شمس الحسن کا بیان ہے کہ میرے والد سید احمد حسن مرحوم دیوبند میں ہر دو حضرات کے ہم سبق رہے اور حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر رہا کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ مولانا کی والدہ کو میرے ساتھ اتنی شفقت تھی جب تک میں نہ آجاتا مولانا کو کھانا نہیں دیتی تھیں یہ بھی فرمایا کہ مولانا محمود حسن صاحب اس قدر ذہین تھے کہ طالب علمی میں کبھی مطالعہ بھی اہتمام سے نہ دیکھا مگر سبق میں کسی سے کم تیز نہ رہے اور مولانا خلیل احمد جب انبہٹہ سے آئے تو ان کے ابتدائی کتابوں کے سبق میرے سپرد ہوئے مگر وہ اتنے تیز نکلے کہ چند ہی روز میں ہمارے ہم سبق ہو گئے۔ مجھے ہر وقت کتاب کا کیڑا بنا ہوا دیکھ کر ان صاحبوں نے میرا نام چرخ رکھ دیا تھا۔ وہ وقت نکل گیا مگر اب ملنے کا جب کبھی اتفاق ہوتا ہے تو جس بے تکلفی و محبت سے ملتے ہیں وہ بیان میں آ سکنے کے قابل نہیں۔ پھر کیا پوچھنا دونوں ذہین و ذکی روحانی بھائیوں کا جنہوں نے عمر کا اکثر حصہ قریب جسمانی کے ساتھ گزارا اور طفولیت و شباب اور کہولت و شیخوخت ہر حصہ حیات میں ایک دوسرے کے شریک و غمگسار رہے۔

میرٹھ میں چودھری لیاقت علی خاں کی کوٹھی پر ایک مرتبہ ان سب حضرات کا اجتماع ہوا اور لوگوں نے خواہش کی کہ کسی طرح حضرت شیخ الہندؒ کا وعظ سنیں۔ مولوی میر شاہ خاں بولے کہ اس میں کامیابی ہو سکتی ہے تو صرف مولانا خلیل احمد کو کہ وہی ایسی ہستی ہے جو مولانا سے بزور کہہ سکتی ہے اور مولانا ان کی بات کو نیچا نہیں ڈال سکتے۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ ہم بھی ہمیشہ اسی ارمان میں رہے اور اب تک حضرت کا وعظ نہیں سنا۔ چنانچہ سب لوگ حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آج تو کسی طرح مولانا کا وعظ سنوا ہی دیجئے۔ حضرتؒ نے فرمایا بہت بہتر اور اس کے بعد مولانا کے پاس آ کر بے تکلف لہجہ میں فرمایا۔ دوستوں کی خواہش ہے کہ آج بعد ظہر کچھ بیان فرما دیجئے۔ مولانا نے جو کہ استاذ الکل ہو کر ادنیٰ طالب علم کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے فرمایا مجھے تو وعظ کہنا ہی نہیں آتا حضرتؒ نے فرمایا یہ کون کہتا ہے کہ آپ کو وعظ

کہنا آتا ہے اور آپ وعظ کہیں۔ درخواست یہ ہے کہ جس طرح مدرسہ میں بیٹھکر حدیث کا ترجمہ فرماتے ہو یہاں مسجد میں بیٹھکر کسی حدیث کا ترجمہ سُنا دو۔ حضرت مولانا کی اُس وقت عجیب حالت تھی کہ نہ اقرار کئے بن پڑتی تھی نہ انکار کئے۔ آخر جب دیکھا کہ مفر نہیں تو فرمایا اچھا مگر اس شرط پر کہ تم موجود نہ ہو۔ حضرتؒ نے فرمایا بہت اچھا مجھ سے اتنی وحشت ہے تو میں بعد نماز چلا آؤں گا۔ میری وجہ سے یہ صدہا لوگ کیوں محروم رہیں حضرتؒ مولانا مسکرا کر چُپ ہو رہے اور حضرت نے لوگوں سے کہدیا کہ جا بیٹھیے درخواست منظور ہے اور بعد ظہر مولانا کا بیان ہوگا۔ چنانچہ بعد ظہر حضرت مولانا کو منبر پر بیٹھنے کا اصرار کیا گیا مگر آپ نہ اٹھے اور جب دیکھ لیا کہ مولانا خلیل احمد صاحب سنتیں پڑھکر روانہ ہوئے تو بیچ کے در میں بیٹھکر بیان شروع فرمایا۔ میں بھی حاضر تھا کیا کہوں کہ اس سادہ ترجمہ اور پست لہجہ کی مسلسل تقریر میں کیا شیرینی تھی جسکی حلاوت زبان قلب میں آج تک موجود ہے۔ حضرتؒ نے جب دیکھا کہ وعظ شروع ہوگیا تو باہر باہر دوسرے راستہ آکر اندر دالان میں اس طرف بیٹھ گئے جدھر مولانا کی پشت تھی اور بیان ختم ہونے پر جلدی سے بالا بالا اُسی راستے اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ دوسرے وقت جب اجتماع ہوا تو حضرت نے فرمایا تم نے تو بہتیرا چاہا کہ سب وعظ سُنیں مگر ہمیں نہ سُنے لیکن ہم نے سُن ہی لیا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کس طرح؟ فرمایا ہم بھی تمہارے پس پشت ایک گوشہ میں آ بیٹھے۔ مولانا نے فرمایا پشت پناہ بننے کے لئے تم آئے کدھر سے اور وعدہ کرنے کے بعد خلاف کیسے کیا؟ فرمایا میں نے تو یہی کہا تھا کہ نماز کے بعد چلا آؤں گا۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ پھر مسجد ہی میں نہ جاؤں گا اور آخر اس کی کوئی وجہ بھی کہ عمر بھر میں ایک وعظ ہو اور وہی ہمارے کانوں میں نہ پڑے۔ غرض دیر تک انبساط کے ساتھ مزاح ہوتا رہا اور حاضرین اس کا مزہ لیتے رہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی مستقل سوانح حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب مرتب اور شائع فرما چکے اور وہی اس خدمت جلیلہ کے اہل بھی تھے۔ مجھے بھی حضرت کی خدمت میں بارہا حاضری کا اتفاق ہوا اور اب نظریں ڈھونڈتی ہیں کہ اُس بے نظیر ہستی کو جیسے

امام ربانی علم کا کھلا فرمایا کرتے تھے کہاں اور کس طرح دیکھوں۔ علم ظاہری کے لحاظ سے آپ کی شانِ محدثیت دنیا پر کھل گئی کہ کامل اڑتیس ۳۸ سال آپ نے علوم دینیہ کی اشاعت و تدریس میں صرف کئے اور کابل، قندھار، بلخ، بخارا، تاشقان، چین، تبت، المیہ اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ تک کے لوگ آپ کے شاگرد بنے بلکہ مالٹا میں ترکی و شامی بھی منتفع ہوئے کہ آپ سے مستفید ہو کر دوسروں کو فائدہ علمیہ پہنچانے والوں کی تعداد اس وقت شمار سے بیروں ہے۔ مگر آپ کے علم باطنی کا پورا ادراک بڑی ہستیاں بھی نہ کر سکیں کہ اخفا و فنائیت آپ میں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ آپ ایک حال میں ہر وقت غرق رہتے تھے جس کا خلاصہ اللہ کا بول بالا ہونے کی تمنا و سعی میں مر مٹنا ہے۔ اور باوجودیکہ آپ قد و قامت میں مختصر اور جثہ میں ضعیف و نحیف تھے مگر آپ کی ہمت اور باطنی قوت اتنی بڑھی ہوئی کہ اٹل پہاڑ کو دھکیل دینا اپنی ہمت کے سامنے کچھ دشوار نہ سمجھتے تھے ۱۳۳۳ھ میں آپ کا سفر حجاز جو آخر کار چھ سالہ مصر و مالٹا کی اسارت اور طرح طرح کی صعوبت و مشقت پر ختم ہوا جس وقت پیش آیا تو بندہ بھی حاضر تھا اور وقار و استقلال کا وہ حیرت بخش منظر دیکھ رہا تھا جو اب دنیا میں دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ چونکہ مرد و عورت یگانہ و بیگانہ ہر شخص کو خیال تھا کہ آپ ہجرت فرما کر ہندوستان چھوڑ رہے ہیں۔ اس لئے جس کو ذرا سا بھی آپ کے ساتھ تعلق محبت تھا وہ اس رخصت کو آخری زیارت سمجھ کر رو رہا تھا۔ گھر آپ کے رشتہ داروں اور کنبہ کی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر مردانہ ہی سے آپ کو ایک لمحہ کی فرصت نہ تھی کہ گھر میں جا کر صاحب فراش بی بی اور نازک دل لڑکیوں کو الوداع کہیں۔ ریل پر سوار ہونے کا وقت قریب آگیا اور آپ کو اس مردانہ ازدحام سے مہلت نہ ملی جو کئی ہزار کی تعداد میں جمع اور اضطراب کے ساتھ آپ کی آخری وصیتوں کا خواہشمند تھا۔ آخر آپ کے چھوٹے بھائی مولانا محمد حسن صاحب آپ کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے آپ کو زبردستی گھر میں لائے کہ معصوم بھتیجیوں اور بیمار بیوی کا بھی کوئی حق ہے جو صبح سے منہ دیکھنے کو تڑپ رہی ہیں۔ چنانچہ آپ نے اندر قدم رکھا تو صاحبزادیوں اور

کنبہ کی محرم عورتوں نے آپ کو گھیر لیا۔ بندہ اُس وقت دروازے پر کھڑا تھا اور عزیزوں کی اس وقت جو حالت تھی کہ گویا جنازہ گھر سے نکل رہا ہے اس پر میرا کلیجہ نکلا جاتا تھا مگر اللہ رے استقلال حضرتؒ کوہ سکوت بنے ہوئے سب کی آہ وزاری سُنتے رہے اور آخر بی بی اور بچیوں سے جو روتے روتے بیہوش ہوا چاہتی تھیں یہ کہہ کر کہ آخر شور وغل سے نتیجہ کیا؟ اب سوائے اس کے کہ میری کھال میں بھُس بھر کر رکھ جاؤ کہ ابا زندہ بیٹھا ہے اور مجھ میں کیا رہ گیا۔ آخر کیا ہمیشہ یہیں بیٹھا رہوں گا اور مروں گا نہیں؟ پس صبر کرو اور اس ذات پر نظر رکھو جو تمام عالم کا محافظ و مربی ہے۔ اپنا دامن چھڑا کر آپ چل دیئے اور السلام علیکم کہکر مردانہ میں آ گئے۔ زندگی میں موت کا منظر دیکھتے ہوئے آخری سفر کا یہ استقلال میرے لئے تو اتنا حیرت بخش ہوا کہ دیر تک مبہوت بنا کھڑا رہا مگر آپؒ کے نزدیک ایک چلتی ہوئی معمولی سی بات تھی کہ باہر آتے ہی آپ نے بیٹھک کا جس میں عمر گذری تھی قفل لگایا اور کنجی بھائی کو دے کر وہاں کمرے سے لپیٹا اور ایسی تیز سپاہیانہ چال سے پیدل اسٹیشن کو روانہ ہوئے کہ قوی و تندرست چلنے والے تھک جاتے تھے مصافحہ کی تمنا میں حاضرین نے اسٹیشن تک دوڑ دوڑ کر برا باندھ لیا تھا اس لئے آپ نے سواری پسند نہ کی اور جس وقت آپ ریل پر پہنچے تو اتنی لاتعداد مخلوق جمع تھی جس کی گنتی نہیں ہو سکتی اس کے بعد جو کچھ طائف اور سفر و مالٹا میں گذرا وہ بزبان حال یوں کہتا ہے کہ ؎

قیس و فرہاد کا قصہ تو سُنا ہنس ہنس کر ۔۔۔ اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

مگر جب آپ واپس آئے تو اس مسکراہٹ و ثبات قدم کے ساتھ واپس آئے کہ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ کو چھاتی سے لگاتے اور خوش ہو کر باتیں کرتے تھے۔ آپ حقائق کے مشاہدہ میں ہر وقت غرق رہتے اور مخلوق سے غایت درجہ انبساط برتتے مگر جب خالی بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ کسی فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ بندہ حاضر تھا آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا مولوی عاشق الٰہی ایک بات کہوں؟ ہم نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ ہندوستان میں علم کی اتنی کمی تھی کہ دور دراز سے خود ہمارے اضلاع میں بھی

جنازہ کی نماز پڑھانے والا مشکل سے ملتا تھا۔ اور آج علم کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ شہر تو شہر کوئی قصبہ بلکہ شاید کوئی گاؤں بھی ایسا نہ ہو جہاں کوئی مولوی نہ مل جائے اس کے بعد ذرا دوسرا پہلو دیکھو کہ غدر کا زمانہ گذرے کچھ مدت نہیں ہوئی کہ ابھی اُس کے دیکھنے والے بھی زندہ ہیں۔ اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ پھانسی گرم ہو رہی تھی اور ان ناکردہ مظلوموں کا پرا بندھا ہوا تھا جن کو پھانسی کا حکم دیا جا چکا تھا وہ لوگ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ایک نعش کو اتارا جا رہا اور دوسرے زندہ کو چڑھایا جا رہا ہے۔ اس طرح پر موت ان کی نظر کے سامنے تھی اور اُن کو عین الیقین تھا کہ دین پر مضبوطی ہی میرا شمار مُردوں میں ہوا چاہتا ہے۔ بایں ہمہ کوئی شخص دشمن بھی ان کے متعلق ضعفِ ایمان کا یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ کسی نے بھی موت سے ڈر کر اسلام سے انحراف یا تبدیل مذہب کا خیال کیا ہو۔ باوجود قلت علم اور غلبہ جہالت کے اُن کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ مرنا قبول تھا مگر مذہب پر حرف آنا قبول نہ تھا۔ اور آج باوجود کثرتِ علم ضعفِ ایمان کا یہ حال ہے کہ ذرا ڈنڈے کے خوف یا دو پیسہ بلکہ دو حرف انگریزی کے عطیہ کی طمع دلا کر جو چاہے کہلا لو اور جو چاہے کرا لو۔ عجیب بات ہے کہ قلتِ علم کے وقت ایمان میں اتنی قوت اور کثرتِ علم کے زمانہ میں ایمان کی اتنی کمزوری۔ اس کے بعد فرمایا سچ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ایک جگہ علامت قیامت بیان کیا علم کا کم ہونا اور دوسری جگہ فرمایا کہ قیامت کے قریب علم زیادہ ہو جائے گا۔ اہل باطن نے بغیر دیکھے نورِ فراست سے تطبیق دی تھی مگر ہم بدنصیبوں نے اُس وقت کو آنکھوں سے دیکھ لیا کہ صورت علم کثیر ہو گئی مگر حقیقت علم قلیل ہو گئی اور یہی خاص علامت ہے قربِ قیامت کی۔

ایک مرتبہ ایسے ہی تفکر سے افاقہ پا کر فرمانے لگے مولوی عاشق الٰہی میں غور کیا کرتا ہوں ابھی چند سال ہوئے چند دن میں اتنی قلت تھی کہ دو دو چار چار پیسے بھی قدر کے ساتھ لیے جاتے تھے اور مدرسین و طلبہ کو چھپر کے سایہ میں بیٹھنا بھی نعمت معلوم ہوتا تھا۔ بایں ہمہ علماء ایسے تیار ہوتے تھے کہ باید و شاید۔ آج ہم ہیں کہ دکھی ہو کر

کھاکر پڑھنے والوں کی بدولت دین کا ماہتاب چمک رہا ہے۔ اور اب چندوں کا یہ حال ہے کہ ریاستوں سے ہزار ہا روپیہ مقرر اور امراء و متمول تاجروں سے کثیر کثیر رقمیں آتی ہیں۔ مگر نہ علم میں وہ برکت ہے نہ حال اور عمل میں وہ اخلاص۔ مدارس کو دیکھو تو تعمیرات زائدہ میں ترقی اور عالیشان عمارتوں کی بھرمار۔ طلبہ کو دیکھو تو ہر طرح امراء جیسے باورچی خلفے اور اس پر بھی ان کو شکایت اور اعتراض۔ آہ زمانہ ہی پلٹ گیا۔ ظاہرداری ہر جگہ بڑھ گئی اور بطن واندروں ہر چیز کا جاتا رہا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ پہلے جو نتیجہ پیسوں میں نکلا وہ آج ہزاروں روپیہ میں بھی نہیں نکلتا۔ ذرا سکوت فرماکر خود ارشاد فرمایا کہ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اس زمانہ میں حلت حرمت کا اہتمام مسلمانوں کے قلوب سے جاتا رہا اور حب مال نے بھر دیا کہ روپیہ کمانے کی فکر میں حدود شرعیہ کا تذکرہ بھی لوگوں کو ناگوار گذرنے لگا ہے اس لئے پہلے جو کچھ مدرسوں میں آتا تھا اگرچہ مقدار میں قلیل ہوتا تھا مگر حلال خالص اور محنت و ریاضت کا کمایا ہوا بابرکت آتا تھا۔ لہٰذا اس کے ثمرات بھی شیریں اور بابرکت مرتب ہوتے تھے۔ اور آج گو مقدار میں کثیر آتا ہے مگر اس میں اکثر حصہ وہ ہوتا ہے جس میں شریعت کے جواز و عدم جواز کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ لہٰذا وہ یہاں آکر بھی یا مٹی میں ملائے جانے کے قابل ہوتا ہے اور فضول تعمیرات میں خرچ ہوجاتا ہے یا زوائد امور میں صرف ہوجاتا ہے چھٹ چھٹا کر جو حلال بچتا ہے وہ تو تعلیم میں صرف ہوتا ہے مگر وہ اقل قلیل ہے لہٰذا علم موثر عمل کا ثمرہ بھی اقل قلیل صدق اللہ العلی العظیم الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات والطیبات للطیبین والطیبون للطیبات حضرت پیران پیرؒ فرماتے ہیں اے لوگو میں تمہارے مصارف دیکھ کر مداخل کا پتہ چلا لیتا ہوں کہ

مـ: درس کے لئے راحت کا مکان یا طلبہ کے قیام کی جگہ جس کا نام دار الطلبہ ہے علاوہ اس کے کہ مہمانان رسول کا احترام واکرام اور راحت رسانی ہے علی نگرانی پر قدرت اور تحقیر سے تحفظ کا سبب ہونے کے سبب اصل ضرورت میں داخل ہے ۱۲

تمہارا پیسہ حرام جگہ صرف ہوا دیکھتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ ضرور حرام طریق سے حاصل ہوا تھا لہذا مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ اور مباح جگہ صرف ہوتا دیکھتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ جائز صورت سے کمایا گیا تھا اور اگر خاص اہل اللہ پر یا عین خوشنودی خدا کے مواقع پر خرچ ہوتا دیکھتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ صرف اباحت ہی نہیں بلکہ طاعت ورضائے حق کے ساتھ حاصل کیا ہوا تھا۔ پس جیسا بیج ویسا درخت اور جیسا تخم ویسا اس کا پھل۔ عوام شکایت تو کرتے ہیں کہ اب علماء ایسے کیوں نہیں جیسے پہلے تھے مگر اس پر غور نہیں کرتے کہ ان کا کمایا ہوا پیسہ جو مدرسوں میں آتا ہے ویسا خالص اور پاک نہیں ہے جیسا ان کے بزرگوں اور اسلاف کا تھا۔ وہ اپنا کسب مال اللہ کی مرضی کے موافق کریں اور اس کو طلبہ کی خورد ونوش بنائیں تو پھر علماء پہلے سے دیندار محتاط اور مخلص اللہ والے خاشع وخاضع تیار ہونے کیا دشوار ہیں۔ الحاصل حقائق علمیہ جن کا مرتبہ کشوف کونیہ سے بدرجہا ارفع واعلیٰ ہے ہر وقت آپ کے قلب پر وارد ہوتے اور موقع موقع پر آپ اس کا اظہار بھی فرماتے رہتے تھے۔ قدرت نے آپ کو اس صدی میں ایک خاص خدمت علم وعمل کے لئے پیدا کیا تھا اس لئے اس وقت سے جبکہ آپ بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے آپ کو شجاعت اور اپنے آقا پر جان نثاری کا مادہ آپ کے قلب میں موجود تھا۔ آپ کو بچپن سے شکار کا شوق تھا۔ مگر نہ اس لئے کہ طرح طرح کے گوشت کا مزہ چکھیں بلکہ اس لئے کہ قوی مسلمان کو ضعیف مسلمان پر فوقیت ہے اور اسلام چاہتا ہے کہ جس صورت سے مسجد کے ملا ہو کہ نماز کی صف میں دلق پوش مسکین بنے کھڑے ہو اسی طرح میرت وہمت سے شہسوار سپہ سالار ہو کہ امارت وقیادت کی لوا ہاتھ میں دے دی جائے تو اس کی حرکت دشمنوں کے دل ہلا دے۔ بغاوت تو بڑی چیز ہے اپنی سرکار کے خلاف کبھی وسوسہ بھی آپ کو نہیں گذرا مگر آپ کی اس جامعیت کے سبب بدظنوں کو طرح طرح کے خیالات قائم کرنے کا موقع ملا اور ہوا جو کچھ ہوا کہ آپ کے مراتب میں ترقیات ہوئیں اور دنیوی جاہ کے ساتھ آپ کا اخلاص آخر کو اس دنیوی جاہ واقتدار کا بھی سبب ہوا جس نے آپ کے مخالفوں سے بھی آپ کی مدارج کرادی ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء

کو آپ دنیا سے رخصت ہوئے مگر اس طرح کہ دنیا کے جم غفیر کو اپنا والہ و شیدا بنا کر اور علمی و عملی ایسی یادگار چھوڑ گئے جو عرصہ دراز تک قائم رہے گی - وفات کا مادہ تاریخ یہ ہے ع عالم کی موت جان لو عالم کی موت ہے

وصال سے دو دن قبل بندہ حاضر ہوا تو ضعف کی وجہ سے آپ کو کروٹ بدلنا دشوار تھا اور اکثر غشی طاری رہتی تھی مگر جب خادم نماز کا وقت ہو جانے کی اطلاع دیتا تو آپ ایسے مستعد ہو جاتے تھے گویا تندرست ہیں میری موجودگی میں عصر کا وقت آیا اور خادم نے آپ کے کان کے قریب منہ لا کر کہا کہ نماز کا وقت ہو گیا تو آپ نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور اشارہ کیا کہ مجھے بٹھادو۔ چنانچہ دو آدمیوں نے آپ کو اٹھا کر بٹھایا اور تیمم کرایا اس کے بعد پلنگ کے نیچے مصلے پر آپ کو کھڑا کر دیا اور آپ نے اشارہ سے فرمایا کہ اب چھوڑ دو سہارے کی ضرورت نہیں میں مجسم حیرت بنا ہوا دیکھ رہا تھا کہ ضعیف جثہ جس سے پہلو بدلنا دشوار تھا کس ہمت کے ساتھ ظاہری سہارے کے بغیر ایسا چست کھڑا ہے گویا مضبوط سپاہی ہے جس کو پہرہ پر تعینات کیا گیا ہے چونکہ آپ دہلی میں بغرض علاج ٹھہرے ہوئے تھے اس لئے قصر نماز پڑھی اور دوسری رکعت پر جب سلام پھیرا تو بے اختیارانہ گاؤ تکیہ پر سر رکھ دیا اور دیر تک بات یا اشارہ بھی نہ فرما سکے۔ بس وقتی طاقت تھی جو صرف نماز کے فرض ادا کرنے کے لئے بجلی کی طرح بدن میں جاری ہوتی اور سلام پھیرتے ہی نکل جاتی تھی کہ پھر وہی ضعف دبا لیتا اور آپ کو فرش پر گرا دیتا تھا۔

تو در و گم شد وصال این است و بس ‌ ‌ گم شدن گم کن کمال این است و بس

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست ‌ ‌ از کجا مے آید این آواز دوست

حضرت رحمۃ اللہ علیہ شریف حسین کی شورش میں جب واپسی ہندوستان کے قصد سے چلے تو حضرت شیخ الہند طائف میں تھے اور جب آپ مکہ معظمہ آئے تو معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد صاحب چلے گئے مگر با انتظار جہاز جدہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو آپ اونٹ پر سوار ہو کر جدہ آئے اور محض رخصتی ملاقات کے لئے شگستان عرب کا وہ راستہ

قطع کیا جس کو حجاج مجاہدہ سمجھتے ہیں۔ آخر ہجرت سے قیام فرما کر آپ ادھر روانہ ہوتے کہ اسیر نالۂ بن کر بہت کچھ حاصل کرنا مقدر تھا اور حضرتؒ ادھر آئے کہ یثرب کی مٹی پیوستہ ہونے سے قبل چند علمی و عملی صدقات جاریات کی تکمیل کرنا باقی رہ گئی تھی اور آخر چند سال کے اندر عالم برزخ میں پھر دونوں حضرات ایک لوا کے نیچے محشور ہوتے کے لیے جمع ہو گئے کہ رنگ جدا جدا تھا مگر مقصود واحد ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش — من انداز قدت را می شناسم

دارالعلوم دیوبند کے مدرس دوم ہونے کی حیثیت سے مسلم شریف کا سبق حضرتؒ کے پاس خاص التزام سے رہا اور آپ اس کا اتنا اہتمام فرماتے تھے کہ دوپہر کو وقت معمول سے پہلے آپ خانقاہ سے مدرسہ میں تشریف لاتے اور نودرہ میں طلبہ کے ساتھ نماز باجماعت پڑھ کر سبق شروع فرما دیتے۔ بارش کے موسم میں پائنچے چڑھا کر خانقاہ سے چلتے اور کبھی ایسا نہ ہوتا کہ معمولی عذر پر مدرسہ تشریف نہ لائیں توضیح تلویح اور ہدایہ اخیرین کے اسباق بھی آپ کے پاس رہتے اور ادب کی کتابیں بھی آپ ہی کے سپرد ہوا کرتی تھیں۔ چھ سالہ مدت قیام میں جس قدر طلبہ نے دارالعلوم میں دورۂ حدیث پڑھا وہ سب آپ کے شاگرد ہیں جن میں مشہور یہ ہیں۔ مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری مولوی ولایت حسین صاحب دیورہ ضلع گیا۔ مولانا صدیق احمد صاحب مہاجر مدنی برادر مولانا حسین احمد صاحب۔ مولانا محمد یٰسین صاحب شیرکوٹی۔ مولوی گل محمد خان صاحب مدرس حال دیوبند اور مولوی انتظار حسین صاحب سہسپوری۔

وہ زمانہ حاجی عابد حسین صاحب دیوبندی کے اہتمام کا تھا اور میران کے اضافہ کی آڑ میں کچھ ایسا فتنہ برپا ہوا جس نے اہل مدرسہ کو پریشان کر دیا کہ کچھ اہل شہر بھی مخالفین میں شریک ہو گئے اور اتنا زور دیا گیا کہ یا ہماری خواہش کے موافق ہو ورنہ مدرسہ استبداد کی بدولت بند ہو جائے گا۔ شرپسند اوباشوں کی دھمکیاں جدا تھیں اور حکام رسی کے ناز پرسیٹ کو مغلوب کرنے کا دعویٰ جدا تھا کہ ہمدردان مدرسہ کو یہی اندیشہ تھا مدرسہ آندھی کے جھونکوں سے متزلزل ہو جائے گا مثل مشہور ہے "ملا کی دوڑ مسجد" ان روحانی

بھائیوں نے بھی آخر اپنی پریشانی وبیکسی کا اظہار بذریعہ تحریر اپنے باپ سے کیا جو مر
سرپرست بھی تھے تو یہ تسلی بخش جواب آیا جو استقامت کا مجسمہ اور شفقت کی تصو
اس خط کا فوٹو لے کر اعلیٰ کاغذ پر طبع بھی کر دیا گیا ہے کہ جن کو حضرت گنگوہیؒ کی تحر
بجنسہٖ دیکھنے کا شوق ہو وہ زیارت کر سکیں اور یادگار بنا کر پاس رکھ سکیں کہ اب نہ وہ
باقی ہے نہ تحریر کرنے والا قیمت ۲/ ہے از بندہ رشید احمد عفی عنہ۔ برادران مکرم جناب
مولوی محمود حسن صاحب و مولوی خلیل احمد صاحب مدفیوضہما بعد سلام مسنون مطالعہ فر
آپ دونوں کے چند خطوط پہنچے جس سے وہاں کا حال معلوم ہوتا رہا۔ آج مولوی خلیل ا
صاحب کا خط آیا جس سے پریشانی مدرسین کی دریافت ہوئی لہٰذا یہ تحریر ضرور ہوئی م
پیارے دوستو تم کو کیوں اضطراب و پریشانی ہے۔ تم تو مومن متوکل علی اللہ ہو خ
پر قانع رہو اور مدرسہ سے آپ کو فقط اتنا تعلق ہے کہ درس دیئے جاؤ۔ اگر مدرسہ
حق تعالیٰ کرا دے گا تم اپنے گھر بیٹھ رہنا۔ اگر مفتوح رہا درس میں مشغول رہنا جو تم
درس کرانا اہل شہر کو منظور نہ ہوگا تو دوسرا باب مفتوح ہو جائے گا۔ تم کس واسطے پریشا
ہوتے ہو۔ خبر بھی مت ہو کہ کیا ہو رہا ہے اپنا کام کئے جاؤ۔ تمہارے برابر تو کسی کے
دیا نہیں چلتے۔ تم کیوں بے دست و پا اپنے آپ کو لکھتے ہو جس کام کے تم ہو اس
تکرار نہیں۔ اب فقط نزاع یہ ہی ہے کہ اہل شوریٰ کی زیادت ہو تمہارا کیا حرج۔
تم اپنا کام کرو حاجی صاحب مصلحت کا کام کرتے ہیں۔ وہ اپنی تدبیر میں رہیں خو
کچھ ہو ہماری تمہاری مرضی کے موافق ہو یا مخالف۔ اور اہل شوریٰ خود منصب اختیا
حاجی صاحب کو دے کر مطمئن ہو گئے تو تم پر کیا بار ہے۔ بس تم جیسے لوگوں سے تر
کا ہونا بے موقع ہے۔ تم کسی امر میں لب کشا مت ہو۔ کوئی پوچھے تو جواب دو کہ ا
کے باب میں ہم سے پوچھو جو ہمارا کام ہے انتظام وغیرہ کو نہ ہم جانیں نہ ہم دخل دیں
اندیشہ بدمعاشاں بھی کیوں کرو۔ اس شعر حضرت شیخ المشائخ قدس سرہٗ کو مدنظر رکھو

قصد ظالم بسوئے کشتن ما   دل مظلوم ما بسوئے خدا
او دریں فکر تا بما چہ کند   ما دریں فکر تا خدا چہ کند

یہ ان روز ازل مقدر ہو چکا ہے ذرہ ذرہ جو واقع ہو گا مدرسہ کے امور میں بھی بس وہ ہی ہو گا اور ہو کر رہے گا خواہ کوئی دفع کرے یا واقع کرے پھر تم کیوں مشوش ہوتے ہو۔ ہر چہ از محبوب رسد شیریں بود۔ ہم کون ہیں؟ بے اختیار محض ہیں۔ اگرچہ بظاہر مختار ہیں۔ ہم پر جو گذرے گا وہ عین لطف ہو گا اور جو عالم میں فساد ہو گا وہ عین مصلحت ہو گا خواہ خرابی مدرسہ ہو یا بقا خواہ عزت و نصب ہمارا تمہارا ہو خواہ ذلت و عزل۔ تم یہ سب وقائع بازیگر کے سانگ سمجھ کر اپنے درس کے شغل میں بسر کرو۔ این و آں کو زید و عمر پر چھوڑ دو۔ ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔ نہ کوئی مفسد کچھ کر سکے نہ کوئی مصلح کر سکتا ہے سب فاعل مختار کرتا ہے وما تشاءون الا ان یشاء اللّٰہ ع

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ✤ کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد وھو ارحم الراحمین

بس تمام ہوا قصہ وہاں کی خیر کا مشتاق ہوں بشر ہوں اپنے دوستوں کا دعا گو خیر طلب ہوں۔ تم کو کوئی گزند نہیں مطمئن رہو۔ نہ مدرسہ کہیں جائے۔ ہر شخص کو اپنے اپنے خیال پر نازاں جان کر کالائے بد بریش خاوند کرد اور دم بخود ہو کر می لوتل و می نیوش و چیزے مخروش۔ فقط۔ سب عزیزوں کو بعد سلام مسنون یہ ہی مضمون جان بخش بعد سلام مسنون فرما دیں۔ جو دوستان اہل تدبیر ہیں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں بعد سلام مسنون مضمون شکر و رضا ان سے کہہ دیں۔ اور جس کو چاہو سلام کہو۔ بنا نیہ وقت اور یہ شورش اہل فساد عین مصلحت ہے اس کا جس قدر غلغلہ ہو گا اسی قدر مفید ہو گا۔ انجام بخیر ہی خیر واسب دوائم رہے گا۔ رشید احمد[۱]

مدرسہ آخر اللہ کا کام تھا اور اللہ کی چیز تھی اس لئے آندھیاں خوب خوب چلیں مگر اوپر ہی اوپر زور دکھا کر فنا ہو گئیں۔ اور بگولے شور و غل مچاتے رہے مگر اپنے ہی چکر میں گھوم کر تمام ہو گئے کہ مدرسہ کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ بلکہ شعبان ۱۳۱۰ھ میں اہتمام

---

[۱] حضرت گنگوہی کے اس والا نامہ کا فوٹو طبع کرایا گیا تھا جس کی چند کاپیاں موجود ہیں گویا ہو بہو حضرت کی تحریر ہے جن پوتوں کو اپنے دادا کی روشن تحریر دیکھنے کی تمنا ہو وہ جلد طلب کریں قیمت ۸ھ ہے

منشی فضل حق صاحب کے نام تبدیل ہو کر شورش کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا اور آخر ۱۳۱۰ھ میں منشی صاحب مستعفی ہوئے تو مولانا محمد منیر صاحب مہتمم مقرر ہوئے اور آخرکار ۱۳۱۳ھ میں زمام مدرسہ بانی مدرسہ کے جگر گوشہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے ہاتھ میں آئی جو اس وقت مدرسہ کے مدرس سوم تھے اور ان کی تحریک حضرت نے فرمائی تھی۔

میاں صاحب مولانا سید اصغر حسین دیوبندی تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں بزمانہ اخیر حضرت رح نے مہتمم صاحب مرحوم کے متعلق اپنے اخلاص و محبت کے ذکر میں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ فرمایا کہ حافظ احمد صاحب رح کے اہتمام کے متعلق حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں سب سے اول میں نے تحریک کی تھی اس وقت تک کسی کو خیال بھی نہ تھا اور یہ فرمایا کہ تحریک ہی کر کے نہیں چھوڑ دی بلکہ حسب موقع یاد دہانی اور تائید بھی کرتا رہا۔ احقر نے عرض کیا کہ یہ حضرت کی بصیرت صادقہ تھی کہ ایسا عمدہ انتخاب فرمایا جس سے دارالعلوم کو اتنی ترقی ہوئی۔ نیز فرمایا کہ بعض لوگوں کی نسبت مجھے معلوم ہوا تھا کہ حضرت گنگوہی کی خدمت میں میری نسبت کچھ پہنچا کر حضرت کے اعتماد و تعلق کو کم کرنا چاہتے ہیں لیکن واقعی امر یہ ہے کہ یہ سب ایسی ہی معمولی سماعی باتیں تھیں۔ یقین کے ساتھ کبھی معلوم نہیں ہوا کہ میری نسبت کسی نے ایسا ارادہ یا معاملہ کیا ہو اور اب الحمد للہ میرے دل میں کسی کی طرف سے کوئی خلش اور شکایت نہیں۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی: میرے دل میں آئی اور میں پڑھنا چاہتا تھا ونزعنا ما فی صدورھم من غل۔ (یعنی اہل اللہ کے قلوب سے رنجش باہمی نکل جانے کا مصداق اور وقوع بعض دفعہ دنیا ہی میں ہو جاتا ہے)۔

حضرت صورت اور سیرت میں اپنے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رح کے بہت مشابہ تھے۔ اسی تحریک اہتمام کے زمانہ میں کسی نے حضرت سے کہا کہ آپ سعی تو کر رہے ہیں مگر حافظ صاحب کے مہتمم ہو جانے کے بعد آپ مدرسہ میں نہیں رہ سکتے کہ وہ آپ کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتے جس نگاہ سے ان کے باپ نے آپ کے ماموں کو دیکھا، مگر آپ مسکرا دیئے اور فرمایا کہ میں رہوں یا نہ رہوں مدرسہ ترقی و عروج کے زینہ پر چڑھتا

رہے کہ میرے لئے دوسرا دروازہ مفتوح ہو جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی تنخواہ کی خاطر مدرسہ کی ترقی کا خیال چھوڑ دوں۔ اس کے بعد کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی اور آخر آپ نے اپنے کو کامیاب دیکھ لیا کہ مدرسہ کا اہتمام حافظ صاحب کے ہاتھ سے نہ نکلا یہاں تک کہ ۲۴ جمادی الاول ۱۳۰۷ھ میں خود حافظ صاحب نے دنیا کو چھوڑ دیا اور حیدر آباد سے واپسی میں کہ مدرسہ ہی کی ضرورت کے لئے سفر کیا تھا اسٹیشن نظام آباد پر انتقال فرما کر حیدر آباد کے مقبرہ متعلقہ صالحین میں دفن ہوئے۔

قدرت کو منظور تھا کہ دونوں تخیف الجثہ قوی القلب حضرات کے فیضان ظاہری و باطنی کا جدا شیوع ہو اور ہر ایک اپنے اپنے استاد کے لگائے ہوئے باغ کا مستقل باغبان بنے اس لئے آپ کو دیوبند چھوڑنا پڑا جس کی صورت یہ ہوئی کہ آپ کے استاد حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کہ مدرسہ کی روح رواں تھے (آپ ہی کے نام پر مدرسہ کا نام مظاہر علوم رکھا گیا ہے) ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ کی شب میں مرض درد گردہ وصال فرما گئے۔ تو آپ کی جگہ بٹھانے کے لئے مدرس اول کی تلاش ہوئی ۱۳۰۳ھ میں مولوی عبدالعلی صاحب کو کہ مدرس دوم تھے قائم مقام مدرس اول بنا دیا گیا مگر ۱۳۰۷ھ میں مولانا رحمت ہے کر مراد آباد گئے اور وہاں سے استعفا بھیج دیا۔ تو مولوی احمد علی صاحب میرٹھی جو کہ مدرس دوم تھے اور مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کے صاحبزادے مولانا حبیب الرحمن صاحب جن کا جدید تقرر ہوا تھا ایک درجہ میں رہے کہ مدرس اول کسی کے نام پر نہ لکھا جاتا اور کیفیت میں اندراج نام کے لئے تقدم و تاخر کی بھی رعایت نہ ہوتی تھی۔ ۱۳۱۰ھ میں مولوی احمد علی صاحب کو مدرسہ سے علیحدہ کر دیا گیا اور اب مولانا حبیب الرحمن کے نام پر مدرس اول لکھا جانے لگا۔ ربیع الاول ۱۳۱۱ھ میں مولوی حبیب الرحمن صاحب ایک ماہ کی رخصت لے کر حیدر آباد گئے اور وہیں معقول تنخواہ پر قیام فرما کر سہارنپور استعفا بھیج دیا۔ تب ممبران مدرسہ نے حضرت گنگوہی کی خدمت میں زور کے ساتھ درخواست کی کہ مولانا خلیل احمد صاحب دیوبند میں مدرس دوم ہیں یہاں ان کو مدرس اول بنا کر بھیج دیا جائے کہ دونوں مدرسے حضرت ہی کے زیر سرپرستی ہیں چنانچہ حضرت نے

منظور فرما کر مولانا کو لکھدیا اور آپ ۴ جمادی الثانیہ ۱۳۱۴ھ کو خیر و برکات کے مظہر ثانی بنکر مظاہر علوم میں تشریف لے آئے۔ اس وقت مدرسین کی تنخواہیں حسب ذیل تھیں حضرت[1] مولانا خلیل احمد صاحب مدرس اوّل چالیس[40] روپیہ مولانا[2] عنایت الٰہی صاحب مہتمم و مدرس بیس[20] روپیہ مولانا[3] ثابت علی صاحب مدرس پندرہ[15] روپیہ مولوی[4] محمد اسلم صاحب مدرس دس[10] روپیہ۔

ہر چند کہ سال کے ختم ہونے میں صرف دو[2] مہینے باقی تھے مگر اس میں بھی آپ کی تعلیمی کارگذاری کافی سے زائد ہوئی کہ جو کتابیں ناتمام رہ گئی تھیں ان کو ختم کرایا اور چند کتابیں از ابتدا تا آخر پڑھائیں۔ توضیح[1] تلویح از ص۱۸۸ تا ص۲۴۰ دیوان[2] حماسہ از ص۱ تا ص۳۲ رشیدیہ[3] از ص۲۲ تا ختم شرح[4] وقایہ جلد دوم از ص۲۷۲ تا ختم موطا[5] امام مالک از اول تا کتاب الصوم موطا[6] امام محمد تمام شرح[7] نخبہ از ابتدا تا ص۳۰ اور سراجی[8] از ابتدا تا ص۱۹

دوسرا سال ۱۳۱۵ھ شروع ہوا تو دورۂ حدیث کی اکثر کتابیں اور ادب و منطق وغیرہ کے مختلف بڑے اسباق آپ کے سپرد ہوئے اور ختم سال پر آپ کے تعلیمی نقشہ میں کتب ذیل کا اندراج ہوا۔ بخاری[1] شریف تمام۔ ابوداؤد[2] شریف تمام۔ ترمذی[3] شریف تمام مسلم[4] شریف تا ص۱۲۳ شرح[5] نخبہ تمام۔ شرح[6] عقائد مع خیالی تمام۔ حسامی[7] تا ص۱۲۶ مقامات[8] حریری ۲۵ مقامہ جلالین[9] تمام ایضاً دوبارہ تمام سلم[10] العلوم تصورات ملا حسن[11] تمام میر زاہد[12] رسالہ تمام غلام یحییٰ[13] تمام حمد اللہ[14] تا ص۷۹ مطول[15] تا ص۱۱۱ اور تلخیص[16] المفتاح تا ص۵۰۔

قلت تنخواہ کی وجہ سے آپ نے اہل و عیال کو دیوبند ہی میں اپنے پاس بلا لیا تھا کہ علیحدہ رہنے میں گذر مشکل تھا۔ چنانچہ سہارنپور تشریف لائے تو یہاں بھی متعلقین ساتھ آئے۔ دیکھنے کو تو سہارنپور میں پانچ روپیہ آپ کی ترقی ہوئی مگر خرچ اتنا بڑھ گیا کہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے آپ کی تنخواہ خرچ ہو جایا کرتی کہ وطن قریب تھا اور رشتہ داروں کی آمد و رفت بکثرت ہونے لگی۔ ادھر گنگوہ کا قرب ہوا اور آپ کے اپنے ہادی و مرشد کی زیارت کا شوق ہر جمعہ کو حاضری پر مجبور کرنے لگا۔ پھر مروت و سخاوت آپ کے خمیر میں ملی ہوئی تھی اس لئے اس مقدس سفر میں جتنے رفقا آپ کے ساتھ ہوتے ان سب کا کرایہ آپ خود

دینے کی کوشش کیا کرتے۔ سہارنپور چونکہ ضلع تھا گنگوہ وانبہٹہ اور دیوبند کا اس لئے کوئی واقف یا عزیز کسی شہری یا عدالتی ضرورت سے بھی آتا تو آپ گوارا نہ فرماتے کہ سرائے میں ٹھہرے یا بازار سے کھائے۔ پھر ما شاء اللہ کنبہ کثیر اور برادری کا جتھہ پڑا تھا۔ اس لئے تقریبات غمی و شادی میں اپنی اور اہل وعیال کی شرکت کو بھی آپ حسن معاشرت اور صلہ رحمی کے درجہ میں ضروری سمجھتے تھے۔ کہ یہ شیریں تعلقات انجام کار ہدایت واصلاح کا سبب بنتے ہیں۔ ان تمامی وجوہ سے آپ تنگدست رہے مگر آپ کے استقلال اور توکل نے کسی پریشانی کا کبھی اثر نہ لیا۔ اور یہ فکر تو پاس بھی نہ پھٹکا کہ کہیں دوسری جگہ زیادہ تنخواہ پر جائیں یا کسی ریاست سے وظیفۂ اعانت کے خواہشمند ہوں۔ جب قرض کچھ بڑھا تو جدی ترکہ میں آپ کو جو کچھ ملا تھا اس کا کوئی جزء فروخت کر کے سبکدوشی فرمالی اور اپنے تعلیم کے کام میں اتنے مستعد ہو کر مشغول رہے کہ ماتحت مدرسوں پر بھی اس کا اثر پڑتا اور وقت مقررہ سے حاضری میں ذرا بھی کسی کو دیر ہوتی تو وہ حضرت کو موجود اور پڑھانے میں مشغول دیکھکر خود شرما جایا کرتا تھا۔ وقت کا انضباط اور معمول پر مداومت آپ کے لئے کچھ ایسی طبعی شے بن گئی تھی کہ آندھی ہو یا مینہ، صحت ہو یا مرض، عسر ہو یا یسر کچھ ہی کیوں نہ ہو جو ارادہ آپ کرتے یا وعدہ فرمالیتے جب تک، بالکل ہی مجبور نہ ہو جائیں کسی بڑے سے بڑے مانع ومزاحم سے بھی متزلزل نہ ہوتے تھے۔ ایک بار حضرت مولانا تھانوی مدرسہ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ موضع بٹ پورہ کے ایک مخلص نے حضرت کی مع خدام اور حضرت مولانا تھانوی کے سب کی دعوت کر دی۔ جس کو حضرت نے قبول فرمالیا۔ کہ اخلاص اور فقر کی آپ بہت زیادہ رعایت اور قدر فرمایا کرتے تھے۔ دوسرے دن کے لئے ایک سہارنپوری تاجر نے تمام مجمع کو مدعو کیا۔ اور حضرت نے وعدہ فرمالیا کہ بہتر ہے۔ صبح کو انشاء اللہ واپس آجائینگے اور دوپہر کا کھانا تمہارے یہاں کھائیں گے۔ شام کو گاڑی گئے اور شب کو قیام فرمایا۔ صبح کو روانگی کا وقت آیا تو ایسے زور کی بارش کہ چند قدم چلنا مشکل۔ مگر حضرت کے ارادہ میں تزلزل نہ آیا۔ اور ہر چند ہی اہل موضع کا اصرار ہوا کہ ایسی حالت میں حضرت سفر نہ فرمائیں۔ مگر حضرت نے فرمایا نہیں بھئی آج دوپہر کی دعوت فلاں شخص کی قبول کر چکے اور وعدہ ہو

چکا ہے کہ صبح کو آئیں گے۔ غرض چل دیئے اور خوب بھیگتے ہوئے چھتری اسٹیشن پر آکر ریل میں سوار ہو گئے۔ اسٹیشن سہارنپور پر اتر کر گاڑی میں بیٹھے آرہے تھے کہ راستہ میں وہ تاجر ملے اور حضرت نے گاڑی فوراً ٹھہرا کر ان کو اطلاع دی کہ ہم لوگ حسبِ وعدہ پر آگئے ہیں۔ وہ پریشان ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت بارش اتنی زور کی تھی کہ مجھے آپ کے واپس تشریف لانے کی بالکل امید نہ تھی ہذا اس لئے میں نے کچھ سامان نہیں کیا۔ اب کل صبح کی دعوت ہے۔ مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ اس وقت حضرت کا حلم اور میرا غصہ دیکھنے کے قابل تھا۔ مگر بوجہ ادب کے غصہ ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ اور مولانا نے یہ بھی منظور فرما لیا۔ حالانکہ حضرت خود ہمارے ساتھ واپس آرہے تھے اور گھر والوں کو اطلاع تھی کہ آنے والے مجمع کی دعوت ہو چکی ہے۔ مگر آتے ہی حضرتؒ نے کھانے کا انتظام فرمایا۔ اور سارا مجمع تا وقت حضرت کا مہمان ہوا۔ اگلا دن ہوا تو حضرتؒ حسبِ وعدہ داعی کے گھر جانے کو تیار ہوئے۔ مگر میں نے کل کے غصہ کی وجہ سے انکار کر دیا اور ظاہری عذر کیا کہ سویرے بھوک نہیں لگتی۔ اور دیر ہو جانے سے ریل نہ ملے گی۔ اور مجھے کل وطن جانا ضروری ہے حضرت مزاج شناس تھے اور بات کو سمجھ چکے تھے مگر ساتھ ہی صاحبِ تدبیر بھی تھے۔ اور ہر دو مخالف پہلوؤں کو سنبھالا کرتے تھے۔ اس لئے سفارش فرمائی کہ شریک تو ہو جاؤ اگر رغبت ہوئی تو کھا لینا ورنہ اصرار نہ ہوگا۔ چنانچہ مولانا شریک ہوئے اور تھوڑی دیر بعد اجازت لے کر بغیر کھائے روانہ ہو گئے۔ مگر صاحبِ دعوت کو مکان سے باہر ساتھ لاکر خوب سرزنش کی اور کان کھولے کہ بزرگوں کے حلم و تواضع سے مغرور ہو کر ایسی نامعقول حرکت پھر نہ کریں۔

ایک مرتبہ حضرتؒ نے میرٹھ تشریف لانے کے لئے وقت مقرر فرما کر خط کے ذریعہ مجھے اطلاع دی۔ اتفاق سے تمام رات اتنی شدید بارش رہی کہ گھر سے نکلنا مشکل تھا۔ میں نے اسٹیشن پر حاضری کا قصد کیا تو دوستوں نے احمق بنایا کہ ابر اتنا غلیظ و وسیع ہے کہ یہ موسلا دھار مینہ سو سو میل سے کم نہیں۔ ایسی حالت میں حضرتؒ کا گھر سے چلنا وہم میں بھی نہیں آتا۔ بالخصوص جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی محرکِ سفر نہیں

ہے۔ ہر چند کہ دل میرا بھی مانتا تھا کہ اسی حالت میں سفر ہرگز نہ ہوگا۔ مگر بارہا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وعدے پہ جاڑ اور کپکپی کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لئے محض واہمہ پر چل نکلا۔ اور شدت بارش کی وجہ سے کوئی سواری بھی نہ ملی۔ تو پیدل روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن پر پہنچتے ہی گاڑی آئی اور حضرت رح نظر آئے کہ کھڑکی سے منہ نکالے جھانک رہے ہیں۔ میں نے اپنی حاضری پر اس وقت حق تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کیا اور حیران ہو گیا کہ مجھ کو جوان ہو کر اسٹیشن تک آنا مشکل تھا۔ اور حضرت رح بڑھاپا پیری سہارنپور سے سفر کر رہے اور وقت موعود پر پہنچ رہے ہیں۔ وہم ہو کہ شاید سہارنپور میں بارش کا یہ زور شور نہ ہو مگر حضرت رح نے گاڑی سے اترتے ہی سینہ سے لگا کر فرمایا کہ تو نے کیوں تکلیف کی۔ بارش تو چلتے وقت وہاں اتنی تھی کہ دروازے سے باہر آنا مشکل تھا۔ مگر وعدہ کر چکا تھا۔ خیال ہوا کہ دوستوں کو انتظار کی تکلیف ہوگی اس لئے بند گاڑی کرایہ کی منگا کر اسٹیشن پر آیا اور جوں توں کر کے سوار ہی ہو گیا۔

حافظ قمر الدین صاحب نے اپنی لڑکی کے عقد میں حضرت کو شامل کے مدعو کیا اور حضرت رح نے باوجودیکہ اماں جی ضعف پیری اور مرض کے سبب چند قدم چلنے سے بھی معذور تھیں۔ مگر حافظ صاحب کے ساتھ محبت پورا نہ ہونے کے سبب منظور فرما لیا۔ اتفاق سے ایک دن قبل بذریعہ تار آپ کو اطلاع ملی کہ آپ کے چھوٹے بھائی مولوی رشید احمد جو دہلی میں زیر علاج تھے سخت بیمار ہیں۔ اور آپ کا پہنچنا ضروری ہے۔ اس تار پر آپ فوراً تیار ہو گئے۔ اور شرکت نکاح کے وعدہ کا فوراً انتظام فرمایا کہ اماں جی اپنے بھائی حاجی مقبول احمد کے ساتھ وقت معینہ پر غازی آباد روانہ ہو جائیں۔ دہلی سے جس وقت گنجائش پاؤں گا وقت پہ غازی آباد پہنچ لوں گا۔ گاڑی شام کو جانے والی تھی۔ اس سے پہلے آپ نے مدرسہ کے اسباق پڑھائے۔ اور پھر اسٹیشن پر پہنچ کر ریل میں سوار ہو گئے۔ آپ کی روانگی کے بعد دوسرا تار آیا کہ بھائی رشید احمد کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ تار بھی آپ کو اسٹیشن پر پہنچا دیا گیا۔ جبکہ آپ ریل میں بیٹھ چکے تھے۔ بھائی کی وفات کا صدمہ اور اس پر یہ فکر مزید کہ بی بی بچے محض علاج کے لئے دہلی آئے ہوئے تھے کس قدر پریشان ہوں گے کہ دفن کفن کا انتظام بھی پردیس میں بیوہ اور یتیموں کو مشکل ہوگا۔ بایں ہمہ آپ وعدہ نہ بھولے اور مزید تاکید فرمائی کہ مقبول احمد سے کہہ دینا کہ اپنی بہن کو

لے کر وقت پر غازی آباد پہنچ جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ حافظ قمر الدین کو پریشانی ہو۔ حزن اور فکر ورنگ کے ساتھ یہ حیرانی جدا تھی کہ گاڑی بارہ بجے شب کو دہلی پہنچے گی۔ اور مرحوم کے قیام کی جگہ بھی معلوم نہیں۔ کہ کس مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے موسم بھی سردی کا ہے کہ سب اپنے لحافوں میں مکانات کے اندر پڑے سوتے ہوں گے۔ کسی کو آواز دینا اور پتہ کرنے کے لئے جگانا بھی مشکل۔ مگر آپ کا استقلال ہر جگہ آپ کو تھامتا اور کہتا تھا کہ جیسا بھی کچھ پیش آئے گا دیکھا جائے گا۔ چنانچہ آپ دہلی پہنچے اور اس کوچہ میں قدم رکھا جس کا نام تار میں لکھا تھا۔ مگر وہاں آدم نہ آدم زاد۔ رات اندھیری اور نہ کوئی دوکان کھلی ہوئی نہ مکان جگہ جگہ گنٹے اور کنکر پڑا ہوا تھا۔ اور آپ تنہا تھے۔ ایک جگہ ٹھوکر کھائی اور گھٹنے میں چوٹ بھی آئی۔ مگر آپ اس خیال میں آگے بڑھتے رہے کہ کوئی نظر آئے۔ تو کچھ اتہ پتہ معلوم ہو۔ دیر کے بعد آپ کو ایک واقف کا مکان نظر آیا۔ اور آپ نے دروازے پر دستک دے کر ان کو جگایا۔ وہ باہر آئے تو حضرت کو کھڑا دیکھا اور کہا کہ بھائی رشید احمد کو تو دفن بھی کر چکے اور ان کی بی بی اور بچیاں علی گڑھ روانہ ہو گئیں۔ یہ سنتے ہی حضرتؒ نے علی گڑھ جانے کا عزم کر لیا۔ اور ہر چند انہوں نے عرض کیا کہ حضرتؒ آرام فرمالیں مگر آپ نے فرمایا کہ وقت بہت کم ہے۔ کل شام کو مجھے ایک عقد میں غازی آباد شریک ہونا ہے۔ اور اس سے قبل بیوہ اور یتیم بچیوں کو دیکھ لینا۔ اس لئے آپ فوراً واپس ہو گئے۔ اور آخر شب میں جانے والی گاڑی سے علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ ۱۰ بجے مکان پر پہنچے۔ اور یتیم بھتیجیوں کے سر پر ہاتھ رکھا۔ بیوہ کو تسلی دی اور مرحوم بھائی کے مرض وفات اور انتظام دفن و کفن کے حالات پوچھتے رہے۔ دو گھنٹہ بعد گاڑی غازی آباد واپس آتی تھی۔ اس لئے آپ نے جاتے ہی فرمادیا کہ وعدہ کر چکا ہوں بعد عصر ایک نکاح میں شرکت کا۔ اس لئے اس وقت ٹھہر نہیں سکتا اور ہر چند بچیوں کا اصرار ہوا کہ رات کو چلے جانا۔ مگر آپ اپنے نظام اوقات کو نہ توڑ سکے۔ تمام ضروری انتظامات فرما کر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وقت سے قبل اسٹیشن پہ پہنچ گئے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کوئی میلہ ہے اور سواریوں کی اتنی کثرت ہے کہ سیکنڈ کلاس میں بھی جگہ ملنا ناممکن۔ اس پر بھی آپ نہ گھبرائے اور

ارادہ میں تذبذب نہ لائیے ۔ فوراً سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا۔ گاڑی آئی تو درحقیقت کشاکشی کی یہ حالت کہ الاماں الاماں سیکنڈ کلاس میں بھی گھسنے تک کی جگہ نہیں۔ آخر بدقت تمام آپ اندر پہنچے اور بیت الخلا سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ گاڑی چل کر جب دو اسٹیشن نکل لی تو آپ نے دیکھا کہ مسافر زیادہ اترنے اور تھوڑے چڑھتے ہیں اس لئے گاڑی جب ٹھہری تو آپ اترے اور ڈیوڑھے ۔۔ یہ میں کچھ جگہ پا کر اس میں آ بیٹھے کہ سیکنڈ کلاس میں تنگی کے ساتھ ناجنسوں کی معیت زیادہ کوفت کا سبب تھی۔ وہیں آپ نے وضو کر کے نماز پڑھی اور عصر سے کچھ بعد آپ غازی آباد پہنچ گئے۔ بندہ بھی چونکہ شریک عقد تھا۔ اور اکثر کو حضرت کی شرکت سے مایوس پا رہا تھا۔ مگر یقین کئے ہوئے تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو حضرت جب شرکت کا وعدہ فرما چکے تو اپنی انتہائی کوشش میں حبہ برابر کمی نہ فرمائیں گے۔ اور وقت پر ضرور پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ مغرب کی جماعت کھڑی ہوا چاہتی تھی کہ حضرت کا چہرہ مبارک نظر آیا۔ اور بلبلیں اس گلاب پر قربان ہونے لگیں۔

دو چار دس بیس نہیں بلکہ صدہا واقعات ایسے ملیں گے جن میں ہر واقعہ اس کی مستقل شہادت ہے۔ کہ پابندئ وقت اور ایفاء وعدہ کا اہتمام آپ کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔ اور کوئی صعوبت کیسی ہی دشوار کیوں نہ ہو آپ کی ہمت اور حوصلہ کو داب نہیں سکتی تھی۔ پھر کیا پوچھنا حاضری مدرسہ اور پابندئ اسباق کا جو کہ آپ کا فریضۂ منصب اور سارے کاموں میں اصل تھا۔ کہ اس کی پابندی نے تو تمام ملازمین مدرسہ کو وقت کا پابند بنا دیا تھا۔ اور بغیر اس کے کہ کوئی نگرانی کرے ہر چھوٹا بڑا اپنے وقت پر مدرسہ میں موجود اور خدمتِ مفوضہ میں مشغول نظر آتا تھا۔ آپ کا غایت مقصود یہ تھا کہ تمامی نصاب سال بھر کا ہر مدرس کے پاس ایسے ماہواری اوسط سے پورا ہو کہ ختم سال پہ نہ کوئی سبق بچے اور نہ آخر سال میں ختم کتاب کی خاطر زیادہ زیادہ سبق ہو کہ پڑھنے والوں کی سمجھ میں بھی نہ آسکے۔ آپ کی تقریر مختصر اور جامع ہوتی تھی۔ صاف اور عام فہم لفظوں میں عبارت کا ترجمہ کرتے اور مطلب سمجھایا کرتے تھے۔ آواز زیادہ اونچی نہ تھی مگر پھر بھی پچاس ساٹھ طلبہ کے دائرہ تک بآسانی پہنچتی تھی۔ مفہوم عبارت سمجھانے

کے بعد آپ طلبہ کو شبہ اور اعتراض کا موقع دیتے اور پھر مسکرا کر اس کا جواب دیا کرتے تھے۔ بات کرتے ہیں آپ کے دہن سے پھول جھڑتے اور تقریر گویا موتیوں کی لڑی ہوتی تھی۔ آخیر عمر میں آپ کی آواز مرتعش ہوگئی تھی۔ مگر تسلسل و حلاوت وہی تھا جو جوانی کے زمانہ میں تھا۔ بڑے درجے کی پندرہ سولہ ضخیم کتابوں کا ختم سال سے قبل تمام کرا دینا آپ کے لئے معمولی بات تھی۔ اور کامل چھ سات گھنٹے درس دینا اور دماغ و زبان سے مسلسل کام لئے جانا آپ کی عادت بن گیا تھا۔ درس سے فارغ ہو کر آپ فتاویٰ نویسی میں مشغول ہوتے اور اس کے لئے بھی جو وقت مقرر کر لیا تھا اس میں تخلف نہ ہوتا۔ پھر آئے ہوئے خطوط کے جوابات جدا تھے۔ اور اس کا بھی اس قدر التزام و اہتمام تھا کہ جس خط کا جواب نہ آئے۔ اس کا یقین ہو جاتا تھا کہ پہنچا نہیں۔ بالخصوص جن خطوں میں ٹکٹ رکھا ہوتا اس کا جواب تو جلد سے جلد لکھواتے تھے کہ بار امانت سے سبکدوشی ہو۔ ضروری سے ضروری کام آپ مدرسہ کا وقت ہو جانے پر ملتوی کر دیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ گھر میں اناج یا آٹا نہیں اور مدرسہ کا وقت آگیا تو آپ مدرسہ میں آجاتے اور منتظر رہتے کہ کوئی دوست آجائے تو اس سے آٹا منگوا کر گھر میں پہنچا دیا جائے۔ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی نظر نہ آتا یا آپ مشغولیت میں بھول جاتے اور جب فارغ ہو کر کھانے کا وقت آتا تب آپ کو خیال ہوتا کہ آٹا تو تھا ہی نہیں روٹی کہاں پکی ہوگی۔

سنہ ۱۳۱۴ھ سے آخیر عمر تک کا تعلق مظاہر علوم سے رہا اور کامل اکتیس برس آپ نے ایک جگہ بیٹھ کر علوم دینیہ کی خدمت تدریس میں صرف کئے کہ ۲۹۱ طلبہ فارغ التحصیل ہو کر مدرسہ سے سند لے کر رخصت ہوئے۔ جو ہندوستان کے تمام اطراف میں اور حجاز و یمن تک پھیلے کہ بحر خلیل کی انہار جاریہ بن کر ملکی خشک زمین کو سیراب کریں۔ اور قیامت تک یہ سلسلہ کہ ایک ایک مستفید سو سو کو عالم بنا کر آبیاری ارض یابس کے قابل بناسکے۔ اس بے شمار اور ان گنت تعداد میں پہنچ گئے ہیں جس کا علم بس اللہ ہی کو ہو سکتا ہے۔ اور وہ سب کارنامے حضرتؒ ہی کے نامۂ اعمال میں درج ہوتے رہیں گے۔ والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثوابا و خیر املا۔

سنہ ۱۲۸۹ھ سے ۱۳۱۴ھ تک منگلور، بھوپال، بہاولپور، سکندرآباد، بریلی اور دیوبند کی پچیس سال تک تدریس علم و نفع رسانی خلق کو تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ رکھا جائے تو صرف مدرسہ مظاہر علوم کے صدقات جاریات آپ کے اتنے کثیر در کثیر ہیں کہ ان کی نظیر اس صدی میں بمشکل ملے گی۔ اور ایک ایسے شخص کے لئے جو اس کا سچا طالب ہو کہ بندے کو دنیا میں آکر کیا کرنا چاہیے۔ آپ کی سوانح بتائے گی کہ بس اس تعلیم کی اشاعت میں مرمٹنا چاہیے جو خالق جل شانہ کی طرف سے سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہم تک پہنچی اور اسی کی خدمت میں یہ سانس گزار دینے چاہئیں۔ جو لمحات مہلت بناکر مولیٰ کریم کی طرف سے ہم کو عطا ہوئے ہیں۔ کہ یہی ہر وقت کا شغل ناز اور فخر کے قابل ہے ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اور باوجود دینی خدمات میں فنا ہو جانے کے کبھی اس کا وسوسہ بھی نہ آیا کہ آخرت کا ذخیرہ کچھ جمع ہو گیا۔ جب فرمایا چشم نم ہو کر یہی فرمایا کہ دوستوں کے حسن ظن پر جی رہا ہوں کہ شاید کسی کے طفیل مغفرت ہو جائے اور حق تعالےٰ اپنے صلحاء کے حسن ظن کی لاج رکھ لے ؎

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنم منت شناس ازو کہ بخدمت بگذاشتت

ایک مدرسہ کی تاریخ کا پہلا ورق تھا کہ مولانا سعادت علی صاحب فقیہ سہارنپوری کے قلب میں دینی مدرسہ جاری کرنے کا خیال ہوا اور یکم رجب کو محلہ قاضی میں آپ نے اس کی بنیاد رکھی۔ مولوی سخاوت علی صاحب انبہٹوی کو تیرہ ۱۳ روپیہ ماہوار پر مدرس بنا کر بٹھا دیا۔ اور مولوی عنایت الٰہی صاحب و حافظ قمر الدین صاحب کو کہ مولانا سعادت علی صاحب سے عربی پہلے سے پڑھا کرتے تھے۔ مدرسہ کا ابتدائی طالب علم بنایا۔ جن کو مولوی سخاوت علی صاحب نے نحو میر شروع کرائی اور خود مولانا نے بلا تنخواہ مدرسہ کی سرخدمت کو تنہا انجام دیا۔ پھر مولانا احمد علی صاحب نے معاونت فرمائی اور تین ماہ

یعنی توانی ۱۲۸۳ھ میں مولانا محمد مظہر صاحب صدر مدرس مقرر ہوئے۔ تو مولوی سخاوت علی صاحب مدرس دوم ہو گئے۔ اس ابتدائی سرنامہ کو دیکھئے اور ایک اس وقت کو جبکہ حضرتؒ نے سفر حجاز کے لئے ڈیڑھ سال کی رخصت لی اور مدرسہ کو اپنے تلامذہ خدام کے حوالے فرما کر ۱۱ شوال ۱۳۱۴ھ کو عرب سدھارے کہ مالی اور علمی ترقیات میں اس عروج پر پہنچ چکا تھا۔ جس نے ابتدائی زمانہ کو ایسا بنا دیا تھا جیسے یوسف علیہ السلام کے شاہ مصر بن جانے کے زمانہ میں آپ کے کنعان سے نکل کر بازار مصر میں آنے کا وقت کہ پہلا زمانہ دیکھنے والا اگر اس حالت کو اچانک دیکھے تو برادران یوسفؑ کی طرح یہ بھی نہ سمجھے کہ ہم جس کا نظارہ کر رہے ہیں اس سے کچھ سابق تعارف ہے یا نہیں۔ اس درمیان میں مدرسہ کو مختلف حوادث و انقلابات پیش آئے جن کا پیش آنا دنیا میں آنے والی ہر چیز کے لئے ضروری ہے۔ اور جن کے مفصل حالات مدرسہ کی سالانہ کیفیت میں درج ہیں جو اب تک مدرسہ کی یادگار بنی ہوئی رکھی ہیں۔ مگر بحمداللہ...... وہ عروج جو حضرت کے ہاتھوں مدرسہ کے لئے روز ازل میں مقدر ہو چکا تھا۔ کسی حال ہبوط پذیر نہ ہوا اور ایسی علمی اسلامی یادگار بن کر صفحۂ ہستی پر موجود ہے۔ جس کو بعض امتیازی خصوصیات کے لحاظ سے اس وقت دنیا میں بے نظیر کہنا بے موقع نہیں کہ علمی افادہ کے ساتھ اب تک طلبہ کے عملی حالات پر بھی اہتمام کے ساتھ نظر رہتی ہے اور تمامی[ے] موجودہ مدرسین حضرت ہی کے تلامذہ و مریدین ہیں۔ اور ان کی مخلصانہ و متوکلانہ معیشت اس وقت نمونۂ سلاف ہے۔ کہ قلیل تنخواہ پر اس اہتمام و شوق کے ساتھ خدمات مفوضہ انجام دیتے ہیں۔ جو دوسری جگہ کثیر تنخواہیں لینے والے بھی انجام نہیں دیتے۔ کیونکہ دیکھ چکے ہیں کہ ان کے پیشوا نے تنگی معاش کی مختلف صعوبتیں اٹھائیں۔ مگر قرض لینا بھی گوارا نہ کیا۔ جو اثر پڑا وہ آپ کے بطن و جسد پر پڑا۔ مگر مدرسہ سے ایک وقت غیر حاضر رہنا یا ایک سبق پر بھی فاقہ کے ضعف و اضمحلال کا اثر ڈالنا آپ کو پسند نہ آیا۔ بڑے بڑے زلزلوں میں بھی آپ

ے بجز ایک مدرس ابتدائی شعبہ کے کہ ان کو تلمذ بیعت حاصل نہیں گو محبت و عقیدت مثل تلامذہ ہے ۱۲

مدرسہ سے نہ ہلے اور اپنے نفس یا اہل وعیال کی خوش عیشی کی خاطر آپ نے محلہ سے بھی باہر قدم نہیں نکالا۔ ہاں مدرسہ کی خاطر آپ نے نہ گرمی دیکھی نہ سردی نہ ضعف پیری کا خیال کیا نہ رمضان کی تعطیل اور روزوں کی دشواری کا۔ نہ ریل کے سفر سے گھبرائے نہ جہاز کے سفر سے۔ رانڈیر۔ بمبئی۔ رنگون۔ بہاولپور اور ڈیرہ اور جوناگڑھ جیسے مقامات بعیدہ مدرسہ کو نفع پہنچنے کی طمع پر آپ کے لئے اس بڑھاپے کے زمانہ میں ایسے تھے جیسے سہارنپور سے انبیٹھہ یا دیوبند۔ سنہ ۳۰ھ تک کامل سولہ برس آپ کو گزرے کہ آپ کی تنخواہ میں ایک روپیہ کی بھی ترقی نہیں ہوئی ہاں جمادی الثانیہ سنہ ۳۱ھ میں جب تمام ہی ملازمین مدرسہ کو ترقیاں دی گئیں تو آپ کی تنخواہ میں بھی دس روپیہ کا اضافہ کر دیا گیا جس کو آپ نے بادل ناخواستہ قبول کیا اور فرماتے رہے کہ چالیس روپیہ ہی کے قابل کام کرنا مشکل ہے۔ اب پچاس روپیہ کے قابل کام کس طرح انجام دوں۔

سنہ ۲۵ھ سے چونکہ حضرتؒ پر نظامت مدرسہ کا بار پڑ گیا اور مدرسہ ہی کے ساتھ آپ کو گویا عشق تھا اپنی ضروریات کے لئے آپ کو اسفار پر مجبور کرنے لگا تھا اس لئے دو متضاد خدمتوں کا بیک وقت انجام دینا آپ کو دشوار ہوا ہر چند آپ نے کوشش کی کہ اسفار سے واپس آکر اسباق مافات کی تلافی کر دوں مگر وقت میں ربڑ کی خاصیت نہیں ہے کہ بڑھانے سے بڑھ سکے اس لئے آپ قادر نہ ہوسکے۔ جمادی الثانیہ میں آپ نے دیکھا کہ سالانہ امتحان کا صرف ایک مہینہ باقی ہے اور دورہ کی کتابیں سب ناتمام ہیں۔ ادھر اسفار کی وجہ سے آپ کی طبیعت بھی ناساز ہوگئی کہ ہمت بھی فرمائیں تو پورا نہیں کر سکتے اس لئے آپ نے گنگوہ سے مولوی محمد یحییٰ صاحب کو بلوایا کہ قائم مقام بن کر ناتمام کتابیں ختم کرا دیں۔ چنانچہ رجب سنہ ۲۶ھ میں مولانا آئے اور ۸ روز میں کتابیں باحسن وجوہ ختم کرا کر واپس تشریف لے گئے سنہ ۲۷ھ میں بھی یہی صورت پیش آئی اور مولانا ممدوح نے کہ بارگاہ گنگوہ کے پیش کار ہو چکے تھے، وقت سے حضرتؒ کے خاص محبوب اور لاڈلے تھے ناتمام کتابوں کی تکمیل کرائی اور حضرتؒ کی تنخواہ باضابطہ وضع ہونے دی۔ آخر حضرتؒ نے دیکھا کہ اسفار کی ضرورت روز افزوں ہے اور

بار بار اس عاجز ناظم کا اہتمام دشواری سے خالی نہیں لہٰذا مولانا کو مجبور کیا کہ مدرسہ میں مستقل قیام کریں اور دورہ کے اسباق قبول فرمائیں۔ چنانچہ مولانا کو حضرت کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی اور جمادی الاول ۱۳۲۰ھ میں مستقل قیام فرما کر حضرتؒ کو راحت پہنچائی کہ جس وقت بھی جہاں جانے کی ضرورت ہو حضرت آزادی کے ساتھ جائیں اور اپنے متعلقہ اسباق کے ساتھ حضرتؒ کے اسباق بھی مولانا پڑھائیں، مگر مولانا کی شرط یہ تھی کہ تنخواہ نہ لوں گا چنانچہ ہر چند ہی سرپرستان مدرسہ کا اصرار ہوا مگر آپ نے اس کو منظور نہ کیا۔ ہاں جب حضرتؒ سفر میں جاتے اور قائم مقام بن کر حضرت کے اسباق پڑھاتے تو وہ تنخواہ وصول فرماتے اور مکان پر جا کر ان ہی کے حوالے کر آتے تھے۔ چنانچہ حضرت کا چوتھا سفر حج بمعیت مولانا شاہ زاہد حسین صاحب رئیس بہٹ ۱۳۲۸ھ میں ہوا وہ اسی صورت سے ہوا کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب نے پانچ مہینے قائم مقام بن کر حضرتؒ کے اسباق پڑھائے اور ہر مہینہ تنخواہ وصول کر کے ان ہی کو پہنچاتے رہے کہ وہ اس سفر حج میں حضرتؒ کے ہمراہ نہ تھیں یہی وجہ ہے کہ تمام سال کی تنخواہ کیفیت میں حضرت کے نام درج ہے اور حضرت بلا تردد یہ تنخواہ لیتے رہے ورنہ اصالتاً مولانا محمد یحییٰ صاحب نے خدمت درس پر کبھی ایک حبہ بھی نہیں لیا اور یہ ان کی مخصوص اور امتیازی شان تھی۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے اور حضرت گنگوہیؒ سے نسبت رکھنے والوں میں شاید کوئی ایسا ہو جو مولانا سے واقف نہ ہو۔ ان کا تاریخی نام بلند اختر تھا اور وطن اصلی کاندھلہ ضلع مظفر نگر۔ ان کے والد مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ دہلی کے آخری بادشاہ ظفر کے سمدھیانہ میں بچوں کی تعلیم پر ملازم تھے جو غدر کے بعد شاہ نظام الدین میں رہتے اور اس تقریب سے مولانا بھی وہیں مقیم تھے۔ مولانا کا جدی نسب حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب سے اور مولوی مظفر حسین صاحب سے چھٹی پشت مولوی محمد شریف پر اس طرح جا ملتا ہے کہ مولوی محمد یحییٰ بن محمد اسمٰعیلؒ بن غلام حسین بن حکیم کریم بخش بن حکیم غلام محی الدین بن مولوی محمد ساجد بن مولوی محمد فیض بن مولوی

محمد شریف بن مولوی محمد اشرف بن حبیب اللہ محمد شاہ دین بابر بن شہاب الدین بن شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل بن شیخ قطب شاہ۔

مولانا کی والدہ بی صفیہ بنت مولوی ضیاء الحسن بن مولوی نور الحسن بن مولوی ابوالحسن بن مفتی الٰہی بخش بن شیخ الاسلام وہ حافظ قرآن بزرگ تھیں جن کے حیرت انگیز معمولات یومیہ پہلے درج کر چکا ہوں کہ مولانا مظفر حسین بن مولانا محمود بخش بن شیخ الاسلام کی نواسی اور امی مرحومہ کی بیٹی تھیں۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب فطرتاً ذہین و ذکی اور طبعاً اور لطیف المزاج پیدا ہوئے تھے۔ ان کی والدہ فرمایا کرتی تھیں کہ میرے دودھ کم تھا اس لئے بچی کو مرضعہ نے دودھ پلایا مگر حالت یہ تھی کہ اس کے کپڑے اگر میلے ہوتے تو بچی رویا کرتا اور دودھ نہ پیتا تاوقتیکہ وہ نہا کر کپڑے نہ بدل لیتی۔ آپ نے سات برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا تھا اور اس کے بعد چھ مہینے تک مسلسل اپنے والد کی طرف سے مامور رہے کہ جب تک قرآن مجید پورا حفظ نہ پڑھ لو گے روٹی نہ ملے گی ناں ختم کے بعد تمام دن چھٹی۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ میں عموماً ظہر سے قبل پورا کلام مجید ختم کر لیا کرتا اور پھر کھانا کھا کر چھٹی کے وقت میں اپنے شوق سے فارسی پڑھا کرتا تھا۔ حفظ قرآن کے زمانہ میں بھی آپ نے باپ سے پوشیدہ فارسی کے بہت سے دواوین و قصص از خود دیکھ لئے تھے اور باوجود اس کے حفظ قرآن کے سبق پر اثر نہیں آنے دیا۔ چھ مہینے گذرنے پر باپ نے عربی شروع کرائی اور خود ہی پڑھائی آپ کے والد اکابر اہل اللہ میں سے تھے وظائف کے زیادہ پابند اور تہجد کا خاص اہتمام فرمانے والے اس لئے مولانا کو اور آپ کے بڑے بھائی مولوی محمد صاحب کو تاکید طویل نفلیں پڑھتے مگر مولوی یحییٰ صاحب چند مختصر نوافل پڑھ کر کتاب دیکھنے میں لگ جاتے کہ طبیعت اس پر مجبول تھی مولانا فرمایا کرتے تھے کہ والد صاحب کو وضو کے اوراد کا خاص اہتمام تھا اور ہم پر بھی اصرار تھا کہ پابندی کریں مگر مجھے علم کی دھن تھی اس لئے میں وضو کرتا ہوا بھی فارسی اور عربی کے حاشیے یاد کیا کرتا تاکہ والد صاحب دیکھیں تو سمجھیں کہ دعائیں پڑھ رہا ہے۔ گو مولانا مرحوم کے طور پر فرمایا کرتے تھے خوب وضو کی دعائیں پڑھی

جائز ہی ہیں شرم کی بات ہے۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب کی علمی استعداد اور علوم نقلیہ کے ساتھ فنون عقلیہ کی مہارت تامہ اس نوعمری میں مسلم و مشہور ہونے کے ساتھ علماء عصر میں حیرت کی نظروں سے دیکھی گئی کہ بڑوں بڑوں کو مولانا سے علمی مکالمہ کرنے میں تحیر تھا مگر اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اکثر کتابیں آپ نے خود دیکھی ہیں اور استاد سے بہت ہی کم پڑھی ہیں عربی ادب میں آپ کو اتنی مہارت تھی کہ نثر اور نظم دونوں بے تکلف لکھتے مگر یوں فرمایا کرتے تھے کہ تمام ادب میں استاد سے میں نے صرف مقامات حریری کے ۹ مقامے پڑھے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ استاد نے کہہ دیا تھا میرے مکان کو آتے جاتے راستہ میں پڑھ لیا کرو اس لئے میں ساتھ جاتا اور راستہ میں پڑھا کرتا اور اکثر جگہ استاد فرمادیا کرتے کہ اس لفظ کے معنی مجھے معلوم نہیں خود دیکھ لینا۔ یہ ادب کے استاد شیخ الہند کے بھائی حکیم مولانا محمد حسن صاحب دیوبندی تھے اور اس لئے آپ ان کا ہمیشہ احترام بھی بہت کرتے اور استاد کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔ محض اسی کی خاطر مولانا کا چند روز دیوبند قیام رہا کہ نصف مقامہ یا کچھ زیادہ روانہ ہو جایا کرتا۔ نو مقامے پڑھ کر آپ وہاں سے کاندھلہ آگئے اور وطن کے مدرسہ عربیہ میں مولوی یداللہ صاحب سنبھلی سے کہ معقولات میں مشہور تھے منطق کا سبق شروع کردیا مگر وہ علم ادب سے ناواقف تھے اس لئے ایک گھنٹہ مولوی محمد یحییٰ صاحب ان سے حمد اللہ پڑھا کرتے اور ایک گھنٹہ مولوی یداللہ صاحب آپ سے مقامات حریری پڑھا کرتے تھے۔

فرماتے تھے کہ حمد اللہ میں نے ۱۸ دن میں پڑھا کہ ظہر کے بعد اس کا سبق ہوتا تھا۔ اس لئے صبح ہی میں حمد اللہ اور اس کے حواشی لے کر مطالعہ دیکھنے کو نانی اماں کی چھت پر جا بیٹھتا اور ۱۲ بجے اتر کر روٹی کھایا کرتا تھا بسا اوقات حمد اللہ کے سبق میں استاد سے بحث ہو جاتی کہ میں جو مطلب سمجھا ہوتا وہ اس کو غلط بتاتے اور دوسرے عنوان سے تقریر فرماتے تھے۔ میں کہہ دیا کرتا تھا کہ مطلب تو یہی ہے جو میں عرض کر رہا ہوں مگر گفتگو مقامات کے گھنٹہ میں رہنے دو ورنہ میرا سبق ناقص رہ جائے گا۔ آپ فرمایا کرتے

تھے کہ سُلّم مجھے ازبر یاد تھی اور تسبیح نے کہ میں نے اس کی عبارت کو از اول تا آخر دو دو سو مرتبہ پڑھا ہے۔

ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے دیکھا ہے کہ ادب کی اکثر درسی کتابیں مولانا محمد یحییٰ نے محض اپنے حافظہ سے لکھ کر طلبہ کو دے دیں اور چلتے پھرتے نہایت بے پروائی کے ساتھ پڑھائی ہیں چنانچہ نفحۃ الیمن متنبی اور حماسہ تمام ان کے لکھے ہوئے اب بھی موجود ہیں منطق اور ادب کے علاوہ باقی کتابیں آپ نے دہلی میں مدرسہ حسین بخش میں پڑھیں مگر حدیث پڑھنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا کیونکہ یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ دہلی میں حدیث پڑھنے سے آدمی غیر مقلد ہو جاتا ہے فرمایا کرتے تھے کہ میرے بھائی مولوی محمد صاحبؒ نے چونکہ حدیث گنگوہ میں پڑھی تھی اس لئے میں حضرت کا معتقد تھا اور میں نے ٹھان لی تھی کہ حدیث پڑھونگا تو گنگوہ میں پڑھونگا ورنہ نہیں پڑھوں گا مگر زمانہ وہ تھا کہ حضرت امام ربانی کی آنکھوں میں نزول ماء شروع ہو چکا اور حضرت نے دورہ کا درس بند فرما دیا تھا۔ یہاں امتحان کا وقت قریب آیا تو اہل مدرسہ نے مولوی محمد یحییٰ صاحب کا نام بھی بخاری شریف کے امتحان میں لکھ دیا حالانکہ آپ نے اس کا ایک سبق بھی نہیں پڑھا تھا۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ اہل مدرسہ نے والد صاحب پر زور دیا تو انہوں نے فرمایا یحییٰ کیا حرج ہے ابھی پانچ مہینے باقی ہیں اس میں پڑھ لو۔ چنانچہ وہ پانچ مہینے میں نے نظام الدین کے حجرہ میں اس طرح گذارے ہیں کہ خود مسجد کے رہنے والوں کو معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں بجز ان دو لڑکوں کے جن کے ذمہ میری روٹی اور وضو کے لئے پانی لانا مقرر تھا۔ چنانچہ اسی دوران میں کاندھلہ سے میری نکاح کی طلبی کا تار آیا تو لوگوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ مکتوب الیہ عرصہ سے یہاں نہیں ہے اور نہ معلوم کہاں چلا گیا۔ جب ان طلبہ کو خبر ہوئی تو مجھے بھی تار کی اطلاع ہوئی۔ غرض اس دوران میں میں نے بخاری شریف سیرۃ ابن ہشام طحاوی ہدایہ اور فتح القدیر با لاستیعاب اس اہتمام سے دیکھی ہیں کہ مجھے خود حیرت ہے۔ اتفاق سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب ممتحن تجویز ہوئے اور تشریف لائے تو میرے جوابات دیکھ کر یہ لفظ فرمائے کہ ایسے جوابات مدرس بھی نہیں لکھ سکتا، اور اسی بنا پر حضرت نے جب گنگوہ حاضر ہوئے تو امام ربانی سے

سفارش فرمائی کہ ایک مرتبہ دورہ میری خاطر مولوی یحییٰ کو اور پڑھا دیجئے کہ ایسا شاگرد حضرت کو نہ ملا ہوگا۔ چنانچہ حضرت نے وعدہ فرما لیا اور اب حضرت کا وہ آخری دورہ ہوا جس کو آخری دور کا آخری منظر کہا جاتا ہے اور مولوی یحییٰ کے طفیل ایک کثیر جماعت جو مایوس ہو چکی تھی اس آخری بہار کے دیکھنے کو پھر گنگوہ میں جمع ہو گئی۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب کا وہ دورہ پڑھنے کے لئے گنگوہ آنا گویا حضرت کی خدمت کے لئے اپنے کو وقف کر کے آنا تھا کہ بارہ برس تک جانے کا نام نہ لیا حتیٰ کہ امام ربانی دنیا سے سدھار گئے۔ اور وہ بہار ہی ختم ہو گئی جس نے دنیا کو قرونی منظر دوبارہ دکھانے کے لئے اپنی طرف کھینچا تھا۔ آپ کا قیام لال مسجد کے حجرہ میں ہوا اور آخر تک وہ حجرہ آپ کے پاس رہا۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ دورہ میں میری ایک حدیث بھی کبھی نہیں چھوٹی گو ناغہ قریب تھا مگر میں خود جانے کا نام تو کیا لیتا والدہ کے اصرار پر حضرت مجھے خود امر فرماتے تو سبق کے حرج کا عذر کر دیا کرتا۔ ایک عید کے موقع پر حضرت نے یہ وعدہ فرمایا کہ سبق میں تمہارا انتظار کیا جائے گا اور مجھے حکم دیا کہ تمہاری والدہ کا بار بار تقاضا ہے جاؤ گھر ہو آؤ تو میں کاندھلہ گیا اور فوراً واپس آگیا۔ جو صاحب قراءت کیا کرتے تھے ترمذی کا ایک باب چھوڑ کر دوسرے باب سے پڑھنے لگے۔ ہر چند میں نے اور دیگر شرکاء سبق نے اصرار کیا کہ ایک باب چھوٹ گیا مگر وہ یہی کہتے رہے کہ نہیں وہ ہو چکا۔ چند روز بعد جب دوسری مرتبہ حضرت نے فرمایا کہ کاندھلہ ہو آؤ تو میری زبان سے نکلا کہ حضرت پہلی ہی مرتبہ کا قلق ہے کہ ایک باب چھوٹ گیا۔ حضرت نے فرمایا اچھا کل اس کو پڑھائیں گے۔ چنانچہ دوسرے روز وہ باب پڑھایا اور اتنی طویل تقریر فرمائی کہ حد نہیں۔ اس دن کا قاری کچھ ایسا مدہوش تھا کہ سبق کم ہونے پر اس کو غصہ آیا اور جب تقریر تمام ہو چکی تو میری طرف مخاطب ہو کر کہا کوئی اور حدیث رہ گئی ہو تو وہ بھی پڑھ لو میں اور حضرت قدس سرہ دونوں چپ کہ زبان سے کچھ نہ فرمایا مگر غصہ کی وجہ سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ سنا ہے کہ یہ طالب علم کچھ ہی مدت بعد پاگل ہو گیا اور عقل

جاتی رہی اعوذ باللہ من غضب اللہ وغضب رسولہ وغضب اولیائہ فقط

آہ مولوی محمد یحییٰ مرحوم میرے محسن اور مخلص دوست تھے جن کے کمالات حقیقیہ اور حالات سبقیہ بیان کرنے کو مستقل تالیف کی ضرورت ہے آخر کوئی چیز تھے کہ امام ربانی کو اولاد سے زیادہ پیارے ہوئے کہ حضرت انکو بڑھاپے کی لاٹھی اور نابینا کی آنکھیں فرمایا کرتے اور کسی ضرورت سے وہ چند منٹ کے لئے اِدھر اُدھر ہو جاتے تو امام ربانی بےچین اور بیکل ہو جایا کرتے تھے بارہ برس کامل اس لاڈ اور پیار میں گذرے کہ کوئی اس کی نظیر بیان نہیں کر سکتا حتیٰ کہ امام ربانی کا وصال ہو گیا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے جن کی دُور بین بصیرت بارہ برس پہلے سمجھ چکی تھی کہ مولوی یحییٰ کوئی چیز ہیں گنگوہ جا کر وہ عمامہ جو آپ کو مرشد العرب والعجم کے دست مبارک سے عطا ہوا اور اصل پیچوں پر سیا ہوا اب تک محفوظ رکھا ہوا تھا یہ کہتے ہوئے اپنے دست مبارک سے مولوی یحییٰ کے سر پر رکھ دیا کہ اس کے مستحق تم ہو اور میں آج تک اس کا محافظ و امین تھا۔ الحمد للہ کہ آج حق کو حقدار کے حوالہ کر کے بار امانت سے سبکدوش ہوتا ہوں اور تم کو اجازت دیتا ہوں کہ کوئی طالب آئے تو اس کو سلاسل اربعہ میں بیعت کرنا اور اللہ کا نام بتانا۔

مولوی محمد یحییٰ صاحب بھی خود صاحب بصیرت تھے اور بارہ برس امام ربانی کے پیش کار بن کر گذار چکے تھے کہ سب ہی چھوٹے بڑے اس دربار میں آتے اور حاضری دیا کرتے تھے مگر شروع سے ان کے قلب میں حضرتؒ کی ایک خاص عظمت تھی اور اُس وقت بھی جبکہ گنگوہ کا دربار قائم ہونے کے سبب کسی کو وہم بھی نہ تھا کہ چند روز بعد ہر مجاز کا دربار جُدا قائم ہو گا فرمایا کرتے تھے کہ مولانا خلیل احمد صاحب سے تعلق رکھنے والا کبھی محروم نہیں رہ سکتا اور مولانا کی ایک شان خاص ہے جو بیان میں نہیں آسکتی یہی سبب ہے کہ آپنے جس مخلص کو بھی امام ربانی کے بعد انہوں نے مشورہ دیا یہی دیا کہ حضرتؒ کی طرف رجوع کرو۔ بہ رجس دوست کی خیر خواہی پر مٹے اس کو مجبور کیا کہ کہ حضرت سے بیعت ہو اور آستانہ خلیلیہ سے نہ ہٹو کہ یہاں سے محروم جانے والا

کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ایک مرتبہ میری درخواست پر رمضان میں قرآن شریف سُنانے کے لئے میرٹھ تشریف لائے تو میں نے دیکھا دن بھر میں چلتے پھرتے پورا قرآن مجید ختم فرما لیتے اور افطار کا وقت ہوتا تو اُن کی زبان پر قل اعوذ برب الناس ہوتی تھی۔ ریل سے اُترتے تو عشا کا وقت ہو لیا تھا۔ ہمیشہ باوضو رہنے کی عادت تھی اس لئے مسجد میں قدم رکھتے ہی مصلے پر آ گئے اور تین گھنٹہ میں دس پارے ایسے صاف اور رواں پڑھے کہ نہ کہیں لکنت تھی نہ متشابہ گویا قرآن شریف سامنے کھلا رکھا ہے اور باطمینان پڑھ رہے ہیں تیسرے دن ختم فرما کر روانہ ہو گئے کہ نہ دور کی ضرورت تھی نہ سامع کی۔ یہ بھی مولانا کی خصوصی شان تھی کہ بالاصالت کبھی تنخواہ نہیں لی اور کبھی درس پر کسی قسم کا معاوضہ گوارا نہیں فرمایا۔ اس کا شوق تھا کہ بچوں کو گھیر گھار کر عربی تعلیم میں ڈالتے اور اس کی خاطر ان کو طلبہ کے ساتھ ایسا مشفقانہ پدرانہ برتاؤ کرنا پڑتا تھا جس پر بعض بدنیت بدگمانوں کو بدظنی کا موقع ملتا تھا اور اس کے ساتھ ہی چونکہ بے نفسی حد سے زیادہ تھی اس لئے طلبہ میں ایسے جلے رہتے تھے گویا ہم سبق طالب علم ہیں جن میں ہر قسم کا ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ اس طرز سادگی پر بدگو کو دوسرا تائیدی موقع ملتا مگر آپ مست و مدہوش تھے اور فرمایا کرتے تھے میاں خدا سے معاملہ صاف ہونا چاہیئے کہنے بھی دو جس کا جو دل چاہے کہا کرے میرا کیا بگڑے ہے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ کھانے کا وقت ہوتا تو سارے طلبہ سے کہتے اپنے اپنے کھانے لے آؤ۔ اور جب مختلف قسم کے کھانے سب لے آتے تو کسی کو دال ملی اور کسی کو ساگ۔ کوئی گوشت لایا اور کوئی ترکاری تو اپنے گھر سے بھی کھانا منگاتے اور ایک طشت یا کونڈے میں سب کھانوں کو مخلوط کر کے فرماتے کھاؤ بسم اللہ۔ طلبہ کی اکثر دعوت کیا کرتے اور خفیہ طور اُن کی تمامی ضروریات مالیہ پوری فرماتے۔ یتامی و بیوگان اور یگانہ و بیگانہ محتاجوں کی پوشیدہ طریق سے اتنی خدمت کرتے کہ سُننے والا حیران ہو جائے۔ سادگی اور اپنے نفس کی طرف سے استغنا کا یہ عالم تھا کہ شاید گھر میں پانچ روپیہ کا غلہ بھی ایک دفعہ نہیں ڈلوایا۔

مگر مصارفِ خیر پر خرچ کا یہ عالم تھا کہ جس وقت انتقال ہوا تو آٹھ ہزار روپیہ کے مقروض تھے اور کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ کس مد میں قرض ہوا۔ اللہ پاک نے بیٹا بھی باپ کا نمونہ عطا فرمایا تھا اس لئے اس نے سارا قرض اس ذخیرۂ کتب سے ادا کیا جو باپ نے چھوڑا تھا اور ہر بات میں باپ کا سچا جانشین ہونے کے سبب حضرتؒ کا ایسا نورِ نظر بنا جیسا باپ حضرت گنگوہیؒ کا بنا تھا۔ فللہ الحمد کہ علم شریعت و طریقت دونوں میں کامگار رہا اور تعلیقات ابوداؤد میں بالتخصیص حضرتؒ کا قوتِ بازو بن کر بارگاہ خلیل سے وہ انعام پایا جس پر ہمسروں کو جو کچھ بھی غبطہ ہو وہ کم ہے کہ حضرتؒ نے ختم تعلیقات کے بعد مجاز طریقت بنا کر مدینہ منورہ سے واپس کیا اور شیخ الحدیث خطاب عطا فرما کر اپنے مدرسہ میں بٹھانے کا امر فرمایا بعض ارکین کو بعض مصالح کی بنا پر پس و پیش ہوا تو حضرت نے مدینہ منورہ سے بندہ کو تحریر فرمایا کہ مولوی زکریا ماشاء اللہ اس خطاب کے اہل ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ حدیث میں ان کو کتنا تبحر حاصل ہے لہذا اگر مدرسہ والوں کو اس خطاب کے دینے میں تامل ہے تو تم میری طرف سے یہ خطاب دے دو اور مدرسہ کے انتظامات خرچی و کلی میں ان کی رائے کو دخیل بنا کر مشیر ناظم قرار دو۔

مولوی عبداللہ صاحب گنگوہیؒ کہ حضرت کے مجاز طریقت تھے مولانا محمد یحییٰ صاحب ہی کے شاگرد اور سارے باندھے ادھر لائے ہوئے تھے کہ انگریزی اسکول میں پڑھا کرتے اور اپنے محلہ والی مسجد میں جس کا حجرہ مولوی محمد یحییٰ صاحب نے اپنے قیام کے لئے لے رکھا تھا کبھی کبھی نماز کو آجایا کرتے تھے آپ نے تاڑ لیا کہ نماز کا شوق رکھتا ہے اس میں کیا عجب ہے دینی تعلیم کی طرف رغبت پا جائے لہذا صاحب سلامت پیدا کی اور بہلا پھسلا کر خارج وقت میں عربی پڑھنے کا شوق دلایا۔ مولوی عبداللہ کہنے میں آگئے اور میزان شروع کر دی۔ ذراغبی زیادہ تھے۔ ایک دن مولانا نے دو گردان یاد کرنے کو کہد یا جن کو رٹتے رٹتے شام ہو گئی۔ مولانا نے فرمایا خدا کے بندے کیا ظلم ہے کہ ایک گردان میں شام کر دی۔ کہنے لگے ہیں مولوی صاحب یہ تو ۲ دو تھیں ۲ دو تھیں اور یہ کہکر رونے لگے۔ غرض اسی طرح پھسلا کر آگے چلایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی چھوٹی

گئی اور عربی کے مدرس رہے۔ حق تعالیٰ نے خوش نصیب بنایا تھا لہٰذا اوّل عالم باعمل ہوئے اور پھر سالک مجاز طریقت۔ اس بنا پر مولانا مرحوم کے اعمالِ حسنہ بھی مولوی محمد یحییٰ صاحب رحؒ ہی کے نامۂ اعمال میں درج ہیں ورنہ جس انگریزی میں پڑ لئے تھے وہ خدا جانے کہاں پہنچاتی۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب کی وفات کے بعد اپنے استاد زادہ مولوی محمد زکریا صاحب سے مولوی صاحب کو محبت بڑھ گئی تھی اور باوجود عمر میں بڑے ہوئے انکا احترام فرمانے لگے تھے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ مولوی زکریا صاحب میں نے ایک خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر بتاؤ۔ خواب یہ ہے کہ آسمان سے ایک بڑا انار گرا اور زمین پر گرتے ہی اس کے سب دانے جدا جدا ہو گئے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب تشریف رکھتے ہیں اور فرما رہے ہیں۔ بھائی اس انار میں ایک دانہ میرا بھی ہے۔ یہ خواب سنا کر تعبیر کا تقاضا کیا اور جب مولوی زکریا صاحب نے بار بار یہی جواب دیا کہ مجھے تعبیر دینا نہیں آتی تو فرمایا اچھا میں بتاؤں تعبیر۔ کہ وہ دانہ میں ہوں اور میں تو آخر مولوی صاحب کا ہوں ہی۔ اور یہ بشارت ہے میری موت اور پھر مغفرت کی۔ چنانچہ چند ماہ بعد اسی سال مولانا کا وصال ہو گیا اور دق میں مبتلا ہو کر ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب رحؒ نے گنگوہ میں دورہ حدیث پڑھتے وقت اس کا بھی اہتمام کیا کہ حضرت رحؒ کی تقریرات جو سبق میں سنتے وہ خارج وقت میں ضبط کر کے نقل فرماتے اور لکھ لیا کرتے تھے جو ہر کتاب کی ایک مستقل تعلیق اور نادر الوجود شرح بن گئی تھی۔ حضرتؒ چونکہ مولوی محمد یحییٰ صاحب کی ذکاوت اُس وقت جانچ چکے تھے جبکہ وہ دہلی میں طالب علم تھے اور اب بارہ برس گنگوہ حاضر ہونے میں ان کے تبحر علمی اور استعداد علمی کا مزید تجربہ فرما چکے تھے اس لیے آپ مدت سے متمنی تھے کہ مولوی یحییٰ مظاہر علوم میں آ جائیں مگر اوّل تو حضرت رحؒ کی صاحبزادی صاحبہ کا اصرار کہ وہ ان کو باپ کی ہمانقاہ سے جدا نہ ہونے دیتی تھیں۔ دوم مولانا کا تنخواہ سے انکار جس پر احتمال ہوتا تھا کہ دل آزاد اور پابند ہو کر نہ رہ سکیں گے۔ لہٰذا دو سال تو آپ نے صاحبزادی صاحبہ کو راضی

کر کے مولانا کو اخیر سال میں چند روز کے لئے بلایا اور دورہ تمام کتابیں ختم کرا کے گنگوہ تشریف لے گئے مگر تیسرے سال آپ نے مستقل قیام پر زور دیا اور تنخواہ نہ لینے کی شرط کو منظور فرما لیا کیونکہ اندازہ ہو گیا کہ پابندی کے لئے تنخواہ اور اس کا عدم دونوں بالکل مساوی ہے اور تنخواہ لینا کسی طرح بھی منظور نہیں فرما سکتے چنانچہ جمادی الاول ۱۳۲۸ھ میں مولانا مستقل تشریف لے آئے کہ حضرتؒ کے اسفار مدرسہ کی ضروریات کے لئے دن بدن بڑھتے جاتے اور اس کا اثر آپ کے اسباق پر پڑ کر مدرسہ کی علمی کار گذاری میں نقصان کا سبب بنتا تھا۔ اس وقت سے لے کر ۱۳۳۳ھ یا پانچ سال کامل آپ مظاہر علوم میں درس دیتے رہے حتی کہ اخیر ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ کی شب میں بمبئی سے حضرت کو تار آیا کہ سفر حج سے واپس ہو کر بمبئی پہنچے مولانا ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور چند ہی گھنٹہ میں شہید ہو کر راہی عالم قدس ہوگئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ علم و عمل کا مجسمہ آن کی آن میں دنیا سے رخصت ہو کر ہمیشہ کے لئے سہارنپور کے گورستان میں سو رہا اور حضرتؒ کو بذریعہ تار اس سانحہ کی بمبئی میں اطلاع دی گئی۔ حضرتؒ کے قلب پر اس دفعی واقعہ کی سخت چوٹ لگی لیکن آپ تو مجسم صبر و رضا تھے اس لئے برداشت فرما گئے۔ مگر پیری کا زمانہ صدمہ زدہ دل اور وہی اسفار کی کثرت اور درس کا بارِ عظیم جس کے انتظام سے اطمینان پایا تھا وہ پھر سر پر آپڑا اس لئے حضرتؒ راضی برضا اپنی علو ہمت سے اس کو انجام دیتے رہے لیکن اب تنخواہ لینے میں حضرت کو تردد ہونے لگا کہ جتنے اسباق جوانی میں پڑھا سکتا تھا جب ضعف پیری کے سبب اس کو انجام نہ دے سکوں اور مولوی یحییٰ جیسا نائب مقام بھی نہ رہا کہ میری کمی کو نیابتاً پورا کر دے تو اب مدرسہ سے تنخواہ لینا جائز نہیں چنانچہ حضرت نے تنخواہ ترک فرما دی اور ہر چند سرپرستان مدرسہ کا اصرار ہوا کہ تنخواہ ہی کیا ہے جو حضرت کی خدمات جلیلہ کا معاوضہ ہو سکے اور خدمت کے لئے صرف گنتی کے چند روپیہ پر سو روپیہ ماہوار بھی نذر کرتے ہیں۔ مگر حضرتؒ نے نہ مانا اور فرمایا کہ مدرسہ کا روپیہ چندہ کا مال اور خدا کا مال ہے جس کے ہم لوگ صرف امین و محافظ ہیں بےجا تصرف یا مروت کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے اور میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہاں کا روپیہ کے قابل قدر نہیں

دے سکتا لہذا تنخواہ نہ لوں گا۔

یہ وقت ہی کچھ عجیب تھا کہ ادھر تنخواہ سے حضرتؒ نے دست برداری فرمائی اور اُدھر مصارف بدستور بلکہ دن بدن زیادہ کہ تعلقات وسیع ہو جانیکے سبب مہمانوں کی آمد و رفت بڑھ گئی۔ اس لئے آپ نے قصد فرمایا کہ انبہٹہ میں سکونت مستقل فرمادیں کہ وہاں کوئی خاص اہتمام ہی سے جائے گا تو پہنچ سکے گا اور قصباتی گذران جدی زمین کی پیداوار میں تنگی ترشی سے ممکن ہے کہ شہری گذران میں ہر قسم کا خرچ بڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آہستہ آہستہ آپ کا یہ قصد پختہ ہو چلا اور اہل مدرسہ کو معلوم ہوا کہ حضرتؒ اس خیال میں ہیں تو حضرت مولانا رائے پوری قدس سرہٗ کو کہ سرپرست مدرسہ بھی تھے اور حضرت کے ساتھ غایت انس و محبت بھی رکھتے تھے یہ صورت بہت شاق گذری اور سمجھ لیا کہ مدرسہ سے حضرتؒ کے اُٹھتے ہی نہ وہ علمی برکات رہیں گے نہ عملی ثمرات اس لئے پریشان ہو کر سہارنپور آئے اور بقیہ سرپرستان کو جمع فرما کر تجویز پیش کی کہ حضرت کا مدرسہ سے جانا مدرسہ کی کھلی بربادی ہے اور تنخواہ لینے پر حضرت کو راضی کرنا خدام کی طاقت سے باہر ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آمدنی نہ ہونے کی صورت میں سہارنپور قیام کرنے پر مجبور کرنے کا منہ بھی نہیں پس میرے نزدیک مناسب ہے کہ حضرت سے تدریس کا بوجھ باضابطہ اٹھا دیا جائے اور نظامت کا جدید عہدہ قائم کرکے (جس کو پرنسپل کہتے ہیں) حضرت کو اس کا معاوضہ دیا جائے کہ در حقیقت حضرت کا مدرسہ میں محض بیٹھا رہنا ہی نظام مدرسہ کے قائم رہنے کا ذریعہ ہے چہ جائیکہ انتظام و نگرانی خود بڑی شے ہے جس کو حضرت رات دن بلا تحدید وقت انجام دیتے ہیں۔ اور پھر حضرت سے باتفاق اور زور کے لفظوں میں عرض کیا جائے کہ بعد نظامت معاوضہ قبول فرمائیں اور تدریس محض تبرع کا درجہ رہے کہ صدر مدرس کوئی دوسرا ہو اور حضرت کے پاس ایک دو سبق اس درجہ میں رہیں کہ جب حضرت یہاں رہیں تو پڑھائیں اور جب سفر کریں تو صدر مدرس ان کو پورا کرائیں۔ چنانچہ حضرت کو بھی یہ صورت منظور کرنا پڑی اور مولانا عبداللطیف صاحب کو صدر مدرس بنا کر شوال ۲۵ھ سے حضرتؒ نے پھر تنخواہ لینا شروع فرما دی۔

۱۳۳۸ھ میں جبکہ گرانی اجناس اور کثرت مصارف کی عامہ شکایات اور بحمداللہ مدرسہ کی مالی ترقیات اور کافی اعانت کے حصول پر کہ یہ بھی حضرت ہی کی سعی و توجہ سے ہوا تمامی ملازمین مدرسہ کو ترقیاں دی گئیں تو دس روپیہ کا اضافہ حضرت کی تنخواہ میں بھی ہوا جس کو حضرت نے باصرار قبول فرمایا ورنہ آپ اپنے لئے یہی فرماتے رہے کہ مجھ سے تو پچاس روپیہ کے قابل بھی کام نہیں ہوتا اور نہ میری کوئی ضرورت بند ہے اس لئے اس کی حاجت نہیں۔

جمادی الثانیہ ۱۳۴۰ھ میں جبکہ حیدرآباد سے معقول وظیفہ مدرسہ کا مقرر ہوا تو مدرسین نے پھر ترقی چاہی کہ درحقیقت وہ حضرات کتنا ہی خرچ میں تنگی کرتے مگر موجودہ قلیل تنخواہ میں گذر نہیں کر سکتے اور مقروض ہو کر پریشان و پراگندہ دل رہتے تھے۔ چنانچہ عطاء عداوندی کا لحاظ کرتے ہوئے مدرسین کو دل نہاد اور یکسو کرنے کے لئے کہ فکر معاش سے مستغنی ہو کر بسکون و طمانینت تعلیم میں مشغول ہوں پھر سب کو حسب عہدہ ترقی دی گئی اور حضرت کے نام بعہدہ نظامت پندرہ روپے ماہوار کا اضافہ ہو کر پچھتر روپے ماہوار لکھے گئے جس کو حضرت نے تین سال لیا اور آخر ۱۶ شوال ۱۳۴۴ھ کو آپ ڈیڑھ سال کی رخصت بوضع تنخواہ لے کر مدینہ منورہ روانہ ہو گئے اور پورا ڈیڑھ سال گذرنے پر کہ نہ ایک دن کم نہ زیادہ آپ نے داعی اجل کو لبیک کہکر جنت البقیع کو خواب گاہ بنایا۔

مظاہر علوم کا نظام اور کارگذاری

مدرسہ اپنی بنیاد کے وقت قاضی محلہ میں ایک کرایہ کے مکان میں تھا اور کوشش کی گئی کہ اس محلہ میں مدرسہ کے لئے مکان بنایا جائے مگر اسباب مہیا نہ ہو سکے۔ چند سال بعد حافظ فضل حق صاحب کو کہ مولانا محمد قاسم صاحب سے بیعت اور مولانا محمد مظہر صاحب کے مخلص و دوست تھے خیال ہوا کہ مدرسہ کو اپنے محلہ میں لے آئیں۔ یہ مکان جس میں اس وقت مدرسہ ہے حافظ صاحب کا ذاتی مکان تھا اس کو انہوں نے توڑ کر مدرسہ کی موجودہ حالت پر تعمیر کرایا اور مدرسہ کے نام ہبہنامہ کر کے مدرسہ اس میں قائم کر دیا۔ اثناء تعمیر میں مولانا

سعادت علی صاحبؒ فقیہ بانی مدرسہ انتقال فرما گئے اور اسی تعمیری سال پر مدرسہ کا تاریخی نام مظاہر علوم تجویز ہوا۔ اس وقت مدرسہ کے ممبران و سرپرست صرف تین حضرات تھے مولانا محمد مظہر صاحب۔ قاضی فضل الرحمٰن صاحب اور حافظ فضل حق صاحب۔

١٢٩٥ھ میں جب کبار اہل اللہ کا مشہور مجمع حج کو روانہ ہوا تو مولانا محمد مظہر صاحب اور مولوی احمد حسن صاحب کانپوری کہ مدرس دوم تھے اور مولوی عنایت الٰہی صاحب بھی ہمرکاب ہوئے اور مدرسہ میں ان حضرات کی جگہ مولانا احمد علی صاحب محدث اور ان کے صاحبزادے مولوی حبیب الرحمٰن اور ایک بنگالی مولوی امین الحق صاحب عارضی طور پر مدرس رکھے گئے جو واپسی حضرات پر علیحدہ ہو گئے۔ ٢٤ ذی الحجہ ١٣٠٢ھ کی شب میں ٨ بجے مولانا محمد مظہر صاحب نے انتقال فرمایا کہ بمقتضاء حدیث المومن یموت بعرق الجبین آپ کی پیشانی پر پسینہ تھا اور آپ ماتھے پر بار بار ہاتھ پھیرتے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد قاضی فضل الرحمٰن صاحب نے ممبران مدرسہ میں اضافہ کیا اور قاضی ابو سعید مولوی ناظر حسن وکیل۔ خواجہ احمد حسن میر تونگر علی۔ مولوی مشتاق احمد وغیرہ کارکن ذمہ دار قرار پائے۔ ١٣١٤ھ میں بعض ممبران کی تحریک پر حضرت امام ربانی سرپرست بنائے گئے اور مولانا خلیل احمد صاحب صدر مدرسی پر تشریف لے آئے۔ مگر چونکہ اکثر ممبران کو نہ حضرت گنگوہی سے عقیدت تھی نہ مولانا سے اُنس و تعلق اس لئے مولانا کے متعلق صرف پڑھانا تھا کہ انتظامی اُمور میں نہ آپ کو دخل تھا نہ آپ سے کوئی مشورہ لیا جاتا بلکہ مدرسہ سے ہر وقت واسطہ رکھنے کی بنا پر گاہے ماہے جمع ہو جانے والے ممبروں کو آپ کبھی ضرورت پر مطلع فرماتے اور مشورہ بھی دیتے کہ یہ انتظام کر دیا جائے تو اس کو ٹھکرا دیا جاتا تھا آپ بھی خاموش تھے اور اپنے کام سے کام رکھتے تھے کہ پابندیٔ وقت کے ساتھ سبق پڑھاتے اور مکان تشریف لے گئے۔ چنانچہ پانچ سال کامل گذر گئے اور آپ نے کار تدریس کے سوا کسی نظم میں دخل نہیں دیا۔ مگر اس پر بھی آپ نے دیکھا کہ ممبران میں کثرت اس جانب ہے جن کو حضرت گنگوہی سے عناد ہے اور حضرت کی سرپرستی کے ساتھ مولانا کی صدارت بھی دل سے ناگوار ہے کہ خفیہ طور پر آپ کو علیحدہ کرنے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔

تو آپ نے امام ربانی سے اس کا تذکرہ فرمایا۔ حضرت مدرسہ کی سرپرستی سے مستعفی ہوگئے۔ آپ کا خیال درحقیقت صحیح تھا اور چند ہی روز بعد اس کا ظہور ہوا کہ امام ربانی کا استعفا بخوشی منظور کر لیا گیا اور اس کے ساتھ ہی پانچ حضرات نے نا تمام مختصر کمیٹی کر کے آپ کو مدرسہ سے برخاست کر دیا۔ حافظ فضل حق مرحوم کے صاحبزادے مولوی حبیب احمد کو جنہیں اخیر تک حضرتؒ کے ساتھ خاص محبت رہی اس قصہ کا بہت صدمہ ہوا اور وہ حضرت سے چپٹ کر زار زار رونے لگے۔ ہر چند کہ وہ محلہ میں سربرآوردہ اور اس باپ کے بیٹے تھے جو مدرسہ کو قاضی محلہ سے یہاں اپنے مکان میں لائے تھے۔ مگر اپنی قومی نا اتفاقی کے سبب مدرسہ پر حاوی ہو جانے والے ممبران کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے حضرت کا مختصر اسباب اٹھا کر اپنے گھر لے گئے کہ حضرت مکان چھوڑ چکے اور اسباب و متعلقین کو انبہٹہ بھیج چکے تھے اور یہ کہکر کہ حضرت تین چار دن توقف فرما کر ہمیں کوشش کا موقع دیں حافظ عزیز علی اور مولوی اشتاق کو ساتھ لے کر اس پر زور دینے لگے کہ یہ برخاستگی نا تمام کمیٹی میں اور بلا وجہ طے ہوئی ہے لہذا قابل عمل نہیں ہے۔ مگر ممبران مدرسہ کے کان پر جوں بھی نہ رینگی اور ان صاحبوں کے آخری عام جلسہ میں اس تحریک پر بھی یہی جواب دیا گیا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب کوؤں کی کائیں کائیں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ سچ یہ ہے کہ مخلص کی بیکسی جب اس کو چار طرف سے مایوس کر دیتی ہے تو قدرت اپنا کرشمہ دکھانے کے لئے اسباب ظاہری کا پردہ اٹھا دیتی ہے یہ لوگ پریشان تھے کہ نہ مولانا کو روک سکتے ہیں نہ چھوڑ سکتے ہیں۔ بجز رونے کے کوئی کام نہ تھا کہ غیب سے سامان ہوا اور ایک شخص اس وقت جبکہ میاں حبیب احمد متفکر و پریشان مسجد کے در پر کھڑے تھے آکر ان سے پوچھنے لگا کہ کیا پریشانی ہے انہوں نے اس کو فریق ثانی کا جاسوس سمجھکر دھتکار دیا کہ چل تو کون ہم سے پوچھنے والا کہ کیا بات ہے اس نے کہا کہ میں خفیہ پولیس کا ملازم ہوں اور تمہیں اطمینان دلاتا ہوں مجھے پانچ روپیہ دو اور سارا قصہ حسب منشاء مجھ سے لکھوا۔ انہوں نے پانچ روپیہ تو دے دیئے مگر ڈرتے رہے کہ ایسا ہم ہی کو نہ پھانس دے۔ فریق ثانی اپنی تجویز

کی تکمیل میں مشغول تھا اور اگلے دن مولوی عبدالعلی صاحب آ گئے جو حضرت کی جگہ مدرس اول بنائے جانے کو بلائے گئے تھے۔ یہ دوسری کشمکش تھی کہ اپنوں میں مقابلہ کرانے کی تدبیریں تھیں۔

اس قصہ میں سب سے زیادہ درد اور دکھن کا اثر خصوصیت کے ساتھ حضرت مولانا رائپوری قدس سرہ پر تھا کہ رائے پور سے ہر تیسرے چوتھے دن اپنے چھکڑے میں سہارنپور آتے تھے اور حضرت کے شریک حال ہر قسم کی اعانت اور جان و مال تک نچھاور کرنے کے لئے تیار ہو کر قدرت والے مُسبب الاسباب کی طرف سے غیبی مدد کا انتظار فرمایا کرتے تھے ادھر حضرت گنگوہی کا حکم تھا کہ روزانہ مجھے حالات کی اطلاع دی جائے اور اس لئے مولوی مشتاق کے بھائی حبیب احمد روزانہ ٹٹو پر سوار ہو کر گنگوہ جایا کرتے اور ایک ایک واقعہ کانوں میں ڈال آیا کرتے۔ اپنی بات کی پچ اور دعوے کو پورا کر گذرنے کا اہتمام دنیاداروں کے لئے ایسا ضروری ہے کہ چاہے جان جائے مگر آن نہ جائے اس لئے خواجہ ظاہر حسن نے کہ آنریری مجسٹریٹ تھے یہاں تک کہدیا کہ میں بادر صاحب کلکٹر سے کہدوں گا کہ یہ سارا فساد غدر کے مشہور باغی رشید احمد کا ہے اور یہ سب لوگ ان کے جرگہ کے ہیں۔ حق تعالیٰ کو یہ دعوای اور ناز پسند نہ آیا کہ اس نے ایک اسلامی یادگار کو اس عقاب کے پنجے سے بال و پر بنا دیا تھا جو کسی ناقدر دان بڑھیا کے ہاتھ میں پڑ گیا اور اس نے خیر خواہی کے دعوے میں اس کی چونچ اور پنجے کاٹ دئے تھے کہ

خاکساران جہان را بحقارت منگر — تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اسباب کا شیرازہ بکھر گیا اور اس اجنبی صاحب نے ادھر تھانہ میں رپٹ کی کہ مدرسہ میں صبح کو بلوہ ہوا چاہتا ہے اور ادھر کلکٹر ضلع کو متنبہ کیا کہ خواجہ صاحب کی مجسٹریٹی بقائے امن کی جگہ نقض امن کے کام آ رہی ہے اور ممبر مدرسہ ہونے کی حیثیت سے مدرس اول کو بے قصور برخاست کر کے عامہ مسلمانوں میں فساد کا ہیجان پیدا کر دیا اور ادھر مولوی عبدالعلی صاحب کو جا سمجھایا کہ آپ اپنے پاؤں میں کلہاڑی کیوں مار رہے ہیں حکام نے طے کر لیا ہے کہ موقع پر جا کر فریقین کو گرفتار کریں اس لئے خیر خواہانہ مشورہ دینے

آیا ہوں کہ راتوں رات واپس ہو جائیں۔ اور ادھر مولوی حبیب احمد کو سارے قصہ سے باخبر کیا کہ مولانا کو ریل میں سوار کر آیا ہوں اور اب ذرا ہمت دکھاؤ کہ صبح کو مدرسہ کا دروازہ کھول کر مولانا کو جا بٹھاؤ کہ سبق شروع کرائیں اور چند آدمیوں کو دروازے پر کھڑا کر دو کہ انسپکٹر علاقہ آئیں تو زور و قوت کے ساتھ اپنا سچا احتجاج پیش کریں، چنانچہ صبح ہوئی تو صاحب علاقہ مع گارد کے موجود تھے جن کو دیکھکر ایک مجمع کثیر تماشائیوں کا اکٹھا ہو گیا اور انہوں نے ایک نظر میں حقیقت حال معلوم کر کے کمال شرافت و سیاست کا یہ برتاؤ کیا کہ فریقین کو باہمی مصالحت پر مجبور کیا۔ ادھر سے جواب صاف تھا کہ ہمیں نہ پہلے انکار تھا نہ اب انکار ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ مدرسہ نہ ہمارا نہ ان کا۔ ورثہ یا ترکہ پر جھگڑا نہیں ہے صرف مدرسی پر جھگڑا ہے کہ ہم غریبوں کی درخواست ہے برخاستگی کی وجہ بتادو اور علیحدہ کرنا ہو تو پوری کمیٹی منعقد کر کے علیحدہ کر دو اور وہ اپنی طاقت پر نازاں ہماری آواز کو نقارخانہ میں طوطی کی آواز اور کوّے کی کائیں کائیں سمجھتے ہیں۔ بات چونکہ بالکل معقول تھی اس لئے نعیم اللہ خاں صاحب کے مکان پر دونوں فریق کو بلا کر اس تحریر پر سب کے دستخط لے لئے گئے کہ ہم جملہ اشخاص اس بات پر رضامند ہیں کہ جو اختلاف نسبت برخاستگی مولوی خلیل احمد صاحب مدرس اول کے باہم فریقین میں ہے اس برخاستگی کی وجہ پر محمد نعیم اللہ خاں صاحب مجسٹریٹ اور صاحب علی خاں صاحب انسپکٹر جو کچھ رائے یعنی نسبت برخاستگی و بحالی کے قائم کریں وہ فریقین کو منظور ہو گی اور اس میں کسی فریق کو کوئی عذر نہ ہو گا فقط۔ یکم فروری ۱۹۰۳ء

اسی وقت مدرسہ کا رجسٹر جس میں تجاویز سرپرستان درج کی جاتی تھیں قاضی صاحب سے منگا لیا گیا اور جس نے بھی تقرری ثالثی پر دستخط کرنے میں ذرا تامل کیا کہ تمامی ممبران کو جمع کیجئے اسی کو انسپکٹر نے ڈانٹا کہ محض مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ صورت کر رہا ہوں کہ اسی نااہلیت اور دعوئے انانیت نے آج مدارس دینیہ کو جنہیں تاج بنا کر سر پر رکھنا چاہیئے تھا بچوں کا کھیل اور کھلونا بنا رکھا ہے

اور علماء کو جنہیں آنکھوں کی پتلی سمجھنا چاہیئے تھا محتاج اور ذلیل ترین نوکر قرار دے رکھا ہے جس کا ہم پر وبال پڑ رہا ہے اور ہوش نہیں آتا۔ ورنہ آج نہ یہ روز دیکھتا نہ یوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر جیل خانہ بھر دیتا۔ چنانچہ پھر کسی نے چوں نہ کی اور آخر دونوں نے اندر جا کر تجویز لکھی اور قطعی حکم کی صورت میں سب کو سنا دیا جس کی نقل یہ ہے:-

کتاب امورات کمیٹی مدرسہ عربی مظاہر علوم ۱۳۱۹ھ کی کارروائی جلسہ منعقدہ ۳ شوال ۱۳۲۰ھ مطابق ۳ جنوری ۱۹۰۳ء دیکھنے معلوم ہوا کہ ممبران مدرسہ قاضی فضل الرحمٰن و محمد ابوسعید و مولوی خلیل الرحمٰن و میر تونگر علی و مولوی ناظر حسن وکیل صاحبان پانچ کس نے باتفاق رائے مولوی خلیل احمد صاحب مدرس اوّل مدرسہ مذکورہ کو بوجوہات چند علیحدہ کرنے کا قصد کیا۔ لیکن کوئی وجوہات علیحدگی مولوی صاحب تحریر نہیں کیں اور نہ مولوی صاحب موصوف کا کچھ جواب لیا گیا۔ اور کاغذات سابقہ کے ملاحظہ سے معلوم ہوا کہ مولوی خلیل احمد صاحب کو علیحدہ کرنا نہیں چاہتے اور نہ کوئی قصور اور خطا مولوی صاحب موصوف کا ظاہر ثابت ہے۔ اور اگر مولوی صاحب نے دوسری جگہ قصد بند ولیت کا کیا بھی تھا تو ان کو اطمینان دلایا کہ اگر وہ قواعد مدرسہ کی پوری پابندی اور بجا آوری فرائض منصبی عمل میں لاتے رہیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ مدرسہ سے علیحدہ کیئے جائیں۔ اور اب مولوی صاحب موصوف کو بلاوجہ خاص کے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ علیحدگی مولوی خلیل احمد صاحب کی مناسب نہیں ہے جب تک کہ کل ممبران جمع ہو کر ایک جلسہ منعقد کر کے ان کو علیحدہ نہ کریں۔

اور ہماری رائے میں اس مدرسہ کے سرپرست مولوی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی اور مولوی عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور مولوی اشرف علی صاحب تھانوی مقرر کیئے جائیں تاکہ متعلق تعلیم و تقرر و برخاستگی و ترقی و تنزلی مدرسان مدرسہ ان کی رائے سے ہوا کرے اور طریقہ تعلیم کے وہ نگران اور سرپرست رہیں اور دیگر رؤساء و عمائدین شہر بطور ممبر کے رہیں جو ترقی چندہ و انتظامات مدرسہ کیلئے کوشاں رہیں اور خواجہ مظاہر

حسن جو اس وقت مستعفی ہو گئے ہیں وہ بھی کم سے کم ایک سال تک معین اور مددگار رہیں۔ فقط یکم فروری ۱۹۰۳ء

العبد محمد نعیم خاں　　العبد صاحب علی انسپکٹر

عامۂ مسلمانان شہر اس انتخاب پر مسرور ہوئے کہ دین کا گھنٹہ ان تجربہ کار گھڑی سازوں کے ہاتھوں میں گیا جو اس کی مشین کے پرزوں سے پوری واقفیت رکھتے ہیں اور یہ مادہ تاریخ ہو کر کہ ذلک وقع فضل اللہ - ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۲۰ھ کو سرپرستان نے مدرسہ میں مجتمع ہو کر اپنا کام شروع فرما دیا۔

یہ پہلا دن تھا جس کو مدرسہ کے غسل صحت کا پہلا دن یا یتیم نوزائیدہ بچہ کے شفیق مرضعہ کی گود میں آنے کا پہلا روز کہنا چاہیے کہ اسکی ترقیات جسمانیہ و روحانیہ کا دروازہ کھلا اور وہ دن دونا رات چوگنا پھلنے اور پھولنے کے لئے تیار ہو گیا۔ سرپرستان مدرسہ جیسے دیانتدار اور دینی مدرسہ کی بقا و ترقی کے شیدا تھے اپنے ہی حضرت اپنے استاد کے لگائے ہوئے نخلستان کی ہر روش اور کیاری پر جان نثار تھے اس لئے نظام میں دخل دینے اور ہر شعبہ کی ضروریات پر سرپرستوں کو توجہ دلانے کا موقع ملا اور وہ مدرسہ جو زاویہ خمول و کس مپرسی میں پڑا ہوا تھا گھٹنوں چلنے اور پھر لپکنے اور تیز رفتار دوڑنے لگا۔ طلبہ کی کثرت ہوئی مدرسین کا اضافہ ہوا۔ چندہ میں توسیع ہوئی نایاب کتابوں کی بذریعہ وقف و خرید بہتات ہوئی اور عالیشان و محفوظ کتب خانہ جدید بنایا گیا عالی چھتوں پر درسگاہیں تعمیر ہو گئیں۔ ماہر تجوید قاری کا تقرر ہوا مفتی رکھے گئے اور فتاوے نویسی کا مستقل انتظام ہوا کہ وقت پر جوابات جائیں اور سب رجسٹر میں بلفظہا درج ہوں۔ جب ترقیاب کو ماشاءاللہ اور ترقی ہوئی تو مدرسہ کا مکان ناکافی ہو گیا کہ نہ مدرسین کے قیام کے لئے حجرات کافی اور نہ طلبہ کی رہائش کے لئے جگہ وافی۔ طلبہ شہر کی مسجدوں میں مقیم جن کے حالات علمیہ و عملیہ کی نگرانی محال اور مختلف محلوں میں ان کی روٹیاں مقرر کہ ہر معطی ان پر حکومت چلانے کو تیار اس ذلت والی لوٹ... یہ حالت کو دیکھکر حضرت شاہ نے محض تو کلا

سے علی اللہ ایک وسیع زمین خرید کر عالیشان تعمیر کی بنیاد ڈالدی کہ اوپر کے حصہ میں
جدا جدا متعدد درسگاہیں ہوں اور نیچے کے طبقہ میں طلبہ کی رہائش کے لئے کافی
مقدار میں حجرے۔ مہمانان رسول کے لئے مہمان خانہ بننے کے لئے خلیل الٰہی آواز کا
بلند ہونا تھا کہ پہلے ہی سال چار سو چھہتر روپے تین آنے کی رقم آئی اور دوسرے سال
آٹھ ہزار چھ سو چونسٹھ روپے تین آنے ساڑھے چار پائی آگئے ۱۳۲۲ھ میں اس یادگار خلیل کا بنیادی پتھر حضرات سرپرستان کے ساتھ
کثیر جماعت علماء و صلحاء کے مبارک ہاتھوں رکھا گیا اور ادھر تعمیر جاری ہوئی اور ادھر
اہل خیر کی عطاء و سخا کے دریا بہہ پڑے کہ کام نے ایک دن بھی رکنے کا نام نہ لیا
حضرتؒ مولوی تھے اور درسی کتابوں یا مدرسہ کی چٹائیوں کے سوا کسی چیز سے کبھی
واسطہ ہی نہ پڑا تھا خدا جانے انجینیری اور سیاق فن تعمیر کہاں سیکھا تھا کہ محض اپنی
تجویز سے نقشہ بنایا اور خود کھڑے ہو ہو کر مستری سے از اول تا آخر تعمیر کرائی۔ آخر
۱۳۳۲ھ میں دس سال کے اندر جب یہ قصر معلّٰی مکمل ہوا تو دیکھنے والے ماہرین فن
حیران ہو جاتے اور ستر پچھتر ہزار کی لاگت کا تخمینہ کیا کرتے تھے حالانکہ اس میں چالیس
ہزار بھی پورا صرف نہیں ہوا۔

حضرتؒ دنیا سے تشریف لے گئے مگر حضرتؒ کی یہ یادگار جسکی تعمیر میں مدرسہ سے
فارغ ہو کر دوپہر اور شام کا وقت حضرتؒ مستری کے پاس کھڑے ہو کر گذارا کرتے اور
نہ دھوپ کی پروا کرتے تھے نہ بارش کی ایک بڑا صدقہ جاریہ بھی بن کر مدت دراز تک
باقی رہے گا اور حضرت کی یاد اس طرح دلاتا رہے گا کہ زبانوں پر دعائیں ہوں گی اور
دلوں میں تشکر۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو بھی آیا ہے وہ مرنے کے لئے آیا ہے مگر اس موت
پر ہزار زندگیاں قربان جس کے ہر لمحہ میں ایصال ثواب کے لئے وہ بہترین دینی یادگاریں
قائم ہوں جو عالم دنیا و آخرت دونوں میں ہر دیکھنے والے کو دعا گو اور مسرور بنائیں کہ

مبیں حقیر گدایان قوم را کایں قوم　　　شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

اسی کے متصل خوشنما مسجد تیار کی گئی جس میں اہل محلہ اور طلبہ و مدرسین سما سکیں
اور فرش و شامیانہ و روشنی کے وہ کافی انتظام مہیا ہوئے کہ نماز پڑھنے میں اتنی دل بستگی

ہوتی تھی جس کی ماہیت بیان کرنے سے زبان عاجز ہے۔ بلند کرسی کے صدر دروازہ پر دارالحدیث اور اس کی بغلوں میں دو درسگاہیں جو شمالی رُخ ہوا دار وسیع وُدو درسگاہیں جُدا اور غرب وجنوب میں ایک درس گاہ علیحدہ۔ ایک جانب خزانہ جس میں آہنی الماری ہر طرح محفوظ اور نیچے کے طبقہ میں دو دو سے کر آٹھ طلبہ کے رہنے کے قابل چھوٹے بڑے حجرے۔ چونکہ یہ قابل دید عمارت ظاہری حُسن کے لحاظ سے بھی نظروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اس لئے ہم نے اس کا فوٹو لے کر بلاک طبع کرا دیا اور اس کے ساتھ کتب خانہ اور نیز حضرتؒ کے حجرہ و درسگاہ قدیم کا فوٹو بھی شامل کر دیا ہے کہ ناظرین گھر بیٹھے ان کا نظارہ کر سکیں۔

مٹھی کچھ بند کر کے ہاتھ کی دوربین بنانے سے عمارت مجملہ صاف نظر آنے لگی سب سے اوپر فوٹو دارالحدیث کا ہے کہ نیچے طلبہ کا دارالاقامہ ہے اور صدر دروازہ کے اوپر بڑا کمرہ دارالحدیث ہے جہاں حضرتؒ حدیث شریف کا درس دیا کرتے تھے اس عمارت کے محاذ میں شرقی سمت سڑک کے داہنی جانب مطبخ ہے اور وہ بھی حضرتؒ ہی کا قائم کیا ہوا ہے کہ اکثر طلبہ کو بجائے نقد وظیفہ کے خوراک دی جاتی ہے۔ اور خدانخواستہ مرض وغیرہ کی وجہ سے پرہیزی کھانا درکار ہو تو اس کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ نیز جو بااستطاعت طلبہ علاوہ مدرسہ کے کھانا لینا چاہیں ان کے لئے بھی یہاں انتظام ہوتا اور صرف جنس وغیرہ کا جو صَرف مہینہ میں پڑتا ہے وہ ان سے لے لیا جاتا ہے جن طلبہ کو مدرسہ سے کھانا دیا جاتا ہے ان کی تعلیمی نگرانی زیادہ ہوتی ہے اور ماہواری امتحان میں ناکامیاب ہونے پر ان کی خوراک بند کر دی جاتی ہے اور اس کے دوبارہ جاری کرانیکی اس کے سوا کوئی سبیل نہیں کہ آئندہ امتحان میں اچھے نمبروں پر کامیاب ہوں۔ دارالطلبہ کی غربی سمت میں وہ حسین مسجد ہے جو بھوپال کی ایک نیک دل خاتون کلثوم جہاں بیگم نے اپنے روپیہ سے تیار کرائی ہے اور اس کا دروازہ اہل محلہ کے بیرونی دروازے کے علاوہ اسی دارالطلبہ کے برآمدے میں ہے اور اس میں وضو و غسل و روشنی کا مستقل اور کافی

انتظام ہے۔

دوسرا فوٹو کتب خانہ کا ہے جو حضرت مولانا رحیم بخش صاحب سابق وزیر بہاولپور مدظلہم کے عطیہ سے تیار ہوا ہے اور کتابوں کی ترتیب و تحفظ کا یہ جدید طرز بھی حضرت ہی کا دماغ آفرین ہے کہ چھوٹی سی سطح پر ہر فن کی کتابیں بہ ترتیب سجائی ہوئی ہیں کہ جس کتاب کی ضرورت ہو نہایت آسانی سے نکالی جاسکتی ہے۔ ۱۴ھ میں جب حضرت مدرسہ میں تشریف لائے ہیں تو چند فنون کی کتابیں تھیں جن کی تعداد صرف ۱۱۷ تھی مگر ۲۲ھ میں جب آپ ہمیشہ کے لئے حجاز تشریف لے گئے تو تفسیر[1] حدیث[2] اصول حدیث[3] اسماء رجال[4] فقہ[5] اصول فقہ[6] عقائد[7] معانی[8] فرائض[9] کلام[10] مناظرہ[11] وعظ[12] ادب[13] عروض[14] تجوید[15] تصوف[16] منطق[17] ریاضی[18] صرف[19] و نحو[20] غرض معقول و منقول ہر علم و فن کی کافی مقدار میں کتابوں کا ذخیرہ فراہم ہوچکا تھا جنکی تعداد ۱۰۰۲۳ تھی۔ اس کے بعد نایاب چند قلمی کتابیں آپ نے مدینہ منورہ سے مدرسہ کو بھیجیں اور اضافہ ہوتا رہا۔ وہ سب کتابیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں جو آپ کو نظر آرہا ہے۔

تیسرا فوٹو مدرسہ قدیم میں حجرۂ شریفہ کا ہے جس میں حضرت کا قیام رہا اور اب مولانا عبداللطیف صاحب کے تصرف میں ہے صلوٰۃ فجر سے فارغ ہوکر اشراق تک اسی میں حضرتؒ مراقب رہتے اور اکثر دوپہر کو اسی میں قیلولہ فرمایا کرتے تھے اسی کے باہر دروازہ کے متصل دیوار سے کمر لگاکر اوقات فراغ میں بیٹھتے اور جوابات خطوط و فتاوی تحریر فرمایا کرتے تھے۔ سامنے کا حصہ آپ کی قدیم درسگاہ ہے کہ کتاب سامنے رکھکر قالین پر تشریف رکھتے تھے اور طلبہ سامنے اور دائیں بائیں بیٹھا کرتے تھے۔ حتی الوسع ہر منظر اصلی حالت پر دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مکان بجنسہ اور اسی حالت پر موجود ہے مگر افسوس کہ مکین نہیں رہا جس سے اسکی زینت تھی اور اب نظریں اس کو ترستی ہیں۔

مکان دنیا میں ہزاروں ہیں اور خوبصورت سے خوبصورت ہیں مگر مجسم نور اور ازسرتاپا گلاب کے پھول کے قیام و قدم نے جس جگہ کو تماشا گاہ عالم بنا رکھا تھا

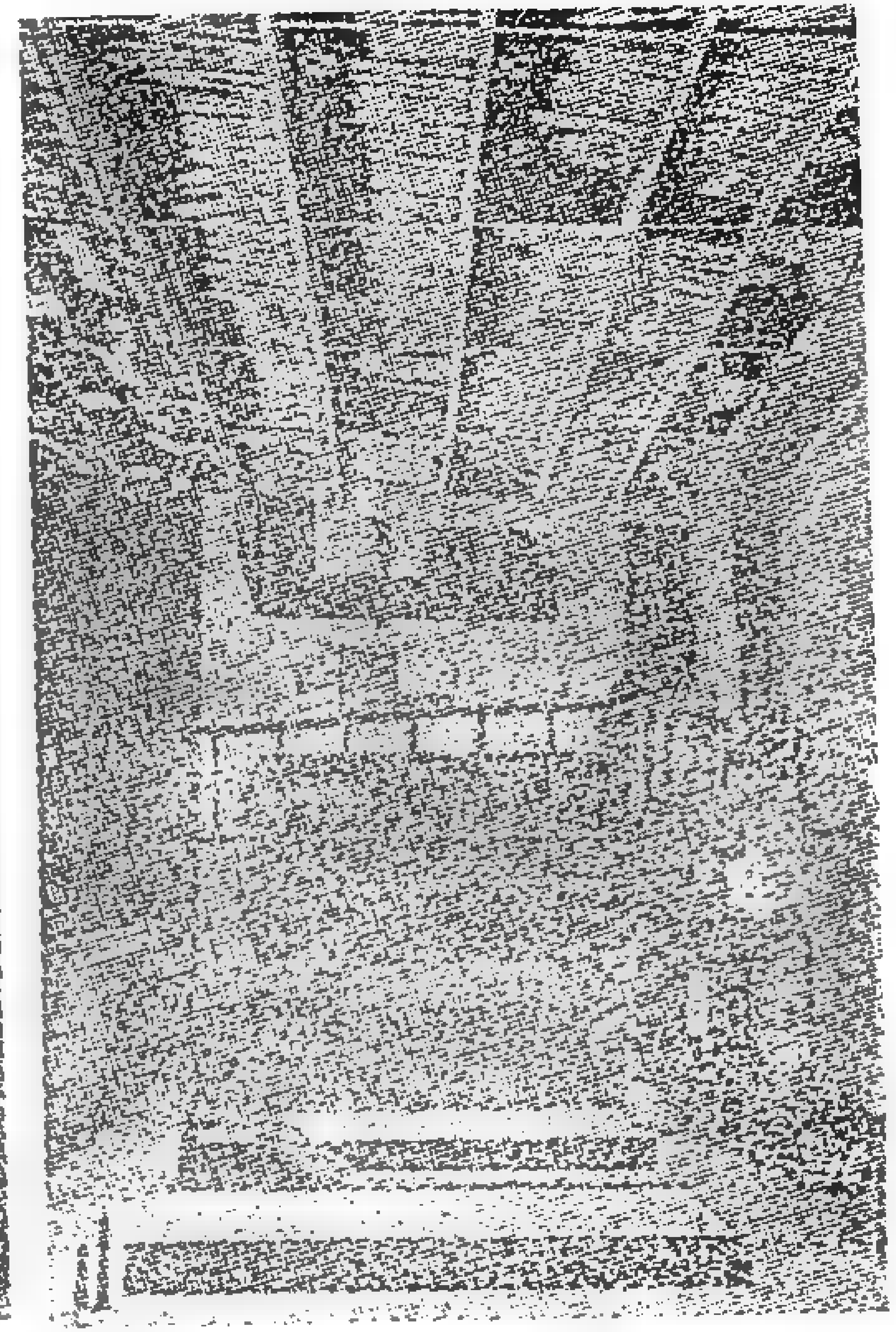
وہ نگاہ میں کچھ ایسا حسین نظر آیا ہے کہ مجبوراً خود لوٹنے اور غائبین کو نظارہ کرانے کی رغبت ہوئی ہے

ہر وقت ہے پیش نظر اک حسن کی دنیا — اب تو یہ ہے جو آنکھوں میں تو ہر چیز حسین ہے

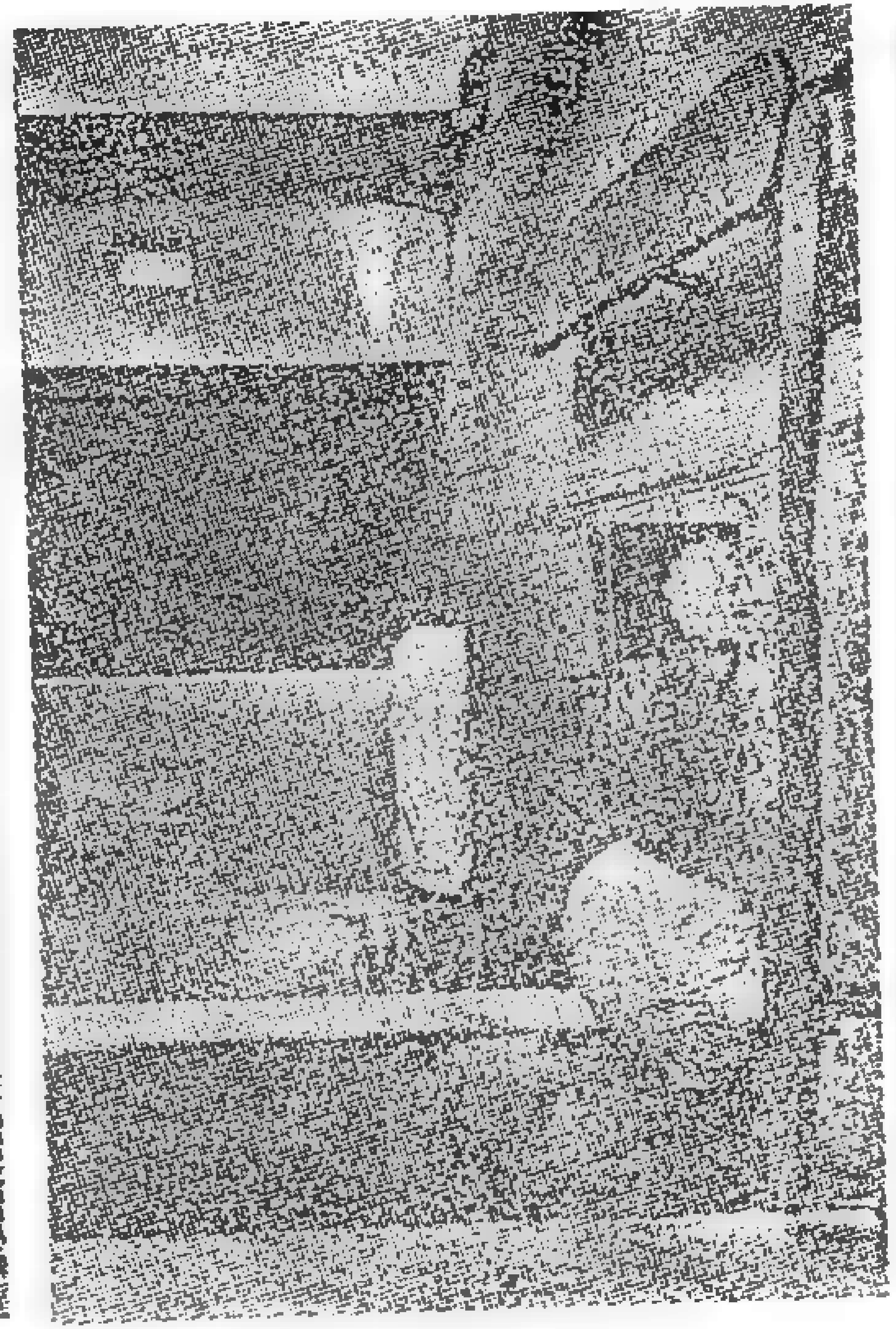
۱۳۴۴ھ میں جبکہ آپ مدرس اول بنکر آگئے تو طلبہ کی کل تعداد ۲۴۷ تھی یعنی درجہ عربی میں ۱۶۵ درجہ فارسی میں ۳۴ اور درجہ قرآن مجید میں ۴۸۔ مگر ۱۳۶۴ھ میں جب آپ مدرسہ سے بیعت مدینہ طیبہ رخصت ہوئے ہیں تو تعداد طلبہ ۵۰۳ تھی یعنی درجہ عربی اعلیٰ میں ۲۸۱ اور درجہ عربی ابتدائی میں ۸۵ درجہ تجوید میں ۸۸ فارسی و ریاضی میں ۳۴ اور قرآن شریف میں ۴۰۔ طلبہ میں بالعموم اور بنگالیوں میں بالخصوص کلام مجید پڑھنے میں صحت لفظی تک کا خیال نہ ہونا آپ کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ اس لئے آپ نے مدرسہ میں تجوید کے درجہ کا اضافہ کیا اور کئی قراء کا اول بدل کے بعد قاری عبدالعزیز صاحب کو کہ جوان صالح وجیہ تھے اور چار سال مدینہ منورہ میں تجوید سیکھ کر سہارنپور بغرض تحصیل علم آئے تھے اس خدمت کے لئے انتخاب فرمایا کہ خود دینیات کی تکمیل کریں اور طلبہ کو فن تجوید کی کتابیں بھی پڑھائیں اور مشق بھی کرائیں چنانچہ مدرسہ خوش الحانی وصحت لفظی کے ساتھ تلاوت کلام اللہ سے گونج اٹھا اور چند ہی ماہ میں اس ضرورت کی بہت کچھ مکافات آپ نے آنکھوں سے دیکھ کر اس درجہ کو مستقل بنا دیا کہ اکثر طلبا گو حافظ نہ ہوئے مگر قاری اور مجود ہو کر مدرسہ سے نکلے۔ اسی طرح عربی کے طلبہ کا دن بدن علمی ضعف آپ کو پریشان کرتا تھا کہ دورہ میں شریک ہونے والے بھی عبارت پوری صحت کے ساتھ نہیں پڑھتے اور اس کا بڑا سبب ان کی ابتدائی صرف ونحو کی کمزوری ونیز بے توجہی تھی جس پر مزید تائید مدرسوں کے اس قانون سے ہو گئی تھی کہ شرح جامی تک وظیفہ نہ دیا جائے اور اس لئے باہر کے طلبہ بالخصوص اطراف بنگال کے جن کی ابتدائی استعداد نہایت کمزور ہوتی تھی وظیفہ کی خاطر بڑی کتابوں میں شریک ہو جاتے اور پھر ان کو اپنی ابتدائی کمزوری کے دور کرنے میں شرم آنے لگتی تھی۔ اس لئے قانون مدرسہ

ہیں کہ گو جماعت چند درچند وہ بھی مصلحت پر مبنی تھا آپ نے ترمیم نہیں کی مگر
ایک درجہ ابتدائی کھولا جس میں میزان سے لے کر شرح جامی تک تعلیم دی جاتی تھی اور
اس کی نگرانی حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ کے حوالے فرمائی کہ ان کو خصوصیت
سے ابتدائی صرف و نحو کے ساتھ مناسبت تھی اور اپنی طالب علمی کے زمانہ سے
اس کا اہتمام فرمایا کرتے تھے اس درجہ کے لئے آپ نے وظائف علیحدہ مقرر
کئے جو عطا کنندگان اسی مد کے لئے دیا کرتے اور اس لئے اس مد کا حساب جدا
رکھا جاتا تھا سالانہ امتحان لینے کے لئے خود مولانا صدیق احمد صاحب تشریف
لاتے اور سختی سے اس کی جانچ کیا کرتے تھے کہ طالب علم صرف و نحو پر پورا قابو ہو گیا
یا نہیں۔ اس کمزوری کو بھی آپ نے دور ہوتا ہوا آنکھوں سے دیکھا اور اس وقت
داخلہ کے امتحان میں سختی فرمائی کہ جب تک طالب علم شرح جامی پر حاوی نہ ہو اس کو
اعلیٰ درجہ میں ہرگز نہ لیا جائے بلکہ مجبور کیا جائے کہ ابتدائی شعبہ میں داخل ہو اور دیکھ
لے کہ اپنی علمی بنیاد کو مضبوط کرے ورنہ کمزور بنیاد پر تعمیر کیا ہوا مکان ہمیشہ کمزور
رہے گا اور گرے گا تو بیسیوں کو دبا کر ہلاک کردے گا۔ اسی درجہ میں آپ نے بقدر ضرورت
فارسی و ریاضی اور تحریر کی مشق پر زور دیا کہ طلبہ روزمرہ کی ضروریات عامہ میں ناقص و کمزور نہ رہیں

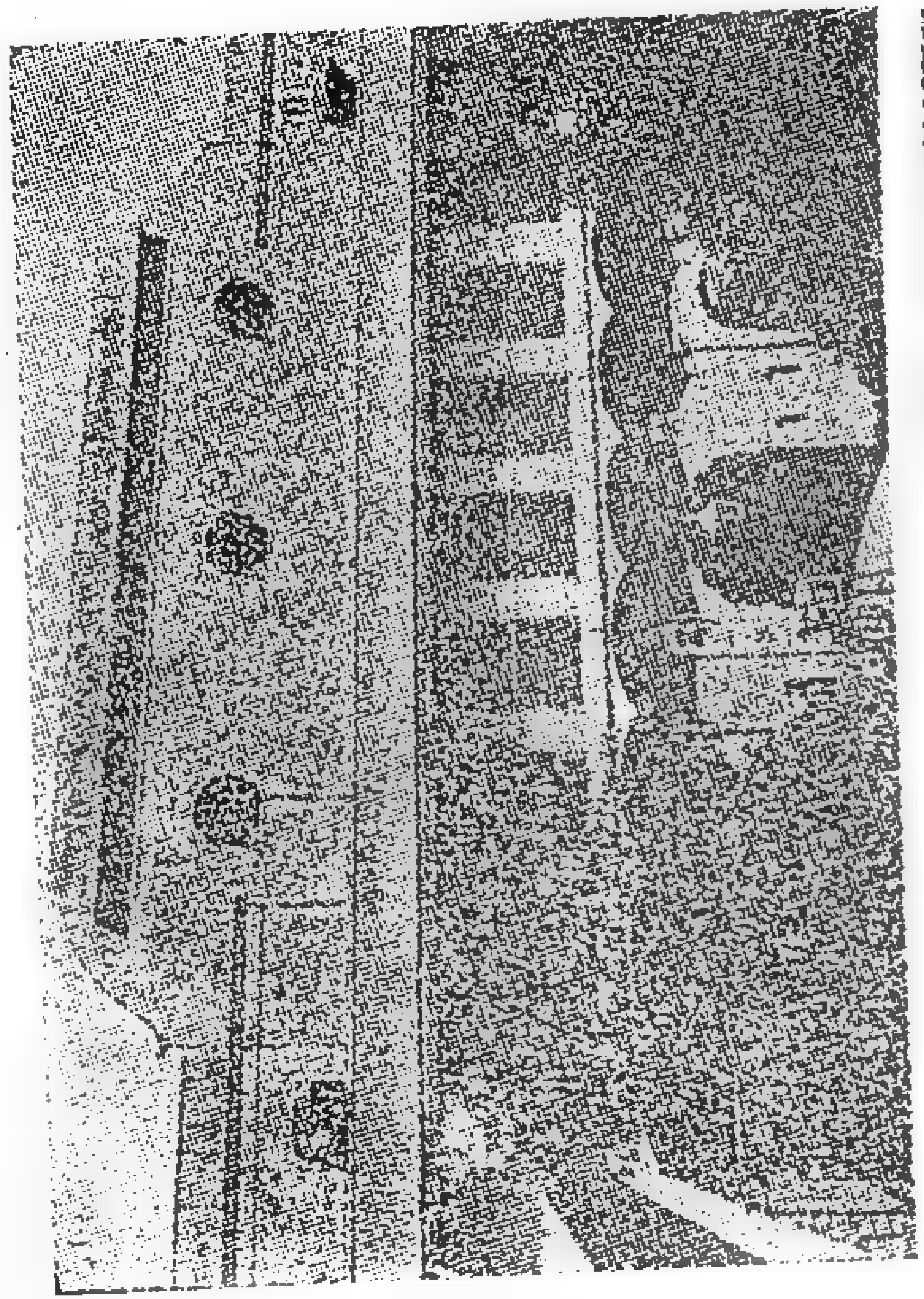
حضرت مولانا صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ حضرتؒ کے چچازاد بھائی اور ہم عمر تھے
کہ بچپن سے آپ ہی کے ساتھ کھیلے اور پڑھے۔ مولانا کو حضرتؒ کے ساتھ ابتدا سے یہ
منافست کا مضمون رہا کہ جو کام حضرتؒ کرتے وہی آپ کرتے اور پیچھے رہنا نہ چاہتے
تھے حضرت نے پڑھنا شروع کیا تو انہوں نے بھی شروع کیا حضرت چچا کے پاس گوالیار
گئے تو یہ بھی گئے حضرتؒ انگریزی اسکول میں داخل ہوئے تو یہ بھی داخل ہوئے
حضرت نے عربی شروع فرمائی تو انہوں نے بھی عربی شروع کی حضرت دیوبند آئے تو یہ بھی آئے
حضرت گنگوہ آکر بیعت ہوئے تو یہ بھی ہوئے اور حضرت نے ذکر و شغل شروع کیا تو انہوں نے
بھی کیا۔ حتیٰ کہ حضرت مجاز و صاحب نسبت ہوئے تو یہ بھی مجاز و صاحب
نسبت ہوئے۔ غرض جس کام میں بھی حضرت ہاتھ ڈالتے اپنے پیچھے



کتب خانہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور



درسگاہ قدیم و حجرہ قیام گاہ حضرت رحمۃ اللہ



دار الطلبہ و دار الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

اور ساتھ ساتھ مولانا کو پاتے اور اس لئے خوش ہوتے اور دونوں کی محبت باہمی دن بدن بڑھتی چلی جاتی تھی۔ مولانا خود فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تو مولانا خلیل احمد کی حرص ومنافست نے پڑھایا اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے اللہ یجتبی الیہ من یشاء ویہدی الیہ من ینیب۔ آیت شریفہ میں وصول الی اللہ یعنی نسبت کی دو قسم ظاہر ہوئیں۔ ایک اجتبائی کہ اُدھر سے کشش ہو اور بندۂ سالک کو مسلوب بنایا جائے اور ایک انابتی کہ ادھر سے طلب ہو اور سالک محبت و والہ بنے۔ چنانچہ میری نسبت اجتبائی ہے کہ تھوڑی محنت کروں یا زیادہ وہ نسبت یکساں حالت پر رہتی ہے اور اگر میری طرف سے ذکر و اعمال صالحہ میں کوتاہی ہوتی ہے تو اُدھر سے خود کشش ہوتی ہے اور مولوی خلیل احمد صاحب کی نسبت انابتی ہے کہ جتنی عبادات میں زیادتی کرتے ہیں اسی قدر نسبت میں ترقی ہوتی ہے اور اگر عبادات میں کمی ہوتی ہے تو نسبت میں ضعف و کمی لاحق ہوتی ہے۔"

مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر زمانہ اکتساب واردات کا بکثرت ہجوم ہوا اور سلوک میں آپ کو مقامات کی تفصیلی سیر کرائی گئی۔ چنانچہ مکاتیب رشیدیہ میں آپ کے نام کے پچیس خطوط درج ہوئے ہیں وہ سب اسی حالت کے مظہر ہیں۔ ایک بار حضرتؒ نے فرمایا کہ میں سفر حج سے واپس آکر مولانا سے ملنے کے لئے دہلی گیا تو میں نے دیکھا کہ ذکر میں ایک جگہ الجھ رہے ہیں اور طبیعت آگے کو نہیں چلتی۔ گنگوہ آکر میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت مولوی صدیق احمد صاحب کی طرف توجہ فرمائیں کہ وہ ذکر میں الجھ رہے ہیں۔ اس کے بعد جو ملنے کا اتفاق ہوا تو دیکھا ماشاء اللہ خوب چل رہے ہیں۔ آپ فارغ التحصیل ہو کر رامپور چلے گئے تھے۔ حکیم عبدالمجید خاں مرحوم دہلوی جب وہاں گئے اور آپ کو دیکھا تو طب پڑھنے کی ترغیب دی اور اپنے ساتھ دہلی لے آئے چنانچہ کتب طب کی تکمیل کرائی اور مطب بھی کرایا۔ اس وقت آپ گنگوہ میں بیعت ہو چکے اور اکتساب شروع کر چکے جب سب کچھ ہو لیا تو دفعتہً دل گھبرایا کہ روز گو مُوت کون دیکھا کرے اور اس میں تو یہی کرنا پڑے گا اس لئے ہر چند حکیم صاحب

نے ٹھہرایا مگر میں نہ ٹھہرا۔ پھر حکیم صاحب کو چونکہ مجھ پر شفقت زیادہ تھی اس لئے بہت سی خاص دوائیں میرے ساتھ کر دیں مگر مجھے توجہ نہ رہی تھی اس لئے وہ بھی پڑے پڑے خراب ہو گئیں اور میں سب پڑھا پڑھایا بھول گیا کہ معالجہ کی توفیق ہی نہ ہوئی۔

آپ اپنے ابتدائی زمانہ کا قصہ فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد مجھے بارہ روپیہ ماہوار پر مدرسہ ہی میں مدرس بنا لیا گیا اور میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ میرے طرز تعلیم پر طلبہ کا رجوع میری طرف زیادہ ہوا۔ اور مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم نے فرمایا مولوی صدیق احمد تمہاری وجہ سے میری دیرینہ مراد پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ مجھے مدت سے افسوس ہے کہ پنجاب بنگال دور دور کے طلبہ آتے اور فارغ ہو کر چلے جاتے ہیں۔ اور ہمارا علاقہ علم سے خالی ہوا چلا جاتا ہے اب میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں اپنے ملکی طلبہ کا زیادہ خیال ہے اور یہی میری تمنا و شوق ہے میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو اگر یہ پسند ہے تو وظیفہ کے لئے کافیہ اور قدوری کی قید اٹھا دیجئے اور طالب علم چھوٹا ہو یا بڑا اس کا کھانا مقرر فرما دیجئے چنانچہ آپ نے اس کو منظور فرما لیا اور پھر تو طلبہ کی یہ حالت ہوئی کہ سو میں پچھتر میرے پاس تھے ان کی تعلیم میزان سے ملا حسن تک تھی اور ۲۵ باقی مدرسین کے پاس۔ عام مدرسین کی عادت یہ تھی کہ کتاب میں جو جگہ سمجھ میں نہ آئی استاد کے پیچھے پڑے اور پوچھ لیا مگر مجھے اس سے عار آتی تھی اور میں مطالعہ دیکھا اور دماغ پر زور دے کر نکالا کرتا تھا۔ مدرسہ کے نصاب میں تعلیم نحو میر کے لئے دو مہینے مقرر تھے مگر میں نے اپنی جماعت کو آٹھ دن میں نحو میر حفظ کرا دی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے دوسرے مدرسین نے شکایت کر دی اور حضرت نے مجھے بلایا۔ حضرت کو غصہ زیادہ تھا اور دیر تک خفا ہوتے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میری جماعت کا اور دوسرے مدرسین کی جماعتوں کا امتحان لے لیجئے مگر شرح جامی کے سوالات نہ کیجئے اس سے معلوم ہو جائے گا کہ میں نے بے پروائی سے وقت ضائع کیا یا کچھ کام کر کے دکھایا۔ چنانچہ حضرت نے سب کو بلا کر امتحان لیا اور سخت امتحان لیا کہ اکثر کا کام

رہے مگر جتنے کامیاب ہوئے وہ میری ہی جماعت کے تھے اور ناکامیاب طلبہ میں بھی میرے شاگردوں کے نمبر دوسروں سے زیادہ تھے۔ ان باتوں سے مدرسوں کو مجھ پر حسد پڑھنے لگا اور آخر مجھے مدرسہ سے نکلوا دیا۔

طلبہ کی ابتدائی تعلیم بالخصوص صرف و نحو میں پختگی اور ملکہ راسخہ پیدا ہوجانا چونکہ بچپن سے آپ کے نزدیک قابلِ اہتمام رہا اس لئے آپ سہارنپور و دیوبند دونوں مدرسوں کے ابتدائی شعبہ کے باضابطہ ممتحن رہے کہ ہر سال مالیر کوٹلہ سے تشریف لاکر امتحان لیتے اور رئیس جس کے آپ ملازم تھے ان ایام کو آپ کی رخصت میں بھی محسوب نہ کرتا تھا۔

میں نے بھی ایک مرتبہ آپ کو امتحان دیا ہے کہ مجھے عربی شروع کئے ہوئے تیسرا مہینہ تھا اور نحو میر ختم ہو چکی تھی اتفاق سے آپ میرٹھ تشریف لائے اور مدرسہ میں قیام فرمایا چونکہ شوق تھا اس لئے آتے ہی میرے استاد مولانا عبدالمومن صاحب سے کہ میں نے از اول تا آخر مولانا ہی سے پڑھا ہے دریافت فرمایا کہ بچے کونسی کتاب پڑھتے ہیں۔ مولانا نے مجھے پیش کر دیا اور فرمایا کہ اس کو میزان شروع کئے دو مہینہ ہوئے اور نحو میر ختم کر چکا ہے مولانا نے کتاب بند کرادی اور اول سے جو سننا شروع کیا تو آخر تک حفظ پوچھ لیا کہ کتاب کی ... ایک سطر یا ایک بات بھی نہ چھوڑی۔ اس کے بعد خوش ہو کر دعا دی اور فرمایا بچہ ہونہار ہے" مولانا اس کو بھول بھلا گئے اور اب جس وقت بھی دیکھتے احترام فرمایا کرتے۔ مگر مجھے شرم آتی اور ابتدائی امتحان یاد آجاتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ تو میرے بھی ممتحن بن چکے ہیں کہ فلاں وقت فلاں مدرسہ میں آپ نے نحو میر کا از اول تا آخر میرا امتحان لیا تھا حالانکہ میری عمر بارہ سال کی تھی اور میزان سے لے کر نحو میر تک میں نے دو مہینہ میں پڑھا تھا۔ سوچ کر فرمایا ہاں کچھ یاد تو آتا ہے۔

حضرتؒ ممدوح کو کشف بہت ہوتا اور مزاج میں اتنی سادگی تھی کہ بے تکلف اپنے کشوف کونیہ کا اپنے لوگوں سے اظہار فرمایا کرتے تھے۔ تذکرۃ الرشید کے بعد

رہے چونکہ حضرت کو مجھ پر شفقت بہت بڑھ گئی اور آپ کی غایت بے تکلفی نے مجھے بھی بے تکلف بنادیا تھا اس لئے ایک مرتبہ ظہور مہدیؑ کے غایت قرب کی بابت اپنے کشوف بیان فرمانے لگے گویا ہر لمحہ انتظار ہے اور توقع غالب ہے کہ اسی سال ظہور ہو جائے میں نے عرض کیا کہ حضرت بات یہ ہے کہ مجھے ان امور سے دلچسپی نہیں اور یوں سمجھتا ہوں کہ جو امر جس وقت بھی ہونے والا ہے ہو کر رہے گا کوئی قبل از وقت معلوم کرلے تو کیا نفع اور معلوم نہ ہو تب کیا نقصان بالخصوص قیامت اور اس کے متعلقات چونکہ ان پانچ چیزوں میں ہیں جن کا علم بجز اللہ جل جلالہ کے کسی کو حاصل نہیں حتیٰ کہ خلاصہ عالم و عالمیاں صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وقت کا تعین معلوم نہ ہوا اور بعض آثار و علامات کا آپ نے تذکرہ فرمایا جس میں اس کا اشارہ بھی نہیں کہ کس صدی یا کس سال اور کس مہینہ میں یہ واقعہ ہوگا اس سے پتہ چلتا ہے کہ حق تعالیٰ کو منظور ہی نہیں کہ اپنے اختصاصی علم کا کسی کو کچھ بھی حصہ دیں ورنہ محبوب کی ذات اس کے لئے احق و اولیٰ تھی لہٰذا میرا خیال تو یہ ہے کہ جن اہل اللہ کو اس کے متعلق کوئی کشف ہوا اس میں ضرور خلط ڈالا گیا تاکہ علم بالمغیبات کی تخصیص بذات اللہ میں فرق نہ آئے صاحب کشف کی ولایت میں بھی کوئی فرق نہ آیا کہ اس نے جو کچھ دیکھا حق دیکھا۔ جیسے دوربین میں دور کی چیز پاس نظر آتی ہے کہ دیکھنے والا ہاتھ بڑھا کر اس کو پکڑنا چاہتا ہے مگر یہ نہیں سمجھتا کہ چیز درحقیقت دور ہے اور صرف دوربین اس کو پاس دکھارہی ہے۔ پس غلطی بھی ہے اور واقعیت بھی کہ شے نظر آنیوالی بیشک صحیح مگر اس کا قرب بعد دوربین کی مقدار قوت پر مشتبہ اور غیر معلوم ہے یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ ہاں بات یہی ہے۔

حضرت ممدوح میں سخاوت و مہمان نوازی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ ایک بار خود فرمایا کہ جب میں طالب علمی کے لئے دیوبند آیا تو میرے والد صاحب نے مجھے ایک چونی دی کہ ضرورت میں کام آئے گی۔ میں نے اس کو کمربند میں باندھ لیا اور وہ چھ مہینے تک بندھی رہی۔ اس کے بعد کسی ضرورت سے اس کو بھنایا پس اس کے

بعد سے میرے ہاتھ میں کبھی پیسہ نہیں رہا اور جو کچھ آتا وہ خرچ ہو جایا کرتا تھا حتیٰ کہ ۱۳۰۲ھ میں جب میں حج کو جانے لگا اور حضرت امام ربانی سے اجازت لینے گنگوہ آیا تو حضرت نے دعائیں دے کر رخصت فرمایا۔ باہر نکلا تو حضرت نے آواز دی اور فرمایا کہ مولوی صدیق احمد جب میرے پاس سے کوئی حج کے لئے رخصت ہوتا ہے تو میں اس کو نصیحت کیا کرتا ہوں کہ ہاتھ کو تنگ نہ رکھنا مگر تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ ہاتھ کو فراخ نہ کرنا بلکہ تنگ رکھنا۔ چنانچہ آپ نو سو روپیہ لے کر وطن سے مع اپنی والدہ کے روانہ ہوئے اور زمانہ وہ تھا کہ تین سو روپیہ فی کس بھی کافی سمجھا جاتا تھا مگر آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب مدینہ منورہ سے واپس مکہ ہوا ہوں تو سب خرچ ہو چکا اور مجھے فکر تھا کہ ہندوستان جانے کے لئے کس سے قرض مانگوں اسی پریشانی میں ایک دن جا رہا تھا کہ ایک دکاندار نے مجھے بلایا اور کہا مجھے چار سو روپیہ سہارنپور کے فلاں تاجر کو پہنچانا ہیں اگر آپ لیتے جائیں تو احسان ہوگا میں نے کہا کہ ایک شرط منظور ہو تو لیتا جاؤں گا وہ یہ کہ اس میں سے دو سو روپیہ قرض لوں گا جن کو سہارنپور پہنچ کر ادا کروں گا اور دو سو میرا امانت ہوگا کہ بجنسہ پہنچاؤں گا دکاندار نے اس کو بخوشی منظور کر لیا اور میرے لئے زادراہ کا انتظام بلا سوال غیب سے ہو گیا۔ یہ بھی فرمایا کہ قافلہ والے عام طور پر اپنے بدوؤں کی شکایت کرتے تھے مگر مجھے تو میرے بدو نے بہت ہی آرام دیا۔ میں نے اس کے واسطے کھجوریں خرید لی تھیں اور جب وہ کہتا یا شیخ الجوع میں تو اس کو ایک لپ بھر کر دے دیتا اور وہ خوش ہو جاتا تھا۔ غرض باوجودیکہ آپ نے شیخ کے حکم کی تعمیل میں ہاتھ روکنے کی ہر وقت ہی کوشش رکھی مگر پھر بھی آپ کا ہاتھ دوسرے فراخ دستوں سے آگے بڑھتا رہا اور گیارہ سو روپیہ دو تقر کے حج میں صرف ہو گیا ایک مرتبہ آپ بزمانۂ طالب علمی بیمار ہوئے کہ کسی کو زیست کی امید نہ رہی۔ سہارنپور میں ایک حکیم حاذق تھے آپ کے والد نے بغرض علاج ان کے پاس لے جانا چاہا اور رتھ بھی کرایہ پر کر لیا۔ آپ فرماتے تھے کہ اسی رات میں نے خواب دیکھا کہ مدینہ منورہ

روضہ مطہرہ پہ حاضر ہوں اور بڑے شوق سے صلوٰۃ وسلام پڑھ رہا ہوں
کیا دیکھتا ہوں کہ دفعتہً دروازہ کھلا اور میں سلام پڑھتا ہوا اندر داخل ہوا۔
تھوڑی دیر بعد دوسرا دروازہ کھلا اور میں اندر گیا تو معلوم ہوا کہ سرور عالم صلی
اللہ علیہ وسلم ملاء اعلیٰ کی سیر کو تشریف لے گئے ہیں میں ٹھہر رہا اور ذرا دیر
بعد آنحضرت روحی فداہ ایک تخت پر تشریف لائے کہ داہنی طرف ابوبکر تھے اور
بائیں طرف عمر فاروق ہیں میں نے حضرت کو دیکھتے ہی پھر الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول
اللہ پڑھنا شروع کیا اور حضرت نے میری طرف رخ فرما کر پوچھا کیا ہے میں نے
عرض کیا کہ حضرت بیماری کی وجہ سے میرا پڑھنا رہ گیا میرے لئے دعا فرما دیجئے
کہ صحت ہو جائے فرمایا تو اچھا ہے یا اچھا ہو گیا۔ دیکھو صحیح لفظ یاد نہیں رہا اس
کے بعد آنکھ کھل گئی۔ صبح کو اٹھا تو آرام معلوم ہوتا تھا مگر چونکہ رات کو رایہ پر کہلا گئی
تھی اس لئے مجھے سہارنپور لے گئے حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر والد صاحب
سے فرمایا کہ پیر جی صاحب تمہارا لڑکا تو بالکل اچھا ہے صرف نقاہت اور ضعف
باقی ہے سو معجون کا نسخہ لکھے دیتا ہوں اس کو کھلائیں ضعف بھی جاتا رہے گا۔
آپ کے حقیقی بھائی مولوی انوار احمد صاحب فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ جب
حضرتؒ کے بعد میں منگلور کی مدرسی پر گیا تو جائداد کی مشترکہ آمدنی پہ میری غلط
فہمی سے مجھے بھائی صدیق احمد کی طرف سے کبیدگی ہو گئی اور میں کشیدہ ہو
بیٹھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آپ دہلی بغرض تعلیم طب گئے اور طب کو چھوڑ چھاڑ کر دہلی
ذکر و شغل میں مشغول ہو گئے تھے۔ میں نے خواب دیکھا کہ کسی بلند جگہ پر کھڑا ہوں
جو نہ زمین ہے نہ آسمان اور ایک خوشنما بنگلہ ہے جس کا کمرہ تعمیر ہو رہا ہے معمار
مسلمان ہیں۔ ایک کا نام مولا بخش ہے اور دوسرے کا غلام رسول ہے میں نے
ان سے پوچھا کہ یہ بنگلہ کس کا ہے؟ جواب دیا گیا کہ آپ کے بھائی مولوی صدیق
احمد کا۔ میری نظر نیچے پڑی تو چنائی گاؤدم نظر آئی اور میں نے کہا ایسی بھدی چنائی
کیوں کی؟ کہا ابھی درست کئے دیتے ہیں اور سلیقہ سے کر فوراً اس کو سیدھا کر دیا

کہ ایک سنوت میں ہو گئی اور بنگلہ مکمل دتیار ہو گیا۔ باہر دیکھا تو چار طرف چھوٹی سی نہر جاری ہے اور بجانب غرب چھوٹی سی مسجد ہے جس میں خوبصورت لوٹے رکھے ہیں۔ پھر میں نے نظر اٹھائی تو صدہا بنگلے چھوٹے بڑے تیار نظر آئے مگر مکین کسی میں نہیں۔ دوبارہ نظر اٹھائی تو شمالی رُخ ایک عالیشان عمارت نظر آئی اور ایک عمارت بجانب جنوب . . . میں نے شمالی عمارت کے اندر جانے کا قصد کیا تو دربان نے روکا کہ ابھی حکم نہیں ہے تم پہلے جنوبی محل میں جاؤ۔ وہاں آیا تو دربان نہ تھا اور میں اندر داخل ہوا۔ دیکھتا ہوں کہ سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم مع خلفاء اربعہ تشریف فرما ہیں۔ فرطِ شوق میں کئی منٹ تک قدم چومتا رہا کہ غلبۂ سرور میں میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دفعتاً آنکھ کھل گئی اور دیکھا کہ آنسو جاری تھے۔ پھر آنکھ لگ گئی اور پھر یہی خواب دیکھا حتیٰ کہ تین دفعہ یہی پیارا منظر نظر آیا لیکن اسی خواب پر میری وہ بدظنی بھائی کے ساتھ جاتی رہی اور میں وطن آیا تو معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب نے اپنا مستعملہ کُرتہ حضرت گنگوہی کے پاس بھیجا کہ خلفاء میں جس کو اس کا مستحق سمجھو اُسے دے دینا اور حضرت امام ربانی نے وہ کُرتہ بھائی صدیق احمد کو مرحمت فرمایا ہے چنانچہ بھائی بھی وطن آئے اور اس ملبوس شریف کی مجھے زیارت کرائی۔ اس کے بعد ہم بھائیوں میں کبھی کوئی خلش یا رنجش نہیں ہوئی۔

مولانا رحمۃ اللہ فرماتے تھے ایک بار مجھ سے کہا گیا کہ پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ میں نے تین باتیں دریافت کیں جن میں ایک یہ تھی کہ مجھ پر یہ انعامات کیوں ہوئے تو ارشاد ہوا کہ شفقت علے الخلق والطلبہ کی وجہ سے۔ ایک بار ارشاد ہوا کیا چاہتے ہو؟ شہرت یا اولاد تو میں نے اولاد کو پسند کیا۔ چنانچہ آپ صاحب اولاد ہوئے۔ اور ماشاء اللہ سب عالم وصالح اور خوشحال ضروریات معاش سے فارغ البال۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے شروع میں مجددیت کا دعویٰ کیا تھا۔ میں اس وقت مالیر کوٹلہ تھا اور بھائی مشتاق احمد کے پاس جو کہ لدھیانہ کے اسکول میں ہیڈ مولوی تھے وطن کو آتے جاتے ٹھہرا کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھی اکثر

لدھیانہ آتے تھے اور مریدوں میں خوب آؤ بھگت ہوتی تھی۔ بھائی مشتاق احمد کی مجلس میں تذکرہ ہوا کہ مولوی صاحب ذرا معلوم تو کریں کہ آیا واقعی وہ مجدد ہیں میں نے کہا جب ایسا اتفاق ہو کہ وہ آئے ہوئے ہوں اور میں بھی یہاں موجود ہوں تو اس وقت چلیں گے۔ اتفاق سے ایسا موقع پیش آگیا اور ایک مجلس میں میرا اور مرزا صاحب کا اجتماع ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ علمی گفتگو میں تو مرزا صاحب کچھ الٹی سیدھی بولتے ہی رہیں گے اور نتیجہ نہ نکلے گا لہذا میں نے ان سے پوچھا کیا واقعی آپ مجدد ہیں؟ کہا ہاں۔ میں نے کہا تو آپ کو مقامات سلوک ضرور طے کرائے گئے ہوں گے؟ بولے جی ہاں۔ میں نے کہا سیر اجمالی ہوئی یا تفصیلی؟ کہا اجمالی ہوئی ہے۔ میں نے کہا سیر اجمالی والا مجدد نہیں ہو سکتا کہ حضرت مجدد سرہندی قدس سرہٗ نے اپنے مکتوبات میں فلاں جگہ اس کی تصریح فرمائی ہے اس پر مرزا صاحب بولے مجھے اجمالی اور تفصیلی دونوں قسم کی سیر کرائی گئی ہے میں نے کہا تفصیل بیان کیجئے۔ بولے ایسی تفصیلی تھی جیسے ریل گاڑی تیز چل رہی ہو کہ بظاہر تفصیلی ہوتی ہے مگر کچھ یاد نہیں رہتا۔ میں نے کہا ایسی تفصیلی سیر میں اسٹیشن تو تمام پڑتے ہیں انہیں کے نام شمار کرا دیجئے تو کچھ جواب نہ بن پڑا اور اکثر مولوی صاحبان کو جو مجمع میں موجود تھے ان کی طرف سے اعتقاد جاتا رہا۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مالیر کوٹلہ میں مولوی عبدالرحیم مرحوم کے پاس دو طالب علم تھے جن کو یہ زعم تھا کہ ہمارے استاد جیسا کوئی معقولی دنیا میں ہے نہ ہم جیسا مستعد کوئی طالب علم۔ میرے پاس اس وقت مولوی عبداللطیف (لطیف یار جنگ بہادر پنشنر حیدرآباد دکن) ملا حسن پڑھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ دونوں طالب علم آئے اور کہنے لگے یہ لڑکا ملا حسن کا کتنا سبق پڑھتا ہے میں نے کہا ۲ دو ورق۔ تعجب سے کہنے لگے ہم تو تین چار سطر سے زیادہ نہیں پڑھتے کیا یہ ۲ دو ورق سمجھ لیتا ہے؟ میں نے کہا بلکہ سمجھا سکتا ہے ان کو اور زیادہ حیرت ہوئی کہ ہم ملانوں کو تو وہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ قال اللہ و قال الرسول کے

سوا انہیں کچھ آتا ہی نہیں اور معقول سے ان کو کیا سروکار۔ لہذا کہنے لگے اچھا اجازت دیجئے کہ یہ ہمارے ساتھ تکرار کیا کریں۔ میں نے کہا بہتر ہے تم آجایا کرو۔ چنانچہ دونوں طالب علم دوسرے وقت آئے اور مولوی عبداللطیف نے مُلاّ حسن کھول کر ایک مقام اُن کو سمجھایا۔ اس کے بعد پوچھا کہ سمجھ بھی لیا؟ اور اچھی طرح ذہن نشین بھی ہوگیا؟ وہ بولے کہ ہاں خوب سمجھ لیا۔ تب مولوی عبداللطیف نے کہا کہ کتاب کا یہ مطلب نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے بلکہ یہ مطلب ہے اور اس کی اچھی طرح تقریر کی۔ اس بحث کو جب وہ تسلیم کرچکے تو مولوی عبداللطیف نے پھر کہا کہ یہ بھی مطلب غلط ہے اور یہ یہ اعتراض پڑتا ہے چنانچہ تیسرے مطلب کی تقریر کی اور اس کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کرا کے ان کو تسلیم کرا دیا۔ آخر وہ اٹھے اور اپنے مزعومہ خیال کو وہیں چھوڑ کر اُٹھے۔

مولانا مرحوم اُن خوش نصیب بزرگوں میں تھے جن کو حق تعالیٰ کی طرف سے دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں بھرپور عطا ہوئیں۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ کے مجھ پر بڑے انعامات ہیں۔ عالم دین بنایا۔ اولاد عطا فرمائی۔ اولاد بھی صالح مطیع اور عالم ہیں نے اپنی اولاد کی اولاد کو بھی دیکھا۔ اور مجھے اپنی اولاد کا یا کسی دوسرے کا دنیوی امور میں محتاج نہیں بنایا۔ بلکہ میرے سے دوسروں کو نفع پہنچوایا۔ چنانچہ آپ مالیر کوٹلہ میں مفتی تھے اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ باوجود کثیر العیال ہونے کے اپنے خاندان اور وطن کے نادار و حاجتمند اور یتامیٰ و بیوگان کی ہمیشہ خبر گیری فرماتے اور مالی اعانت کرتے رہتے تھے۔

انبہ کے موسم میں مولانا کا رخصت لے کر وطن آنے کا معمول تھا کہ انبہ سے خاص رغبت تھی اور کھانے سے زیادہ دوسروں کو کھلانے کا شوق تھا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۲۵ء میں حسب معمول مع اہل و عیال وطن آکر موسم انبہ کے ختم پر ستمبر میں واپس ہوئے تو گردن و شانہ کے درمیان خفیف درد ہوگیا جس کا علاج اول یونانی ہوا اور اس سے نفع نہ ہونے پر ڈاکٹری۔ چنانچہ چند روز میں درد جاتا رہا اور آپ نے

پنجشنبہ ۲۷ صفر ۴۴ھ کو داڑھی پر مہندی کا خضاب لگایا اور غسل فرما کر کپڑے
بدل کر بعد نماز عصر معالج کا شکریہ ادا کرنے کے لئے چلے ۔ دروازہ میں آ کر
کچھ ضعف معلوم ہوا اور وہیں بیٹھ گئے ۔ ذرا دیر بعد ہمت فرما کر اٹھے اور ڈاکٹر صاحب
کی توجہ کا شکریہ ادا کر کے گھر آئے کھانا کھایا اور مغرب کی نماز پڑھی مسجد سے واپسی
میں پھر ضعف محسوس ہوا کہ چلتے چلتے ٹھہر گئے اور پھر ہمت کر کے مکان کے بالاخانہ
پر حسب عادت جا لیٹے ۔ عشا کی نماز کو پھر مسجد میں آئے اور باجماعت ادا فرما کر
مکان پہنچے ۔ حسب معمول آخر شب کیلئے پانی بھر کر لوٹا رکھا ۔ کوٹھری کو جس میں آپ کی
مختصر اشیاء ضروریہ رکھی رہتی تھیں قفل لگایا اور گیارہ بجے کے قریب چارپائی پر
لیٹ رہے ۔ مگر آرام نہ آیا تو بے چین ہو کر اٹھ بیٹھے اور ذکر جہر شروع کر دیا ۔ ذرا
دیر بعد قضاء حاجت کو گئے اور واپسی میں ضعف زیادہ ہو گیا ۔ فرمایا سینہ میں درد معلوم
ہوتا ہے ۔ آپ کے صاحبزادے مولوی شفیق احمد نے سینکنا شروع کیا مگر دیکھا کہ آواز
پست ہوتی جاتی ہے دوبارہ قضاء حاجت کے لئے چوکی قریب رکھی گئی اور آپ
فارغ ہو کر تکیہ سرہانے رکھ کر پلنگ پر لیٹ رہے ۔ آپ ذکر کی آواز اتنی کم ہو
گئی کہ بدشواری سنائی دیتی تھی کہ بارہ بجے شب کو دفعۃً بلند آواز سے اللہ کہا اور
روح رفیق اعلیٰ سے جا ملی متعلقین نے سمجھا کہ غشی یا سکتہ ہوا مگر ڈاکٹر نے آ کر کہا
کہ رخصت ہو لئے اور اب کچھ نہیں ہے ۔ اگلے دن جمعہ کو مالیر کوٹلہ کے گورستان میں
دفن ہوئے اور اس طرح پر ایک نماز قضا کئے بغیر چند لمحات میں آخرت کا کٹھن
سفر ختم فرما لیا فانا للہ وانا الیہ راجعون ۔

پر آنکہ زیست بہ ناچار بایدش نوشید ۔۔۔۔ نہ دور جام مئے کل من علیہا فان

انتقال کے بعد دیکھا گیا تو آپ کے کمربند میں صرف ایک اکنی تھی اور میں دو چار
سے تین دن قبل آپ کا خط بڑے صاحبزادے مولوی فاروق احمد کے نام بہاولپور
پہنچا تھا جس میں تحریر تھا کہ تقریباً ساڑھے چار سو روپیہ کا مقروض ہوں لیکن اس
سے کچھ زیادہ میری تنخواہوں کا سرکار میں باقی ہے ۔ اللہ کی شان کہ نواب صاحب

اس وقت شملہ تھے۔ آپ کی وفات سے مطلع ہوتے ہی حکم آیا کہ ریاست کا ایک بڑا اہل کار ہماری طرف سے تعزیت کے لئے پس ماندگان کے پاس جائے اور منشی صاحب کی چڑھی ہوئی ساری تنخواہیں ساتھ لیتا جائے اور ایسے موقع پر ریاست کا جو دستور ہے وہ عمل میں لائے۔ اس طرح پر حق تعالیٰ نے آپ کو بار قرض سے اور کفن دفن کے تمام خرچ کو آپ کی کمائی سے پورا کرایا کہ پسماندگان پر آپ کا بار ایک پیسہ کا بھی نہیں پڑا۔ آپ اپنی حیات میں متعدد مرتبہ فرما چکے تھے کہ میری تمام کتابیں بتولیت اولاد وقف ہیں اور میں اپنی اولاد کو وصیت کرتا ہوں کہ علم دین کو جو کہ ان کا ترکہ پدری ہے اپنی اولاد سے نکلنے نہ دیں اور اگر خدانخواستہ میری اولاد میں علم نہ رہے تو اس وقت ان کتابوں کو کسی مدرسہ میں داخل کر دیں۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

حضرتؒ کو مولانا کے ساتھ کئی تعلقات سے محبت تھی کہ چچازاد بھائی تھے۔ بچپن کے ہمجولی اور ہمعصر تھے۔ ہر معاملہ میں عرصہ دراز تک ساتھ ساتھ رہے تھے۔ سمدھی تھے کہ آپ کے ہمشیرزادے اور بھتیجے حافظ ابراہیم کا مولانا کی ہمشیرزادی سے عقد ہوا تھا۔ ہم مکتب اور پیر بھائی تھے اور ایک شیخ سے اجازت یافتہ ہوئے۔ دونوں حضرت امام ربانی کے خلیفہ تھے اس لئے جب آپ کے کانوں میں یکایک اس سانحہ کی خبر پہنچی تو گویا آپ کی کمر شکستہ ہو گئی۔ وطن میں خبر پہنچنے پر اعزہ بالیر کوٹلہ گئے اور جب ان کی واپسی ہوئی تو حضرت نماز جمعہ کے لئے جامع مسجد جا چکے اور خطبہ شروع ہو گیا تھا۔ سنن سے فارغ ہو کر جب حضرت چلے تو آنے والے صاحب نے مصافحہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت وہیں بیٹھ گئے اور مرض و وفات کے مفصل حالات سنتے اور پوچھتے رہے۔ آخر میں چشم نم ہوئے اور انا للہ پڑھ کر فرمایا کہ میرے سارے ہمعصر رخصت ہو چکے۔ اب صرف میں ہوں۔ دیکھئے اس مٹی کو کب تک گھسٹنا مقدر ہے۔

بزم علم و دید لہ ہیچی گشت برہم یک بیک ساقی از محفل شد و بشکستہ شد جام و سبو

محفل علم و ادب شد بے نمک از رفتنش کام جاں تلخ است مرہ از تلخی ہجران او

حضرتؒ طلبہ کے متعلق تعلیمی امور میں بہت محتاط تھے اور اپنی ان میں کسی ادنیٰ رعایت

کو بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ اسی طرح طلبہ کی علمی و اخلاقی حالت پر بھی سخت نظر ڈالا کرتے اور کیسا ہی کسی عزیز یا دوست کا بچہ ہو جب اس کی بدوضعی یا آزادی کو محقق فرما لیتے تو بے تامل مدرسہ سے خارج کر دیتے اور جب تک وہی اپنی حالت پر نادم ہو کر سچی توبہ نہ کرے اس کے ولی و وارث کی کوئی سفارش نہ سنتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کو اتنی بات پر کہ انہوں نے حضرت کی قرابت کے ناز پر اپنے استاد کا احترام و ادب ملحوظ نہ رکھا تھا فوراً مدرسہ کی کتابیں واپس کرنے کا حکم دے دیا اور جب تک خود استاد نے حضرت سے سفارش نہ کی اس وقت تک واپس کردہ کتابیں ان کو دوبارہ نہ دی گئیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دفتر و مطبخ وغیرہ کے ملازمین کی طلبہ پر کوئی داب یا سختی حضرت کو گوارا نہ تھی اور ایسے مواقع پر حضرتؒ ہمیشہ طلبہ کا پہلو لیا کرتے تھے ایک مرتبہ میں حاضر تھا کہ ایک طالب علم کی آپ کے پاس محرر مطبخ کے متعلق شکایت آئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ طلبہ کو کھانا تقسیم کر رہے تھے۔ اس طالب علم کو جلی ہوئی روٹی ملی جس کے لینے سے اس نے انکار کیا اور محرر مطبخ نے سختی سے جواب دیا کہ اب ختنے بہک گئے کہ جلی اور موٹی سوجھنے لگی۔ لینا ہو لو ورنہ جاؤ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو اپنے حصہ میں لگا لوں یا جو روٹی جلے اس کا تاوان دیا کروں۔ حضرتؒ یہ خبر سنتے ہی مطبخ میں آئے اور غصہ کی وجہ سے آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا میں ساتھ تھا اور دیکھ رہا تھا کہ حضرت کے بدن اور آواز دونوں میں رعشہ ہے۔ محرر مطبخ سے آپ نے واقعہ پوچھا اور جب انہوں نے خود ہی اس توقع پر صحیح صحیح بیان کر دیا کہ طلبہ کا نظام قائم رکھنے کے لئے محرر کی طرفداری کی جائے گی تو اس وقت آپ نے فرمایا منشی جی سنو۔ مدرسہ انہیں پردیسی بے وطن مسکین طلبہ کے دم سے قائم ہے اور تم اور میں دونوں انہیں کے طفیل میں روٹیاں کھا رہے ہیں اگر یہ نہ ہوں تو نہ مطبخ کی ضرورت نہ تمہاری حاجت۔ مدرسین بھی فارغ اور مدرسہ بھی خالی۔ یہ مسکین بھی محتاج سہی مگر مجھے اور تمہیں دونوں کو روٹیاں دے رہے ہیں مجھے صرف یہ یاد رکھو کہ تمہیں ترش کلام کرنے کا کیا حق تھا اور تم کون تھے یہ کہنے والے کہ ختنے بہک گئے

میں ان کا باپ بنا ہوا ابھی زندہ بیٹھا ہوں تم کو مطبخ سے جزو تنخواہ بنا کر دو خوراک ملتی ہیں آخر کیا وجہ تھی کہ جلی ہوئی روٹی تم اپنی خوراک میں نہ لگا سکے اور مہمان رسول کو مجبور کیا کہ یا تو یہی جلی ہوئی کھائے ورنہ فاقہ کرے۔ اب تو اپنی خوراک اس کے حوالہ کر دو اور آئندہ کے لئے خوب کان کھول لو کہ کسی طالب علم کے ساتھ کچھ بھی تیز یا ترش برتاؤ کیا تو کان پکڑ کر مطبخ سے نکال دوں گا۔ ہاں کسی طالب علم کی کوئی غلطی ہو تو مجھ سے کہو میں تحقیق کے بعد جو سزا مناسب سمجھوں گا دوں گا۔ مگر دوسرے کو نہ دیکھ سکوں گا کہ وہ انہیں ترچھی نظر سے بھی دیکھے جو تکبر بیجی غلطی ہے اس لئے اس وقت تنبیہ پر اکتفا کرتا ہوں کہ آئندہ اس کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

اسی طرح مدرسین کے احترام کا آپ کو خاص اہتمام تھا اور ان کے ساتھ وہ شفقت ولطف کا برتاؤ فرمایا کرتے جو ان کے لئے شایان تھا باوجودیکہ تمام مدرسین آپ کے شاگرد اور معتقد خادم تھے مگر جب کوئی آتا تو آپ اس کو پاس بٹھا لیتے اور انکی بری بھلی سب توجہ سے سنتے اتنے مسکراتے اور کوئی شکایت لاتا تو اس کی کافی تحقیق فرما کر ان کو تسلی دیا کرتے تھے طالب علم اور استاذ کے مابین کوئی قصہ ہوتا جس میں غلطی استاد کی ہوتی تو اس وقت بڑی حقیق پیش آتی اور بڑی حسن تدبیر سے دونوں پہلو سنبھالا کرتے تھے۔ مولوی ظفر احمد کے مزاج میں غصہ تھا۔ ایک مرتبہ طالب علم کے بے تکے سوالات پر ان کو پڑھاتے ہوئے غصہ آیا تو کتاب کہ فلسفہ کی تھی طالب علم کے منہ پر ماری حضرتؒ کے قریب ہی ان کی درسگاہ تھی اور حضرت نے سب دیکھا اور سن لیا تھا اس وقت گرفت کرنے میں طالب علم کی جرأت بڑھنے کا اندیشہ تھا اور حضرت کو اس کا خاص اہتمام رہتا تھا کہ طلبہ کے قلوب میں استاذ کی عظمت قائم اور باقی رہے اس لئے ایسا کر دیا گویا سنا ہی نہیں بعد عصر جب مولوی ظفر احمد صاحب مجلس میں آکر بیٹھے تو حضرت نے فرمایا مولوی ظفر کیا کتاب سے بھی مارا کرتے ہیں، کتاب تو اس کے لئے موضوع نہیں ہوئی پھر کتاب بھی مدرسہ کی جو کہ وقف ہے اور جسکی حفاظت ضروری مولوی صاحب نے غلطی کا اقرار اور آئندہ کے لئے احتیاط کا عہد کیا تو آپ مسرور ہوئے اور پھر محبت کے لہجہ میں فرمایا بھائی آجکل طلبہ کو مارنے کا زمانہ نہیں ہے

کیونکہ زمانہ فساد کا ہے قلوب میں تکبر بھرا ہوا ہے بعض نادان مقابلہ سے پیش آنے لگتے ہیں اس سے تو بالکل ہی احتیاط کرو اور اگر کوئی زیادہ بک بک لگا دے اس کو مہتمم سے اطلاع کر کے درس سے اٹھا دو بس اس سے زیادہ سزا کی ضرورت نہیں یا امتحان اپنے مدرسہ کا ہو یا دوسرے مدرسہ کا حضرت سخت لیا کرتے مگر اس کے ساتھ ہی نمبر اچھے دیتے تھے ۱۳۲۷ھ میں مدرسہ جامع العلوم کانپور میں دینیات سے فارغ شدہ طلبہ کے امتحان دلائے جانے کی تجویز ہوئی کہ تمام علوم میں امتحان لیا جائے اور بجائے تقریری کے تحریری امتحان ہو جس کے لیے سوالات بیرونی علماء سے منگائے جائیں۔ چنانچہ ادب و بلاغت اور صرف و نحو کا امتحان حضرت کے سپرد ہوا۔ اور حضرت نے علوم عربیت کے اہم سوالات تحریر فرما کر مدرسہ میں بھیج دئیے مولوی ظفر احمد صاحب تھانوی بھی شریک امتحان تھے اور جب امتحان سے فارغ ہو کر وطن آئے تو حضرت کی زیارت کا شوق ہوا کہ اس سے قبل کبھی زیارت نہ ہوئی تھی چنانچہ جب بھائی کے ساتھ دیوبند جانے لگے تو بھائی سے اپنی خواہش ظاہر کی کہ راستہ میں ہمارے حضرت کی زیارت کرتے چلیں کہ ادب و بلاغت میں ہمارے ممتحن تھے شاید کچھ نتیجہ امتحان کا بھی پتہ چل جائے بھائی نے کہا کہ ہیں زیارت کرنا چاہو تو کر لو باقی نتیجہ امتحان کا پتہ مولانا نہیں دیں گے کہ یہ قاعدہ کے خلاف بات ہے چونکہ مولوی ظفر احمد صاحب کے قلب میں حضرت کی عظمت بیٹھ گئی اور ایک میلان و کشش پیدا ہو گئی تھی اس لیے مدرسہ میں آئے اور حضرت کی زیارت کی مولوی ظفر احمد صاحب کا بیان ہے کہ حضرت کی طبیعت مبارکہ میں شفقت تو قدرت نے ایسی کوٹ کوٹ کر بھری تھی کہ اس کی نظیر ملنا دشوار ہے زیارت کے ساتھ ہی جس چیز کو میں نے دیکھا وہ حضرت کا تبسم کے ساتھ خندہ پیشانی سے شفقت و عنایت فرمانا اور تھوڑی ہی دیر میں قبل از یں کہ میں نتیجہ امتحان کے متعلق کچھ عرض کرتا خود ہی یہ فرمانا تھا کہ میاں ظفر تمہارے جوابات سے ہم بہت خوش ہوئے تم نے سب سوالات کے جوابات اچھے لکھے اور بالخصوص اردو کی عربی اور عربی کی اردو بہت سے اچھی بنائی فالحمد للہ

لیے ہم نے نمبر بھی تم کو اچھے دیئے اور یہ فرما کر حجرہ میں تشریف لے گئے اور جوابات
کے پرچوں کا پلندہ نکال کر باہر تشریف لائے۔ اس میں سے میرے جوابات کا
پرچہ نکالا اور میرے سامنے ڈال دیا کہ دیکھو نمبر سب سے زیادہ ہیں (یعنی سو
نمبر ہی صرف ایک یا دو کم تھے) اور کسی کے نمبر اس قدر نہیں ہیں، سب تم سے کم ہیں۔
اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ شاید حضرت کو کشف ہو گیا کہ میں نتیجہ امتحان
کے متعلق خیال لے کر آیا ہوں۔ اس کے بعد پھر مجھے اپنے ساتھ دولتکدہ پر لے گئے
اور جو میٹھے پراٹھے تیار تھے اپنے ہاتھ سے پیالی میں نکال کر مجھے عطا فرمائی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں اول صبح کے دو گھنٹے ترمذی شریف ہوا
کرتی اور اس کے ختم ہو جانے پر بخاری شریف شروع ہو جاتی تھی اور رجب کے
وسط میں دونوں کتابوں سے باطمینان فراغ ہو جاتا تھا اس کے بعد فقہ و تفسیر کے
اعلیٰ اسباق ہوتے اور اوقات مدرسہ میں ایک گھنٹہ آپ کا درس سے فارغ رہتا
تھا جو فتاویٰ لکھنے یا دوسروں کے لکھے ہوئے کو دیکھنے اور سننے میں خرچ ہوتا
تھا۔ ۲۸ھ سے جب مولوی محمد یحییٰ صاحب تشریف لے آئے تو آپ کا
ایک گھنٹہ صبح کا اور ایک شام کا فارغ ہونے لگا اور یہ وقت امور نظم مدرسہ میں
صرف ہونے لگا۔ ۳۵ھ میں جب آپ نے ابوداؤد کی شرح بذل المجہود کی تالیف
شروع فرمائی تو دو گھنٹے صبح کے تالیف کے لئے تھے اور ایک گھنٹہ شام کا فتاویٰ
کے لئے اور باقی گھنٹوں میں درس۔ مگر ۳۹ھ میں صبح کا تمام وقت بذل کی تالیف میں
مستغرق ہو گیا اور شام کو ایک سبق کا آپ درس دیتے تھے جو ہر سال بدل جاتا
تھا کہ ایک سال ابوداؤد شریف ہوتی دوسرے سال مسلم شریف اور پھر نسائی
شریف۔ اخیر کے دو سال ۴۳، ۴۴ھ میں صرف موطا امام محمد طلبہ کے اصرار پر تبرکاً
پڑھاتے اور صبح کا تمام وقت بذل میں خرچ ہوتا تھا اور شام کا خطوط کے جوابات
اور فتاویٰ میں کہ ڈاک کی آمد بہت بڑھ گئی تھی۔ جوابات خطوط ابتدا میں آپ خود
تحریر فرمایا کرتے اور خط ایسا حسین تھا گویا تصویر کھینچ دی چنانچہ ۲۹ھ تک کے

آپ کے بھیجے ہوئے خطوط بندہ کے پاس ایک ہزار سے زیادہ موجود ہیں جو حضرت کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ جلد اور اتنا حسین لکھنا حضرت ہی کا کام تھا۔ بعض خطوط حضرتؒ نے آخر شب میں چراغ کے سامنے لکھے ہیں کہ دن کو فرصت نہیں ملی مگر کیا مجال کہ حسن میں ذرہ برابر فرق آیا ہو۔ پھر جب رعشہ بہت بڑھ گیا تو مولوی محمد یحییٰ صاحب مولوی عبید اللہ حاجی مقبول احمد اور مولوی زکریا صاحب وغیرہم آپ کے کاتب رہے۔

انتظام مدرسہ کے متعلق حضرت میں ایک خاص کمال یہ تھا کہ ہر شعبہ کی نگرانی بغیر وقت صرف کئے فرماتے تھے کہ کسی کام میں بھی مشغول ہوں خیال چار طرف رہتا اور کسی شعبہ سے بھی غفلت نہ ہوتی تھی۔ مدرسین کی تعلیم۔ طلبہ کی حاضری مطالعہ تکرار کتب بینی پابندی نماز و تلاوت قرآن اور نیک چلنی و وضعداری کا جداجدا دھیان تھا اور دفتر کے تمامی رجسٹروں کی وقت پر خانہ پُری اور حساب کتاب کی صحت و صفائی کا جدا خیال تھا۔ کتب خانہ کی محافظت اور صفائی و ترتیب پر علیحدہ نظر تھی اور مطبخ کی اجناس کے محفوظ اور وزن میں ہر وقت صحیح رہنے پر علیحدہ نگاہ تھی۔ ہر شعبہ کے ملازمین کا صحیح وقت پر آنا حضرت کی ادنیٰ توجہ اور ہیبت خداداد کی بدولت اتنا قابو میں آیا ہوا تھا کہ چند منٹ کی غیر حاضری کے چھپا لینے پر بھی کوئی قادر نہ تھا۔ علمی مشغلہ آپ کا اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اہل نظر اس پر تعجب کیا کرتے تھے چہ جائیکہ اس پر فتاویٰ کا اشتغال کہ وہ مستقل مد ہے اور پھر خطوط کے جوابات جس میں علمی اشکالات طلب مشورہ احتیاج تربیت ذکر و اوراد کے استفسار اظہار و واقعات خانگی معاملات وغیرہ وغیرہ سب ہی کچھ ہوتے تھے جدا مشغلہ تھا جو دماغ کے کامل سکون اور طبیعت کے پورے حضور کو چاہتا تھا۔ اس پر ہر شعبہ کی نگرانی اور طرہ یہ کہ ان ہر جزو کی اصلاح اور ترقی کا فکر و تدبر ایسے امور تھے کہ دیکھنے والا حیران ہو جاتا تھا۔ بس ایک مشین تھی جو بھاپ کے ذریعہ چل رہی اور اپنے ساتھ جڑے ہوئے ہر آلہ کو اس کام میں لگائے ہوئے تھی جس کے لئے وہ وضع کی گئی ہے کہ انجن صرف ایک ہے

مگر اس پن سے نکلنے والی برقی قوت چکیاں بھی چلا رہی ہے کہ آٹا پیسیں۔ پریس
بھی چلا رہی ہے کہ کاغذ چھاپیں۔ پنکھے بھی چلا رہی ہے کہ پسینہ سوکھے اور قمقمے
بھی روشن کر رہی ہے کہ دنیا جگمگا اٹھے اور رات کی تاریکی میں نصف النہار کا سورج
نکل آوے۔ اسی طرح حضرتؒ کا ایک دم تھا کہ درس بھی دیتا تھا۔ تالیف بھی کرتا تھا
معاشرت اہل و عیال میں بھی نمونۂ سنت بنا ہوا تھا مدرسہ کے ہر شعبہ کی نگرانی اور اس
کی ترقی میں فکر و سعی بھی رکھتا تھا۔ مہمانوں کی مدارات اور تمامی کنبہ و برادری سے
شیریں تعلقات نباہتا تھا مخلصین کی دلدہی اور معاصروں کی مخلصانہ محبت میں دُور
دُور کے سفر اور متواتر و مسلسل و مختلف اسفار میں حسب موقع دن اور ہفتے اور مہینے
خرچ کرتا تھا طالبین میں ہر شخص کی طاقت و قابلیت کے موافق ان کو زبانی اور بذریعہ
مراسلت اصلاح حال کی تعلیم بھی دیتا تھا توجہ و تصرف ہمت سے ان کی تربیت بھی فرماتا
تھا اور باایں ہمہ اپنے مولیٰ کے ساتھ قلبی و جسدی تعلقات کے تمامی حقوق ادا کرتا
تھا جو زہاد و عباد کسی پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ کر ادا کیا کرتے ہیں۔ اس دماغی اور بدنی مشاغل
میں مشغول ہو کر کوئی برسوں کا حاضر باش بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں نماز کی تکبیر تحریمہ حضرتؒ
سے چھوٹ گئی یا فلاں شب تہجد کے لئے آنکھ نہیں کھلی۔ حضرتؒ کے مشاغل روزمرہ کا
عشر عشیر بھی کسی کے سر پر رکھ دیا جائے تو بڑا بہادر و باہمت کہلائے گا اگر چند ہفتے
بھی یکساں حال پر تیقظ و چستی میں گزار دے چہ جائیکہ عمر کا بڑا حصہ اور وہ بھی اخیر جس
میں بیماری جسمانی قوتیں جواب دینے لگتی ہیں اس چستی و پابندی میں گذرا کہ جو دن آیا
وہ ایک جدید اشتغال کا اضافہ ساتھ لایا کہ مدرسہ بھی ترقی پذیر ہو کر روزانہ مزید توجہ
کی احتیاج بڑھاتا رہا اور اصلاح و تربیت روحانی کے سلسلہ میں بھی روزانہ ترقی
ہو کر کمًّا و کیفًا مزید اشتغال کی ضرورت بڑھتی رہی۔ باوجودیکہ آپ مدینہ کی زمین میں دفن
ہونے کی ہوس پر ہندوستان چھوڑ چکے اور سمندر پار جہاں سے خط بھی پچیس [۲۵] دن میں
پہنچے یکسو ہو کر بیٹھ چکے تھے۔ مدرسہ سے رخصت لے چکے اور اس کو اپنے معتمد
خدام کے حوالے کر کے تمامی ذمہ داریاں سر سے اتار چکے تھے مگر میں مجسم حیرت بن گیا

جب آپ کا رجسٹری شدہ والا نامہ میرے نام آیا جس میں مدرسہ کے متعلق پانچ سے
زیادہ وہ جزئی واقعات لکھے جن کی تحقیق اور اصلاح کی ضرورت تھی اور پھر ہر واقعہ کا
قطعی فیصلہ بھی تحریر فرمایا کہ فلاں واقعہ اگر صحیح ہو تو یہ کرنا چاہیئے اور غلط ہو تو یہ ہونا چاہیئے
اور اس کے بعد قواعد کلیہ کے درجہ میں نگرانی کا سبق پڑھایا یا مافات کی تلافی اور آئندہ کی
احتیاط کا طریق سکھلایا اور ان علامات مخفیہ پر آگاہ کیا جو اس وقت نہیں مگر آئندہ
سوئی کا پھاوڑہ بنتی نظر آتی ہیں۔ غرض جن امور سے ہم حاضرین کی آنکھیں اور کان تک
بے خبر اور قلوب مقفل و دماغ معطل تھے آپ نے یثرب کی زمین میں بیٹھے ہوئے ان
پر روشنی ڈالی اور ایسی ڈالی کہ اُن سے نفع اٹھانے والا ایک چلتے ہوئے مفید عام
کارخانہ کی تمام ذمہ داریوں کو بآسانی انجام دے سکتا ہے بشرطیکہ چاہے یہ
آپ کا خداداد تیقظ اور عطاء الٰہی بصیرت تھی کہ آپ دُور بیٹھے وہ دیکھتے اور
سمجھتے تھے جو پاس بیٹھے ہوئے کو نظر نہیں آتا تھا۔ عام انتظام اگرچہ برائے نام مولانا
حافظ عبداللطیف صاحب کے حوالے تھا مگر آپ خفیہ اور ظاہر دونوں طرح خود نگرانی
فرماتے بلکہ ناظم اور نظام پر بھی نظر رکھتے تھے کہ آئندہ کام اُن کے حوالے کرنا اور ان
کو وہ انتظامی سبق پڑھانا تھا جو آئندہ نگران کا محتاج نہ رکھے۔ احباب و متوسلین میں
کوئی تجارت پیشہ یا محاسب داں مدرسہ میں آتا تو آپ ان کو دفتر کے رجسٹروں پر نظر
ڈالنے اور خرچ جانچنے روزنامچہ اور بہی کھاتہ بغور دیکھنے کا حکم فرماتے اور مشورہ
لیا کرتے کہ موجودہ طریق میں جو نقص ہو وہ بتائیں کہ اصلاح کی جائے۔ پھر اچھے اچھے
تاجر اور محاسب کوئی مشورہ دیتے تو حیران ہو جایا کرتے تھے جبکہ حضرت کو دیکھتے
کہ اتنی تفصیل سے حضرت نے اس کو سمجھ لیا اور پھر اس کے حسن و قبح کی وجہ بحث اور
کرید شروع کر دی۔ اس کے بعد اس کا مفید ہونا محقق ہوا تو حضرت نے فوراً تسلیم
کر لیا اور مہتمم صاحب سے فرما دیا کہ رجسٹر کا اندراج ان کی تجویز کے موافق ان سے
سمجھ کر لیجئے اور اگر مفید نہ پایا تو ہنس کر جواب دیا کہ مولویوں کے لئے موجودہ طریق
کافی ہے اور فضول طوالت میں پڑ کر۔ زائد کاغذ اور ناحق وقت کہاں سے لائیں۔

وابستہ تو اسی طرح رہنے دو۔ مدرسہ کے تمامی نظام کا خلاصہ یہ تھا کہ عطا کنندگان کا عطا کردہ چندہ اپنے محل پر صرف ہو اور علم دین کی تکمیل کرنے والے عالم باعمل بن کر مدرسہ سے جائیں کہ اطراف دنیا میں منتشر ہو کر اس نور کو پھیلائیں جو سید نا محمد صلے اللہ علیہ وسلم بارگاہ رحمن و رحیم سے لے کر مکہ میں تشریف لائے تھے۔ چنانچہ آپ کی بتیس سالہ مدت صدارت و نظامت میں قریب چار سو کے وہ علماء تیار ہوئے جو ہدایت یاب نہیں بلکہ دوسروں کو ہادی بنانے کے لئے کافی ثابت ہوئے اور بحمد اللہ ان کا اکثر حصہ اب بھی درس و تدریس میں مشغول اور علماء تیار کرنے میں لگا ہوا ہے جن میں چند مشاہیر کے نام یہ ہیں:-

[1] مدرسہ کے موجودہ تمام مدرسین یعنی مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب ناظم [2] مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث [3] مولانا عبد الرحمن صاحب صدر المدرسین [4] مولوی اسعد اللہ صاحب رامپوری [5] مولوی محمد زکریا صاحب قدوسی [6] مولوی منظور احمد صاحب سہارنپوری [7] مولوی جمیل احمد صاحب تھانوی [8] مولوی مسعود علی خاں صاحب راجو پوری [9] مفتی ضیاء احمد صاحب گنگوہی [10] قاری عبد العزیز صاحب اور [11] قاری سعید احمد صاحب اجراڑوی وغیرہم مدرسین مظاہر علوم [12] مولوی عبد الکریم صاحب مدنی نواسہ حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مہاجر اور [13] مولوی عبد الحق صاحب مدنی نقشبندی مدرسان مدرسۃ الایتام مدینہ منورہ [14] مولوی علیم اللہ صاحب مدرس کنز العلوم ٹانڈہ [15] مولوی اشتاق الرحمن صاحب کاندھلوی مدرس فتح پوری دہلی [16] مولوی محمد مبین صاحب دیوبندی مدرس مدرسہ اسلامیہ انبالہ چھاؤنی [17] مولوی عبد الرحمن صاحب اورنگ آبادی مدرس مدرسہ وسطانیہ (دکن) [18] مولوی سید میر جہاں شاہ صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ عدن کیمپ [19] مولوی شمس الحق صاحب مدرس موضع اجراڑہ [20] مولوی محمد حامد صاحب مدرس کالج پٹنہ [21] اور مولوی بدر عالم صاحب مدرس مدرسہ ڈابھیل ضلع سورت [22] مولوی محمد عادل صاحب گنگوہی مترجم (حیدر آباد دکن) [23] مولوی قیس احمد صاحب دیوبندی [24] مولوی شبیر علی صاحب برادر زادہ حضرت مولانا تھانوی [25] مولوی حافظ عبد العزیز صاحب نواسہ حضرت مولوی

رائے پوری [۲۶] مولوی شفیق احمد صاحب صاحبزادہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب [۲۷] مولوی
فیض الحسن صاحب سہارنپوری [۲۸] مولوی حکیم محمد ایوب صاحب سہارنپوری [۲۹] مولوی لطیف
الرحمٰن صاحب کاندھلوی [۳۰] مولوی محمد طیب صاحب رامپوری [۳۱] مولوی مجد الدین صاحب کشمیری
[۳۲] مولوی غلام الرحمٰن صاحب تبتی [۳۳] مولوی عبد الرحیم صاحب غزنوی [۳۴] مولوی غلام حیدر
صاحب بخاری [۳۵] مولوی روشن دین صاحب بہاولپوری اور [۳۶] مولوی محمد عرفان صاحب
ہزاروی وغیرہم اطال اللہ بقاءہم۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر چہار طرف پورب پچھم اتر دکن
تمامی اکناف ہند کے بڑے شہروں میں مدرسہ کا فیض بواسطہ و بلا واسطہ پہنچا ہوا
ہے کہ ہزارہ پشاور کشمیر دریا خاں غزنی کابل سیالکوٹ جموں راولپنڈی تبت گوجرانوالہ
ملتان گجرات جہلم امرتسر فیروزپور جالندھر کوہاٹ اٹک مظفرگڑھ ڈیرہ غازی خاں
بہاولپور جیند پٹیالہ دہلی میرٹھ علی گڑھ مراد آباد لکھیم پور فیض آباد اعظم گڑھ سیتاپور
مونگیر آرہ بردوان چاٹگام لوکھالی بارکیال فرید پور کمرلا پورنیہ میمن سنگھ بالدہ سلہٹ
ڈھاکہ سندھ اور دکن میں کوئی بڑا ضلع ایسا نہیں جہاں مدرسہ کے فیض کی نہر جاری نہ ہو
اور اس کی تفصیل مدرسہ کی روداد سے معلوم ہو سکتی ہے جو سالانہ طبع ہوتی ہے کہ
سنہ ۱۳۱۴ھ میں چار طلبہ کو سند فراغ دی گئی اور سنہ ۱۳۱۵ھ میں پانچ کو سنہ ۱۳۱۶ھ میں
سات کو سنہ ۱۳۱۷ھ میں سات سنہ ۱۳۱۸ھ میں چھ سنہ ۱۹ھ میں سات سنہ ۲۰ھ میں ۱۰ سنہ ۲۱ھ
میں ۵ سنہ ۲۲ھ میں ۸ سنہ ۲۳ھ میں ۱۰ سنہ ۱۳۲۴ھ میں ۹ سنہ ۲۵ھ میں ۹ سنہ ۲۶ھ میں ۱۶
سنہ ۲۷ھ میں ۸ سنہ ۲۸ھ میں ۱۰ سنہ ۲۹ھ میں ۱۶ سنہ ۳۰ھ میں ۱۳ سنہ ۳۱ھ میں ۱۶ سنہ ۳۲ھ
میں ۷ سنہ ۳۳ھ میں ۹ سنہ ۳۴ھ میں ۱۴ سنہ ۳۵ھ میں ۷ سنہ ۳۶ھ میں ۱۹ سنہ ۳۷ھ میں ۱۰
سنہ ۳۸ھ میں ۱۱ سنہ ۳۹ھ میں ۲۴ سنہ ۴۰ھ میں ۱۸ سنہ ۴۱ھ میں ۱۴ سنہ ۴۲ھ میں ۲۵
سنہ ۴۳ھ میں ۳۳ اور سنہ ۴۴ھ میں ۳۰ کو سند عطا کی گئی۔

اس لحاظ سے کہ حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ نے بھی حضرت
سے ابتداء میں کچھ پڑھا ہے حضرت ممدوح کو بھی تلامذہ میں شامل کیا جا سکتا ہے کہ حضرت
ممدوح باوجودیکہ حضرت کے ہمعصر ہم عمر پیر بھائی اور اپنے شیخ کے مجاز تھے اور دونوں حضرات

ہیں وہ محبت و یگانگت تھی جس کی نظیر نہیں مل سکتی کہ حضرتؒ سفر حجاز کو تشریف لے جاتے
تو اپنے تمام متوسلین کو یہ وصیت فرما کر جاتے تھے کہ رائپور کی حاضری دیتے رہیں اور
جس امر میں مشورہ یا استفسار کی حاجت پیش آئے وہ مولانا رائے پوری سے پوچھیں
گویا ہیں ہمہ حضرت رائپوری حضرتؒ کا وہی ادب کرتے تھے جو شاگرد کو استاد کا کرنا
چاہیے اور حضرت کی شاگردی پر فخر کیا کرتے اور جب اس کا اظہار فرماتے تو بے حد
مسرت اور ناز کے ساتھ اظہار فرمایا کرتے تھے۔ حضرت رائپوری مدرسہ کے سرپرست
تھے اور جب حضرتؒ کی مدرسہ سے علیحدگی کا قصہ ہوا ہے تو مخلصانہ محبت کا جو اثر حضرت
رائپوری پر ہوا اس کی مثال نہیں پیش ہو سکتی کہ رات دن کا کوئی گھنٹہ اس فکر سے خالی
نہ جاتا تھا۔ رات کو نیند نہ آتی تھی۔ دن کو آرام نہ ملتا تھا ہر تیسرے چوتھے دن اپنے
سگھڑ میں سوار ہو کر سہارنپور آتے حضرت کی ملتے اپنی کہتے اور مجیب الدعوات کی
بارگاہ میں دعا مانگتے ہوئے رائپور واپس چلے جاتے تھے حتیٰ کہ وہ خوشگوار نتیجہ نکلا جس
کی کبھی خواب بھی نظر نہ آتی تھی کہ رجسٹری شدہ ری تجویز کے تین سرپرستوں میں
آپ کا نام بھی شامل ہوا اور باوجودیکہ آپ حد سے زیادہ یکسوئی پسند اور گوشہ نشینی
کے عاشق و شیدا تھے مگر اس سرپرستی پر بایں کامیابی کہ حضرت استاذ مدرسی پر بحال
ہی نہیں بلکہ آزاد و خود مختار ہو کر ترقیات مدرسہ میں سعی کے قابل ہو گئے اور علوم
دینیہ کی اشاعت کا دروازہ کھل گیا کہ اللہ کا نام اور اس کے احکام اطراف دنیا میں
پھیل سکیں گے آپ نے سرپرستی کا بار سر پر رکھنے میں کچھ بھی پس و پیش نہیں کیا بلکہ
غیبی کارنامہ کو دیکھ کر آپ کی مسرت کی کوئی حد نہ رہی اور آپ مولانا تھانوی
کو بلا کر لئے کر دیوبند میں جمع ہو کر تینوں صاحب باتفاق رائے اس کو منظور
فرمائیں خود تھانہ بھون تشریف لے گئے اس کے بعد عمر بھر اس بار عظیم کا وہ حق ادا کیا
جس کے لئے بس آپ ہی شایاں تھے اور اس زمانہ میں بھی جب کہ آپ کو کروٹ
لینا مشکل اور بات کرنا دشوار تھا اس خدمت سے مستعفی ہونا گوارا نہ فرمایا۔
سنہ ۲۲ھ میں حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب نے وصال فرمایا تو آپ کی

ہوگیا آپ کے خشتِ جگر اور دیدۂ نور نظر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سرپرست قرار پائے اور پھر حضرت مولانا محمد احمد صاحب رامپوری اور مولانا سر رحیم بخش صاحب پریزیڈنٹ بہاولپور کا سرپرستوں میں اضافہ ہوا اور آخر میں سب حضرات سرپرستان کے اصرار و اتفاق رائے پر خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی سرپرستوں میں شامل ہوا۔ اس طرح پر مدرسہ مظاہر علوم دینیہ کے چیدہ و برگزیدہ افراد کی ہمت دستی اور توجہات کے گہوارہ میں تربیت پاتا ہوا اس حالت پر پہنچا کہ دیوبند و سہارنپور اور رامپور کے مقتدا، مدرسہ کے نظام کو اپنے خدام کے حوالے فرما کر عالم قدس کا سفر اختیار کر گئے اور مدرسہ اسی شان کمال کے ساتھ ناظرین کی آنکھوں اور اہل دل کے قلوب کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے کہ دیکھنے والا کہتا ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجا ست

حضرت مولانا رائپوری قدس سرہ

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

حضرت ممدوح اس صدی کی وہ مقتدر ہستی تھی جو گذشتہ صدیوں کے بزرگان مشاہیر کا نمونہ بن کر دنیا میں آئی تھی۔ شانِ تفویض کی مجسم تصویر، بحر توحید کی غواص، تسلیم و رضا میں غرق اور توکل و اعتماد میں فنا، شریعت میں آپ عالم متبحر تھے، مگر طریقت کا آپ پر غلبہ تھا کہ دیکھنے والا آپ کو مولوی و عالم نہ سمجھتا تھا۔ یکسوئی اور گوشہ نشینی آپ کی طبیعت ثانیہ تھی۔ مگر حق تعالیٰ کو آپ کے نور فیضان سے عالم کو منور کرنا تھا اس لئے جس گمنامی و پنہانی کے آپ تمنی و شیدا تھے اس میں نا کامیاب ہوئے۔ مخلوق کو قدرتی طور پر آپ کی طرف کشش ہوتی اور آپ جتنا دنیا سے بھاگتے گھبراتے اور دامن چھڑاتے تھے اسی قدر دنیا آپ کا تعاقب کرتی تھی اور دامن پکڑتی تھی۔ آپ کے حالات تحریر میں لانا قلم سے زیادہ دشوار ہے

محبوبیت آپ پر سایہ افگن تھی اور اس لئے مخلوق کو آپ کے وجود با جود سے ظاہری
و باطنی ہر قسم کا ہر وقت نفع پہنچتا رہتا تھا۔ آپ کا قیام قصبہ رائپور ضلع سہارنپور
میں بستی سے باہر ایک باغ میں تھا جس کے نیچے نہر جاری تھی اور دنیا ہی میں حق
تعالیٰ نے آپ کو جنت تجری من تحتہا الانہار کا مصداق بنا رکھا تھا۔ آپ
حضرت گنگوہی قدس سرہ کے اجلہ خلفاء میں تھے اور غلبہ کتمان و اخلاص کی وجہ سے
نقشبندیت کا آپ پر غلبہ تھا کہ باغ کے پتے پتے اور نہر کے قطرے قطرے سے ذکر اللہ
سنائی دیتا اور مجلس و بے حس شخص بھی حاضر خدمت ہو کر اس اندرونی لذت کو
محسوس کرتا تھا جس میں آپ کا۔ اور آپ کے متوسلین کا ہر لمحہ گزرا کرتا تھا۔

نقشبند یہ عجب قافلہ سالار اند — کہ برند از رہ پنہاں بحرم قافلہ را

آپ سنت نبویہ کے عاشق تھے اور تعلیم قرآن مجید سے بالخصوص مانوس کہ تمامی علوم
دینیہ بلکہ دین کی اصل یہی ہے۔ اور عام طور پر اس کی طرف سے توجہات کے قلیل
ہو جانے سے آپ کی توجہ اس طرف اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ جگہ جگہ مکاتب قرآنیہ
جاری کرنے کے آپ حریص تھے اور بچوں کو صحیح و صاف سادہ لہجہ میں قرآن مجید
پڑھتا ہوا دیکھ کر آپ بہت خوش ہوا کرتے تھے خود آپ کے باغ میں بھی ایک مدرسہ
تھا جو توکل کا مجسمہ تھا کہ نہ کوئی جائداد اس کے لئے وقف تھی نہ کہیں سے چندہ
مقرر تھا۔ بلکہ حاضر ہونے والے مخلصین میں کوئی اہل مال یا خوشحال حاضر ہوتے
تو ان کے سامنے مدرسہ کا تذکرہ کرنا بھی آپ کو گراں گذرتا تھا کہ یہ تذکرہ بھی ایک
قسم کا سوال ہے اور مخلوق پر اپنی حاجت کا پیش کرنا یا اس میں کسی قسم کی ان سے
مدد چاہنا آپ کی طبعی غیرت کو گوارا نہ تھا۔ بایں ظاہری بے سروسامانی کے بستی
کا یا باہر کا جو بچہ بھی پڑھنے کے خیال سے آتا وہ بشوق و رغبت لیا جاتا اور اس
کو اپنا محسن سمجھ کر محبت و شفقت کے ساتھ فوراً داخل کر لیا جاتا تھا۔ ماشاء اللہ
اس مکتب میں ستر سے زیادہ طلبہ تھے جن کے کھانے اور کپڑے کی تمامی ضروریات
خزانہ غیب سے پوری ہوا کرتی تھیں۔ ان طلبہ میں اندھے اور معذور بھی ہوتے تھے

تھے جن کی کفالت والدین اور کنبہ کو بھی بار معلوم ہوتی تھی اور اس لئے وہ مدرسہ
میں آجاتے تھے کہ یہاں ماں باپ سے زیادہ شفقت کرنے والے ان کو ملتے تھے
نیز یہاں ایسے چھوٹے نو عمر بچے بھی تھے جن کو خود منہ دھونا بھی اچھی طرح نہیں
آتا تھا اور ان کے ماں باپ ناداری کی وجہ سے ان کو مکتب میں پہنچا دیتے تھے
یہ دیکھکر حیرت ہوتی تھی کہ مدرسہ میں پہنچ جانے کے بعد ان بچوں کا ایسا دل لگتا
تھا کہ پھر نکالے بھی نہ نکلتے تھے۔ ہر خورد سال اور نابینا و معذور بچہ کسی سمجھدار
بڑے طالب علم کی نگرانی میں دے دیا جاتا تھا کہ وہی اس کی بول و براز اور خورد
و نوش کی تمام ضروریات کا کفیل بنتا تھا۔ پکڑ کر جنگل لے جاتا واپس لا کر حمام و
سقایہ بتاتا، لوٹے میں پانی لے کر منہ دھوتا اور آہستہ آہستہ ستھرائی و صفائی کی
پیار کے ساتھ اس کو تعلیم دیتا رہتا تھا۔ تمام طلبہ عموماً گاؤں کے باشندے تھے
جن کی گذران سادہ اور جفاکشی طبعی عادت تھی۔ اس لئے حضرتؒ کو اس کا لحاظ بھی
زیادہ تھا کہ طلبہ کاہل نہ بنیں۔ لہذا ان کی اور مدرسہ کی تمامی ضروریات کا بار
خود انہیں پر تھا کہ چند طلبہ کے متعلق روٹی پکانا تھی اور وہ مدرسہ سے چھٹی ملتے
ہی ہمارے مدرسہ کے طلبہ کی روٹیاں پکایا کرتے اور چند طلبہ کے ذمہ پانی لانا تھا
کہ وہ وقت آتے ہی گھڑے لیکر نہر پر جاتے اور جس قدر پانی کی بھی مدرسہ
کے تمام طلبہ کو ضرورت ہوتی وہ گھڑے اور مٹکے لبریز کر دیا کرتے تھے۔ مسجد کا
سقایہ بھی وہی بھرتے اور جنگل سے خودرو لکڑی کا ٹکر یا جھنکر بھی طلبہ ہی لاتے تھے
آٹھویں دن اپنے اور ان نا سمجھ بچوں کے جو ان کی تحویل میں ہوتے کپڑے دھوتے
اور نہر پر جا کر خود نہاتے اور ان کو مل مل کر نہلایا کرتے تھے۔ غرض ضروریات بشریہ
کا کوئی کام ایسا نہ تھا جو ان سے نہ لیا جاتا ہو اور اس طرح پر نہ ان میں کاہلی آنے
پاتی تھی اور نہ ان میں وہ مادہ پیدا ہوتا تھا جس کی وجہ سے آئندہ اپنی ضروریات
پورا کرنے میں ان کو عار آئے یا کسی کام کو خلاف شان سمجھیں۔ خس پوش مکان
جنکی دیواریں بھی پھونس اور بانس کی تھیں ان کا مدرسہ تھا اور جنگل کی زمین

جوتہ کبھی میلی ہو کہ دھلنے کی ضرورت پڑے نہ پھٹے اور پرانی ہو کر بدلنے کی حاجت پیش آئے۔ ان کا فرض تھا جس پر دینی و دنیوی ضروریات سے فارغ ہو کر آرام سے لیٹتے اور ہنسی خوشی سو کر ہنستے خوش ہوتے اٹھ بیٹھا کرتے تھے۔ صبح صادق سے ڈھائی گھنٹہ قبل آخر شب میں سب کو جگا دیا جاتا اور وہی وقت ان بچوں کے اپنا سبق یاد کرنے کا ہوتا تھا۔ کہ چار چار یا پانچ پانچ طلبہ دور بیٹھا کر ایک چراغ بیچ میں رکھکر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بیٹھ جاتے اور دن میں پڑھا ہوا سبق یاد کرکے اٹھا کرتے تھے۔ اس طرح پر بچپن ہی سے ان کو آخر شب میں اٹھنے کی عادت ہو جاتی اور وہ برکات جو اس مبارک وقت میں قدرت نے رکھی ہیں بآسانی ان کو حاصل ہو جاتی تھیں۔ نو وارد طلبہ شروع شروع میں کسمساتے مگر ساٹھ ستر طلبہ کا بآواز بلند پڑھنا ان کو میٹھی نیند سونے نہ دیتا اور آخر چار دن کے بعد وہ خود اپنے زمرہ میں شامل ہو جاتے تھے کہ نہ نیند رہتی تھی نہ خمار۔ یہ سنسان گھڑیوں کے چند منٹ جس میں معدہ بھی صاف اور ہلکا ہوتا تھا اور یکسوئی بھی بدرجہ کمال تھی وہ دن کے چند گھنٹوں سے بڑھکر حفظ میں مدد دیتے اور صبح کو سبق ایسا فر فر سناتے تھے کہ تمام دن رٹنے والا بھی ایسا نہیں سنا سکتا۔

مکتب کیا تھا نائب رسول جامع شریعت و طریقت شیخ کی خانقاہ تھی جس میں کچی لکڑیوں کو بآسانی سیدھا کیا جاتا اور ان اخلاق حسنہ کو عادت بنا کر دلوں میں رچایا جاتا تھا جو بڑے ہو کر برسوں کے مجاہدہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔ ایثار و شفقت علی الخلق کا ان بچوں میں ایک خاص مضمون ہوتا تھا اور قناعت و صبر کا ایک مخصوص رنگ۔ ایک مرتبہ صبح سویرے بندہ خس پوش مسجد میں چلا گیا جو خس پوش مدرسہ کے متصل تھی تو میں نے ایک بچہ کے رونے کی آواز سنی جس کی عمر سات آٹھ برس کی تھی کہ سسکیاں لے رہا اور اس کا نگران طالب علم بڑے پیار کے لہجہ میں اسی اپنی دیہاتی سادہ زبان میں اس سے پوچھ رہا تھا کیوں رو رہے ہے؟ کیا ماں یاد آرہی ہے؟ یا پیٹ میں درد ہے؟ یا میں تو تیرے پاس

موجود ہوں اور تیری ہر خدمت کو حاضر ہوں کچھ تو بتا کیوں پریشان ہے ؟ تاکہ اس کا انتظام کردوں - دیر ہوگئی کہ نہ بچہ کی سسکیاں تھمیں اور نہ طالب علم پوچھنے اور بہلانے پھسلانے سے اکتایا - آخر جماعت کا وقت آیا تو اس کو گود میں اٹھا کر باہر لایا اور خدا جانے کیا تدبیر کی کہ اس کو منا لیا اور وضو کرا کے اس کو سنتیں پڑھانے میں لگا دیا - سلام پھیر کر دیکھتا ہوں تو وہ پیچھے بچوں کی صف میں بیٹھا دعا مانگ رہا ہے -

صرف یہی ایک جگہ تھی جہاں مسجد نبوی کا نقشہ نظر آتا اور بارش میں ٹپک کر سجدہ گذار پیشانی کو تر زمین سے مانوس کیا کرتی تھی - اور بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ جو لطف پھونس کے سایہ میں اس ستھرے ریتلے فرش پر نماز پڑھنے میں نصیب ہوا وہ آج تک کبھی اور کہیں نصیب نہیں ہوا - قرآن شریف کے ساتھ اردو کی دینیات اور نماز روزہ کے مسائل ضروریہ کے رسائل بچوں کو پڑھائے جاتے تختی لکھوائی جاتی اور قابل بنا دیا جاتا تھا کہ مدرسہ سے جا کر اپنی کھیتی کے کام میں لگیں مگر جنگلی بن کر نہیں بلکہ آدمی اور ولی بن کر لگیں کہ دین کا کوئی پہلو کمزور نہ ہو اور ان کی سادہ راحت کی گذران میں نقصان نہ آئے -

اصل طبیعت میں اور تصنع و بناوٹ میں بہت فرق ہے کہ اول الذکر کا انجام برکت و کامیابی ہے اور ثانی الذکر کا ثمرہ ذلت و ناکامی - پس ایک شخص کسی بڑے رئیس کا ملازم ہوا اور رئیس نے وعدہ کر لیا ہو کہ تمہاری تنخواہ تا زیست بند نہ کی جائے گی اس کے دل کو ٹٹولو کہ اپنی معاش کی طرف سے اس کو کیا بے فکری ہو گی اور وقت پر تنخواہ مل جانے کا کتنا بھروسہ ہو گا - اور اس کے مقابل اس کا حال دیکھو جو سندیں لیے ہوئے طالب ملازمت میں جگہ جگہ درخواستیں پیش کرتا پھرتا اور ہر جگہ سے یہ جواب سنتا ہے کہ اس وقت کوئی جگہ خالی نہیں ہے ہاں آئندہ خیال رکھا جائے گا اس شخص پر جو پریشانی مسلط ہو گی اس کا یہ اثر ہو گا کہ اب کسی محکمہ میں درخواست دینے پر بھی اسی جواب کے واہمہ و خوف میں اس کو سکون حاصل نہ ہو گا اور نہ توقع ہی کی راحت ملے گی کہ یہاں کامیاب ہو جاؤں گا - پس یہ شخص لاکھ دعوے کرے کہ

مجھے معاش کی طرف سے اطمینان ہے اور میں صرف سبب کے درجہ میں جگہ جگہ درخواستیں دے رہا ہوں مگر اس کا یہ دعویٰ غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ پس حق تعالیٰ کے وعدۂ رزق رسانی پر کسی قلب کا سچا اعتماد درحقیقت ایک بڑی نعمت ہے اور اس پر بلاشبہ ہر ضرورت کے انجام دینے کا وہ شہنشاہ کفیل ہے جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں۔ مگر اس اعتماد کا محض دعوے کرنا یا اعتماد والوں کی سی صورت بنانا کہ دل میں اعتماد کا نام بھی نہیں کچھ کام نہیں دے سکتا اور نہ اس وعدہ کا مستحق بناتا ہے جو ومن یتوکل علی اللّٰہ فہو حسبہ کے ذریعہ تمامی بندوں کے لئے عام ہے پس درحقیقت ضعف ہمارا ہے کہ سنی سنائی باتوں پر توکل کی صورت بناتے اور جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتے ہیں ورنہ جو توکل کی حقیقت ہے اگر قلب کو میسر آجائے تو ہم سے زیادہ کوئی غنی و بے نیاز نہیں ضعف و ناکامی کا نام توکل رکھنا ہماری نادانی ہے اور اس لئے اس کا نتیجہ ہمیشہ ذلت و پشیمانی ہے۔

حضرتؒ کو حق تعالیٰ نے توکل کی نعمت نصیب فرمائی تھی اور اس لئے مدرسہ کا یہ بڑا کارخانہ نہ کسی محصل کا حاجت مند تھا نہ سفیر و مبلغ کا۔ بمقتضائے ہر کسے را بہر کارے ساختند " آپ کا ایک رنگ خاص تھا جس میں آپ مستغرق تھے اور اس لئے بلا اسباب ظاہری آپ کے سارے کام منجانب اللہ انجام پایا کرتے تھے کیونکہ آپ کا قدم ابتلا و امتحان کے وقت ڈگمگاتا نہ تھا۔ ایک مرتبہ ملا عبدالعزیز صاحب نے کہ آپ کے قدیم مخلص خادم اور مدرسہ کے نگران اعظم تھے آکر اطلاع دی کہ آٹا بھی ختم ہو چکا اور لکڑیاں بھی تمام ہوگئیں۔ کل کے لئے نہ جنس کا دانہ ہے نہ پاس کوئی پیسہ آپ یہ سن کر خاموش ہو گئے اور کچھ جواب نہ دیا مگر خود فرماتے تھے دل میں اپنے مالک سے یہ دعا ہوئی کہ اے کریم آقا یہ تیری مخلوق جو تیرے کلام کی تلاوت و تعلیم میں مشغول ہے کیا فاقہ کرے گی؟ اس کے بعد خود ہی یہ مضمون دل پر جما کہ تو جان تیرا کام اگر فاقہ ہی کرانا منظور ہے تو صبر کی توفیق بخشئے کہ یہ بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے رات ہوئی اور موجودہ غلہ پکا کر مٹکے خالی ہو گئے مگر آپکی طبیعت پر نہ ہراس دیر پریشانی

آئی نہ کسی سے قرض مانگنے کا وسوسہ ہوا۔ صبح نہ ہوئی تھی کہ طالب علم جو نہانے کیلئے ندی پر گئے تھے دوڑتے ہوئے آئے اور کہا حضرت جی ندی میں تو لکڑیاں بہتی چلی آرہی ہیں۔ خوشی کے مارے آپ کا چہرہ دمکنے لگا اور آپ نے فرمایا کریم رزاق نے تمہاری روزی کا سامان بھیجا ہے جاؤ جتنی سمیٹی جائیں سمیٹ لاؤ۔ چنانچہ سارے طالب علم دوڑ پڑے اور روک لگا کر لکڑیاں لادنا شروع کر دیں کہ دو گھنٹے میں اتنا اونچا ڈھیر لگ گیا جس سے زیادہ گنجائش بھی نہیں تھی۔ لکڑیوں کی آمد بھی بند ہو گئی اور اب آٹے کی ضرورت رہ گئی۔ دو گھنٹے بعد ڈاکیہ آیا اور ڈیڑھ سو روپیہ کا منی آرڈر پیش کیا جس میں لکھا تھا کہ مدرسۃ القرآن کے لئے بھیجتا ہوں اس کے خرچ میں لائیں۔ آپ فرماتے تھے کہ میں نے بھیجنے والے کا نام پوچھا تو ایسا شخص جس کو میں جانتا بھی نہ تھا۔ میں نے بار بار کہا کہ کسی اور کا ہوگا کیونکہ بھیجنے والا میرے ذہن میں نہیں، یا مگر ڈاکیے نے کہا کہ پتہ آپ کا نام آپ کا۔ مرسل کو آپ پہچانیں یا نہ پہچانیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا ہے۔ پس آپ نے وصول فرمایا اور یہ کہکر ملا عبد العزیز کے حوالے کیا لو ملا جی اللہ نے اپنے مہمانوں کے آٹے لکڑی کا سامان کر دیا۔ روٹی کا وقت آگیا ہے اس لئے جلدی آٹا منگا لو کہ لکڑی موجود ہے موٹی موٹی روٹیاں پکا کر نمک سے سب کھالیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ وہ لکڑیاں پورے چھ مہینہ کام آئیں اور روپیہ کا تو آج تک پتہ نہ چلا کہ کس نے بھیجا تھا۔ الحمد للہ اس کے بعد مدرسہ کو کبھی ایسی صورت پیش نہیں آئی اور نہ میں نے جانا کہ مولیٰ کریم کہاں سے بھیجتے ہیں اور کس سے دلواتے ہیں۔

کارساز ما بساز کار ما فکر ما در کار ما آزار ما

صبر و شکر قناعت اخلاص علم و یقین تفویض و توکل رضا و تسلیم کی آپ مجسم تصویر تھے ہر چہ از دوست میرسد نیکو ست آپ کی خوشی تھی مرض اور تکلیف کا کتمان آپ میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس کا ظاہر کرنا یا زبان سے نکالنا بھی آپ اپنے اللہ جل جلالہٗ کی شکایت کرنا سمجھتے اور مخلص سے مخلص حاضر باش کو بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ آپ کو تکلیف ہے۔ ایک بار شاہزین نے دیکھا کہ نماز کے لئے مسجد کو جاتے وقت آپ کے پاؤں میں لنگ

ہوتی ہے اور پوچھا بھی کہ حضرت کیا کچھ تکلیف ہے مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں الحمدللہ
ہر طرح راحت ہے۔ کئی دن متواتر اسی حال پر گذر لئے آخر چھٹے ساتویں دن مسجد
کو جاتے ہوئے پاجامہ پیپ اور خون سے بھر گیا اور اس وقت خدام کو پتہ چلا کہ دمل
تھا جو اندر ہی اندر ریک رہا تھا۔ اور آپ نہ زبان سے ذکر فرماتے تھے نہ چلنے میں اثر
محسوس ہونے دیتے تھے کہ بزبانِ حال اظہار نہ ہو جائے ایک بار آپ سخت بیمار ہوئے
کہ زیست کی امید نہ تھی۔ حکیم جمیل الدین صاحب معالج تھے ایک دن بندہ بھی حاضر
تھا کہ اشاروں سے باتیں فرمائیں۔ ہر چند حکیم صاحب نے دریافت کیا کہ کیا تکلیف
ہے مگر آپ چہرہ کی بشاشت اور ہاتھ کے اشاروں سے صحت اور راحت ظاہر فرماتے
رہے آخر تین دن اسی حالت پر گذرے اور چوتھے دن معلوم ہوا کہ سارے منہ کے
اندر آبلے پڑ گئے تھے جن کو کھول کر دکھانا تو کیا گوارا ہوتا بات کرنے میں منہ کا کھلنا اور
آبلوں کا دیکھا جانا بھی آپ کو گوارا نہ ہوا اس لئے اشاروں سے باتیں کیں۔

اس کے ساتھ مخلوق کی دل جوئی و مدارات بھی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی
کہ ہر شخص یوں سمجھتا تھا حضرت کو سب سے زیادہ محبت میرے ساتھ ہے۔ اس لئے
دونوں کے جمع ہو جانے کے وقت آپ کو بڑی ضیق پیش آتی کہ جب آپ کا مرض کھل جاتا
تو خدام کا اصرار ہوتا تھا دوا استعمال کرنے کا اور آپ طبعی اقتضا سے دوا کا استعمال
مکروہ سمجھتے تھے کہ جس مالک نے مرض دیا وہی معالج کافی ہے۔ اور ادھر خدام سے صاف
انکار فرما کر ان کی دلشکنی بھی نہ کر سکتے تھے اس لئے مفید و مضر ہر دوا یہ سمجھ کر کہ یہ بھی
منجانب اللہ ہے آپ پیتے اور دوا کے موثر ہونے کا کسی درجہ میں بھی آپ کو واہمہ
نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک نادان طبیب نے مخلصانہ خدمت کا حق ادا کرتے ہوئے
آپ کو زہر دے دیا کہ فوراً آپ کو قے ہو گئی اور مرض ترقی کر گیا ڈاکٹری تشخیص
سے پتہ چلا کہ چند منٹ قے نہ ہوتی تو جانبری محال تھی۔ حضرتؒ سے جس کو ذرا بھی
تعلق تھا وہ حکیم صاحب پر آنکھیں نکالتا اور ان کی صورت سے بیزار ہو گیا۔ مگر آپ
کو حکیم صاحب کی ندامت اور اپشیمانی کی ان سے یہ وحشت ایک مستقل تکلیف دہ بن

گئی کہ وہ بھی کتمان وضبط میں رہتی تھیں کا اثر یہ تھا کہ حکیم صاحب تشریف لاتے تو آپ ان کو سب سے الگ اپنے پاس چارپائی پر بٹھاتے اور کسی کی بھی دوا کا استعمال ہو مگر حکیم صاحب سے مشورہ لیا کرتے اور وہ اس کو مناسب مرض بتاتے تو آپ استعمال فرماتے ورنہ ان سے ایسی ہی باتیں کرتے جس سے ان کو یقین ہو جاتا کہ حضرت میرے معالجہ کے معتقد اور میری حذاقت مزاج شناسی کے معترف ہیں۔ اور مخلص خدام سے ایک مرتبہ نرم لہجہ میں اس طرح فرمایا کہ حکیم صاحب تو میرے محسن ہیں غلطی تو ہر بشر کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ مگر جو کچھ کیا وہ محبت و شفقت ہی کی نیت سے کیا ان کو کوئی ترچھی نظر سے دیکھتا ہے تو میرے دل پر ایک برچھی لگتی ہے۔ فاعل مختار بجز مولیٰ کریم کے کوئی نہیں۔ جو ہوا وہ اس کی مشیت سے ہوا پھر کسی کو کیا حق ہے کہ آلہ و اوزار کو سرزنش کرے یا مجھے خوب معلوم تھا کہ حضرت دوا کا استعمال محض مخلوق کی دلداری کے لئے مجاہدہ سمجھ کر کیا کرتے تھے مگر بارہا ہم نے دیکھا کہ یہ حکیم صاحب آئے تو فوراً حضرت نے اس اہتمام سے بلایا گویا حضرت دیر سے انکا انتظار کر رہے تھے اور چپکے چپکے ان سے باتیں کرتے اور یہ سمجھا سمجھا کر حضرت کو جواب دیا کرتے کہ یوں کرنا چاہیئے اور اس دوا کا استعمال ہونا چاہیئے۔ حضرتؒ اس پر فرحت کا اظہار فرماتے اور ان کا دل باغ باغ ہو جاتا کہ حضرت کو میری تشخیص و معالجہ کے سوا کسی پر اعتماد نہیں ہے۔

دلداری خلق کا رنگ آپ پر اتنا غالب تھا کہ پیاری سے پیاری چیز اس کے مقابلہ میں ہیچ تھی۔ آپ سفر حج کو چلے اور اسی بیاسی نفر آپ کے ساتھ ہو لئے جن میں مختلف طبقات اور مختلف خیالات کے لوگ تھے۔ اتنا جم غفیر اور ان کی خبر گیری کوئی آسان بات نہ تھی خصوصاً جبکہ آپ کے ساتھ اہلیہ اور بہو اور صاحبزادہ عبدالرشید مرحوم بھی تھے۔ کہ اپنے ہی انتظامات کی سنبھال مشکل تھی مگر اللہ رے ہمت نہ بیوی بیٹے کا فکر ہوا نہ اپنی جان کا۔ رفقاء میں ہر شخص کی راحت کا خیال مقدم تھا۔ بمبئی پہنچے تو جہاز تیار مگر سب کے ٹکٹ نہ ملیں تو آپ ٹھہر گئے اور وہاں دس بارہ سے زیادہ ٹکٹ

تھی باقی نہیں۔ آخر رفقا کو آپ نے روانہ کیا اور خود دوسرے جہاز کے انتظار میں پندرہ دن پڑے رہے۔ مکہ مکرمہ پہنچ کر عبدالرشید مرحوم پیچش میں مبتلا اور اتنا بیمار ہوا کہ کروٹ لینا مشکل مگر آپ کو رفقاء کے سامنے نہ اپنی تکلیف کا جس قدر بچے کی تکلیف کا احساس۔ جوں توں اونٹ پر لاد کر حج ہوا اور اب مدینہ منورہ کے لیئے قافلہ کی تیاری کا وقت آیا تو ہر شخص کا تقاضا تھا کہ جلدی چلو ہمارے پاس خرچ کم رہا ہے اور اس لئے مکہ میں زیادہ ٹھہر نہیں سکتے۔ عبدالرشید کی یہ حالت کہ اونٹ پر لیٹنا بھی مشکل چہ جائیکہ بارہ دن مسلسل کا کٹھن سفر مگر آپ نے تیاری کر دی اور مطوف کو سب کا کرایہ پہنچا دیا کہ اسی قافلہ میں ہمارے چلنے کا انتظام کرو۔ اتفاق سے بندہ بھی اپنے حضرتؒ کے ساتھ بعد میں حاضر حرم شریف ہو کر حضرت سے مل لیا تھا۔ یہ حال دیکھکر حضرتؒ تشریف لائے اور بندہ ساتھ تھا۔ حضرت نے تیز لہجہ میں مولانا سے فرمایا کہ آپ مکہ میں ہیں جنگل میں نہیں۔ اس لئے اس حالت میں کہ عبدالرشید کسی طرح سفر کے قابل نہیں آپ کیوں عجلت کر رہے ہیں؟ مولانا چونکہ حضرتؒ کا بہت ہی زیادہ احترام فرماتے تھے کہ شاید کوئی مرید اپنے پیر کا بھی اتنا احترام نہ کر سکے اس لیئے گھبرا گئے اور عرض کیا کہ حضرت کیا کروں رفقاء کو اپنی خاطر تکلیف میں نہیں ڈالا جاتا کہ ان کو عجلت ہے اور خرچ کم ہو چلا۔ وہ میری وجہ سے رُکے تو ان کا مکہ میں بادل ناخواستہ وحشت کے ساتھ قیام ان کے لئے موجب وبال ہو جائے گا۔ حضرتؒ نے کہ اپنے صاف گوئی کے دوسرے رنگ میں غرق تھے بلیساختہ فرمایا تمہیں اُن کے روکنے کی ضرورت نہیں کہدو جس کا دل چاہے جائے اور میں اس وقت عبدالرشید کی شدت علالت کے سبب سفر نہیں کر سکتا۔ آخر رفقاء کی رعایت ان سب سے زیادہ ضروری ہے کہ رفیق سفر بھی ہے۔ اور بیٹا ہے جس کے حقوق سب پر مقدم ہیں۔ مولانا گردن جھکا کر چپ ہو رہے اور جب حضرتؒ چلنے لگے تو اشارہ سے مجھ کو رُک جانے کا امر فرمایا اور پھر تنہائی میں اپنی پریشانی و ضیق ظاہر فرمائی کہ سمجھتا سب کچھ ہوں مگر یہ لوگ میری معیت کے لئے گھر دل سے چلے ہیں۔ اب کس منہ سے جواب

دو دن کہ تم جاؤ میں نہیں جاتا۔ ان کے دل کیا کہیں گے کہ عبد الرحیم کی معیت کے شوق میں حج کو گئے اور اس نے معیت چھوڑ کر ٹکا سا جواب دے دیا۔ اب دوسری جانب حضرتؒ کی گرانی خاطر کی پیش آگئی کہ حضرت کے خلاف مزاج سفر کس طرح کروں۔ رہا عبد الرشید کا قصہ سو موت ہے یا حیات امر مقدر ہے اور وقت مقرر ہے۔ جتنے دنوں کی لے کر آیا ہے اس میں ایک لحہ کی کمی یا بیشی نہیں ہو سکتی سب گذر ہی جائیں گی۔ اب معاملہ تیرے سپرد کرتا ہوں کسی طرح حضرت سے بخوشی اجازت دلا دے کہ میری تو حضرت کے سامنے عرض کی ہمت ہی نہیں" مجھے درحقیقت دونوں حضرات سے محبت وعقیدت تھی کہ حضرتؒ اگر داہنی آنکھ تھے تو مولانا میری بائیں آنکھ تھے اور واقعہ ہے کہ ان دنوں حضرات کو بھی اس ناکارہ کے ساتھ اسی نسبت کا تعلق شفقت و تربیت تھا اس لئے دونوں حضرات کے رنگ سے انس و مناسبت رکھتا اور ہر ایک کا نرالا جدا لیا کرتا تھا۔ میں وہاں سے رخصت ہو کر حضرتؒ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ حضرت مجھ سے زیادہ حضرت کو علم ہے کہ مولانا پر رفقاء کی مراعات و دلداری خلق کا اتنا غلبہ ہے کہ اس کے ترک پر قدرت نہیں رکھتے اور عبد الرشید کی تکلیف چونکہ بیٹا ہونے کی حیثیت سے خود حضرت کی تکلیف ہے اس لئے رفقاء کی اتنی دلجوئی پر کہ ساتھ بھی نہ چھوٹنے پائے اپنی ہر تکلیف کا برداشت کرنا حضرت کو سہل ہے۔ مگر اس وقت حضرت کے ارشاد پر ایک بڑی ضیق مولانا کو یہ پیش آگئی کہ نہ دلداری و معیت رفقاء چھوٹ سکے اور نہ حضرت کے خلاف حکم کچھ کر سکیں عجب پریشانی ہے کہ مجھے اندیشہ ہے حضرت اس کشاکشی میں خود علیل نہ ہو جائیں۔ حضرت کو مولانا سے خود محبت تھی یہ سنکر متاثر ہوئے اور فرمایا اچھا بھئی بنام خدا سفر کریں خدا حافظ و ناصر ہے۔ میں اُسی وقت واپس آیا اور عرض کیا کہ حضرت اپنا قصد پورا فرمائیں کہ حضرت کی طرف سے اجازت ہے چنانچہ آپ نے معیت رُفقاء سفر کیا اور اسی حالت میں مدینہ منورہ سے ینبع ہو کر جہاز میں سوار ہوئے حتیٰ کہ عدن کے قریب عبد الرشید مرحوم راہی عالم قدس ہوا اور آپ نماز جنازہ سے فارغ ہو کر بیٹے کی نعش کو سمندر

کے حوالے کر کے اسی سکون سے بیٹھے رہتے جو آپ کے لئے گویا فطری تھا۔ عبدالرشید
کے خسر حاجی عبدالعزیز خاں بھی شریک حج تھے اور مرحوم کی خدمت و تیمارداری
انہیں کے حوالے تھی۔ جب بندہ سفر سے واپس ہو کر رائیور پہنچا تو کمال حسرت کے
ساتھ فرمانے لگے کہ مرحوم کے آخری سانس سے لے کر اب تک اس ارمان میں ہوں کہ
حضرت کی زبان سے عبدالرشید کا نام سنوں مگر حضرت سے کوئی تذکرہ ہی ایسا نہ سنا
جس میں مرحوم کا نام لیں۔ تیرے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا کہ مجھے حضرت سے مرحوم کا
نام سنوا دے۔ میں نے کہا بہتر ہے کوشش کروں گا۔ چنانچہ حاضر ہوا اور سمجھتا تھا کہ
حضرت کو درحقیقت میرے ساتھ بے حد محبت ہے اس لئے سارے سفر کی باتیں کر کے
میں نے عرض کیا کہ حضرت معلوم ہوا عبدالرشید مرحوم جان بر نہ ہوا اور مدینہ کے قریب
رخصت ہوا۔ حضرتؒ اس کو گھونٹ گئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ حضرت میرا
دل چاہتا ہے کہ حضرت مجھے عبدالرشید جیسا بیٹا سمجھیں۔ بس اس پر جوش آ گیا اور بے ساختہ
فرمایا عبدالرشید جیسے پچاس ہوں تو تجھ پر قربان اور تیرے ساتھ محبت کا مقابلہ عبدالرشید
کی محبت کیسے کر سکتی ہے؟ حضرت کی یہ شفقت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے
اور حاجی عبدالعزیز صاحب کا ارمان پورا ہو گیا کہ انہوں نے دو مرتبہ مرحوم کا
نام حضرتؒ کی زبان سے سن لیا۔

حضرت مولانا قدس سرہٗ کی ذات اور خود حضرت کے ساتھ میرا اتحاد یا نہ تعلق اس
کو مقتضی تھا کہ جداگانہ مستقل سوانح لکھتا کہ میری اصلاح و تربیت میں حضرت کا ایک
خاص حصہ ہے جس کے احسان سے میری گردن نہیں اٹھ سکتی۔ مگر حضرت کا رنگ اخفا
وکتمان کے متعلق مجبور کئے ہوئے ہے کہ لاکھ میں سے ایک بات بھی بیان نہیں کر سکتا
آپ دائم الفکر اور دائم السکوت تھے کہ بلا ضرورت بولنا ہی نہیں جانتے تھے مگر جب
امر بالمعروف کا وقت آتا تو آپ کی عاشقانہ تقریر ایسی نرالے طرز پر ہوتی تھی کہ دلوں
میں کھبتی اور پتھر کو موم بنا کر پگھلا جاتی تھی ایک مرتبہ بعد عصر حسب معمول آپؒ صحن باغ
میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور چند حضرات ... مریدین کا ایک کثیر

مجمع چاند کا ہالہ بنا بیٹھا تھا کہ راؤ مراد علی خاں صاحب نے حضرات صحابہ کی باہمی جنگ و رنجش کا تذکرہ شروع کر دیا اور اس پر رائے زنی ہونے لگی کہ فلاں نے غلطی کی اور فلاں کو ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔ جہاں تک نوبت پہنچی تو دفعۃً حضرتؒ کو جوش آگیا اور مہر سکوت ٹوٹ گئی کہ جھرجھری سے کر حضرتؒ سنبھلے اور فرمایا راؤ صاحب ایک مختصر سی بات میری سن لیجئے۔ بات یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں مخلوق کو قیامت تک پیش آنے والی تمامی ضروریات دین و دنیا سے باخبر کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ وقت اتنی بڑی تعلیم کے لئے آپ کو بہت ہی تھوڑا دیا گیا تھا۔ اس تعلیم کی تکمیل کے لئے ہر قسم کے حوادث اور واقعات پیش آنے کی ضرورت تھی کہ ان پر حکم اور عمل مرتب ہو تو دنیا سیکھے کہ فلاں واقعہ میں یوں ہونا چاہئے پس اصول کے درجہ میں کوئی واقعہ بھی ایسا نہیں رہا جو حضرت روحی فداہ کے زمانہ بابرکت میں حادث نہ ہو چکا ہو۔ اب واقعات تھے دو قسم کے ایک وہ جو منصب نبوت کے خلاف نہیں۔ دوسرے وہ جو عظمت شان نبوت کے منافی ہیں۔ پس جو واقعات منصب نبوت کے خلاف نہ تھے وہ تو خود حضرتؐ پر پیش آئے مثلاً تزویج اور اولاد کا پیدا ہونا ان کا مرنا و قضا کفنانا وغیرہ وغیرہ تمامی خوشی و غمی کے واقعات حضرتؐ کو پیش آگئے اور دنیا کو عملاً یہ سبق مل گیا کہ عزیز کے مرنے پر ہم کو فلاں فلاں کام کرنا مناسب ہے اور فلاں نامناسب اور کسی کی ولادت و ختنہ و نکاح وغیرہ کی خوشی کے موقع پر یہ بات جائز ہے اور یہ خلاف سنت مگر وہ واقعات باقی رہے جو رسول پر پیش آئیں تو عظمت رسالت کا خلاف ہو اور نہ پیش آئیں تو تعلیم محمدیؐ ناتمام رہے مثلاً زنا و چوری وغیرہ ہو تو اس طرح حد و تعزیر ہونا چاہیئے اور باہم جنگ و قتال یا نفسانی اغراض پر دنیوی امور میں نزاع و رنجش ہو تو اس طرح اصلاح ہونا چاہیئے یہ امور ذات محمدیؐ پر پیش آنا کسی طرح مناسب نہ تھے اور ضرورت تھی پیش آنے کی۔ لہذا حضرات صحابہ نے اپنے نفوس کو پیش کیا کہ ہم خدام و غلام آخر کس مصرف کے ہیں۔ جو امور حضرتؐ کی شان کے خلاف ہیں وہ ہم پر پیش آئیں اور حکم و نتیجہ مرتب

کیا جائے تاکہ دین کی تکمیل ہو جائے چنانچہ حضرات صحابہ پر وہ سب ہی کچھ پیش آ لیا جو آئندہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے رشد و ہدایت بنا اور دنیا کے ہر چھوٹے بڑے کو معلوم ہو گیا کہ فلاں واقعہ میں یہ کرنا اور اس طرح کرنا مناسب ہے اور یہ کرنا اور اس طرح کرنا نامناسب۔ پس کوئی ہو تو ایسا با ہمت جاں نثار ہو تکمیلِ دینِ محمدی کی خاطر ہر ذلت کو عزت اور عیب کو ہنر سمجھکر نشانۂ ملامت بننے پر فخر کرے اور بزبانِ حال کہے کہ ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت　　　سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

شہرت و نیکنامی اور عزت و نام آوری سب چاہا کرتے ہیں مگر اس کا مزہ کسی مجذوب سے پوچھو کہ جاں نثاری میں کیا لطف ہے اور کوچۂ معشوق کی ننگ و عار کیا لذیذ شے ہے ؎

از ننگ چہ گوئی کہ مرا نام زننگ است　　　واز نام چہ پرسی کہ مرا ننگ زنام است

سچے عشاق تو اس طرح ہماری تمہاری اصلاح و تعلیم کی خاطر اپنی عزت و آبرو نثار کریں اور ہم ان کے منصف و ڈپٹی بن کر تیرہ سو برس بعد ان کے مقامات کا فیصلہ دینے لگے بیٹھیں اور نکتہ چینیاں کر کے اپنی عاقبت گندی کریں۔ اس سے کیا حاصل؟ اگر ان جواہرات سفینہ کے قدرداں نہیں بن سکتے تو کم از کم بار زبانی و طعن ہی سے اپنا منہ بند رکھیں کہ اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضا۔ دیر تک آپ نے یہ تقریر فرمائی کہ دہن مبارک سے پھول جھڑتے اور سامعین کے مشامِ جاں میں مہکتے رہے۔

جس طرح آپ کو تعلیمِ قرآن مجید سے شغف تھا اسی طرح خود تلاوت کلام اللہ سے عشق تھا۔ آپ حافظ قرآن تھے اور شب کا قریب قریب سارا وقت تلاوت میں صرف ہوتا تھا۔ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں شاید آپ گھنٹہ بھر سے زیادہ نہ سوتے ہوں۔ اور اسی لئے آپ کو لوگوں سے وحشت ہوتی تھی کہ معمولِ تلاوت میں حرج ہوتا تھا۔ عصر و مغرب کے درمیان کا وقت عام دربار اور سب کی ملاقات کے لئے مخصوص تھا اور

عہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے متعلق کہ ان کو میرے بعد نشانۂ ملامت نہ بنا لیجیو۔

اس کے علاوہ بغیر کسی خاص ضرورت کے آپ کسی سے نہ ملتے اور مکان کا دروازہ بند فرما کر خلوت کے مزے لوٹتے اور اپنے مولیٰ کریم سے راز و نیاز میں مشغول رہا کرتے تھے۔ خوراک آپ کی بہت ہی کم تھی اور ماہ رمضان میں تو مجاہدہ اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا تھا۔ افطار و سحر دونوں کا کھانا بمشکل دو پیالی چائے اور آدھی یا ایک چپاتی ہوتا تھا۔ شروع میں آپ قرآن مجید تراویح میں خود سناتے اور ۲ بجے ڈھائی بجے فارغ ہوتے تھے۔ مگر آخر میں دماغ کا ضعف زیادہ بڑھ گیا تو سامع بنتے اور اپنی تلاوت کے علاوہ تین چار ختم سن لیا کرتے تھے۔ ماہِ مبارک میں چونکہ تمام رات اور تمام دن آپ کا مشغلہ تلاوت کلام اللہ رہتا تھا اس لئے عام مہمانوں کی آمد آپ روک دیا کرتے اور مراسلت بھی پورے مہینے بند رہتی تھی کہ خط کسی کا بھی عید سے قبل دیکھا یا سنا نہ جاتا تھا۔ اللہ جل جلالہٗ کا ذکر جس پیرایہ پر بھی ہو آپ کی اصل غذا تھی اور اسی سے آپ کو وہ قوت پہنچتی تھی جس کے سامنے دوا المس اور جواہر مہرہ ہیچ تھا۔ ایک مرتبہ آپ سخت بیمار ہوئے اور ضعف کی وجہ سے کر بدن مشکل ہو گیا۔ پھر مرض سے کچھ افاقہ ہوا مگر ضعف کی وہی حالت رہی کہ دودھ پینے کے لئے چمچہ ہاتھ میں تھامتے تو ہاتھ کانپتا اور چمچہ پکڑا نہ جاتا تھا ایک مزاج شناس خادم نے طبیب کو رائے دی کہ مقویات و مفرحات کا استعمال بیکار ہے کوئی کتاب جس میں معارف و حقائق ہوں سنانا شروع کر دیجیئے کہ روزانہ قوت بڑھتی رہے گی۔ چنانچہ غالباً حجۃ اللہ البالغہ کا اشراق کے وقت سنانا حکیم صاحب نے معمول بنا لیا۔ حضرت بڑے شوق سے سنتے اور بے اختیار سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کر ہوشے بعض دفعہ جوش میں اٹھ بیٹھا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں بندہ حاضر اور شریک سماعت ہوا تو ایک جگہ یہ حدیث آئی و من یتال علی اللہ یکذبہ۔ جو شخص اللہ پر قسم کھاتا مثلاً یوں کہتا ہے کہ واللہ فلاں کام اس طرح ہوگا تو حق تعالیٰ اس کو جھوٹا بناتا اور اس کی قسم و دعوے کے خلاف فرماتا ہے۔ یہ سن کر آپ جوش میں اٹھ بیٹھے اور بندے کی طرف رخ فرما کر ارشاد فرمایا ایک حدیث میں تو یوں ہے متلم م

لواقسم علی اللہ لابرہ خدا کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو حق تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرماتا ہے یا حضرت کا منشا یہ تھا کہ دونوں حدیثوں میں تعارض کس طرح رفع ہو اور تطبیق کی کیا صورت ہے حضرت کا فیضان چونکہ پاس بیٹھنے والوں پر بھی پڑتا تھا اس لئے فوراً ایک بات ذہن میں آئی اور میں نے عرض کیا کہ حضرت وہاں لفظ اقسم آیا ہے اور یہاں یتالی جو کہ باب تفعل سے ہے اور اس کی خاصیت ہے تصنع و تکلف۔ لہذا مطلب صاف ہے کہ قسم بے ساختہ کبھی جوش قلبی سے نکلے تو اس پر ثمرہ مرتب ہوگا کامیابی کا اور اگر بناوٹ و تصنع سے قسم کھائی جو دعوے ہے اپنے تقرب اور مجاب الدعوات ہونے کا تو اس پر ثمرہ مرتب ہوگا ناکامی اور جھٹلائے جانے کا۔ لہذا تعارض ہی نہیں کہ تطبیق کی ضرورت ہو۔ حق تعالیٰ کے ہاں قدر و منزلت اخلاص کی ہے نہ کہ نفاق و تصنع کی۔ ایک چرواہے نے جوش محبت میں اپنے اللہ سے باتیں کیں کہ آپ مجھے مل جائیں تو پاؤں دباؤں اور دودھ پلاؤں۔ وہ خدا کو اتنا پیارا ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے الفاظ پر نظر کر کے اس کو گستاخ قرار دیا اور ایسے الفاظ کے استعمال سے روکا تو حق تعالیٰ کا سیدنا موسیٰ کو حکم ہوا کہ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی

اور منافقین نے پیغمبر کے ساتھ نمازیں پڑھیں اور محبت و عظمت رسول کے بڑے بڑے دعوے کئے مگر حکم آیا کہ ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار۔ پس بڑا فرق ہے اخلاص و سادگی میں اور بناوٹ و تصنع میں۔ حضرت کا چہرہ اس تقریر کو سنکر خوشی سے دمکنے لگا اور سبحان اللہ سبحان اللہ فرماتے ہوئے پھر تکیہ پر لیٹ رہے۔ کامل تین گھنٹے آپ کتاب سنتے اور یہ بھی نہ پتا کہ آپ بیمار ہوئے تھے اور ضعف ہے حتیٰ کہ چند ہی روز میں آپ کی کمزوری قوت سے بدل گئی اور آپ نماز کو اپنے پاؤں سے مسجد تک جانے لگے۔

حقائق و معارف آپ پر بارش کی طرح برسا کرتے مگر آپ کسی پر ان کا اظہار

فرمایا کرتے تھے کسی خاص موقع پر کوئی بات زبان سے نکل جاتی ورنہ ہر وقت
آپ ایک اندرونی لذت میں غرق رہتے اور بزبان حال فرمایا کرتے

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ تو ز غنچہ کم ندمیدہ در دل کشا بچمن درآ

ایک دن آپ کی مجلس میں بدعت و سنت کے مسائل اختلافیہ کی بحث ہونے لگی۔
آپ دیر تک سنتے رہے اور آخر میں فرمایا کہ میرے نزدیک علاوہ دلائل علمیہ کے حق
و باطل پہچاننے کا ایک معیار اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ قدرت نے ہر چیز میں اپنے ہم
جنس کی طرف کشش کا مادہ رکھا ہے کہ کبوتر با کبوتر باز با باز۔ اور یہ قدرت کا عطیہ
جس کو فطرت کہنا چاہیئے اجسام ہوں یا اعراض سب ہی میں جاری و ساری ہے پس
جس فعل کے متعلق یہ شبہ ہو کہ معلوم حق ہے یا باطل، اس میں یہ دیکھنا چاہیئے
کہ اس کی طرف میلان کن قلوب کا ہوا اور کشش کس قسم کے لوگوں کی ہے، پس اگر
دیکھو کہ بد دین فساق و فجار کو ابتداءً اسکی طرف حرکت ہوئی اور وہی قلوب جوش
و خروش کے ساتھ اس کی طرف لپکتے ہیں تو سمجھ لو کہ اس فعل میں ضرور ظلمت ہے اگرچہ
ظاہری صورت نورانی اور دینی معلوم ہوتی ہو کیونکہ اس میں نور ہوتا تو ظلماتی قلوب کو
جذب نہ کرتا بلکہ وہ اس سے بھاگتے اور نورانی قلوب اولیاء و صلحاء کے اس کی
جانب کھنچتے۔ اور اگر کسی فعل کو دیکھو کہ دیندار اہل اللہ اسکی طرف جاتے ہیں اور عوام
و بازاری اس سے بھاگتے ہیں تو سمجھ لو کہ ضرور اس فعل میں نورانیت ہے کہ اہل نور
کے قلوب کو اس طرف کشش ہوئی اور ظلماتی قلوب نے اس سے وحشت کھائی پس عوام
کا کسی اختلافی مسئلہ کے متعلق یہ کہنا کہ ہم تو بے پڑھے ہیں اور دونوں طرف مولوی
ہیں پھر ہم کیونکر سمجھیں کہ کون حق پر ہے عنداللہ کے نزدیک معتبر اور عذر مقبول نہ ہوگا
بالخصوص جبکہ وہ دونوں طرف علماء ہونے کے قائل ہو کر بھی ایک طرف جھکے ہوئے
ہیں جو دلیل سبب ہے کہ ایک شق کو ان کے نفوس نے ترجیح دے کر اختیار کیا اور اپنے
اوپر سے الزام اتارنے کے لئے مولویوں میں فیصلہ نہ کر سکنے کا عذر تراشتے ہیں
اس طرح پر ذرا غور کرنے سے ہر بے پڑھے سے بے پڑھا حق اور باطل سمجھ سکتا

سے ہے کیونکہ دیکھ رہا ہے کہ رسومات و بدعات رائجہ کی طرف زیادہ بازاری عوام جھکتے ہیں جن کو نماز روزہ تک سے وحشت و بے تعلقی ہے اور زیادہ پڑھے لکھے مائل ہوتے ہیں جنکی نورانیت قلوب کو حب جاہ و مال نے داب لیا ہے اور اگر کوئی مخلص دھوکہ کھا کر ادھر چلا بھی گیا تو خود اپنے قلب کو ٹٹول لے کہ وہ کشش نہ ہوگی جو درود و نماز و روزہ جیسی کھلی اور صاف عبادتوں کی طرف اسکو ہوتی ہے اور اس لئے امید ہے انشاء اللہ کسی وقت اس کا قلب اسکی رہبری کرے گا اور وہ متنبہ ہو کر نور سنت کی طرف ضرور آجائے گا۔ یہ سننے کے بعد میرے ذہن میں یہ مضمون آیا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے قصۂ بہتان میں آپ کی براءت و پاکدامنی کا ثبوت دیتے ہوئے آخر میں حق تعالیٰ نے ایک دلیل یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات والطیبات للطیبین والطیبون للطیبات گندی عورتیں گندے مردوں کے لئے ہوتی ہیں۔ اور گندے مرد گندی عورتوں کے لئے علیٰ ہذا ستھری عورتیں ستھرے مردوں کے لئے خاص ہیں اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لئے" پس اگر تعلق زوجیت مراد ہو کر ثبوت لیا جائے کہ حضرت صدیقہؓ چونکہ اطیب الخلق پیغمبرؐ کی بی بی ہیں لہذا فحشاء کی گندگی سے پاک صاف ہونی چاہئیں۔ تو یہ دلیل منقوض ہو جائے گی حضرت آسیہؑ اور حضرت لوطؑ کی بی بی سے کہ اول الذکر طیبہ ہو کر خبیث بلکہ اخبث کی زوجیت میں آئیں اور امراۃ لوط خبیثۃ النفس ہو کر طیب النفس پیغمبر کی زوجہ بنی۔ اور دلیل حق تعالیٰ کی خصوصاً ایسے نازک قصہ کی براءت کے لئے مخدوش نہیں ہو سکتی پس لامحالہ کشش اور محبت مراد لی جائے گی کہ دنیا جانتی اور ہر موافق و مخالف آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ حضرت صدیقہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ ہیں کہ اطیب الخلق کا قلب مطہر ان کی طرف کھنچتا اور مائل ہوتا ہے۔ پس لامحالہ ماننا پڑے گا کہ حضرت صدیقہ میں طیب ضرور ہے اور ایسی عفتی سے جو کہ اصلی گندگی ہے وہ پاک صاف ہیں ورنہ گندی طبیعت رکھتے ہوئے پاک اور ستھرے قلب کا میلان اس طرف کبھی نہ ہوتا پس کہیں زوجیت کے

بلفاتی میں اس کا خلاف ہوا بھی تو یہ کوئی ثابت نہیں کرسکتا کہ کشش اور دلی محبت بھی دونوں میں ہوئی ہو۔ یہ قاعدہ کلیہ جس کو حق تعالیٰ نے آخری اور قطعی دلیل بناکر ہر قریب و بعید اور زکی و بلید کے لئے فیصلہ قرار دے دیا کہ اگر حضرت صدیقہ پر واہمہ ہو گندگی نے نفسی کا تو اثر پڑے گا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقد تقدس بلکہ پھر حق تعالیٰ کی محبوبیت کے ساتھ گستاخ بننے پر جس میں ایمان ہی ہاتھ سے گیا کہ آپ محبوب ہیں حق تعالیٰ کے۔ اور اگر حضرت کو بحیثیت رسالت و محبوبیت اطیب النفس سمجھا کہ ایمان کا مقتضا ہے تو حضرت عائشہ کو ضرور طیبۃ النفس ماننا پڑے گا کہ حضرت عائشہ کی محبوبیت اور آنحضرت کے قلب کا اس طرف انجذاب و میلان اُس زمانہ والوں کے لئے مشاہدہ سے اور ہمارے لئے تواتر و شہرت سے ثابت ہو کر تحقق و یقینی بن چکا ہے۔ اب جس کا بھی دل چاہے ہر امر میں حق و باطل ہونے کا فیصلہ کرلے کہ قد تبین الرشد من الغی بس اپنے اللہ سے معاملہ صاف کرنا منظور ہو پھر تو انشاء اللہ انشاء اللہ حق واضح ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ اس کے بعد فرمایا المرء مع من احب میں بھی یہی راز ہے کہ محبت سے کشش ہوتی ہے اور کشش محبوب کو محب کے رنگ میں رنگ دیتی ہے کہ جس درجہ کی کشش ہوگی اسی درجہ کی معیت لامحالہ مرتب ہوگی۔ اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ اسی لئے کہتے ہیں کہ اہل اللہ کی محبت بڑی نعمت ہے کہ جو کچھ ملتا ہے اسی کی بدولت ملتا ہے چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق کو تمامی صحابہ پر فضیلت اسی محبت پر نصیب ہوئی ورنہ آپ کا مجاہدہ عملی اس درجہ تھا کہ تمام صحابہ سے بڑھا دے۔ اور محبت و کشش کے یہ اثرات تھے کہ سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی رائے میں کبھی اجتہادی غلطی ہوئی تو ابوبکرؓ کی رائے بھی اُس غلطی میں شریک اور شامل رہی کہ یہ غلطی کا اشتراک دوسروں کی اصابت رائے سے بہتر اور عند اللہ زیادہ وقیع تھا۔ اسی محبت کا ثمرہ تھا کہ حضرت صدیق کو خلافت بلافصل کا اہل بنایا جس کو حضرت نے بایں الفاظ ارشاد فرمایا کہ ابی اللہ والمومنون الا ابابکر کہ جس طرح ذات محمدی کے ہوتے ہوئے

اللہ اور اس کے ایمان دار بندے کسی دوسرے کی حاکمیت کی طرف میلان نہیں کر سکتے اسی طرح وفات محمدی کے بعد آپ کے محب مجانس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی جانشینی کی طرف جھک ہی نہیں سکتے۔ کہ حق دار کے حق کو قائم رکھنا ایک نور ہے اور نورانی ذات قلوب کا نور کی طرف طبعی میلان ضروری اور فطری امر ہے۔ غرض دیر تک تقریر فرمائی کہ سننے والے محو و مستغرق تھے اور رحمت الٰہیہ کی پھوار دلوں پر پڑ رہی تھی۔ اس قسم کے حقائق کا ہر لمحہ آپ پر ورود ہوتا تھا جن کو اول تو آپ ہی زبان سے نہ نکالتے تھے اور کبھی کچھ بیان فرمایا تو میرا دل نہیں چاہتا کہ حضرت کے خلافِ طبع ان کی اشاعت کروں۔ وساوس و خطرات پر آپ کو اطلاع زیادہ ہوتی اور بلا ارادہ آپ اس پر مطلع ہوتے تھے۔ حافظ مختار احمد صاحب سیوہاری جب پہلی مرتبہ رائپور حاضر ہوئے تو مہمان خانہ میں اترے۔ اور چونکہ چائے کے زیادہ عادی تھے اس لئے حضرتؒ کو اطلاع ہونے سے قبل ان کے ملازم نے چائے تیار کرنے کا قصد کیا۔ ابھی ارادہ ہی تھا کہ ایک صاحب آئے اور کہا کہ آپ کو حضرت بلا رہے ہیں۔ ان کو بغیر اطلاع پائے حضرت کی طلبی پر تعجب ہوا اور جلدی جلدی حضرت کے پاس حاضر ہوئے۔ مصافحہ کرتے ہی حضرتؒ نے خادم سے فرمایا ملا جی سے کہو کہ چوہدری صاحب کے لئے چائے جلدی لے آئیں۔ اس پر ان کو دوسری حیرت ہوئی مگر ساتھ ہی ان کو یہ خیال آیا کہ میری چائے کی طلب کا تو حضرت کو کشف ہو گیا لیکن میری عادت تو یہ ہے کہ صبح کو چائے نہیں پیتا جب تک انڈا نہ کھا لوں۔ یہ خیال آتا تھا کہ حضرت نے خادم کو آواز دی اور فرمایا ملا جی سے کہنا دو انڈے بھی لیتے آئیں اس قسم کے واقعات کشوف کونیہ اور اطلاع خطرات کے ہزاروں کی تعداد میں پیش آئے اور رات دن پیش آتے تھے مگر نہ آپ کے نزدیک وقیع تھے نہ آپ اس کا قصد فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ بندہ حاضر ہوا اور حاجی احمد حسن صاحب کہ حضرت کے خادم اور میرے دوست اس وقت ڈیرہ دون میں ضلعداری نہر پر تعینات تھے میری موجودگی میں حضرتؒ کی زیارت کے خیال سے ایک گھوڑے پر آئے جو کسی

دو وقت سے مانگ لیا تھا۔ گھوڑا باغ میں چھوڑ کر حضرت کے پاس حاضر ہو گئے اور باتوں میں دیر لگ گئی۔ مغرب کے قریب باہر آئے تو گھوڑے کی تلاش ہوئی۔ چاروں طرف دیکھا کہیں پتہ نہیں۔ فکر ہوا کہ گھر کا راستہ بڑا لمبا ہے اب بغیر سواری پہاڑی راستے وقت پر ڈیرہ پہنچنا بھی مشکل۔ ملا عبدالعزیز سے کہا کہ حضرت کو اطلاع دے دو اور سنو حضرت کیا فرماتے ہیں۔ وہ حضرت کے پاس گئے اور قصہ عرض کیا۔ حضرت نے ذرا گردن جھکائی اور پھر فرمایا ملا جی کسی طالب علم کو نہر کی سیدھی پٹری پر تو ذرا بھیجو کہ تلاش کرے۔ ملا جی خوش خوش یہ کہتے ہوئے آئے کہ لو گھوڑا مل گیا اور اس کے بعد طالب علم کو نہر کی پٹری پر بھیجو یا عشا کا وقت ہوا چاہتا تھا کہ طالب علم گیا اور دو ڈھائی فرلانگ چلا ہوگا کہ گھوڑے کو رامپور کی طرف رخ کئے کھڑا پایا اور وہ اسکی رسی پکڑ کر اپنے ساتھ لے آیا۔ قلت طعام، قلت منام اور قلت کلام کا آپ کو اہتمام تھا۔ امراء سے آپ کو وحشت اور فقراء سے انس تھا اس کے ساتھ ہی مہمان نوازی آپ کی حد سے بڑھی ہوئی تھی کہ مہمان پر اپنی راحت کا نچھاور کرنا آپ کی عین مراد تھی۔ ایک دفعہ بندہ حاضر ہوا تو بعد مغرب دیکھا کہ مکان سے جو کہ بستی میں باغ سے دو فرلانگ فاصلہ پر تھا کھانا خود لئے آ رہے ہیں شرم کے مارے مجھے پسینہ آ گیا اور میں نے عرض کیا کہ حضرت کیا کوئی خادم نہ تھا کہ حضرت نے تکلیف فرمائی۔ بیساختہ فرمایا دل تو چاہتی چاہا کہ خود لے کر چلوں کہ اس سے زیادہ خوشی کا وقت کون سا ہوگا۔

ایک مرتبہ حاضر ہوا تو شب کو آنکھ کھلی دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت لاٹھی لئے باغ میں پھر رہے ہیں۔ اٹھ کر بیٹھ گیا تو حضرت پاس آئے اور فرمایا جنگلی بھینسا کبھی کبھی باغ میں گھس آتا ہے اس کی نگرانی کر رہا تھا کہ مہمانوں کی نیند خراب نہ کرے۔ آپ اطمینان سے سو جایئے۔ صبح کو معلوم ہوا کہ حضرت کی تو تمام رات پہرہ داری ہی میں گذری۔

ایک مرتبہ مولوی وہاج الدین صاحب جو کہ حضرت گنگوہی سے بیعت تھے رامپور آئے رات زیادہ جاگی تھی اور سفر کا تکان بہت تھا ایک طرف لیٹ کر سو گئے ذرا دیر بعد آنکھ کھلی تو دیکھا ایک شخص پائینتی بیٹھا ہوا آہستہ آہستہ ان کے پاؤں دبا رہا ہے

مگر اس احتیاط سے کہ آنکھ نہ کھل جائے اول تو سمجھے کہ شاید حضرت نے کسی خادم کو بھیجا ہے مگر جو غور کی نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ یہ تو خود حضرت مولانا ہیں یہ گھبرا کر اٹھے اور کود کر چارپائی سے نیچے آ گئے کہ حضرت یہ کیا غضب کیا فرمایا بھائی اس میں حرج کیا ہے آپ کو تکان بہت ہو گیا ہوگا ذرا لیٹ جائیے کہ آرام مل جائے۔ انہوں نے کہا بس حضرت معاف فرمائیے میں باز آیا ایسے آرام سے کہ آپ سے پاؤں دبواؤں ؎

تواضع اور مروت کا کوئی شخص مجسم ہو ۔۔۔ تو وہ میرا قدرِ رفیع عبد الرحیم باصفا ہوگا

خواب کی تعبیر میں آپ کو بہت مناسبت تھی مگر تفصیل بہت کم بیان فرمایا کرتے تھے۔ چودھری حافظ مختار احمد صاحب نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ چت لیٹے ہوئے ہیں اور سیدھی جانب سر کے برابر ایک مونڈھے پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ اور آپ سے کچھ نیچے قلب کے مقابل سیدنا یوسف علیہ السلام ہیں قلب بجائے بائیں جانب کے دائیں جانب ہے اور کھلا ہوا ہے کہ نہ اس پر کوئی کپڑا ہے اور نہ گوشت دکھائی کو پھر اس کے اوپر سے ہٹا دیا گیا اور قلب پر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے فیضان کا ترشح ہو رہا ہے جس کی لذت بائیس سال گذر جانے پر اب بھی محسوس ہوتی ہے۔ خواب ہی میں یہ خیال ہے کہ نور بھرا جا رہا ہے۔ چند علماء سے انہوں نے خواب ذکر کیا اور ہر ایک نے تعبیر دی مگر ان کے دل کو نہ لگی۔ رائپور حاضر ہوئے تو حضرت کو خواب سنایا۔ فرمایا بارک اللہ بہت اچھا خواب ہے جس کی تعبیر کھلی ہوئی ہے کہ آپ کو نسبت یوسفی حاصل ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت ذرا اسکو تشریح فرمائیں کہ نسبت سے کیا مراد ہے۔ فرمایا چودھری صاحب دیکھئے جس طرح دنیا میں جس کسی کو جو کچھ بھی انعام اکرام عطا ہوتا ہے وہ سب حقیقتاً بادشاہ کی جانب سے ہوتا ہے مگر اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ خزانہ شاہی سے وزراء کو دیا جاتا ہے اور وزراء کے یہاں سے ہر محکمہ کے سردار کو اور پھر اس سردار کی طرف سے ہر اس شخص کو ملتا ہے جو اس کا مستحق اور اس افسر کا ماتحت ہوتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی روحانی برکات و فیوض بندوں کو عطا ہوتے ہیں وہ سردار دو جہاں

صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے سیدنا موسٰی سیدنا عیسٰی اور سیدنا یوسف غرض جملہ انبیاء علیہم السلام تک پہنچتا ہے۔ اور یہ حضرات اپنی صفات اور کمالات خصوصی کی بنا پر حسن حسن محکمہ کے سردار و امیر تا فلہ قرار پائے ہیں اسی خصوصی انعام سے بہرہ یاب ہونے والوں کو وہ فیوض و انعامات الٰہیہ پہنچاتے ہیں۔ اور وہی صفات خصوصی نسبت کہلاتے ہیں کہ کوئی نسبت ابراہیمی ہے اور کوئی نسبت یوسفی کوئی موسوی اور کوئی عیسوی اس وقت چودھری صاحب کو انشراح صدر ہوا اور سمجھے کہ سر کی جانب سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا تشریف فرما ہونا اور قلب کے محاذ میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا قلب پر انوار و برکات کا ڈالنا یہ حقیقت رکھتا ہے۔

ہر چند کہ آپ خلق مجسم تھے مگر خلاف سنت عقیدہ والوں سے آپ کو کمال نفرت تھی۔ ایک مرتبہ آپ کے کسی مرید نے ضلع رہتک کے ایک عالم کی صفائی کرتے ہوئے یوں کہا کہ حضرت وہ تو حضور کے رشتہ دار ہیں اور بالکل ہمارے ہم خیال ہیں۔ صرف بعض عقائد میں کچھ یوں ہی سا جزوی اختلاف ہے جیسا باہم ائمہ میں۔ وہ صاحب اپنی تقریر ختم کرنے نہ پائے تھے کہ آپ کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہو گئے اور آپ نے تعجب کے ساتھ فرمایا کہ ہائیں عقائد میں اور اختلاف؟ یہ تو جزوی ہونا آپ کو خود ہی تسلیم ہے میرا تجربہ تو یہ ہے کہ عقائد میں جز تو جز اگر بالکل بھی اختلاف نہ ہو مگر شک اور شبہ کا درجہ ہو تو وہ بھی برباد و گمراہ ہوئے بغیر نہیں بچتا پھر اس کو ائمہ کے اختلاف سے تشبیہ دینا تو بڑی ہی دلیری کی بات ہے بس جا ہے عمل میں کتنی ہی کمزوری ہو مگر خدا نہ کرے کہ کوئی مسلمان بدعت کو سنت سمجھے یا سنت کے سنت ہونے میں شک لائے کہ یہ بلائے بے درماں مہلک اور سم قاتل ہے۔" آپ کے امر بالمعروف کا طریق بھی عجیب پیارا تھا کہ کوئی کتنا ہی بدعمل ہو آپ اس کو چھاتی سے لگاتے اور اپنے کو اس کے سامنے ہیچ در ہیچ سمجھتے مگر جب دیکھتے کہ اس کو تعلق ہو گیا اور اب نصیحت کرنا بے اثر نہ ہو گا تو چپکے سے نہایت نرم اور میٹھے لفظوں میں اس کو اتباع شریعت کی ترغیب دیا کرتے تھے ایک بار میرے ساتھ ایک صاحب حاضر

خدمت ہوئے جن کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔ حضرتؒ کے اخلاق و مہمان نوازی دیکھکر وہ حیران ہو گئے۔ اور جب رخصتی مصافحہ کرنے لگے تو عرض کیا کہ حضرت میرے لئے دعا فرمائیں۔ حضرت نے ہاتھ تھامے ہوئے ان سے ارشاد فرمایا بہت اچھا انشاء اللہ حکم کی تعمیل کروں گا مگر ایک عرض میری بھی ہے اس کو آپ قبول فرمالیں وہ یہ کہ طلائی انگشتری کو شریعت نے مرد کے لئے حرام کہا ہے اگر اس گناہ بے لذت کو ترک فرمائیں تو پھر خوش ہو کر دل سے دعا نکلے گی یہ سُنکر وہ صاحب شرما گئے کہ پیشانی پر پسینہ آگیا اور فوراً انگوٹھی اتار کر ہاتھ میں لے لی۔

حضرت پیران پیر کے مواعظ الفتح الربانی ایک مرتبہ مجھے ملے اور میں حضرت کو پڑھ کر سنانے لگا تو حضرت پر وجد طاری ہونے لگا اور بے اختیار باصرار فرمایا کہ اس کا ترجمہ کردے کہ بہت مفید ہوگا اور طباعت شروع ہونے پر جتنا بھی طبع ہوتا جائے وہ مجھے فوراً بھیجدیا کر کہ بھیجنے میں کتاب پوری ہونے کا انتظار نہ دیکھیو۔ چنانچہ میں نے اس کا ترجمہ کیا اور حضرتؒ اس سے بہت ہی محظوظ ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کتاب جس کے پاس بھی گئی اس کو خاص روحانی فائدہ پہنچا حتّٰی کہ ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گئی اور دوبارہ طبع ہوئی جو قریب ختم ہے۔ اس کے مطالعہ سے قلب میں ایک قوت پیدا ہوتی ہے اور رضا برقضا و شانِ تسلیم کی ایک عجیب و غریب تعلیم حاصل ہوتی ہے جو تجربہ ہی پر موقوف ہے۔

آپ کو حضرت گنگوہی قدس سرہ کے متوسلین سے خاص محبت تھی کہ وہ شیخ کے یتیم بچے تھے اور شیخ کی یاد تازہ کیا کرتے تھے ان میں سے کوئی بھی آتا تو گویا آپ کے ہاں عید آجاتی۔ اور اگر کوئی خاص تعلق والا آتا تب تو آپ کی مسرت کا کچھ ٹھکانا ہی نہ رہتا تھا۔ اس کی خدمت و دلداری کو تمامی نوافل و اذکار پر ترجیح دیتے اور اکابر میں سے کوئی بزرگ تشریف لاتے تب تو کچھ پوچھنا ہی نہیں کہ آپ کتنا اہتمام فرماتے اور آپ کا رواں رواں مسرور ہو کر یوں پکارا کرتا تھا

عہ اسکا نام فیوض یزدانی ہے اور قیمت دو روپیہ چار آنہ ہے نیز اسکے ہر وعظ کی شرح عجیب طرز پر جدا لکھی ہے جس کا نام انوار سبحانی ہے اور قیمت دو روپیہ ہے۔

وہ آج آئیں مرے گھر خدا کی قدرت ہے ۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نکاح بیوگان آپ کی قوم میں عیب سمجھا جاتا تھا اس کی اصلاح میں آپ نے بہت کچھ تکلیفیں سہیں اور مصائب برداشت کیے۔ عملاً اس کی تشدید ثابت کرنے کے لئے خود بھی بیوہ سے نکاح کیا اور اس نکاح پر جو کچھ طعن و تشنیع اور جان کے خطرات آپ کے رفع درجات کے لئے مقدر تھے وہ پیش آکر رہے جن کو آپ نے شیر و شکر سمجھ کر پیا اور مزہ لیا۔ آپ کے جوان صاحبزادے عبدالرشید مرحوم کا انتقال ہوا تو صبر و رضا کی آپ مجسم تصویر تھے کہ مرحوم کے پسر و داماد کا نام باپ کی زبان سے سننے کی تمنا تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا گویا آپ کو اس کی وفات کا صدمہ ہی نہیں ہوا مگر میں نے جہاں تک غور کیا حزن تو غیر اختیاری اور لازمہ بشریت ہے انسان کو دو دن کے پالے ہوئے بکری کے بچے سے بھی تعلق ہوتا اور اس کے مرنے پر دل دکھتا ہے پھر بیٹا تو بیٹا ہی ہے جس کو ثمرۃ الفواد اور جگر کا ٹکڑا کہا جاتا ہے اس کا تو جوانی میں مرنا حزن سے کیسے خالی رہ سکتا ہے لیکن اس موت نے حزن بشری و طبعی کے ساتھ ایک روحانی مسرت بھی آپ کو حاصل تھی جو طبیعت ثانیہ نہیں بلکہ طبیعت اصلیہ بن گئی تھی کہ آپ کو بیوہ بہو کے نکاح ثانی کا موقع ملا اور مردہ سنت کے زندہ کرنے کی ایک قدرت حاصل ہوئی۔ نصیحت کرنے اور دوسرے کو کسی کام کی ترغیب دینے اور عمل کرانے کی دو ہی صورتیں ہیں ایک زبان سے سمجھانا ۲ دوم خود عمل کر کے دکھانا زبان سے سمجھانا جو تعلیم قولی کہلاتی ہے اگرچہ زمانہ اور وقت کے لحاظ سے انفع اور زیادہ دیرپا ہے کہ عمل تو صرف دیکھنے والے حاضرین کو تعلیم دے سکتا ہے۔ لیکن قول حاضر و غائب دونوں کا معلم بنتا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو سبق پڑھاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی عمل کے ذریعہ سے جو تعلیم و نصیحت ہوتی ہے وہ متعلم کے لئے قولی تعلیم کی بہ نسبت نہایت آسان اور بہت جلد سمجھ میں آنے والی ہوتی ہے اسی لئے جہاں حق تعالیٰ نے بندوں کی بہبودی کے لئے آسمانی کتابیں نازل فرمائیں کہ موجودہ و آئندہ ہر زمانہ کے لوگوں کو ان کے ذریعہ سے مرضیات الٰہی کا علم حاصل

ہوتو نہیں کتابوں کے ساتھ ان کے احکام پر عمل کرنے والے پیغمبروں کو بھی بشر بنا کر دنیا میں بھیجا کہ خود عمل کر کے مخلوق کو احکام الٰہیہ پر عمل کرنا سکھائیں۔ ایک سمجھدار نوجوان کو زبانی نماز پڑھنا سکھاؤ اور کہو کہ اول تکبیر پڑھو اور پھر ہاتھ باندھو وغیرہ وغیرہ تو چند دن سکھانے پڑھانے کے بعد بھی شاید وہ پوری نماز پڑھ سکے گا لیکن اگر ایک ناسمجھ بچے کو بھی سامنے بٹھا کر خود نماز پڑھ کر دکھا دو تو عجب نہیں تمہاری چند منٹ کی یہ تعلیم اس سے پوری نماز پڑھوا دے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس تعلیم کا اثر دیکھنے والے ہی تک محدود ہوگا اور جو موجود نہیں یا پیدا ہی نہیں ہوئے ان کو نماز سکھانے کے لئے پھر قول کی حاجت ہوگی کہ عمل ختم ہو جانے والا ہے اور قول باقی رہنے والا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی اسکولوں میں یہ الزام دور کرنے کے لئے کہ مسلمان بچے اپنے دین سے ناواقف اور بے بہرہ رہ جاتے ہیں کتنا ہی دینیات کا نصاب کیوں نہ پڑھایا جائے مگر وہ مفید نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہاں صرف قول سے تعلیم دینے اور زبان سے پڑھانے اور بتلانے والے ہوتے ہیں خود عمل کر کے دکھانے والے اور عملی تعلیم دینے والے نہیں ہوتے۔ پھر عمل کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک اوپرے دل سے عمل کرنا دوسرے دلبستگی اور محبت و شوق کے ساتھ کرنا۔ کہ پہلا درجہ کتنا ہی پابندی و مواظبت سے ہو مگر اس کے بقا کا اعتبار ہے اور نہ اس میں حلاوت و شیرینی ہے۔ مگر دوسرا درجہ اگر ضعف بدن کی وجہ سے کمزور بھی نظر آئے تو بھی پختہ و پائدار ہوتا ہے اور اس کے اندر ایسا مٹھاس ہوتا ہے جس کی ماہیت بیان میں نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس دینیہ میں بھی گو تعلیم قولی کے ساتھ عاملین کے اعمال و افعال طلبہ کو عملی تعلیم ضرور دیتے ہیں مگر وہ تعلیم صرف بدن پر رہتی ہے اور دل میں نہیں اترتی اور اسی لئے اندیشہ رہتا ہے کہ متعلم کسی وقت تارک عمل اور بدعمال نہ بن جائے۔ ہاں اس علم اور عمل بدن سے فراغ پانے کے بعد ضرورت ہے ان عاملین کی خدمت میں رہنے کی جن کے اعمال قلب سے صادر ہوتے اور احوال بن جاتے ہیں۔ کہ اب عملی تعلیم دل میں اترے گی اور احکام الٰہیہ پر عمل کرنے کا ذوق انس و شوق پیدا ہو جائے گا جو کہیں بھی رہو گے مگر معلم و راہبر اور نگران و منتبہ بنا ہوا تمہارے

ہر وقت وہر ساعت ساتھ رہے گا پس ایسا معلم اگر مدرسہ ہی میں نصیب ہو جائے تو زہے نصیب ورنہ جس طرح دو فن حاصل کرنے کے لئے دو مدرسوں میں جانا ضروری ہے اسی طرح علم ایدان مدارس میں حاصل کرنے کے بعد علم قلوب کی تحصیل کے لئے خانقاہوں میں جانا پڑے گا۔ کہ ہر کارے و ہر مردے۔ جنکے اعمال دیری اور صرف بدن سے ہوں گے ان کی تعلیم کا اثر فقط جوارح و اعضاء تک پہنچے گا۔ اور جن کے اعمال دل سے اور شوق محبت کے ساتھ ہوتے ان کے سارے کام صورتاً ہی ہونگے جو معلم ایدان کے تھے اور نصاب تعلیم میں کوئی اضافہ نہ ہوگا مگر ان کی تعلیم فعلی دیکھنے والوں کے دلوں میں اترے گی اور مشین کے پرزوں کو چلانے والی ایک مخفی برقی قوت پیدا کریگی جس کو محبت کی آتش اور برق شوق کہا جاتا ہے ۔

از ساعت دل غبار کثرت رفتن
خوشتر کہ بہر زہ در وحدت گفتن

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا
واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

الحاصل نائبین رسالت جن کے قلوب میں سید المحبین والمحبوبین صلے اللہ علیہ وسلم کے مشکوٰۃ قلب سے وہ نور منتقل ہوا ہے جس کو عشق کی آگ اور حب الٰہی کی حرارت کہا جاتا ہے ان کا طبعی اقتضا خود ان کو عمل پر ایسا مجبور کرتا ہے جیسا فرہاد کو جوئے شیر لانے کے لئے کوہ کنی پر مجبور کیا تھا۔ اور اسی میں ان کو وہ لذت آتی ہے جو کہ ہر کوفت اور حزن وغم کو مغلوب بلکہ معدوم کر دیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی چونکہ وہ بخیل و تنگ خیال نہیں ہوتے لہٰذا ان کا دل چاہتا ہے کہ ساری دنیا ہمارے محبوب کی ہماری طرح محب و شیدا بن کر مال و جان اور عزت و خانماں نچھاور کرنے لگے اس لئے برقی قوت دو چند ہو کر عمل کی محرک ہوتی ہے اور مخلوق کے دلوں میں اس کی تعلیم اترتی چلی جاتی ہے حضرت رائیپوری قدس سرہ کا یہ رنگ عالم آشکارا ہو چکا تھا اور آپ کی ساری راحت و خوشی بس اس میں رہ گئی تھی کہ اللہ کا بول بالا ہو اور دنیا کا ہر فرد سنت محمدیہ پر عامل اور والہانہ شیدا۔ اس سعی میں مال اور اولاد تو کیا چیز ہے اپنا مرنا بھی آپ کے لئے زندگی اور فنا و ختم ہو جانا بھی عین حیات تھا ۔

سر بوقت ذبح اپنا ان کے زیرِ پائے ہے — کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

قصہ مختصر اپنی قوم کا بیوہ کے نکاح کو عیب سمجھنا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقتضائے طبعی کہ آپ کی اکثر ازواج مطہرات بیوگی ہی سے آپ کی زوجیت میں آئیں، مدعیانِ اسلام کے قلوب سے مٹ جانا آپ کے لئے ایسا ہی سوہانِ روح تھا کہ ماں باپ بہن بھائی اور بی بی اور اولاد سب ہی کی وفات کے درد و غم سے بڑھا ہوا تھا کہ آپ اندر ہی اندر جھڑتے اور مرجھائے چلے جاتے تھے۔ ہر چند کہ آپ اس کی قولی تعلیم بارہا اور مدت تک دے چکے تھے مگر ضابطہ پڑی تو تھی کہ یہ کہکر الگ ہو جاتے ہیں اپنا کام پورا کر دیا نہیں مانتے تو جاؤ جہنم میں۔ وہ تو دل میں ایک آگ لگی ہوئی تھی جو آگے بڑھا رہی اور گوشہ میں نہ بیٹھنے دیتی تھی ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم — باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

آخر اپنی عملی تعلیم کے لئے خود اپنے خاندان کی ایک محترمہ خاتون سے آپ نے نکاح کیا جس نے آپ پر نہیں بلکہ اپنے خدا پر خاندانی ناپائدار ناموس کو نثار کر دیا۔ مگر آپ کی سوزشِ اندرون میں اس سے بھی ٹھنڈک نہ پڑی بلکہ آپ کا دل چاہتا تھا کہ خود عورت ہوتا اور بیوہ بنتا تو نکاح ثانی کر کے اس رسم بد کو توڑنے کے صلہ میں قوم کی طعن و ملامت سنتا اور شادکام ہو کر خوش ہوتا اور کہتا ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی — جواب تلخ مے زیبد لب لعل شکر خارا

چنانچہ آپ مرحوم بیٹے کی بیوہ کے پاس گئے اور اس کو اس طرح تسلی دی کہ بیٹی اب تک تو بہو تھی اور آج سے میری بیٹی ہے۔ دنیا فانی ہے اور یہاں کا ہر تعلق ایک دن ٹوٹنے والا ہے۔ ہمارے عزیز ایک ایک کر کے ہم کو چھوڑتے جائیں تب اور ایک دن ہم سب کو یک لخت چھوڑ کر چلے جائیں تب بہر حال موت نے فراق دائمی ڈال دی۔ ایک ذات وہ بھی ہے جو کبھی کسی حال جدا ہونے والی نہیں ہے۔ اس کی محبت پر ہماری عادت بھی اتنی ہے کہ کسی دوسری محبت میں اس کا لاکھواں حصہ بھی نہیں ہے۔ ہم مریں یا جئیں وہ ہم سے جدا نہ ہوگا۔ ہماری خوش نصیبی ہے اگر اغیار کی محبت دل سے نکل کر اس

کی محبت دل میں سما جائے۔ دنیا کی عزت و ذلت دونوں ہیچ ہیں اور صحابہ نے اپنے
اللہ و رسول کا بول بالا کرنے کی خاطر کنبہ و برادری اور وطن و قوم سب ہی سے پیٹھ
پھیر لی۔ اور اس کا ان کو یہ صلہ ملا کہ آج ان کا نام بھی ہمیں پیارا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے
اللہ سے دل لگاؤ۔ آخرت کی عزت کو عزت سمجھو کہ شریعت کے سامنے بے زبان اور
بے شعور بن جانے کا نام ہے۔ کہ ساری دنیا کسی کام کو ذلیل کہے مگر شریعت اس کا حکم
دے تو ہمیں شریعت کا ساتھ دینا چاہیئے کیونکہ دنیا دار نے عزت کے لئے دنیا اور مٹی
کے نیچے دبا کر سب چلے آئیں گے اور پھر اسی مالک سے واسطہ پڑے گا جس نے شریعت
پر عمل کا حکم دیا ہے۔ جب وہ پوچھیگا کہ ہم تمہارے نزدیک زیادہ عزیز تھے یا برادری
تو اس وقت پیشانی سے پسینہ آجائے گا اور افسوس ہوگا کہ ہائے قبر تک ساتھ دینے
والوں کا ہمیں نے ساتھ دے کر اپنے کریم مولا سے کیوں بگاڑی۔ اس کے بعد آپ
نے شوہر کی تجویز میں خیال دوڑایا اور آخر ایک دن مرحوم کے خسر حاجی عبدالعزیز خاں
کو کہ حضرت سے بیعت بھی تھے بلا کر تنہائی میں اپنا منشائے مراد ظاہر فرمایا۔ حاجی صاحب
کو عبدالرشید مرحوم کی یاد تازہ ہوئی تو رونے لگے مگر دیکھتے تھے کہ میں خسر ہوں اور
حضرت اس مرحوم کے باپ ہیں۔ آنسو نکلے تھے کہ حضرت نے فرمایا ہا حاجی عبدالعزیز
خاں یہ رونے کا مقام ہے یا ہنسنے کا۔ آج خدا نے وہ دن نصیب فرمایا کہ اس کے
محبوب پیغمبر کی مردہ سنت ہم ناکارہ گناہگاروں کے ہاتھوں زندہ ہو۔ یہ ہنسی کی نچھاور
کا وقت ہے کہ اتفاق سے میسر آگیا پس لوٹ لو جتنا لوٹا جائے۔ نہ ہوتا عبدالرشید پیدا
یا نکاح سے قبل ہی مر جاتا۔ یا بیوہ چھوڑ کر نہ جاتا تو ہم کیا کرتے اور کیونکر یہ نعمت پاتے
اب تک جو کچھ ہوا محض عطاء رب تھی جس میں ہمارے کسی فعل کو دخل نہ تھا۔ اب ان
عطاؤں کے شکریہ کا وقت آیا اور ہمارے کسب اور عمل کا دخل ہوا تو ہم سے زیادہ
بدنصیب کوئی نہ ہوگا اگر اس کی قدر نہ کریں۔ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا اور وقت
نکلنے پیچھے بجز افسوس و حسرت کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا اس کا محتاج نہیں کہ تم سے اپنی
مردہ سنت کو زندہ کرائے مگر تمہارے لئے فخر کا موقع ہے کہ تم کو سو شہیدوں کا

اجمیر پہنچنے کے لئے انتخاب فرمائیے ۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف — بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

پھر میرے حقوق تعلقات ادا کرنے کا دن بھی یہی ہے کہ میں چاہتا ہوں یہ نکاح ضابطہ پُری کا اور ادھورے دل سے نہ ہو بلکہ امنگ اور چونپ سے ہو کہ حقیقت میں مسلمان کے خوشی منانے کے قابل یہی نکاح ہے۔ چونکہ مجھے تم سے توقع ہے کہ اس وقت دین کی خاطر میرے قوت بازو بنو گے اور کر دکھاؤ گے جو مسلمان کو ایسے موقع پر کرنا چاہیئے لہٰذا مجھے تفصیل کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کہتا ہوں کہ فلاں جگہ میں نے تجویز کی ہے اور زندگی کا اعتبار نہیں میں چاہتا ہوں کہ جلد اس خوشی کو آنکھوں سے دیکھوں۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا اور وہ عمل ہوا کہ عمل کرنے والے دنیا سے رخصت ہو گئے مگر کارنامہ آب زر سے لکھا ہوا ہر دل پر ثبت ہے۔

بہو کو آپ نے باپ کے گھر پہنچایا کہ اعلان عام اسی میں تھا اور نکاح اوّل کا اس کو نمونہ بنانا تھا۔ باوجودیکہ عبدالرشید کے نکاح میں آپ تشریف نہیں لے گئے بلکہ دولہا کو چند احباب کے ساتھ بھیج دیا تھا کہ اس وقت اتباع شریعت اسی سادگی کو مقتضی تھا مگر نکاح ثانی میں آپ نے شرکت کا وعدہ فرمایا اور حالانکہ علیل و کمزور تھے مگر خاص اہتمام کے ساتھ وقت سے پہلے پہنچے۔ نکاح کا وقت آیا تو عبدالعزیز خاں کو بلایا اور چپکے سے فرمایا دل یوں چاہتا ہے کہ بستی اور نواح کی ساری قوم کو دعوت دی جائے اگر مالی وسعت ہو تو اس خرچ کو جنت کی قیمت سمجھ کہ پھر وقت نہ ملے گا۔ عبدالعزیز خاں حیران تھے کہ پہلا نکاح تو اتنا سادہ کہ نہ خود تشریف لائے اور نہ کسی کی دعوت پسند فرمائی اور اب خلاف عادت خود مشورہ ہے خرچ کا اور انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ خود قرض لے کر بھی اس ضیافت عامہ پر تیار ہیں۔ عرض کیا کہ حضرت حق تعالیٰ نے حضرت کی جوتیوں کے طفیل سب کچھ دے رکھا ہے جیسے ارشاد ہو دعوت دے دوں۔ یہ سنکر آپ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑی اور فرمایا کہ اس پاس سب ہی کو بلاؤ اور ہمت ہو تو کھانا بھی میٹھا و نمکین دونوں قسم کا پکواؤ

اور دل کھول کر کھلاؤ کہ تمہارے لئے اس سے زیادہ اجر و ثواب کی بکھیر لوٹنے کا کوئی موقع نہ ہوگا اس لئے ہمت نہ ہارو اور جتنا اعلان ہوسکے خوب کرو چنانچہ سب کچھ ہوا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ شادی میں نہ خرچ کرنا منع ہے نہ بخیلی و دل تنگی واجب۔ یہ امور دل کی خوشی کے تابع ہیں کہ دنیاداروں کے نزدیک پہلا نکاح حوصلہ و خوشحالی دکھلانے کا وقت بنتا ہے مگر دینداروں کے نزدیک جس نکاح میں اللہ کا بول بالا اور رسول کی مردہ سنت زندہ ہوتی ہو اس کی خوشی کے برابر معمولی و رسمی ہزار نکاح بھی نہیں ہو سکتے۔ کہ رسمی نکاح محض رفع ضرورت ہے جیسا بھی سادہ ہو جائے بہتر ہے مگر جس خرچ میں دینی مصلحت ہو کہ حب خدا و رسول اس کے محرک ہیں وہ سب صدقات کے حکم میں ہے اور اس کا پیسہ پیسہ ستر ستر ہزار بن کر قیامت میں ملے گا۔ غرض آپ کا حال کچھ عجیب حال تھا کہ دنیا جسے غم کہتی ہے وہ آپ کے لئے عین خوشی تھی اور دنیا کے نزدیک جس کا نام خوشی ہے وہ آپ کے لئے حزن و غم ہے

معمہ حال میرا شش ابر و برق و باراں تھا میں ہنسنے میں بھی خنداں تھا ہنسنے میں بھی گریاں تھا

آپ پر محبوبیت غالب تھی۔ ہر کہ و مہ کا دل آپ کی طرف کھنچتا تھا۔ آپ کی مجلس انوار و برکات کی مخزن تھی۔ آپ کی صورت دیکھ کر اللہ یاد آتا تھا۔ آپ نے چاہِ کنعان میں چھپنے کی لاکھ کوشش کی مگر قدرت نے آپ کو بازار مصر میں نکال کر آخر منصۂ ظہور اور تخت عروج و شہرت پر لا بٹھایا اور آپ دانہ تخم کی طرح لاکھ مٹے مگر کشت زار ہو کر مخلوق کو شکم سیر بنانے کے لئے باہر نمودار ہوئے بغیر نہ رہے آپ دنیا کے لئے رحمت الٰہیہ تھے کہ اجابت آپ کی دعاؤں کا استقبال کرتی اور آپ منصب ارشاد و ہدایت کے تاجدار تھے کہ درخت کا پتہ پتہ اور نہر کا قطرہ قطرہ حاضرین کو ذکر اللہ کا سبق پڑھایا کرتا تھا آپ کی عمر اپنے مولی کی یاد میں ختم ہوئی کہ تین برس کی عمر سے آپ کے قلب میں طلب و فرقت مولانا گنگوہی کی محبت کا تخم جما اور آخر اسی میں تمام ہو گئے کہ ہڈیوں کا گودا بھی جل جل کر خشک ہو گیا ؎

وہ راز ہوں جو عیاں ہو کے بھی عیاں نہ ہوا وہ نکتہ ہوں جو بیاں ہو کے بھی بیاں نہ ہوا

رواں رواں مرا کیا عشق میں زباں نہ ہوا   بیان نہ ہونا تھا یہ حال دل بیاں نہ ہوا

ایک مخلص طبیب نے آپ کے آخری مرض میں نبض دیکھکر عرض کیا کہ حضرت آپ کو تو بہت پرانی تپ معلوم ہوتی ہے اور ایسی ہے جیسے کسی غلبۂ حزن وغم میں حادث ہوتی ہے اور اندر ہی اندر گھلاتی ہے۔ برسہا برس گذر جانے پر اس وقت آپ کو جوش آیا اور فرمایا ہاں حکیم صاحب سچ فرمایا مجھے تپ شروع اسدن ہوئی جس دن حضرت گنگوہی نے دنیا کو الوداع کہا اور اس کا بدن پر ظہور اس دن ہوا جس دن خبر سنی کہ مولانا محمود حسن صاحب مالٹا میں قید ہو گئے۔ آج مولانا رہا ہو کر تشریف لے آئیں تو کچھ نہیں ایک دفعہ تو جھرجھری لے کر اٹھ ہی کھڑا ہوں گا۔ اتنا فرما کر چپ ہو گئے۔ اور آخر اسیر مالٹا کے ہندوستان آنے سے قبل ہی دنیا سے سدھار لئے ؎

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد   وگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

ایک مرتبہ بیماری میں بندہ اور مولوی محمد یحییٰ مرحوم حاضر ہوئے۔ دونوں سے حضرت کو کمال بے تکلفی تھی اسلئے جب سب اٹھ گئے تو فرمایا مجھے ایک پریشانی لاحق ہے جس میں گھلا جاتا ہوں۔ وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے بندۂ مومن کو لقاء رب کی تمنا ہوتی ہے اور میں اپنے اندر اس مضمون کو نہیں پاتا۔ مولوی یحییٰ صاحب نے کہا حضرت یہ تمنا وشوق تو عندالموت ہوتا ہے اور آپ ابھی مرنے والے نہیں۔ آپ نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمایا مرنے کو تو پڑا ہی ہوں اور اسی لئے فکر ہے کہ شوق لقاء کیوں نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا پھر حضرت ہمارے لئے تو مبارک ہے کہ ابھی حق تعالیٰ نے اس وقت کو مؤخر فرمایا کہ وہ وقت ہوتا تو شوق لقاء بھی غالب آتا۔" چنانچہ آپ تندرست ہو گئے اور زندہ رہے حتّٰی کہ مولوی محمد یحییٰ صاحب نے بھی دفعتہً انتقال فرمایا اور یہ تیسرا روح فرسا صدمہ آپ کو پہنچا جس کو آپ نے سابق صدمات کے پہلو میں رکھ لیا۔ آخر جب وہ وقت آیا جس کے آپ منتظر تھے تو باوجودیکہ کروٹ لینا دشوار تھا اور نماز کے لئے بھی دو آدمی سہارا دے کر اٹھاتے اور پلنگ سے اتار کر مصلے پر بٹھا دیا کرتے تھے مگر آپ پر آستانہ محمدیہ کی حاضری کا غلبہ ہوا

اور آپ نے سفر حج کا پختہ قصد کر لیا۔ میں حاضر ہوا تو آپ نے بڑے اہتمام سے
مجھ کو اٹھا کر تنہائی حاصل کی اور مجسم شوق بن کر فرمایا میں تو تیرا انتظار ہی دیکھ
رہا تھا کہ دل کی بات کہوں۔ وہ یہ ہے کہ انسان حج کا ارادہ کر چکا ہوں اور تمنا
ہے کہ زندہ رہوں تو پہلے جہاز پر سوار ہو جاؤں۔ میں نے عرض کیا حضرت آفرین ہے
حضرت کی ہمت پر کہ کروٹ تو لی نہیں جاتی اور قصد ہے اس کٹھن سفر کا جس میں مستعد
جوان بھی چور چور ہو جاتے ہیں۔ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا حضرت بوڑھے جوان
سب ہی اس راستہ میں چلتے ہیں بس مجھے تو کوئی پکڑ کر ریل میں ڈال دے تو پڑا پڑا
انشاء اللہ چلا ہی جاؤں گا۔ میں نے دیکھا کہ یہ غلبۂ شوق دبنے والا نہیں تو موافقت
کا پہلو لے لیا اور عرض کیا ہاں حضرت "ہمت کا حامی خدا ہے" جب حضرت نے قصد
فرما لیا تو انشاء اللہ پہنچنا کچھ دشوار نہیں۔ فرمایا الحمد للہ الحمد للہ تو نے تو موافقت کر لی
اب ایک خاص درخواست ہے وہ یہ کہ بس اب حضرت ہمارے بزرگوں
میں ایک دم باقی ہے جن کے حکم کے سامنے کوئی چون و چرا کی ہمت نہیں اس کا مفہوم
پڑھا ہوا ہے کہ حضرت نے اجازت نہ دی اور منع فرمایا تو پھر کیا کروں گا۔ بس یہ خدمت
تیرے سپرد ہے۔ حضرت سے بخوشی اجازت دلوا دے۔ میں چونکہ سمجھ رہا تھا کہ یہ
تو سرکار کے بلاوے کی علامت ہے کہ حاضری آستانہ کا شوق بیتاب بنا رہا ہے
ورنہ موسم حج میں ابھی اتنا وقت ہے کہ اس وقت تک حضرت حیات ہی رہیں تو
نہ ہے نصیب۔ پھر آپ کے دل کو پژمردہ کیوں کروں اس لئے میں نے عرض کیا کہ
ہاں حضرت انشاء اللہ ضرور کوشش کروں گا اور امید قوی ہے انشاء اللہ حضرت
انکار نہ فرمائیں گے بلکہ کیا عجب ہے حضرت بھی قصد فرما لیں اور پھر بندہ بھی ہمرکاب
ہو۔ اتنا سنکر فرحت و سرور سے حضرت کا چہرہ چمکنے لگا اور الحمد للہ الحمد للہ اب تو
اطمینان ہو گیا" فرماتے ہوئے از خود اٹھ بیٹھے کہ تکیہ سے سہارا لگائے دیر تک اس
کی دعائیں کرتے اور مزہ لیتے رہے۔

آپ نے قبل از وفات اپنا تمامی سامان حتیٰ کہ بدن کے کپڑے تک وصیت

وظیفہ کے ذریعہ وہ مریدوں کی ملک بنا دیئے تھے مگر تیرہ سو روپیہ نقد زادِ راہ بنا کر مولانا عبدالقادر صاحب کے حوالے کر دیا تھا کہ اس کو محفوظ رکھو یہ میرے اور تمہارے سفرِ حج کا خرچ ہے۔ آخر جوں جوں حج کا موسم قریب آتا گیا آپ کا مرض و ضعف بڑھتا رہا اور وصال کا وقت قریب آتا گیا حتیٰ کہ آپ نے سمجھ لیا کہ اب گنجائش نہیں رہی اور تیرہ سو روپیہ ترکہ بنا چاہتا ہے۔ تب آپ نے مولانا کو بلا کر وہ روپیہ بھی تقسیم کرا دیا۔ کیونکہ آپ مولیٰ کریم سے ایسی حالت میں ملنے کے متمنی تھے کہ دنیا کا کوئی حبہ اور پارچہ بھی آپ کی ملک میں نہ ہو۔ بیت کے دھیان سے ہٹ کر اب آپ رب البیت کے خالص تصور میں غرق ہو گئے اور آخر چند ہی روز بعد وہ مبارک وقت آیا جس کے شوق میں آپ کا رُواں رُواں پکارتا تھا ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جاں طلبم و زپئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — تا درِ میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

آپ کے مرض کو چونکہ امتداد زیادہ ہو گیا تھا اس لئے زائرین آتے اور چلے جاتے تھے کس کو خیال تھا کہ فلاں وقت رخصت کا ہے اور ٹھہرنا چاہیئے۔ حضرت سہارنپوری نے خواب دیکھا کہ آفتاب غروب ہو گیا اور دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ حسبِ معمول تہجد کے وقت حضرت اٹھے اور نفلوں سے فارغ ہو کر متفکر بیٹھ گئے۔ اہلیہ نے پوچھا آج عادت کے موافق آپ نفلوں کے بعد لیٹے کیوں نہیں اور طبیعت کچھ فکرمند معلوم ہوتی ہے کیا بات ہے؟ آپ نے خواب کا اظہار کیا اور محزون لہجہ میں فرمایا اسکی تعبیر ایک تو یہ ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب مالٹا میں محبوس ہیں۔ دوسرے مجھ کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ کہیں شاہ عبدالرحیم صاحب کی حالت نازک نہ ہو۔ غرض صبح کو حضرتؒ بیلوں روانہ ہو گئے جہاں تبدیل آب و ہوا کے لئے حضرت کا قیام تھا۔ بعد مغرب حضرت نے فرمایا آج عشاء کی نماز ذرا سویرے پڑھ لیجو۔ چنانچہ یہ سمجھکر کہ آرام کی خواہش ہو گی نماز اول وقت پڑھ لی گئی اور آپ چارپائی پر لیٹ رہے۔ حضرتؒ دوسرے کمرہ میں جا بیٹھے کہ دفعتہً آپ کو آخری کرب شروع ہوا اور حضرت اپنے کمرہ سے لپک کر پاس آئے۔ مولانا نے

حضرتؒ کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور آپ کا ہاتھ تھام کر اپنے سینہ پر رکھ لیا حضرت نے پڑھنا شروع کیا اور رائپور کا آفتاب اپنے محبوب کا ہاتھ چھاتی پر رکھے ہوئے چند منٹ کے اندر شب کے ۱۱ بجکر ۱۹ منٹ پر غروب ہو گیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون صبح کو جنازہ رائپور کی طرف چلا اور خدام کا مجمع بحسرت و اندوہ یہ کہتا ہوا پیچھے پیچھے ہو لیا ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو　　تو کجا بہر تماشہ مے روی

آخر اسی باغ میں جہاں آپکی حیات شریفہ کا آخیر حصہ گذرا تھا مسجد کی جنوبی سمت آپ کا وہ جسد اطہر جو رضا و تسلیم کے جھولے میں مدتوں چڑھا اور اترا تھا ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء یوم سہ شنبہ کو سپرد زمین کر دیا گیا مگر تنہا نہیں بلکہ ہزاروں یادگاریں چھوڑ کر اور ہزاروں کی حسرتوں اور تمناؤں کو ساتھ لے کر ؎

اکیلا کون کہتا ہے لحد میں نعش عالم کو　　ہزاروں حسرتیں مدفون ہیں دریا کے پہلو میں

بات بہت دور پہنچ گئی کہ سوانح خلیلیہ لکھنا ہے نہ کہ سوانح رحیمیہ مگر بے اختیاری میں قلم سے نکلا جو نکلنا تھا اور وہ بھی اس ضمن میں کہ حضرت کے شاگردوں میں کوئی بھی کامیاب نہ ہوتا تب بھی حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب کا ایک وجود با جود جس کی جوتیوں کے طفیل ہزاروں ہزار مخلوق کا مستار دیا مراد ہو گئی فخر کے لئے کافی تھا کہ اس کی شان یہ تھی جس پر توجہ کی اس کو مالا مال بنا دیا اور جس طرف نظر ڈالی اس کو عشق و محبت کا مزہ چکھا دیا ؎

وہ لوٹ پوٹ ہی دیکھا نگاہ کی جس پر　　کسی کے بس کا تراتیر بے کمان نہ ہوا

بالخصوص جبکہ دونوں حضرات کی باہمی مخلصانہ محبت اتنی متعدی بھی ہو چکی تھی کہ ان کے متوسلین ان کو گویا شیخ ہی سمجھتے تھے اور ان کے متعلقین ان کو پیر کے حکم میں مانتے تھے۔ حضرت مولانا رائپوری کے اس رنگ کو میں نے بار ہا غور سے دیکھا کہ حضرت کے تشریف رکھتے ہوئے کوئی صاحب آتے اور مصافحہ کرنے کے لئے مولانا کی طرف بڑھتے تو حضرت مولانا اپنے ہاتھ سمیٹ لیتے اور حضرت کی طرف اشارہ کر کے ان کو تنبیہ فرماتے کہ گستاخ نہ بنو پہلے حضرت سے مصافحہ کرو کہ اقدم و افضل ہیں اور پھر مجھ سے سفر حج کو جانے کے وقت حضرت کے تلامذہ کی درخواست ہوئی کہ مسلسلات اور سورۂ صف کی

سنا کر باقاعدہ اجازت وسند عطا فرمائیں۔ چنانچہ حضرت نے منظور فرما لیا اور کہا کہ سب لوگ اوپر چل کر بیٹھو میں آتا ہوں۔ چنانچہ پچیس تیس طلبہ صف باندھ کر بیٹھ گئے حضرت اوپر پڑھنے تو بندہ بھی ساتھ ہو لیا کہ اجازت میں شریک ہوں گا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ حضرت مولانا رائپوری بھی طلبہ کی صف میں بیٹھے ہوئے ہیں اور حضرت استاد کی آمد کا انتظار فرما رہے ہیں کہ جہاں ان طلبہ کو اجازت ملے وہاں مجھے بھی یہ شرف نصیب ہو۔ آہ کیا کہوں اور کس زبان سے کہوں کہ ان آنکھوں نے کہاں کہاں اور کیسا کیسا موسم بہار دیکھا اور اب وہی آنکھیں چار سو خزاں کا عالم دیکھ رہی ہیں مگر نہ بہار میں کچھ کیا یا نہ خزاں میں عبرت پکڑی۔ قال اللہ المشتکی۔ انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ ۔

تهیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل کہ خضر از آب حیوان تشنہ مے آرد سکندر را

حدیث اور فقہ

ایک سلیم المزاج شخص ذوق کے صحیح ہونے کی وجہ سے نمکین و شیریں ہر لذیذ غذا کا مزہ لیتا ہے مگر پھر بھی مختلف لذائذ میں کسی خاص ذائقہ کے ساتھ اس کو مخصوص رغبت ہوتی ہے جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو نمکین چیز سے خاص رغبت ہے اور فلاں شخص کو شیرینی سے۔ اسی طرح متبحر علماء کو ہر علم کی واقفیت تامہ ہوتی ہے کہ جس فن کی جو کتاب بھی سامنے آئے اس کو ایسا پڑھاتے ہیں گویا اس فن کے موجد یا اس میں مستغرق و منہمک ہیں۔ مگر باایں ہمہ تمامی علوم میں کسی ایک دو علم کے ساتھ ان کی طبیعت کو خاص مناسبت اور دلچسپی ہوتی ہے گویا تمام علوم مسکونہ مکان ہوتا ہے کہ جہاں بیٹھ جائیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے سجتے ہیں مگر مکان کا وہ کمرہ جس کو طبیعت نے رہائش کے لئے کر لیا ہے ایک مخصوص شان رکھتا ہے کہ جو دلبستگی و انبساط اس میں بیٹھ کر نصیب ہوگا وہ مکان کے کسی حصہ میں بھی نہ ہوگا۔ حضرت کو علوم نقلیہ و فنون عقلیہ میں کوئی علم و فن ایسا نہیں جس کے پڑھانے کا اتفاق نہ ہوا ہو تفسیر حدیث فقہ اصول معانی کلام منطق فلسفہ ہیئت ادب ریاضی عروض نحو اور صرف سب ایسے ... ہر فن اور

آپکی مثال پانی کی سی تھی کہ مربع مستطیل گول بغدادی مسدس مخمس جس وضع کے برتن میں بھی پڑا اس کی وضع لے لی اور ایسا معلوم ہوا گویا اس کی شکل اسی ظرف کے مناسب ہے۔ مگر با ایں ہمہ کمال حدیث اور فقہ سے آپ کی طبیعت کو ایک خاص مناسبت تھی کہ طبعاً آپ ان دو علوم سے رغبت و دلچسپی رکھتے اور ان کے درس میں آپ کی وہ کیفیت ہوتی تھی جو صاحب مکان کی اپنے مانوس حجرہ یا کمرہ میں بیٹھکر ہوا کرتی ہے اور یہی دو[1] علم ہیں جن پر عمل کرنا انسان کی زندگی کا مقصود اور شریعت محمدیہ[2] کا خلاصہ ہے

۱۳۱۴ھ میں جب حضرت مظاہر علوم میں صدر مدرسی پر تشریف لائے تو قدرت نے آپ کے ذوقِ طبعی کا سامان مہیا فرما دیا اور اب آپ کے سپرد حدیث ہی کے اسباق ہوئے کہ کلام الرسول کے بحر ذخار سے دُررِ نفیسہ نکالیں اور اطراف دنیا سے جمع ہونے والے مہمانانِ رسول پر نچھاور فرما دیں۔ کُتب حدیث میں ابوداؤد شریف کو بالخصوص آپ مشکل سمجھتے اور اس کے درس میں خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ یہ بات صاحبِ فن ہی سمجھ سکتا ہے کہ ابوداؤد میں دیگر کتب حدیث کی بہ نسبت کیا اشکال بڑھا ہوا تھا۔ عوام کی فہم کو اس سے تعلق نہیں۔ مولانا محمد یحیٰ صاحب بھی اس میں حضرت کے ہم خیال تھے اور اسی لئے جب سے آپ مدرسہ میں تشریف لائے ابوداؤد کا سبق آپ کے یا مولوی محمد یحیٰ صاحب کے پاس رہا اور آپ نے تیسرے کے پاس جانا اس کا گوارا نہیں فرمایا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ابوداؤد کی بعض عبارتیں ایسی مغلق ہیں کہ مہارتِ فن کے بعد بھی ان کا حل مشکل ہے۔ نیز صاحب ابوداؤد نے ابواب فقہیہ کے جمع کرنے کا خود بھی اہتمام کیا اور گویا محدث و فقیہ دونوں کا منصب پورا فرمایا ہے اس لئے اس کی شان اور دقتِ استنباط بڑھ گئی۔ پھر اسکی کوئی شرح بھی ایسی شافی و کافی نہیں جو اس کے حل مطالب میں مدد دے سکے۔ غایۃ المقصود اور عون المعبود اگرچہ اس کی شرح کہلائیں مگر ان کے مؤلف متاخرین اہل حدیث ہیں جو مقلدین کو خاطی ٹھہراتے ہیں اور اسی لئے حضرات ائمہ بالخصوص امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر جگہ جگہ دلیرانہ قلم چلاتے ہیں بایں وجوہ مدت سے بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہیں

کہ زمانہ طالب علمی سے آپ کے قلب میں اسکی شرح کا داعیہ تھا مگر کام کوئی معمولی نہ تھا وقت بھی وسیع چاہتا تھا اور دماغ بھی فکری اور تمامی افکار سے فارغ اس لیے شوق و ولولہ آپ کی ہمت اُبھارتا مگر چار طرف موانع و مشاغل کا ہجوم ہمت کو پست کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ تین مرتبہ آپ نے خیال کو عزم کے درجہ میں لا کر قلم اٹھایا اور کام شروع کیا مگر پورا ہونا تو درکنار معتد بہ مقدار بھی پوری نہ ہوئی اور آخر دہ لکھا ہوا مسودہ گم ہو گیا۔ تیسری مرتبہ مسودہ آپ کے کاغذات میں ملا تو دیکھا کہ اس پر لکھا ہوا تھا حل المعقود الملقب بالتعلیق المحمود علی سنن ابی داؤد مرۃ ثالثہ ۱۳۱۱ھ۔

تالیف جتنا دشوار کام ہے اس کو کوئی مؤلفین کے دلوں سے پوچھے۔ بالخصوص شرح حدیث کی تالیف کہ لفظاً لفظاً پر ادب والتجا اور ضعف بشریت و حیرانی کی نذر پیش کرنے کی ضرورت ہے اور وہ آزادی جس کو طبیعت کا چلنا بولتے ہیں کسی وقت بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے آپکا اس اہم کام کیلئے ہمت کرنا تعجب تھا اور ہمت کر کے چھوڑ دینا کچھ بھی تعجب نہ تھا۔ مؤلف جب تالیف شروع کرتا ہے تو بس اسی کا ہو رہتا ہے کہ درس تو درکنار کسی سے بات کرنا اور اپنے مقفل حجرہ سے باہر نکلنا بھی کام کے لئے مضر اور مخل معلوم ہوتا ہے۔ پھر ایسا شخص جس کی عمر کے بیالیس سال مدارس میں طلبہ کو درس دیتے گذر لئے اور زمانہ طالب علمی کی محنت و دماغ سوزی سے آرام نہ ملا تھا جو ساتھ ہی ساتھ پڑھانے کی تعب و مشقت کا بار عظیم دماغ پر پڑ گیا اور پھر اتنی مدت ممتد ہوا جو نوجوانوں کو بوڑھا بنانے کا معیار ہے ایسی حالت میں آپ کا کسی معمولی تصنیف کی طرف متوجہ ہونا بھی ہمت ہی ہمت تھی چہ جائیکہ حدیث کی شرح اور وہ بھی ابوداؤد کی جس کا عبارت کے لحاظ سے بھی صحیح نسخہ ملنا مشکل تھا اس لئے ۱۳۱۱ھ کا مسودہ بھی ناتمام رہ کر ان علمی کاغذات میں جا شامل ہوا جن کی بیکسی پر افسوس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

بندگی ہی تھے نہ شمعیں تھیں نہ کوئی فاتحہ خواں تھا — عجب حسرت کا منظر گور غریباں تھا

اب بمنظاہر علوم میں آکر تو آپ کے ذمہ کام بہ کام بڑھ گیا اور درس کے بار عظیم پر

انتظام کا بوجھ اتنا بھاری تھا جس نے دماغ کو کسی طرف توجہ کے قابل ہی نہ رکھا۔ بالخصوص جبکہ اس پر ہر شعبہ کی ترقی کا فکر اور پے در پے اسفار مرتب ہوئے جنہوں نے کار تدریس پورا کرنے کے لئے مولوی محمد یحییٰ صاحب کو گنگوہ سے بلا کر مدرسہ میں لا بٹھانے پر مجبور کیا۔ مگر اللہ رے ہمت کہ جوں جوں عمر زیادہ ہو کر ضعف بڑھتا جاتا تھا ووں ووں آپ کے مشاغل دینیہ علمیہ بڑھتے جاتے اور فرصت و مہلت گھٹتی جاتی تھی۔ مگر ابوداؤد کی شرح کا شوق اسی امنگ کے درجہ میں تھا جو ہر طرح فارغ البال خوشحال بے فکرے نوجوان کو ہر قسم کی راحت و یکسوئی حاصل ہونے کے وقت میں ہونا چاہیے عجب وقت تھا کہ نہ شوق پورا ہو سکتا تھا نہ دل سے نکل سکتا تھا۔

اک عمر سے الجھن میں مری جان حزیں ہے — یہ بھی ہے کوئی بات کہ ہاں ہے نہ نہیں ہے

ان تمامی موانع کے ساتھ ایک بڑا اہم مشکل امر یہ تھا کہ حضرت گنگوہی دنیا سے رخصت ہو گئے جن کا وجود با جود تھا۔ ہوتے ہوئے علاوہ تبحر علمی کے درجہ میں بڑا سہارا تھا کہ جہاں کوئی اشکال پیش آئے گا اس کو شرح مجسم سے حل کر سکیں گے اور اس پر طرہ یہ کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب جو حضرت گنگوہی کی بڑی یادگار تھے اور اس اہم خدمت تالیف میں بہت کچھ مدد دے سکتے تھے وہ بھی عالم خموشاں کو سدھار لئے۔ قطع نظر اس کے کہ ان حادثات عظیمہ نے کمر توڑ دی یوں بھی علمی تالیف میں ہمت کو پارہ پارہ کر دیا کہ پہلے ہوس کے درجہ میں اس کا نام لیتے تو اب بھولکر بھی اس کا خیال نہ لاتے۔ مگر قدرت کو آپ کے مقبول ایک خیر بخش کا کام لینا اور آپ کے اعمال نامہ میں صدقات جاریات اور باقیات صالحات کے اندر کلام الرسول کی اس ضروری و اہم خدمت کو زریں حروف سے درج کرنا منظور تھا اس لئے عین اس وقت جبکہ آپ کی عمر چونسٹھ [۶۴] سال پوری ہو گئی اور آپ اپنے ظاہری و باطنی جانشین مولوی محمد یحییٰ کے انتقال کی خبر سنکر سفر حج سے واپس وطن پہنچے تو اب بے ہمہ شوق کو ابھرا ہوا لے کر پہنچے کہ ظاہری اسباب منقطع ہو چکے تھے اور صورتاً و حقیقتاً دونوں اعتبار سے علیم و قدیر خدا پر نظر رہ گئی تھی اور در حقیقت یہ اسی توفیق اعلیٰ کی طرف سے کشش کا ظہور تھا جو ہمیشہ اپنے

محبین سے وہ کام لیتی رہی جس پر اسباب نے ہمیشہ دانتوں میں انگلیاں دبائیں اور دنیا حیران ہو کر تکتی رہی کہ ؎

اگر از جانب معشوق نباشد کششے طالب عاشق بیچارہ بجائے نرسد

مولوی محمد زکریا صاحب شعبان ۱۳۴۳ھ میں حدیث کے علاوہ تمام کتابوں سے فارغ ہو لئے تھے کہ شوال میں حضرت نے حجاز کا قصد فرمایا اور انہوں نے یہ قصد کیا کہ ترمذی و بخاری جو ہمیشہ حضرت کے ہاں ہوتی تھی حضرت کی واپسی پر حضرت ہی سے پڑھوں گا۔ مگر کامیاب نہ ہوئے اور حضرت کے پیچھے اپنے والد بزرگوار مولانا محمد یحییٰ صاحب سے دورہ پورا کرنا پڑا۔ دوسرے سال ادھر مولانا محمد یحییٰ صاحب کا وصال ہوا اور ادھر حضرت کی حجاز سے واپسی ہوئی تو حضرت کا ان کو اور ان کے رفیق مولوی حسن احمد مرحوم کو ایما ہوا کہ ترمذی و بخاری دوبارہ مجھ سے پڑھو۔ تعمیل حکم کے درجہ میں شروع کر دی مگر یہ جتلانے کے لئے کہ پوری محنت سے پڑھ چکے ہیں، اور اس توقع پر کہ حضرت دوبارہ پڑھنے کو بے ضرورت فرما کر چھوڑنے کی اجازت دے دیں گے خوب ہی مطالعہ دیکھتے اور حواشی کی کوئی تقریر ایسی نہ ہوتی جس کو رات میں ازبر نہ کر لیتے تھے۔ حضرت کے سامنے جاتے تو ایسا پڑھتے گویا چند بار پڑھا لینے والا مدرس پڑھتا ہے۔ اور روزانہ اس کے منتظر رہتے کہ آج چھوڑنے کی اجازت ضرور مل جائے گی۔ مگر تین مہینے ہو گئے کہ حضرت مرحوم اپنے نور نظر جانشین کے اس تبحر و مناسبت حدیث کو دیکھ کر دل ہی دل میں باغ باغ ہوتے مگر یہ اشارہ بھی نہ فرماتے کہ چھوڑ دو پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ آخر ایک دن جبکہ سبق سے فارغ ہو کر یہ دونوں اپنی عادت کے موافق دارالحدیث سے حضرت کے ساتھ مدرسہ قدیم کو آرہے تھے راستہ میں حضرت نے یہ الفاظ فرمائے۔ مجھے ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ ابوداؤد پر کچھ لکھوں۔ کئی دفعہ شروع کر چکا مگر پورا نہیں ہوا۔ اب یہ خیال ہے کہ اگر تم دونوں اعانت کرو تو شاید پوری ہو جائے۔ مولوی زکریا کی زبان سے بیساختہ نکلا کہ ہاں حضرت ضرور شروع فرمائیں۔ نیز یہ بھی کہا کہ حضرت یہ میری دعا کی قبولیت کا ثمرہ ہے۔

حضرت نے فرمایا یہ کیا؟ عرض کیا کہ والد صاحب نے جب مجھے مشکوٰۃ شریف
شروع کرائی تو بڑے اہتمام سے غسل فرما کر دو رکعت نفل پڑھکر شروع کرائی تھی
اور بسم اللہ پڑھانے کے بعد دیر تک قبلہ رُو طویل دعا مانگی تھی، اس کا تو مجھے علم نہیں
کہ انہوں نے کیا دعا مانگی مگر میں نے اس وقت صرف یہ ایک دُعا دیر تک کی تھی کہ بار الٰہا
اب مجھ سے حدیث شریف کا مشغلہ ترک نہ ہو۔ میں اپنی اس دُعا کو از قبیل محالات سمجھ
رہا تھا کیونکہ مدارس کا طرز یہی ہے کہ فارغ شدہ طالب علم کو ابتداء سے درجہ بدرجہ
کتابوں کا پڑھانا ہوتا ہے اور برسوں کے بعد حدیث کا درس دینے کی نوبت آتی
ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مجھے شروع ہی میں حدیث کا سبق مل جاتا، پس مُراد
پوری ہونے کی صورت تو سمجھ میں آتی نہ تھی مگر دعا یہی کرتا تھا سو اس سے بہتر کیا
کہ حضرت شرح ابی داؤد شروع فرمائیں اور میں کتابوں کی تلاش اور تتبع اقوال و معانی
میں لگا رہوں۔ حضرت یہ سنکر مسکرائے اور کتابوں کی فہرست لکھائی کہ کتب خانہ سے
یہ کتابیں نکال لو، چنانچہ ۱۲ ربیع الاوّل ۳۸ھ کو کتب خانہ سے وہ کتابیں لی گئیں
جن کی شرح کے لئے ضرورت تھی اور ۱۳ ربیع کو دار الطلبہ کے اس کمرہ میں جہاں خزانہ
محفوظ ہے بیٹھکر بسم اللہ لکھی گئی۔

مولوی زکریا صاحب کاتب بنے کہ حضرت قدس سرہ رعشہ کی وجہ سے لکھنے
سے معذور ہو گئے تھے مگر مولوی صاحب کا خط زیادہ اچھا نہ تھا اس لئے چند روز بعد
کتابت مولوی حسن احمد کی طرف منتقل ہوئی اور تتبع و تلاش مولوی صاحب کے حوالے
مگر مولوی حسن کا خط گو اچھا تھا لیکن ان کو نقطے لگانے کی عادت نہ تھی اس لئے حضرت
لکھوانے کے بعد ان کی تحریر دیکھتے اور مرتعش ہاتھ سے خود نقطے لگاتے اس وجہ
کتابت پھر مولوی زکریا صاحب کے حوالے ہوئی اور اس طرح ۳۰ ذیقعدہ ۳۵ھ
کو پورے ۹ ماہ میں ابو داؤد کا ایک پارہ تمام ہوا
ذی الحجہ ۳۵ھ میں چند ماہ کے لئے مولوی شمس الحق صاحب اس کتابت
کے لئے مستقل ملازم رکھے گئے اور آخر پھر مولوی زکریا صاحب کو دونوں کام

کا سارا بار اپنے سر پر رکھنا پڑا کہ بوقت ضرورت تنقیح بھی کریں اور پھر حضرت جو فرمائیں اس کو تحریر میں لائیں چونکہ مولوی زکریا صاحب مدرسہ میں مدرس ہو چکے اور ان کو اپنے اسباق کا پورا کرانا بہت ہی دشوار ہو گیا تھا کہ دماغ ہر وقت شرح کے مضامین اور تالیف کے مباحث و ضروریات میں منہمک رہتا تھا اور دوپہر و شب کے خارجی اوقات میں اٹھتے بیٹھتے اسباق پورے کراتے تھے اس لئے محرم ۱۳۴۲ھ سے مستقل صبح کا وقت ان کا مدرسہ سے فارغ کر لیا گیا اور اب وہ سکون کے ساتھ شرح ابی داؤد میں مشغول ہو گئے۔

شرح کے شروع کرتے وقت حضرت کو یا کسی اور کو یہ واہمہ بھی نہ تھا کہ ابو داؤد پوری ہو جائے گی۔ افتتاح کے وقت صرف ایک پارہ کی شرح کا ارادہ تھا کہ اس کی وجہ سے طلبہ کو کتاب کا اندازہ اور طرز و طریق معلوم ہو جائے گا اور خاص مناسبت پیدا ہو جائے گی۔ مگر جب پارہ ختم ہو لیا تو کتاب الطہارۃ ختم کرنے کا خیال ہوا اور جب وہ تمام ہوئی تو کتاب الصلوۃ تک پورا کرنے کا قصد ہوا اور جب وہ بھی ختم ہو چکی تو جلد اول پورا کرنے کا قصد ہو گیا۔ حتیٰ کہ شوال ۱۳۴۴ھ میں آپ حجاز روانہ ہوئے تو اس شوق میں کہ شرح کلام الرسول کی تکمیل آستانہ رسولؐ پر ہو آپ مولوی زکریا کو مدرسہ سے رخصت دلا کر اپنے ساتھ لے گئے اور وصال سے دو مہینہ قبل ختم فرما کر خود بھی عشق رسول میں ختم ہو گئے ؎

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست ۔۔۔ آنجا جز آنکہ جاں بسپارند چارہ نیست

سفر حجاز سے قبل ختم ابو داؤد کا خیال آپ کو کبھی نہیں ہوا۔ جب فرمایا یہی فرمایا کہ فلاں جگہ تک میں پورا کر لوں گا انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد فلاں شخص تکمیل کرے گا کبھی حافظ عبد اللطیف صاحب کا نام فرما دیتے اور کبھی مولوی زکریا صاحب کا لیکن سفر حجاز کا عزم ہونے پر ایسے الفاظ زبان پر آئے جو اختتام کی امید دلاتے اور اس کا متوقع بناتے تھے کہ کاتب ازل نے یہ زریں کارنامہ آپ کے مقدر میں لکھ دیا ہے اور آپ دنیا سے نہ اٹھیں گے جب تک کہ شرح ابو داؤد ختم نہ ہو جائیگی

ایک بار فرمایا میں نے حق تعالیٰ سے تین دعائیں کی تھیں کہ آخرت میں حکومت اسلامی دیکھ لوں، بذل المجہود تمام ہو جائے اور بقیع میں دفن ہو جاؤں الحمد للہ دو کی قبولیت دیکھ لی اور تیسری کا انتظار ہے۔

بذل المجہود ۱۰ ربیع الاوّل ۳۵ھ میں شروع ہوئی اور شعبان ۴۵ھ پورے دس برس پانچ ماہ دس دن میں یہ شرح بڑی تقطیع کے تقریباً دو ہزار صفحات میں پانچ جلد ہو کر ختم ہوئی اور اس کے ختم پر حضرتؒ کو اس درجہ مسرت و خوشی ہوئی جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی خوشی نہیں کر سکتی ہفت اقلیم کی سلطنت کا ملنا انتہاء خوشی کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے مگر اہل اللہ کو دنیوی لذتوں کے حصول میں تو خوشی ہی مفقود ہو جاتی ہے اس لئے میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے حضرت کی اس خوشی کا اندازہ ناظرین کو کرا سکوں آپ نے ختم پر ۲۳ شعبان یوم جمعہ کو علماء مدینہ اور احباب حاضرین کی ضیافت کا سامان کیا اور نہایت اپنے پیسہ سے اور بڑے اہتمام کے ساتھ عربی طرز کی ضیافت کا سامان کیا کہ آپ کا رُواں رُواں شکر الٰہی میں چور اور انعام باری تعالیٰ پر اتنا فرحان و مسرور تھا کہ اس کا اندازہ وہیں کے رہنے والے حاضر باش حضرات نے کیا ہو گا۔ دعوت کیلئے آپ نے خطوط طبع کرائے اور ایک بڑے پیمانہ پر جیران رسول کی میزبانی کا شوق پورا کیا۔ اس خوشی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ان دعوتی خطوط میں حضرت نے اپنے ہندی خدام کو بھی فراموش نہ فرمایا اور ہر چند کہ سمندر پار شرکت محال تھی مگر اس اطلاع کے لئے کہ حق تعالیٰ نے یہ مبارک وقت دیکھنا نصیب فرمایا جس کی بظاہر اسباب کوئی توقع نہ تھی اس کی خوشی میں اپنے جن دوستوں کو ہندوستان رہتے وقت شریک دعوت فرماتے ان کو بھی خطوط بھیجے کہ تصور و خیال میں تو وہ شریک ضیافت تھے ہی چنانچہ بندہ ناچیز کو بھی دعوتی خط بھیجا اور تحریر فرمایا کہ گذشتہ ہفتہ میں الحمد للہ بذل المجہود کی پانچویں جلد سے بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فراغت ہو گئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک بدھ کو اختتام ہوا اور جمعہ کو مدینہ منورہ کے علماء و فضلا کی دعوت کا جلسہ فرمایا گیا پھر کھانے سے اور کسی تعـ

وغیرہ کا نظم نہیں کیا گیا البتہ دعوتی خطوط طبع کیے گئے جو آپ حضرات کی مسرت کے لیے آپ کے پاس بھی ارسال ہیں۔" مولانا سید احمد صاحب مہاجر فیض آبادی نے جن کے مکان پر حضرت کا قیام تھا اور وہ حضرت کی اس روحانی مسرت کا پہلے سے خوب اندازہ فرمارہے تھے بندہ کو اس طرح تحریر فرمایا تعلیق الوداؤد قریب الختم ہے حضرت مدظلہٗ کی طرف سے سب خدام کی دعوت ہوگی۔ کاش آپ بھی رونق افروز ہوتے۔ غالب گمان ہے کہ ۱۲ شعبان سے پہلے ختم ہو جائے گی لہٰذا اس تاریخ مذکورہ تک عریضہ پہنچنا تو مشکل معلوم ہوتا ہے اس لئے جب بھی عریضہ پہنچ جائے آپ اس خوشی کی دعوت کی نیت سے اچھے اچھے کھانے گھر میں پکا کر سب گھر بھر مل کر کھا لیجئے۔ ہم دور افتادوں کو بھی یاد کر لیجئے جس طرح کہ ہم آپ کو یاد کیے بغیر نہیں رہیں گے۔" فقط۔ بہرحال اس خوشی کے وقت حضرت نے اپنے خدام کو جو ہزاروں میل دور تھے گروں سے دور تھے اس طرح شریک کیا کہ دعوتی خطوط ہر ایک کے نام مدینہ سے آئے اور لکھا کہ خیالی شرکت تم صاحبوں کی ضرور ہے اور مسرت کے لئے خط مطبوعہ ارسال ہے وہ مطبوعہ خط جو مدینہ منورہ کے مطبعۃ طیبۃ الشیخ ۔۔۔۔ میں طبع ہوا اور مدعو کا نام قلم سے لکھنے کے لئے جگہ چھوڑی ہوئی تھی یہ تھا بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ۔ عالی حضرت الشیخ ۔۔۔۔ المحترم مد فیضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ وبعد فقد من اللہ علی الاحقر ان منحہ بتالیف بذل المجہود فی حل ابی داؤد وبتکمیل ختامہ ببلدہ صاحب المعجزات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوٰۃ وازکی التسلیمات جعلہ اللہ خالصا لوجہہ الکریم ونفع بہ الاسلام والمسلمین آمین۔ فنومل تشریفکم بعد صلوٰۃ الجمعۃ فی ۲۳ شعبان ۱۳۴۵ھ الی مدرسۃ العلوم الشرعیۃ الکائنۃ فی زقاق البدور لتناول ماحضر اتماما للمسرۃ بقدومکم وشکرا اللہ تعالٰی والسلام۔

داعیکم خادم الطلبۃ خلیل احمد عفی عنہ

۱۳۳۵ھ میں جب اس کا افتتاح ہوا تو اس کی تالیف کے لئے صرف ایک گھنٹہ روزانہ تھا۔ مگر ۱۳۴۰ھ میں صبح کا تمام وقت اس کی نذر ہوا اور شام کے وقت حضرت رحمہ

کے پاس ایک سبق رہا۔ اسی درمیان میں اسفار پیش آتے اور حرج مرض کی وجہ سے ناغہ ہوجاتی اور اس کے ساتھ ہی نظام مدرسہ و نگرانی شعبہ ہائے مختلفہ اور آمد و رفت مہمانان وغیرہ کے مشاغل علیہ بدستور قائم تھے۔ مگر آستانہ محمدیہ پر پہنچکر تو اس کے سوا آپ کو کوئی کام ہی نہ تھا کہ ڈاک بھی دسویں دن آتی تھی۔ ادھر جگہ کی برکت اور طبیعت کا انس ولگاؤ جدا۔ لہذا طبیعت خوب چلی اور دو مہینہ میں کتاب کے ایک سو پچیس صفحات کی شرح قلم سے نکلی۔ ساتھ ہی ساتھ حضرت نے اس کو طبع کرانا شروع کردیا تھا کہ خاص حضرات نے اس کی طباعت کے لئے رقم علیحدہ دی تھی اور حضرت نے اس رقم کو مد طباعت بذل میں جمع فرماکر کتاب مدرسہ کو دے دی کہ اس کا سارا نفع مدرسہ مظاہر علوم کو پہنچے چنانچہ سترہ روپیہ پر کامل پانچ جلد مدرسہ سے مل سکتی ہیں۔

اثناء تالیف میں حضرت کا معمول بڑے اہتمام سے یہ رہا کہ جب کوئی نئی بحث تحریر فرماتے تو احباب اور خدام کو خاص طور پر اس کے دیکھنے کی تاکید فرماتے اور اصلاح و اشکال کا تقاضا کیا کرتے تھے۔ مولانا عبدالرحمن صاحب صدر مدرس مدرسہ کو بھی مستقل نظر ثانی کا امر فرمایا اور ابتدائی اجزاء پر مولانا نے بالاستیعاب نظر بھی فرمائی۔ اشکالات بھی پیش فرماتے اور حضرت ان کو غور سے سنتے تھے پھر ضرورت سمجھتے تو اپنی تحریر میں مراجعت فرماتے اور کبھی توضیح مضمون کے لئے عبارت ہی دوبارہ تحریر میں لاتے تھے۔ حضرت رائپوری جب تشریف لاتے تو اکثر مواقع خاص طور پر سنواتے تھے۔ حضرت مولانا تھانوی مدظلہم۔ مولانا شبیر احمد صاحب۔ مولانا انور شاہ صاحب مولانا حسین احمد صاحب۔ حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب اور مولانا صدیق احمد صاحب وغیرہم جو صاحب بھی تشریف لائے ان کو اہتمام سے حضرت نے مسودہ دکھایا اور تقاضا فرمایا کہ غور کے ساتھ ناقدانہ نگاہ ڈالیں کہ اغیار کے اعتراضات سے بچنے کے لئے اپنوں ہی کے اعتراضات ذریعہ بن سکتے ہیں۔ بندہ جب حاضر ہوتا تو حضرت اسکی ابحاث مشکلہ کا تذکرہ فرماتے اور یہی ارشاد

ہوتا کہ ناقدانہ نگاہ سے دیکھوں، میں حیران ہوتا کہ حضرت کی تحریر پر اور میری ناقدانہ نظر، چہ نسبت خاک را با عالم پاک" مگر حضرت کی بے نفسی وللّٰہیت کہ چھوٹے بڑے کا خیال کئے بغیر ہر علم دوست دارد وصادر سے یہی فرمائش ہوتی تھی۔

مولانا فیض الحسن صاحب کہ حضرتؒ ان کے حقیقی پھوپا تھے جلسہ سالانہ کے موقع پر کانپور سے کہ وہاں تعلیم دینیات سے فارغ ہو کر مطبع اور تجارت کتب کے سلسلہ میں لگ گئے تھے مدت کے بعد سہارنپور تشریف لائے تو تبسم فرماتے ہوئے کھڑے ہو کر ان کو چھاتی سے لگا لیا اور پھر مولوی زکریا صاحب سے فرمایا کہ ان کو بذل المجہود کے اجزا دے دینا یہ دیکھیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت تک میں حضرت سے بیعت بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ سنکر میں پانی پانی ہو گیا اور ایک حرف بھی زبان سے نہ نکلا۔ حضرت تو یہ فرما کر مکان تشریف لے گئے اور میں محجوب و منفعل کہ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔ اتنے میں مولوی زکریا صاحب مجھے وہ اجزا دے گئے اور تعمیلاً للارشاد میں نے کہیں کہیں سے کچھ دیکھا۔ دوسرے دن پھر مجمع میں مجھ سے دریافت فرماتے ہیں کیوں بھائی وہ بذل المجہود کے اجزا دیکھے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں جناب والا کے ارشاد کی تعمیل کر دی۔ یہ سنکر حضرت نے ایک شفقت بھری خاص نظر مجھ پر ڈالی اور دریافت فرمایا کیسے ہیں؟ میں نے یہ سمجھکر کہ متن کی کتابت حوض میں ہو گی اور شرح بصورت حواشی ہر حاشیہ پر جب فن سے مناسبت رکھتا تھا اس کا لحاظ رکھکر عرض کیا کہ قدرے طویل ہیں مگر پُر منفعت ہونے میں کیا شک ہے۔ فرمایا حامل المتن ہونے کی وجہ سے کچھ طول تو ضرور ہے مگر عون المعبود مطبوعہ فاروقی دہلی کے طریقہ پر طبع ہو گی نہ کہ محشی ابوداؤد کے طرز پر"۔ اسی سفر میں مولانا ممدوح حضرت سے بیعت ہو گئے اور بحمد للہ آخری سفر حج کو روانہ ہونے سے قبل حضرت نے مجاز طریقت بنا کر تجدید بیعت کی اجازت دی۔

اثناء تالیف میں کوئی مشکل مقام آتا تو آپ حضرت گنگوہیؒ اور مولانا محمد یحییٰ صاحب کو بار بار یاد فرماتے اور کہا کرتے تھے کہ حضرت گنگوہی کی نبات میں لکھی جاتی،

تو کس قدر سہولت ہوتی۔ کبھی فرماتے کہ حضرت کے سامنے سب اشکال حل ہو جاتے کبھی فرماتے کہ کم از کم ہمارے مولوی صاحب (مولانا محمد یحییٰ) ہی حیات ہوتے تو خوب بحث ہوا کرتی بندہ حاضر خدمت ہوتا یا مولوی ظفر احمد صاحب جب آتے تو حضرت فرماتے ذرا اس کی عربیت پر خاص طور سے نظر ڈالو کیونکہ مجھے عربی زبان پر پوری قدرت نہیں۔ ہم شرمندہ ہو کر عرض کرتے کہ حضرت آپ بھی قادر نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا۔ فرماتے میں تواضع سے نہیں کہتا۔ دوسرے یہ کہ میں عبارت بطور املا کے لکھواتا ہوں۔ بطور تصنیف کے خود نہیں لکھتا اور املا میں نقص رہ جانا مستبعد نہیں۔

مدینہ منورہ پہنچ کر جب ہمہ تن اس میں مشغول ہوئے تو آپ کے قلب پر عجیب کیف تھا قرب آستانۂ محبوب کا انتہا درجہ اور مدتہائے دراز کی تمنا و شوق پورا ہونے کا مزہ الگ اور کلام الرسول کی خدمت میں اشتغال کا مزہ علیحدہ۔ ڈاک بھی آٹھویں دسویں دن آتی تھی اور اس لئے روز و شب اسی انہماک میں گزرتا تھا۔ سعودی حکومت کی ابتدا تھی اور چار طرف مختلف افواہیں جس پر یہاں بعض خدام کو خیال ہوا کہ شاید حضرت مدینہ منورہ میں بسکون و راحت قیام نہ فرما سکیں اور ہندوستان واپس ہوں۔ مگر حضرت کا والا نامہ آیا تو ہر لفظ فرحت میں ڈوبا ہوا تھا چنانچہ شیخ رشید احمد صاحب کے نام خط آیا جس میں تحریر فرمایا۔ میں آپ کو مجملاً اطمینان دلاتا ہوں کہ بحمد اللہ یہاں کے حالات اس قدر اطمینان بخش اور فرحت انگیز ہیں کہ ہم لوگوں کو کسی قسم کا ذرہ بھر بھی اندیشہ نہیں۔ تمام حجاز امن سے معمور ہے۔ جدہ سے مکہ تک مکہ سے مدینہ منورہ تک اور مدینہ منورہ سے جدہ اور ینبع تک دو دو چار چار اونٹ بھی باطمینان آتے جاتے ہیں اور کوئی واقعہ پیش نہیں آتا۔ ہم یہاں تقریباً دو ماہ سے مقیم ہیں۔ ہمارے لئے بحمد اللہ دن عید اور رات شب برات ہے کسی امر کی وجہ سے ہمارے دل میں یہ داعیہ پیدا نہیں ہوا کہ ہم یہاں سے لوٹ جائیں جس قدر اس قسم کے موحش خیالات اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں وہ بالکل غلط اور کذب ہیں غالباً حجاج پہنچ گئے ہوں گے اور ان سے ان خرافات افواہ کی تردید آپ کو اور سب دوستوں کو

معلوم ہو گئی ہوگی۔ تعلیق ابی داؤد باطمینان لکھی جا رہی ہے اور اس دو ماہ کے عرصہ میں انشاء اللہ ایک سو پچیس صفحات کے قریب لکھے گئے ہوں گے جو مولوی رؤف الحسن صاحب کے ہمراہ طبع ہونے کے لئے سہارنپور پہنچ جائیں گے اب میرا پختہ خیال ہے کہ میں تعلیق کے اہتمام کے لئے مدینہ طیبہ میں اگلے سال بھی قیام کروں گا اور حج کے لئے بھی مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ نہیں کروں گا۔ اگر مناسب ہو تو یہ مضمون بھی اخبار میں شائع کرا دیجئے" سچ ہے یثرب کی مٹی میں ملنے کی ہوس اور محبوب کی احادیث میں اشتغال اور شرح ابی داؤد کی تکمیل نفل حج سے بدرجہا زیادہ پیاری چیز ہے اور اس کو صاحب مذہب عاشق رسول حضرت امام مالک کے دل سے کوئی پوچھے ۔

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید معشوق درینجاست بیائید بیائید

مؤلف کا دماغ تالیف کے زمانہ میں کسی دوسرے کام کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ صاحب ہدایہ نے دس برس میں ہدایہ لکھی مگر اس طرح کہ حجرہ میں کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی غلام دونوں وقت کھانا لا کر رکھ جاتا اور تھوڑی دیر بعد خالی برتن دیکھ کر لے جاتا تھا۔ اوقات نماز کے سوا چوبیس گھنٹے میں حضرت ممدوح کی کسی کو صورت بھی نظر نہ آتی تھی۔ مگر حیرت ہوتی تھی جب دیکھا جاتا تھا کہ حضرت کا یہ زمانہ پیری کا اور یہ مجاہدہ معمولہ مستمرہ اور یہ صدمات وفات احباب و متعلقین اور یہ مدارات حاضرین و غائبین اور اس پر ابوداؤد جیسی پُر اشکال و مغلق کتاب کی شرح جس میں دماغ ہی دماغ کا کام اور سات بجے سے لے کر گیارہ بجے تک چار گھنٹے اس میں ختم ہونے کے بعد شام کو وہی درس طلبہ وہی جوابات خطوط وہی فتاویٰ نویسی۔ وہی مہمانوں سے ملاطفت و انبساط اور وہی ہر معمول مستحب پر مواظبت کا اہتمام۔ اس سے زیادہ تعجب اس وقت ہوتا جبکہ آپ تالیف میں مشغول ہوتے اور کوئی مہمان آتا تو وہ سیدھا حضرت کے پاس دار التالیف میں چلا جاتا حضرت اسی تبسم و خندہ پیشانی سے ملتے اور ذرہ برابر گرانی نہ لاتے کہ دماغی کام اور محتاج یکسوئی اشتغال میں بلا ضرورت کیوں

مخل ہوا۔ کافی مزاج پرسی کے بعد پھر اپنے کام میں لگ جاتے اور مضمون بزبان عربی لکھوانے لگتے تھے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ حضرت ادھر مہمان سے باتیں بھی کئے جاتے تھے اور حل عبارات مشکلہ بھی فرماتے ہوتے تھے حتیٰ کہ مضمون ختم ہوجاتا تو کتاب بند کر دیتے اور یہ فرماکر کہ بس اب چلو، مہمان کو ساتھ لئے نیچے تشریف لے آتے گویا مضمون کی آمد حضرت کے قبضہ کی بات تھی کہ جب چاہتے آمد شروع ہوجاتی اور جب چاہتے دماغ اور طبیعت کو اس سے ایسا خالی فرمالیتے گویا اس کا غور وفکر ہی نہیں ہے۔ چنانچہ اس اشتغال میں آپ کو نہ کسی ادنیٰ معمول کے ترک کی نوبت آئی اور نہ کسی امر میں دقت و نسیان پیش آیا۔ نہ احباب کی غمی وخوشی میں شرکت گئی اور نہ ان کی مخلصانہ طلب پر انکا جواب لکھا گیا۔ سب کام بدستور چلتے رہے اور یہ خدمت عظمیٰ ایک مہمی نعمت بن کر اتمام کو پہنچ گئی۔

بذل میں یہ ایک عجیب کمال ہے کہ جو مضمون حضرت کے ذہن میں آیا جبتک متقدمین کے کلام میں اس کی تائید نہ مل گئی حضرت نے اسکو قلم وقرطاس کے حوالے نہیں کیا اور یہ فرمایا کہ بھئی اپنے علم پر کیا اعتماد ہے۔ بایں التزام ہر مسئلہ میں مذاہب ائمہ اربعہ کی تحقیق اور باہم محاکمہ کیا گیا ہے۔ مذہب حنفیہ کی تحقیق اور کافی دلائل کے بعد دوسرے مذاہب کے دلائل کے بہترین اور متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔ ہر راوی کے متعلق پوری جرح وتعدیل کی گئی جو روایات ترجمۃ الباب کے موافق نہ تھیں ان کی توجیہ وموافقت ظاہر فرمائی ہے۔ مصنف نے جن روایات کو تعلیقاً بیان کیا ہے دوسری کتابوں سے ان کی سند اتصال لکھی گئی ہے جو روایات مختصر آئی ہیں دوسری کتابوں کا جہاں وہ مفصل ہے حوالہ دیا ہے اور کلام الرسول کا منشا ظاہر کر کے وہ محاسن وحقائق بیان فرمائے ہیں جن کا حظ وہی اٹھا سکتا ہے جس کو فن حدیث سے مناسبت اور صاحب حدیث سے انس ومحبت ہو۔

ایک مرتبہ حسب معمول صبح کو آپ نے تشریف لاکر مولوی ذکریا سلمہ سے فرمایا فلاں بات لکھی گئی ہے اس کو دوبارہ نکالو چنانچہ وہ نکالی گئی اور آپ نے مراجعت

کوتب فرما کر اس کو کاٹا اور دوسری عبارت لکھی۔ اس کے بعد بڑی مسرت سے اپنا خواب بیان فرمایا کہ تہجد کے بعد ذرا آنکھ لگ گئی تو ایک صاحب کو (جن کا حلیہ بھی ارشاد فرمایا) یوں کہتے سنا کہ یہ جگہ غلط لکھی گئی ہے اس کو درست کر دو۔ ایک بار فرمایا کہ اس قابل تو ہوں نہیں مگر ہوس تھی اور ہے کہ خدام حدیث کی جماعت میں شامل ہو جاؤں اللہ کا انعام ہے کہ اس نے کام لے لیا ۔

کہاں میں اور کہاں یہ نگہت گل   نسیم صبح تیری مہربانی

مولانا محب الدین صاحب مہاجر مکی اعلیٰحضرت حاجی صاحب کے خلیفہ کو کشف زیادہ ہوتا تھا اور حضرتؒ کے ساتھ خاص محبت رکھتے تھے۔ سنہ ۳۵ھ میں ممدوح کا حضرت کو پیام پہنچا کہ اب تمہارا آخری وقت قریب آگیا ہے ہندوستان جلد چھوڑ کر مدینہ پہنچو۔ حضرتؒ تو بچپن سے یہ تمنا رکھتے تھے اس لئے آخری اُمید پہ آنے کے شوق میں حجاز روانہ ہو گئے جنگ کا زمانہ تھا اور شریف حسین نے ترکوں سے مقابلہ کیا تھا کہ طرح طرح کے فتنے رُونما تھے مولوی محب الدین صاحب نے حضرت پر تقاضا کیا کہ جلدی ہندوستان واپس ہو کہ یہاں قیامت صغریٰ قائم ہوا چاہتی ہے تمہارے آخری وقت کا مجھے جو انکشاف ہوا تھا وہ ابھی مؤخر ہے۔ چنانچہ آپ ہندوستان تشریف لے آئے اور بذل المجہود میں مشغول ہو گئے۔ اب سنہ ۴۴ھ میں مولانا کا پھر تقاضہ ہوا کہ مدینہ پہنچو چنانچہ حضرتؒ روانہ ہو گئے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ مولانا کو مکاشفہ میں غلطی ہو گئی مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں مکاشفہ تو صحیح تھا مگر بذل کے لئے حق تعالیٰ نے میری عمر بڑھا دی کہ انجام اس توسیع کا بھی وہی تقدیر مبرم ہے۔ چنانچہ ۲۱ شعبان کو بذل ختم ہوئی اور ۲۷ رمضان کو آپ پر فالج کا اثر ہوا جس میں اول کچھ معالجہ سے خفت محسوس ہوئی مگر یہی سلسلہ مرض چلتا رہا اور آخر ۱۵ ربیع الثانی سنہ ۴۶ھ یوم چہارشنبہ بعد عصر آپ نے دنیا کو چھوڑ کر عالم قدس کا سفر فرمایا۔ اثنائے تالیف میں حضرت کے سامنے ۲ دو لمبی تپائیوں پر کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا جن میں تفسیر حدیث اسماء الرجال اصول حدیث فقہ اصول فقہ لغت سیر و تواریخ اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں ترتیب وار رکھی رہتی تھیں کہ تفسیر میں ابن

جریر و درمنثور بیضاوی اور اس کے حواشی خفاجی و شیخزادہ و قونوی و عبدالحکیم اور
جلالین مع شروح و تفسیر کبیر پر نظر ڈالتے تھے۔ علم حدیث میں بخاری مسلم ترمذی
نسائی ابن ماجہ موطا امام مالک موطا امام محمد دارمی دارقطنی مصنف ابن ابی شیبہ
سنن بیہقی مسند امام احمد طحاوی مشکوۃ اور اس کی شرح علی قاری مسند ابی داؤد
طیالسی منتقی الاخبار اور اس کی شرح نیل الاوطار زاد المعاد فتح الباری قسطلانی
نووی اور حاشیہ السندی مصنفہ مراسیل ابی داؤد عمل الیوم واللیلہ مسند امام ابی حنیفہ
مسند امام شافعی مجمع الزوائد کتاب الآثار سنن الکبریٰ جزء القراءۃ ادب المفرد جزء
رفع الیدین مستدرک اور اس کی تلخیص سبل السلام عینی درجات انجاح الحاجہ
آثار السنن اور اس کی تعلیق تنسیق جوہر نقی زرقانی تعلیق ممجد تلخیص الحبیر درایہ
شرح مشکل الآثار اور ترمذی کی چاروں شرح شرح الخطابی تخریج زیلعی حاشیہ الحصین
الکمال اور مکمل اللآلی المصنوعہ وغیرہ کے ساتھ مولانا گنگوہی کی وہ تقریر جسکو مولانا
محمد یحیی صاحب نے پڑھتے وقت حضرت سے سنکر ضبط کیا تھا سب زیر نظر رہتی تھیں
اسماء الرجال میں تقریب تہذیب تعجیل المنفعہ اصابہ لسان المیزان طبقات المدلسین
خلاصۃ تہذیب الکمال میزان الاعتدال تذکرۃ الحفاظ تجرید اسد الغابہ استیعاب
المؤتلف والمختلف طبقات ابن سعد جمع بین رجال الصحیحین تاریخ صغیر اور ضعفاء
الصغیر اکمال انساب رجال جامع الاصول الکنی المغنی الجواہر المضیئہ طبقات شافعیہ
لباب الانساب اسعاف فوائد بہیہ المتفردات والوحدان اور الضعفاء والمتروکین
وغیرہ کا تتبع ہوتا تھا۔ اصول حدیث میں شرح نخبہ شرح الشرح تدریب الفیۃ الحدیث
فتح المغیث اور بستان المحدثین سامنے رہتی تھی۔ فقہ حنفی میں بدائع مبسوط ہدایہ اور
اس کے حواشی کفایہ عنایہ فتح القدیر کبیری بحر الرائق۔ در مختار اور اس کے دونوں
حواشی طحطاوی اور شامی مراقی الفلاح اور اس کا حاشیہ طحطاوی اور زیلعی و
عنایہ سے کام لیا جاتا تھا اور شافعی فقہ میں کتاب الام اور اس کا حاشیہ اور اقناع
تحفۃ المحتاج روضۃ المحتاجین کتاب الانوار التوشیح فقہ مالکیہ میں کتاب المدونہ للامام

کتاب المقدمات اور مختصر الشیخ خلیل۔ فقہ حنبلی میں اعلام الموقعین اور شعرانی کی کشف الغمہ اور میزان الکبریٰ کا تفحص ہوتا تھا۔ اصول فقہ میں نور الانوار توضیح تلویح حسامی اور اس کے حواشی تحریر اور مستصفیٰ پر غور و فکر مبذول ہوتا تھا۔ لغت میں مجمع البحار لسان العرب قاموس نہایہ مصباح المنیر اور مخصص سے مدد لی جاتی تھی۔ سیر میں ابن ہشام طبری تاریخ الخلفاء معجم البلدان تاریخ الخمیس اور وفیات الاعیان کی ورق گردانی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ نحو میں شرح جامی اور تجوید میں شرح ابن الناصح وغیرہ بھی موجود رہتی تھیں اور ابوداؤد کے چھ نسخے پاس تھے ایک خاص وہ قدیم نسخہ جس میں آپ نے پڑھا اور جگہ جگہ کچھ لکھا تھا کہ متعدد نسخوں سے مقابلہ ہو کر صحیح کیا گیا تھا۔ دوم عون المعبود کے متن پر چڑھا ہوا نسخہ۔ سوم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کا تصحیح کردہ نسخہ مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۳۱۸ھ چہارم مطبوعہ مطبع خیریہ مصر ۱۳۱۰ھ پنجم مولانا فخر الحسن گنگوہی کا حاشیہ کردہ مطبوعہ اصح المطابع اور چھٹا مطبوعہ اصح المطابع ۱۳۱۸ھ

یہ بات کہ اتنی کثیر کتابوں کے بحر ذخار سے کون کون سے موتی نکالے گئے اور بذل المجہود کس قیمت کے جواہرات کا جڑاؤ ہار ہے صرف اہل علم سمجھ سکتے ہیں اور آج نہیں قیامت تک آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی کہ مؤلف بذل المجہود کا علمی دنیا پر کیا احسان ہے۔ چنانچہ جلد اول صـ۳ پر مسواک کی بحث اور صـ۳۴۲ پر بناء جمعہ و ظہر کی بحث اور جلد ثانی میں صـ۱۳۲ پر اشارہ سبابہ کی بحث اور صـ۲۸۸ پر سجدہ کی بحث اور جلد ثالث میں صـ۵۵ پر غسل کی بحث اور صـ۱۰۶ پر قران حج کی بحث قابل دید ہے۔ رہا اس کا صلہ سو صاحب الکلام کے دربار میں حاضری کے وقت اولین و آخرین کا بھرپور مجمع دیکھے گا کہ محبوب پیغمبر کا قدردان خدا خادم کلام پیغمبر کو کیا عطا فرما رہا ہے۔ ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ۔

بذل سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے قلب میں داعیہ پیدا ہوا کہ ترمذی کی شرح بھی اسی نہج پر ہو جائے کہ وہ بھی درسی کتاب اور اس خدمت کی مستحق ہے چنانچہ

آپ نے مولوی زکریا صاحب کو لکھا بھی کہ بنام خدا اس کو شروع کر دو کیا عجب ہے کہ
یہ بھی میرے اعمال نامہ کی زینت بن جائے۔ مگر مولوی زکریا صاحب چاہتے تھے کہ حضرت
افتتاح فرمائیں۔ اور حضرتؒ جواب دیتے تھے کہ تمہارے بغیر مجھ سے اس کا انجام
پانا دشوار کہ از سر نو کتب کثیرہ کا فراہم کرنا اور ان کے تتبع و تلاش سے مضامین کا اپنے
مظان سے نکالنا تمہارا ہی کام ہے۔ آخر میں حضرتؒ نے یہ بھی لکھا کہ اچھا یوں کرو کہ
ایک ورق چھوڑ کر دہیں لکھنا شروع کر دو کہ طرز و طریق سے واقف اور خدمت حدیث
کے اہل بن چکے ہو۔ کسی وقت میری زندگی میں تمہارا آنا ہوا تو پہلا صفحہ میں لکھوا دوں گا
مگر عمر شریف قریب ختم پہنچ چکی تھی اور تمنا و شوق ہی کا اجر ساتھ لے جانا مقدر تھا۔
اس لئے اس کا افتتاح نہ ہوا اور دفعۃً مارا گیا کہ وہ دربار ہی برخاست ہو گیا جہاں
علمی یاقوت و لعل نچھاور ہوا کرتے تھے۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

چونکہ آپ کو حدیث سے طبعاً مناسبت و شیفتگی تھی اس لئے حدیث کی جس
قلمی کتاب کا آپ کو کہیں پتہ چلتا آپ کوشش فرماتے کہ اس کو جس قیمت پر بھی ملے
خرید لوں اور یہ طاقت سے باہر ہو تو نقل کرا لوں۔

۱۳۳۸ھ میں جب آپ چھٹے حج کو روانہ ہو کر مکہ مکرمہ پہنچے تو آپ کو مصنف عبدالرزاق
کا پتہ چلا کہ ایک شخص کے پاس اس کی جلد سوم و چہارم قلمی موجود ہے آپ نے چاہا کہ مدرسہ
کے لئے خرید لیں مگر مالک نے ۲۰ گنا قیمت مانگی جس کو آپ ادا نہ کر سکے اور نایاب کتاب
کے ہاتھ سے نکلنے کا آپ کو بہت ملال ہوا۔ مولوی محمد زکریا صاحب و حاجی انیس احمد
اور مولوی محمد اسحاق صاحب وغیرہ رفقاء نے حضرت کا قلق دیکھ کر عرض کیا کہ اپنا مجمع ہمت
کرے تو تھوڑا تھوڑا حصہ بانٹ کر سب کی نقل کر لے اول آپ کو فکر ہوا کہ دشوار ہے
مگر مولوی محمد زکریا کے استقلال ہمت اور اصرار پر آپ نے مالک کتاب سے نقل کی
اجازت مانگی۔ مالک کو یقین بھی تھا کہ نقل نہیں ہو سکتی پھر انکار کیوں کروں لہذا خوشی سے
اجازت دے دی کہ ہاں ضرور نقل کریں۔ چنانچہ آپ نے رفقاء پر اس کے اجزا تقسیم
فرما دیئے اور چند روز میں دونوں جلدیں نقل ہو گئیں۔ اس میں غلطیاں زیادہ تھیں

تو خود حضرت نے مولوی زکریا صاحب کے ساتھ نقل کا اصل سے مقابلہ فرماتے ہوئے کچھ غلطیوں کی اصلاح فرمائی اور اصل مالک کو واپس دے کر نقل قلمی کو مدرسہ میں داخل فرما دیا۔ مولانا عزیز الرحمن صاحب گنگوہی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن سے حضرت گنگوہی کے لیئے بیہقی نقل کرا کے لائے تھے اس کی آٹھ جلدیں منجملہ دس جلدوں کے حضرت نے گنگوہ سے منگا کر نقل کرائیں جن میں ایک جلد مولوی عبداللہ صاحب مرحوم نے بغیر اُجرت نقل کی اور باقی باجرت نقل ہو کر مدرسہ میں داخل ہوئیں۔ آپ کو پتہ چلا کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی ایک جلد سندھ میں حضرت پیر جھنڈا کے مشہور کُتب خانہ کی زینت بنی ہوئی ہے۔ آپ نے اس کی نقل کی کوشش فرمائی اور اس شرط پر اس کا حصول میسّر ہوا کہ مصنف عبدالرزاق آپ ان کو دیں۔ چنانچہ دونوں کتابوں کا نقل کے لیئے تبادلہ ہوا اور پھر واپسی ہو کر ہر ایک کتب خانہ میں دونوں نایاب کتابوں کے نسخے جمع ہو گئے۔ مدینہ منورہ سے آپ نے زیلعی تخریج ہدایہ مطبوعہ کا نسخہ جو اس وقت بالکل نایاب ہے خرید کر مدرسہ میں بھیجا۔ نیز محیط برہانی کامل جو آٹھ جلدوں میں فقہ کی مشہور کتاب ہے نہایت خوشخط قلمی تین سو روپیہ میں آپ نے خریدی کہ دو سو روپیہ اس کے آپ کو ملتے تھے مگر آپ نے فروخت نہیں کیا اور مدرسہ میں بھیجدی۔ ابوداؤد کی مشہور شرح ابن رسلان جس کے متعلق اکابر لکھتے ہیں کہ ہمیں زیارت نصیب نہیں ہوئی جلد اول و دوم مکتبہ محمودیہ میں آپ کو نظر پڑی تو آپ نے اُجرت پر اس کی نقل کرا کے مدرسہ میں بھیجی اور نویں جلد سے بذل میں کام لیا کہ وہی مقام زیر تالیف تھا۔ وہ گویا بذل المجہود میں نقل ہو گئی اور سوم چہارم پنجم ششم آپ کے رفیق سفر مولوی احتشام الحسن کو ایک کباڑی کی دکان سے ردی کے مول دستیاب ہو گئیں اور وہ ان کو لے آئے۔ اسی طرح علم کلام کا ایک قلمی نایاب رسالہ آپ نے خرید کر مدرسہ میں بھیجا جو عقائد نسفی سے بہتر ہے مگر طبع نہ ہو گا

اسماء الرجال میں طبقات ابن سعد جو آٹھ جلدوں میں ہے آپ نے لندن سے منگوائی اور انساب سمعانی جس کو قلمی سے عکس لے کر فوٹو میں طبع کیا گیا تھا اور بڑی

ضخیم کتاب ہے نیز لندن سے آپ نے بقیمت منگوا کر ہر دو کو کتب خانہ میں داخل کر دیا۔ کرمانی شرح بخاری کی قلمی دو جلدیں لمعات شرح مشکوٰۃ کی جلد اول مشکوٰۃ بر حاشیہ میر سید شریف کامل اور موطا کی شرح محلی جو مشہور ہے اس کے علاوہ دوسری شرح کہ اس کا نام بھی محلی ہے۔ جلد ثانی قلمی نیز حاصل فرما کر آپ مدرسہ میں پہلے داخل فرما چکے تھے۔ حجاز کے قاضی القضاۃ شیخ عبداللہ بن بلیہد نے چند کتابیں جن میں مغنی فقہ حنابلہ کی جلد اول بھی تھی آپ کی خدمت میں ہدیہ پیش کیں اور آپ نے قبول فرما کر ان کو بھی مدرسہ میں بھیج دیا۔

سنہ ۴۳ھ میں مصری ٹائپ خریدنے کے لئے بندہ جب مصر گیا اور واپسی براہ شام و عراق ہوئی تو دمشق میں مجھے پتہ لگا کہ سید بدر الدین محدث کے پاس جمع الفوائد کا قلمی نسخہ کامل تھا اور ٹرکی و فرانس کی جنگ میں ممدوح کا مکان نذر آتش ہوا تو وہ نایاب نسخہ بھی جل گیا۔ مگر اس کی ایک نقل قصبہ کفر سوسہ کے قدیم کتب خانہ میں جو دمشق سے ستر میل کے فاصلہ پر ہے شیخ محمود بن ارشید کے پاس محفوظ ہے مجھے شوق ہوا کہ اس کی حفاظت کا شرف ہندی مسلمانوں کو نصیب ہو اس لئے مولانا محمود سے ملا اور کتاب کو ہندوستان لا کر حضرت کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے بڑے شوق اور غور سے دیکھا اور مسرور ہو کر اس کے طبع ہو جانے کی خواہش ظاہر فرمائی کہ وہ جامع الاصول اور مجمع الزوائد کا مجموعہ تھا جس میں علامہ محمد بن محمد رودانی نے بخاری مسلم ترمذی ابوداود نسائی ابن ماجہ موطا امام مالک مسند ابو یعلی موصلی مسند ابوبکر بزار مسند دارمی اور طبرانی کی معاجم ثلاثہ کبیر و اوسط و صغیر چودہ کتابوں کی تمام حدیثوں کو بحذف مکررات و ترک اسانید ایک عجیب ترتیب کے ساتھ جمع کیا ہے۔ چنانچہ بندہ نے اس کی تخریج و تصحیح میں تین سال محنت اٹھا کر مصری ٹائپ میں اس کو طبع کر دیا۔ حضرت مدینہ منورہ میں مقیم تھے کہ کتاب کے

---

[1] حیات رسول کو مناسب ہے کہ اسکا نسخہ کسی مدرسہ میں وقف یا کسی عالم کو ہبہ کرکے حضرت کو ثواب میں شریک سمجھیں ایصال ثواب کریں کہ متعدد جگہ منتشر ہو کر حفاظت کتاب کا مقصود بھی پورا ہو جائے اور کم خرچ بالا نشین تحفہ صدقہ جاریہ بن کر اور آج کو مسرور بنا تار ہے۔ قیمت عنہ مجلد بارہ روپئے

تیار ہونے کا مژدہ آپ کو پہنچا! مگر افسوس کہ مطبوعہ کی زیارت نہ فرما سکے اور دنیا
سے تشریف لے گئے۔ یہ خدمت بھی اس لحاظ سے کہ حضرت کے ایماء اور برکت دعا سے
تکمیل کو پہنچی آپ ہی کے نامۂ اعمال میں درج ہے۔ غرض جس طرح درس حدیث اور تالیف
شروح احادیث کا آپ کو شغف تھا اسی طرح حدیث کے قلمی و نایاب نسخوں کے محفوظ
کرنے کا بھی حد درجہ کا شوق تھا کہ یہ ثمرہ ہے صاحب جوامع الکلم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت
صادقہ کا جس میں آپ فنا تھے اور چاہتے تھے کہ سرور عالم و عالمیان کا کوئی قول یا فعل
بھی ایسا نہ رہے جس کے علم و عمل سے محروم رہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی اشاعت
کا عشق تھا کہ تمامی امت محمدیہ تک پہنچکر اس کا نفع متعدی ہو اور مختلف مقامات کے
صدہا کتب خانوں میں جمع ہو کر اضاعت سے طرح محفوظ ہو جائے۔ مجنون صحرا میں بیٹھکر
بھی انگلیوں سے ریت پر لیلیٰ کا نام لکھا کرتا تھا کہ اسی سے اس کی طبیعت کو تسلی ہوتی تھی
پھر کیا پوچھنا محبت رسول کہ کلام رسول کی خدمت جس نوع کی بھی ہو عین ثمرہ ایمان ہے۔

دورۂ حدیث سے فارغ ہونے والوں کو آپ سند دیا کرتے تھے۔ ان کے سر پر
دستار باندھنے کی عادت نہ تھی بیرونی علماء آپ سے مسلسلات اور صحاح ستہ کی سند
و احادیث حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوتے اور آپ جن کو اہل سمجھتے اوائل حدیث سُنکر
اور مسلسلات خود سُنا کر ان کو بھی سند دیا کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۲۵ء میں جب آپ شملہ
تشریف لے گئے تو مولوی محمد فاضل صاحب ترجمان سفیر افغانستان نے حاضر ہو کر
سند حدیث کی خواہش کی حضرت نے کتابیں منگوا کر جگہ جگہ سے احادیث سُنیں اور فرمایا
کہ جب تم نصاب ختم کر چکے اور بمبئی و کلکتہ و دہلی وغیرہ جانے کا بارہا موقع ہوا تو اب تک
کسی سے سند حاصل کیوں نہیں کی؟ عرض کیا کہ جیسا میں چاہتا تھا صاحب علم و فضل بزرگ
مجھے کوئی نہیں ملا۔ اور کوئی ملا تو مجھے ان کے اعمال کی طرف سے اطمینان نہ ہوا
اب گھر بیٹھے حق تعالیٰ نے یہ دولت عطا فرمائی تو اجازت حاصل کرنے کا شوق ہوا
فرمایا یہ تمہارا میری نسبت حسن ظن ہے۔ کہو تو مدرسہ سے مطبوعہ سند منگوا دوں
اور کہو تو یہاں دستی لکھوا کر دستخط کر دوں۔ انہوں نے دستی کو ترجیح دی۔ تو آپ نے

مولانا قاری احمد حسن صاحب خطیب جامع مسجد شملہ سے عربی عبارت میں سند لکھوا کر لینے دستخط کیے اور ان کو عطا فرمائی۔ از قاضی عبد المجید صاحب کلرک سکرٹریٹ آفس شملہ

ان علماء کو بھی اگر حضرت کے تلامذہ میں شمار کیا جائے تو صدہا کی تعداد کا اضافہ ہو جائے گا کیونکہ اکثر مدارس ہندوستان کے سند یافتہ علماء بھی ہر سال اس نوع کی اجازت لینے حاضر ہوا کرتے اور عرب میں بھی علماء حرمین اور دیگر بلاد کے علماء بکثرت آپ سے سند اور اجازت حدیث حاصل کیا کرتے تھے۔ چنانچہ بندہ نے بھی حالانکہ ساری کتابیں میرٹھ میں مولانا عبد المومن صاحبؒ سے پڑھی تھیں مگر دل چاہا کہ حضرتؒ سے بھی حدیث کی اجازت اور سند حاصل کروں الحمد للہ حضرت نے اوائل سُنکر اور مسلسلات خود سُنا کر سند عطا فرمائی جس پر اپنے قلم سے دستخط فرمائے اور مہر ثبت کی۔ اس کو تبرکاً درج کرتا ہوں کہ محفوظ ہو جائے اور حضرتؒ نے حدیث کی اجازت جن علماء کو دی ہے وہ اس کی نقل بھی کر سکیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد فخر الاولین والآخرین۔ وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ واولیائہ اجمعین۔ اما بعد فیقول المفتقر الی رحمۃ ربہ القوی خلیل احمد بن الشاہ مجید علی الانصاری الایوبی الانبہٹوی عفی عنہ ان اخی فی اللہ مولانا الشیخ عاشق الٰہی میرٹھی قد قرء علی من اوائل الصحاح الستۃ فی جماعۃ و سمع منی المسلسلات بشاہ ولی اللہ المحدث الدہلوی قدس سرہ وطلب منی اجازتہا و قد حصل لی القرءۃ والسماع لجمیع کتب الحدیث وغیرہا علی شیخی واستاذی والحبر الکامل و البحر الفاضل الفائق باقرانہ علی النیرین الشمس والقمر۔ مولانا الشیخ محمد مظہر النانوتوی الصدیقی ثم قرأت بعض الصحاح اعنی الجامع الصحیح للبخاری من اولہ الی آخرہ والشمائل للترمذی والمسلسلات ومسند الجن المسمی بالنوادر والدر الثمین واوراقاً معدودۃ من صحیح الامام مسلم وشیئاً من مسند الدارمی علی مولانا الشیخ عبد القیوم بن مولانا الشیخ عبد الحی المرحوم البدہانوی ثم البہوپالوی فحصل لی منہ الاجازۃ العامۃ سنۃ الف و مائتین و ثلث و تسعین من الہجرۃ النبویۃ علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والتحیۃ۔ وکذلک عن کذلک

مقيماً في بوفال على خدمة التدريس بالمدرسة السليمانية[ع] ثم لما حضرت خير بلاد الله مكة المشرفة زادها الله كرامة ونوراً لزيارة بيت الله الحرام اول مرة سنة الف ومائتين وثلاث وتسعين حصل لي الاجازة العامة من مولانا الشيخ سيد احمد بن زيني دحلان المكي مفتي الشافعية بها ثم لما تكحلت بغبار طيبة وتشرفت بزيارة قبر سيد المرسلين نبينا محمد النبي الامين عليه وعلى آله الصلوٰة والسلام الى يوم الدين وحضرت عتبة مولانا الشيخ عبد الغني مهاجر المدني قرأت عليه ١٢٩٥ھ شيئاً من اوائل الكتب الستة فاجازني باجازة عامة وقد اجزت الاخ المذكور كما اجازني مشايخي الاعلام بكل ما يجوز لي روايته من كتب الحديث الصحاح الستة والموطائين للامام مالك بن انس والامام محمد بن الحسن الشيباني ومسند الدارمي والمسلسلات لشاه ولي الله المحدث الدهلوي قدس سره والمسلسل باجابة الدعاء عند الملتزم وغيرها من كتب الفقه والتفسير والمنقول والمعقول اجيزه ان يجيز غيره ممن تاهل لهذا الفن الشريف بالشرائط المعتبرة عند علماء هذا الشان واوصيه بتقوى الله في السر والعلانية وان يجتنب عن الامور المحدثة في الدين وعن طلب الدنيا ولذاتها وان لا ينساني في دعواته الصالحة وصلى الله تعالى على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله واصحابه وسلم

مہر

حرره العبد الحقير الاثيم خليل احمد وفقه الله للتزود لغد

محرم ۲۹ھ میں جب آپ مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو علماء مدینہ نے شرف تلمذ اور سند حدیث کی خواہش کی۔ چنانچہ آپ نے مکان پر درس شروع کر دیا اور وہاں جگہ کافی نہ ہوئی تو مسجد نبوی میں بعد عصر آپ درس دینے لگے۔ مسلسلات کی اجازت کے لئے مجمع کثیر ہو گیا اور آپ نے مسلسلات پڑھ کر ہر ایک کو باقاعدہ اجازت عطا فرمائی۔ بندہ بھی شریک جماعت تھا اور تقریباً چالیس علماء بصورت طلبہ حضرت کے سامنے سماعت کر رہے تھے۔ ایک حاسد بریلوی نے خدام حرم نبوی کے افسر اعلیٰ

ع ملازمت بھوپال کے گذشتہ باب میں بندہ نے اپنی لاعلمی ظاہر کی تھی مگر اس سند سے پتہ چلا کہ آپ بھوپال میں مدرسہ سلیمانیہ کے مدرس ہو کر تشریف لے گئے تھے ۱۲

کوکہ ایک ترکی تھا حضرت کی طرف سے اس طرح مشتعل کیا کہ اس وقت حرم نبوی میں بیٹھا ہوا ایک ایسا شخص درس دے رہا ہے جو معاذ اللہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں اچھا اعتقاد نہیں بلکہ گستاخی کرتا ہے ترکی افسر یہ سُن کر جھلا گیا اور غصہ میں سُرخ ہوکر باب الرحمہ کے قریب پہنچا جہاں حضرتؒ درس دے رہے تھے حضرتؒ کا چہرہ مبارک دیکھکر ترکی افسر کا غصہ یکلخت ٹھنڈا ہو گیا اور وہ کچھ دیر کھڑا ہوا درس سنتا رہا۔ پھر بے ساختہ بولا یا شیخ اس وقت ایک شخص نے مجھ سے اس طرح شکایت کی ہے مگر میں آپ کی صورت دیکھکر سمجھ گیا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔ وما ھذا وجہ کذاب اور آپ کا چہرہ جھوٹوں کا سا نہیں ہے حضرت نے فرمایا اولٰئک یفترون علینا وعلے اکابرنا و یحرفون اقوالنا ونفوض امرھم وامرنا الی اللہ۔ وہ لوگ ہم پر اور ہمارے اکابر پر بہتان لگاتے اور ہماری باتوں کو الٹ پلٹ کر غلط طور سے مشہور کرتے ہیں۔ ہم اپنا اور ان کا معاملہ خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ اس کے بعد افسر نے کہا کہ آپ مطمئن رہیں اور اپنا بابرکت درس جاری رکھیں مگر آپ کے مدنی تلامذہ نے کہ خوشحال و نازک مزاج تھے اس قصہ کا اتنا اثر لیا کہ دوسرا بڑا مکان خالی کرا کے حضرت کو مجبور کیا کہ ہم کو وہاں درس دیں تاکہ آئندہ ہم اپنے شیخ کے متعلق کوئی لفظ ایسا نہ سن سکیں جس کی برداشت نہ ہو سکے اور مسجد شریف میں زبان یا ہاتھ سے جواب دینے کی نوبت آئے چنانچہ اگلے دن سے حضرتؒ نے وہاں درس دیا اور سب کو اجازت و سند عطا فرمائی۔

آخر عمر میں بذل المجہود سے فارغ ہوکر اہل مدینہ کے اصرار پر مدرسۃ الایتام مدینہ منورہ میں درس دینا شروع کردیا۔ مگر چند اسباق سے زیادہ نہ ہونے پائے کہ آپ نے داعی حق کو لبیک کہا اور بلا واسطہ سلسلۂ درس ظاہری ہمیشہ کے لئے ختم ہو لیا۔ چند مدارس دینیہ بھی آپ کی سرپرستی میں تھے اور ان کی علمی و مالی ترقیات کا فکر آپ کے افکار میں ایک مستقل اضافہ تھا چنانچہ اجراڑہ ضلع میرٹھ کا مدرسہ جس کو حافظ حاجی محمد حسین صاحب نے متوکلانہ طریق پر محض اپنی ہمت سے قائم کیا تھا بالخصوص آپ کی سرپرستی میں تھا اور اس کے علاوہ مدرسہ انبہٹہ مدرسہ گلاوٹھی مدرسہ کاندھلہ

اور علاقہ میوات کے ۴۸ مکاتب جو مولانا محمد الیاس صاحب کی محنت و توجہ سے جگہ جگہ قائم ہوئے اور بحمد اللہ اس علاقہ جہل و ظلمت کو علم دین سے مالا مال بنا رہے ہیں۔ اور آخیر زمانہ میں مدینہ منورہ کا مدرسہ شرعیہ جس کا نام پہلے مدرسۃ الایتام والمساکین تھا آپ کی سرپرستی میں آیا اور ماشاء اللہ خوب پھلا اور پھولا۔

حل شبہات میں آپ کی تقریر و تحریر سادہ اور عام فہم ہوتی تھی۔ مولوی عبدالمعبود چاٹگامی نے ایک شبہ لکھا کہ شیخ عبدالرحمٰن فتح آبادی اپنی مثنوی گنج راز میں لکھتے ہیں ؎

گر کسے مر پیر خود را باز گوید ایں چراست ۔۔۔ رستگاری کے نماید گرچہ باشد اہل راست

گر بگوید پیر شب را روز طالب شک مدید ۔۔۔ راست ایں تمثیل از پیر ست دایماں از مرید

یا کند امرے خلاف شرع سر تا پا خطا ۔۔۔ سر بنہ و تسلیم کن آں کار بے چون و چرا

ار چہ باشد در نماز و یا کہ باشد روزہ دار ۔۔۔ چوں بخواند پیر آید در گذارد جملہ کار

حالانکہ حدیث میں ہے لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق اور حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ امر ناجائز شیخ کے فرمانے سے کبھی جائز نہیں ہو سکتا۔ اور مولانا تھانوی نے تکشف میں لکھا ہے شیخ کو خلاف شرع کام کرتا دیکھے تو مرید اپنے پیر کو نصیحت کرے! اس کا جواب آپ نے تحریر فرمایا۔ شیخ عبدالرحمٰن نے جو مثنوی گنج راز میں فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب معلوم ہو جائے کہ پیر کامل و مکمل ہے اور اتباع شریعت میں اعلیٰ درجہ پر پہنچا ہوا ہے اس کے بعد اگر اس سے شریعت کے خلاف کوئی امر پایا جائے تو اس پر انکار میں جلدی نہ کرے کہ ضرور درحقیقت کوئی ایسی توجیہ اور عذر ہوگا کہ جس سے وہ فعل خلاف شرع ہی نہ ہوگا۔ اور جو امر کہ قطعاً خلاف شرع ہے اور اس کی کوئی توجیہ و تاویل نہیں ہو سکتی وہ کسی کے لئے جائز نہیں اور نہ کسی کے کہنے سے جائز ہو سکتا ہے۔ فقط

خلیل احمد سہارنپور ۲۷ ربیع الثانی ۴۴ھ

خط مستقیم کے ہمیشہ دو پہلو ہوں گے کہ ذرا اختلاف سے یا داہنی جانب بعید

ہوتا جائے گا یا بائیں جانب دور پڑتا جائے گا پس رسول کے سوا کسی کا اتباع جائز نہیں یہ اسلام کا زریں اصول ہے جس کو خط مستقیم سمجھو۔ مگر اس پر چلنے کے لئے ضرورت ہے افعال و احوال رسول کے علم کی کہ حضرات صحابہ کو حاصل ہوا تھا مشاہدہ سے اور ہم کو حاصل ہوگا ناقلین اقوال اور متبعین احوال کی روایات اور اعمال سے۔ پس جس متبع رسول کا تدین و تبحر خواص امت محمدیہ کے نورانی قلوب نے تسلیم کر لیا اور رات دن صد ہا امور میں اپنی آنکھوں نے بھی دیکھ لیا اس کے متعلق یہ حکم لگانا کہ جو کچھ بھی کہے یا کرے وہ یقیناً حق ہے گویا اس کو معصوم اور رسول کے مساوی سمجھ لینا ہے جو خط مستقیم کا داہنا خط ہے۔ اور کسی امر میں ظاہری مخالفت دیکھکر فوراً غلطی کا حکم لگا دینا کہ خطا کر گیا گویا اپنے کو معصوم اور رسول کے برابر سمجھ لینا ہے۔ جو کہ خط المستقیم کا بایاں خمیدہ خط ہے۔ لہٰذا فعل رسول کی تحقیق میں خود بھی جد و جہد کرے اور متبعین رسول کو اس کا واسطہ و آلہ کار بھی بنائے کہ یہی وہ بال سے باریک راستہ ہے جس پر چلنے کا مسلمان مامور ہے اور اسی کی صورت مثالیہ پل صراط ہوگی جس پر چلنا دنیا میں اعتدال پر چلنے کا تمثل ہوگا۔ جو شخص یہاں اعتدال پر چلنے کا جس درجہ میں عادی و مشتاق تھا وہ اسی بے تکلفی سے قیامت کے دن اس پر چلے گا۔ پس محبت الٰہی جس کے امتحان کی خاطر شریعت وضع ہوئی ہے نہ تو متبعین شریعت کا ہر امر میں دامن پکڑ لینے سے بے نیاز بناتی ہے کہ اندھوں کے لئے راہبر اور وکلاء عدالت کی طرح قانون کی سمجھنے والی جماعت ہے اور نہ ان پر اتنا اعتماد ہونے دیتی ہے کہ ان کو رسول کا منصب دیکر معصوم سمجھ لیں۔ لہٰ کوئی بیرسٹر کیسا ہی قابل کیوں نہ ہو ممکن ہے کہ عدالت میں اس کی فہم اور رائے غلط ثابت ہو۔ لیکن اس اعتماد پر اپنے نازک معاملات اس کے حوالے کرنے کو چھوڑا بھی نہیں جاتا۔ جب تک کہ فضلاء امت محمدیہ کے قلوب اس کے راہبر ہونے پر مجتمع نہ ہو جائیں یہ اجماع امت بمنزلہ رسول کے حکم لگانے اور مسند وکالت کے چھین لینے کے قائم مقام ہے۔

دو گونہ رنج و عذاب است جان مجنوں را ۔ بلائے فرقت لیلٰے و صحبت لیلٰے

حدیث کے بعد درجہ ہے علم فقہ کا اور اس میں آپ کی مجتہدانہ استعداد اور وسعت نظر تمام ہمعصر علماء میں مسلّم تھی کہ جن مسائل میں علماء کے اختلاف ہوتے وہ محاکمہ کے لئے آپ کے پاس بھیجے جاتے اور جن معرکۃ الآراء مباحث میں قلم اُٹھاتے اہل علم گھبراتے تھے وہ آپ کی خدمت میں لائے جاتے تھے۔ مدرسہ میں چار ضخیم جلدیں موجود ہیں جن میں کئی ہزار فتاوے نقل ہیں اور یہ سب وہ ہیں جو خود حضرت کے لکھے ہوئے یا لکھوائے ہوئے ہیں یا دوسروں کے لکھے ہوئے اور آپ کے تصدیق کئے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ عام خطوط ہیں جو مسائل آپ سے پوچھے جاتے اور خط ہی میں آپ ان کا جواب لکھوا دیا کرتے تھے وہ علیحدہ ہیں کہ ان کو جمع کیا جائے تو ایک بڑی کتاب بن جائے مگر چونکہ یہاں مسائل کا استیعاب منظور نہیں بلکہ نمونہ دکھانا ہے اس لئے چند مسائل نقل کرتا ہوں۔

خلافت کے زمانہ میں ہندو مسلم کے اتحاد کی کوششوں پر ذبیحہ گاؤ کے ترک کرنے کی تحریک ہوئی اور بہتیرے علماء بھی اس خیال پر چلنے لگے مگر آپ نے بلاخوف لومۃ لائم ترک کی حرمت کا فتوٰی دیا جو اخبار وکیل امرتسر ۲۶ اپریل ۱۹۱۱ء میں بھی شائع ہوا۔ اس وقت آپ پر بہتیرا سب وشتم ہوا اور مشہور کیا گیا کہ آپ گورنمنٹی آدمی ہیں اور تنخواہ پاتے ہیں۔ مگر حق آخر حق ہی ہے چند ہی دن بعد موافقت کرنے والوں کو رجوع کرنا پڑا اور آخر صادق آیا۔ ع ہر آنکہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

وہ فتوٰی بجنسہ درج کرتا ہوں۔

اسلامی شریعت کے قواعد اور اس کے ضروری احکام میں سے یہ ہے کہ ترویج شعار کفر اور اس کی اعانت سخت حرام ہے۔ دیکھو زنار پہننا وغیرہ امور کہ جن میں شعار کفر کی ترویج ہو کفر ہیں یا حرام۔ اسی طرح شعار اسلام کے ترک کی اعانت بھی حرام ہے خصوصاً جن بلاد میں مخالفت کفر کی وجہ سے جو کوئی امر اگرچہ مباح ہی کیوں نہ ہو عرفاً شعار اسلام قرار پا چکا ہو اس کا بالکل ترک کرنا حرام ہوگا۔

اور اس کے ترک کی اعانت بھی حرام ہوگی۔ مثلاً ہندوستان میں اہل ہنود اپنے لباس میں انگرکھا وہ پہنتے ہیں کہ جس کی داہنی جانب پردہ کھلا ہوتا ہے اور اہل اسلام کے یہاں رفع تشبہ کے لئے یہ امر قرار پایا کہ ایسا انگرکھا پہنیں کہ جس کی بائیں جانب کھلی ہو پس اگر کوئی قوم اس کو ترک کرکے کفار کا طریق اختیار کرے اور اہل اسلام کا طریق چھوڑ دے تو یہ حرام ہوگا اگرچہ فی حد ذاتہ یہ دونوں امر مباح ہیں۔ بنائً علیہ گائے کا ذبح کرنا اور اس کی قربانی گو فی حد ذاتہ مباح ہے لیکن ہندوستان میں یہ امر بحیثیت ایک اسلامی شعار کے اہل اسلام میں مروج ہے اس لئے کہ گائے کا ذبح نہ ہونا ہندوستان میں شعار کفر میں داخل ہوچکا ہے پس ایسی صورت میں اس کا ترک ہونا اسلامی شعار کو یقیناً صدمہ رسال ہے اور شعارِ کفر کی ترویج اور اس کی اعانت ہے لہٰذا ہر مسلمان کو ایسی درخواست پر دستخط کرنا اور انسداد گاؤ کشی کے امر میں اعانت کرنا سخت حرام قریب کفر ہے۔ مسلمانوں کو لازم ہے کہ اس سے نہایت پرہیز کریں اور جن لوگوں نے ناواقفیت سے یا طمع نفسانی سے دستخط کردیئے ہیں یا اور کسی طرح کی اعانت کی ہے ان پر واجب ہے کہ وہ توبہ کریں اور اپنے دستخطوں سے ایک اعلان شائع کریں کہ ہم سے خطا ہوئی اور ہم اس میں شریک نہیں۔ فقط

سید شبیر محمد صاحب ساکن گھوٹکی نے ایک اہم سوال جس میں علماء سندھ کو بڑا اختلاف تھا محاکمہ کی غرض سے مع تحریرات علماء کے حضرت کے پاس بھیجا تو آپ نے اس کو مدلل طریق سے حل فرمایا اور وہ المغتنم فی ذکوٰۃ الغنیم کے نام سے طبع ہوا۔ اسی طرح ایک مسئلہ مذبوح فوق العقدہ کا آیا جس میں علماء کو بہت اختلاف تھا۔ آپ نے اس کا مدلل و مبسوط جواب لکھا جو فتاوٰے مدرسہ میں درج ہے[1] آپ کو جب تک شرح صدر نہ ہوجاتا اپنی جماعت کے بھی کسی مفتی کی رائے کا اتباع نہ فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت مولانا تھانوی کی رائے

---

[1] یہ رسالہ ارزاں قیمت پر سید شبیر محمد صاحب سے گھوٹکی ضلع سکھر (سندھ) کے پتہ پر مل سکتا ہے ۱۲ منہ

سے آپ نے بارہا اختلاف کیا مگر یہ اختلاف چونکہ عالمانہ رائے کا ہوتا تھا لہٰذا تعلق محبت و عظمت میں کچھ بھی فرق نہ آتا تھا۔ محمد حنیف بنارسی ریلوے ڈاک میں ملازم تھے کہ لکھنؤ میں قیام رہتا مگر ہر تیسرے دن لکھنؤ سے بنارس جانا پڑتا تھا نماز کے متعلق ان کا سوال ہوا کہ قصر کریں یا اتمام؟ تو آپ نے تحریر فرمایا "ریلوے ڈاک کے ملازمین ہمیشہ مسافر ہی رہیں گے محل اقامت پر جب تک پندرہ روز مسلسل کی نیت نہ ہوگی اس وقت تک نماز قصر پڑھیں گے۔

اسی طرح سفر شرعی کی مقدار کے متعلق آپ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک چھتیس ۳۶ کوس نہیں بلکہ چھتیس میل پر قصر ہو جاتا ہے لوگ چاہتے تھے کہ سب حضرات کی رائے ایک امر پر متفق ہو جائے۔ چنانچہ حاجی وجیہ الدین صاحب میرٹھی نے مختلف فتوے منگا کر حضرت کے پاس اس غرض سے بھیجے کہ حضرت جواب تحریر فرمائیں مگر حضرت نے لکھا کہ مسئلہ سفر کے متعلق روایات میں کوئی اختلاف نہیں صرف راویوں کا اختلاف ہے کہ قصر ایام کے نصف اقل میں متوسط رفتار والا مسلسل کتنا چل سکتا ہے۔ دوسرے حضرات کے نزدیک ۱۲ کوس ہوئے اور میرے نزدیک ۱۲ میل چنانچہ مشائخ حنفیہ میں بھی رائے کا اختلاف ہوا (کہ کسی نے ۵ فرسخ یومیہ لیا کسی نے ۶ فرسخ اور کسی نے ۷ فرسخ) اور باہم اتفاق نہ ہو سکا لہٰذا اتفاق رائے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ بلکہ اس کو مبتلا بہ کی رائے پر رکھنا چاہیئے کہ جو شخص سفر کرتا ہے اگر وہ اس کو تین منزل سمجھتا ہے تو قصر کرے اور اگر اس کے نزدیک تین منزل نہ ہو تو قصر نہ کرے۔

اور صاحب رائے نہ ہو تو میرے نزدیک اگر منازل معین ہوں تو ان کا اعتبار کرے ورنہ جس عالم سے عقیدت ہو اس پر عمل کرنا کافی سمجھے کہ بحمد اللہ سب فقیہ اور اہل حق ہیں اور ترجیح کے لئے اپنا میلان کافی ہے۔ واللہ اعلم

امداد الفتاوی مع تتمات میں کئی مسئلے حضرت کے محققانہ فیصلے کے مذکور ہیں جن میں چند حوالہ تحلیل کی توضیح میں صاحب المظاہر سہارنپور شائع کر چکے ہیں۔ فتوے یہ ہیں

اعتماد اور شرح صدر کا اہتمام حضرت میں اتنا غالب تھا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے فتوے میں بھی اس کے محتاج ہوتے تھے۔ پھر اگر موافقت و مخالفت دونوں میں شرح صدر نہ ہوا تب تو جواز کا فتوے نہ دینے میں حضرت ہی کی موافقت فرماتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ فرمایا کہ مامور بالحج کے لئے تمتع جائز نہیں اپنے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے اس فتوے میں مجھے شرح صدر نہیں ہوا بلکہ میں اذن آمر کے بعد اس کو جائز سمجھتا ہوں۔ مگر حضرت کے خلاف فتوے دینے کی جرأت نہیں ہوتی مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرتؒ کی رائے معلوم ہونے کے بعد اس خیال سے کہ مجھے اپنے شیخ کا اتباع کافی ہے تھانہ بھون میں اس کے جواز کا فتوے دیا مگر جب تصدیق کے لئے سہارنپور حضرت کے پاس آیا تو آپ نے اس کی تردید لکھی اور تحریر فرمایا کہ جواز کے جو دلائل مجیب نے لکھے وہ سب مخدوش ہیں" البتہ اگر خلاف آپ کو روایات فقہیہ سے محقق ہو جاتا تو پھر آپ اس کا اظہار ضروری سمجھتے اور یہ فرما کر کہ معصوم بجز رسول کے کوئی نہیں اتباع فقہاء کو اتباع شیخ پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ مقیم مقتدی کسی مسافر کے پیچھے دوسری رکعت میں شریک ہو تو کس طرح نماز پوری کرے؟ آیا دو رکعت سکوت سے اور ایک رکعت قراءت سے یا تینوں بالقراءت؟ جیسا کہ مقیم امام کے ساتھ چوتھی رکعت میں شریک ہونے والا اپنی تینوں چھوٹی ہوئی رکعات ادا کرتا۔ حضرت کو علم ثانی محقق ہوا اور آپ نے اس کو مدلل قلمبند فرما کر بھیجا یا اپنی جماعت کے تمام علماء پہلی رائے پر جمے ہوئے تھے لہذا اختلاف کیا اور یہ بھی لکھا کہ حضرت گنگوہی کی رائے بھی ہمارے موافق ہے۔ وہ فتوے پھر حضرت کے پاس آیا تو آپ نے دوبارہ مبسوط تحریر لکھی کہ مجھے بھی معلوم ہے ہمارے حضرت کی رائے اس کے خلاف تھی مگر کتب فقہیہ کی روایات جب صاف اور واضح ہیں تو پھر ان کو چھوڑا نہیں جا سکتا اور اس کا سبب یہ ہوا کہ اس مسئلہ کو جس نے دیکھا صلوۃ المسافرین میں دیکھا۔ حالانکہ یہ تحقیق مسبوق ولاحق کی بحث میں ہے جس پر مفتی کی نظر نہیں گئی۔ چنانچہ آپ اپنی رائے سے نہ ہٹے۔ ہاں حضرت مولانا رائے پوری نے ساری تحریر دیکھ کر حضرت سے موافقت فرمائی اور تحقیق حق سے نہایت

مسرور ہوئے۔ جھینگا مچھلی کے متعلق بھی آپ کی رائے تھی کہ مچھلی نام پڑ گیا، حقیقت میں وہ مچھلی نہیں کہ اس کے گلپھڑے نہیں ہوتے۔ لہٰذا آپ اس کو دریائی جانور سمجھتے اور حلت کا فتوےٰ نہ دیتے۔ مولانا حکیم مصطفےٰ صاحب بجنوری نے کہ علم الابدان و علم الادیان کے جامع ہیں ادویات کی حلت و حرمت کے حکم میں ایک رسالہ تالیف فرمایا۔ ستائیس[۲۷] سوال اس میں ایسے رہ گئے جن کو مولانا حل نہ کر سکے اور تھانہ بھون بھیجنے کی ضرورت ہوئی چند مسائل کا جواب حضرت مولانا نے دیا اور باقی کے متعلق فرما دیا کہ مولانا انور شاہ صاحب یا حضرت مولانا سہارنپوری سے حل کر و۔ حکیم صاحب دیوبند آئے اور شاہ صاحب کے سامنے سوالات پیش کئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا ایک مہینے سے کم میں جواب نہیں لکھ سکتا کہ بہت کتابوں کی طرف مراجعت کرنے کی ضرورت ہے حکیم صاحب کا رسالہ زیر طبع تھا عرض کیا کہ بہت حرج ہوگا۔ فرمایا پھر میں کیا کروں کہ اس سے کم میں جواب دینا مجھ سے ناممکن ہے۔ حکیم صاحب نے وہ سوالات حضرتؒ کی خدمت میں بھیجے اور عجلت کی درخواست لکھ دی تاہم حضرت کا ضعف بصر اور اشتغال کثیرہ کو دیکھتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ زیادہ حرج اوقات نہ فرمائیں تھوڑا تھوڑا کر کے کسی سے لکھوا دیں۔ مگر حضرت نے ان کو دیکھا تو ایک ہی مجلس میں سب کے جوابات لکھوا کر حکیم صاحب کے پاس بھیج دیئے۔ حکیم صاحب حیران ہو گئے اور اب تک فرمایا کرتے ہیں کہ ایسا متبحر فقیہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

اس کے بعد پانچ اہم مسائل اور لکھے کہ ان جواب بھی مرحمت فرمائیں تو اسی بے تکلفی و آسانی سے اُن کا جواب بھی لکھوا دیا کہ گویا پہلے سے مستحضر تھے۔ یہ جوابات مع دیگر فتاویٰ کے انشاء اللہ مستقل رسالہ میں طبع کیے جائیں گے۔

مدینہ منورہ میں آپ کے مخالفین نے جب شورش برپا کی تو وہاں سے ۲۷ سوالات عربی میں آئے اور جن مسائل میں علماء دیوبند کو متہم کیا جاتا ہے سب کی تحقیق و تفصیل دریافت کی تو آپ نے عربی میں مدلل جوابات لکھ کر بھیجے جو المہند کے نام سے طبع ہو کر مصر و شام و فلسطین بھی گئے اور بلاد اسلامیہ کے علماء کی اس پر تصدیقیں ہوئیں۔

جمعہ کی اذان خارج مسجد ہونے کا مسئلہ بریلی سے چلا تو آپ نے اس کا نہایت محققانہ جواب لکھا جو تنشیط الآذان کے نام سے طبع ہوا۔ کوئی اس کا جواب لکھا نہ دے سکا۔

فتوے لکھنے میں حضرت اکثر شامی ملاحظہ فرمایا کرتے مگر جس قول کے وہ ناقل ہوتے اس کو تو حضرت حجت سمجھتے اور جو صاحب شامی کی ذاتی رائے ہوتی اس کو حجت قرار نہ دیتے بلکہ تنقید و تحقیق کرتے اور فرمایا کرتے کہ یہ متاخرین ہیں ہم رجال و نحن رجال ان کی رائے ہم پر حجت نہیں جب تک کہ اسلاف کے قول سے مؤید نہ ہو۔

اوقات فراغ میں حضرت بدائع کو اکثر دیکھا کرتے۔ بارہا سنا ہے کہ حضرت اس کے مصنف کو بہت دعائیں دیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ واقعی یہ شخص فقیہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو فقہ ہی کے واسطے پیدا فرمایا تھا۔ مولوی ظفر احمد صاحب نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت فقہ سے مناسبت پیدا ہونے کی کوئی صورت ارشاد فرمائیں۔ فرمایا مفتیوں کی عادت یہ ہے کہ صرف استفتا آنے کے وقت کتابیں دیکھتے ہیں۔ اس سے کام نہیں چلتا اور جواب میں بہت غلطی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس وقت جلدی میں ایک جگہ کو دیکھ کر جواب لکھ دیتے ہیں حالانکہ دوسرے مقام میں اس مسئلہ کے اندر تفصیل معلوم ہوتی ہے جس سے اس واقعہ مسئولہ کا حکم بدل جاتا ہے۔ پس فقہ سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے شامی اور بدائع کو بالاستیعاب دیکھنا چاہیے۔ ہمارے حضرت گنگوہیؒ نے شامی کو کئی بار بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا ہے اس وقت تک بدائع مطبوع نہیں ہوئی تھی اب میں شامی کے ساتھ اس کے مطالعہ کو بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ حقیقت میں بدائع عجیب کتاب ہے۔ ایک بار فرمایا کہ جزئیات تو زیادہ شامی میں ہیں مگر اصول اور فقہ کی لم زیادہ بدائع میں کہ اس سے مناسبت ہو جاتی ہے تو فقہ میں طبیعت چلنے لگتی ہے۔

ایک بار آپ فتاویٰ مہدویہ مصریہ ملاحظہ فرما رہے تھے اس میں اتفاقاً یہ مسئلہ نظر سے گذرا کہ "دو ذمی مدعی و مدعا علیہ نے قاضی اہل الذمہ کی عدالت میں مرافعہ کیا اور اس نے فیصلہ دیا جو ایک فریق کو ناپسند ہوا۔ اس نے قاضی مسلم کی عدالت میں مرافعہ کیا

اور قاضی مسلم نے قاضی اہل الذمہ کے فیصلہ کو توڑ کر شریعت کے موافق فیصلہ کیا۔ اس کے متعلق علماء مصر سے استفتا کیا گیا کہ قاضی مسلم کا یہ فعل یعنی حکم سابق کا توڑنا صحیح تھا یا نہیں؟ ایک عالم نے جواب دیا کہ صحیح نہ تھا کیونکہ قاضی اہل الذمہ بھی سلطان کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہے لہذا اس کا فیصلہ اگر اہل الذمہ کے مذہب کے موافق صحیح تھا تو اس کا توڑنا اس کو جائز نہ تھا۔ دوسرے عالم نے جواب دیا کہ توڑنا صحیح تھا کیونکہ قاضی مسلم کے پاس جب مقدمہ آئے گا تو وہ شریعت اسلام کے موافق فیصلہ کرے گا اس کا محاکمہ علامہ مہدی مفتی مصر کے پاس بھیجا گیا کہ ان دونوں فتووں میں کونسا صحیح ہے؟ علامہ نے پہلے جواب کو رد کیا اور دوسرے کی تصویب کی! حضرت نے سارا قصہ سنا کر مولوی ظفر احمد سے فرمایا بتلاؤ ان میں کونسا جواب صحیح ہے؟ عرض کیا حضرت بظاہر وہی صحیح ہے جس کی علامہ مہدی نے تائید کی ہے۔ فرمایا نہیں علامہ نے محاکمہ صحیح نہیں کیا کیونکہ قاضی مسلم اہل ذمہ کے بارہ میں شریعت کے موافق فیصلہ اس وقت کر سکتا ہے جبکہ فریقین نے اس کی طرف مرافعہ کیا ہو۔ اور صورت مسئولہ میں فریقین نے مرافعہ نہیں کیا بلکہ صرف ایک فریق نے مقدمہ قاضی مسلم کے یہاں دائر کیا ہے جس کے خلاف قاضی ذمی نے فیصلہ کیا تھا۔ دوسرے فریق نے فیصلہ سابق سے ناگواری ظاہر نہیں کی بلکہ وہ اسی پر راضی ہے اور وہ قاضی مسلم کے پاس مقدمہ نہیں لایا۔ پس مرافعہ نہیں پایا گیا اس لئے قاضی ذمی کا فیصلہ منقوض نہیں ہو سکتا۔ لہذا جواب مجیب اول کا صحیح ہے مگر اس نے دلیل بیان کرنے میں غلطی کی۔ عدم جواز نقض کی یہ وجہ نہیں کہ قاضی ذمی مقرر کردہ منجانب سلطان ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ مرافعہ کا تحقق نہیں ہوا اور جواب ثانی غلط ہے البتہ مجیب ثانی کا یہ قول صحیح ہے کہ جب قاضی مسلم کی طرف اہل ذمہ مرافعہ کریں تو اس کو شریعت اسلامیہ کے موافق فیصلہ کرنا چاہیئے۔ مگر انہوں نے مرافعہ کی حقیقت میں غور نہیں کیا۔ مرافعہ کے یہ معنی نہیں کہ ایک فریق مقدمہ لے آئے بلکہ مدعی و مدعا علیہ دونوں کا اسلامی فیصلہ پر راضی ہو کر مقدمہ لانا شرط ہے [illegible] کہ مرافعہ و ترافع کا تحقق نہ ہوگا؛ اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے مسئلہ کا

جس میں علماء مصر کا باہم اختلاف ہوا اور مفتی اعظم کے پاس محاکمہ کے لیے بھیجا گیا ہو
ایک سرسری نظر میں اس طرح مدلل و مستحکم اور ایسی جلدی فیصلہ کر دینا کس شان تفقہ
کو ظاہر کر رہا ہے۔

عمل کے لیے اختلافی روایات میں ہمیشہ آپ احوط صورت کو ترجیح دیتے تھے
چنانچہ جب میرے بھتیجے نے قرآن مجید ختم کیا تو عمر چودہ سال کی تھی میں نے چاہا کہ
رواج کے موافق فقہاء مجوزین کی روایت پر اس کا قرآن مجید تراویح میں سنوں مگر
حضرت نے تحریر فرمایا "عالمگیریہ میں ہے و امامۃ الصبی العاقل فی التراویح والنوافل
المطلقۃ یجوز عند بعضہم ولا یجوز عند عامتہم کذا فی محیط السرخسی جبکہ اکثر
مشائخ عدم جواز امامت کا حکم فرما رہے ہیں تو مناسب نہیں ہے کہ ایسی عبادت
کے اندر جو سال بھر میں ایک ہی دفعہ آتی ہے قول ضعیف پر عمل کر کے راجح قول
کے موجب ضائع کیا جائے۔ لہذا اس سال بچے کا قرآن نوافل میں سن لیجیے سال
آئندہ میں اللہ خیر رکھے تراویح میں سن لیجیے گا۔ فقط والسلام حاجی شیخ رشید احمد صاحب
کے بچوں کے ختم قرآن پر آپ تشریف لائے تو اپنی تراویح علیحدہ پڑھیں ان کا
اقتدا نہیں کیا۔

بے سند اور بے دلیل بات آپ کو بہت گراں گذرتی تھی چنانچہ وہ اشتہار جو
فرمانِ مصطفوی کے نام سے بار بار جگہ جگہ شائع ہوتا ہے کہ خادم روضہ شیخ احمد کو
بشارت ہوئی کہ اتنے لاکھ میری امت میں مرے مگر بجز چند نفر کے سب کافر مرے
میری وصیت ہے کہ اعمال درست کریں کہ توبہ کا دروازہ بند ہونے والا ہے
اور مسکینوں کو چاول شکر کھلائیں اور یوں کریں یوں کریں۔ ہمیشہ آپ کو گراں
گذرا کہ توبہ اور اصلاح اعمال بیشک ضروری اور مسلمانوں کی حالتوں میں کمزوری
بھی مسلم مگر حضرت روحی فداہ کی طرف بے دلیل انتساب کرنے پر سخت وعید
آئی ہے اور شیخ احمد کا پتہ نہیں کوئی شخص ہے بھی یا نہیں مسلمانوں کو کیا ہو گیا کہ
بغیر تحقیق اس کو فرمانِ مصطفوی سمجھ کر لگے اشاعت کرنے اور کارِ ثواب سمجھنے۔ یہ

تو کسی یہودی یا غیر مسلم کی کارروائی ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام لانے سے روکنے کے لئے بنائے خود ہی مسلمان جب اتنے کافر ہیں تو غیر مسلم کس توقع پر اسلام قبول کرے۔ اور مسلمانوں کو وحشت دلاتا ہے کہ جب اسلام سے کوئی نفع ہی نہیں دنیا کا مزہ اور تنعم کیوں چھوڑا۔ یہ بات اگر صحیح بھی ہو مگر حضرت کی طرف سے منسوب ہونا اس کا صحیح نہ ہو تو اس کو حضرتؒ کی طرف منسوب کرنا حرام ہے اور ثواب سمجھ کر شائع کرنا تو بڑی ہی جرأت کی بات ہے۔ اخیر زمانہ میں جب آپ مدینہ منورہ میں مقیم تھے تو حافظ فخر الدین صاحب نے ایک اشتہار آپ کے پاس بھیجکر استفسار کیا کہ اس خواب کی کیا اصل ہے۔ تو آپ نے جواب لکھا کہ یہاں روضۂ اقدس کا خادم اس نام کا کوئی بھی نہیں اور تحقیق کر لیا کہ یہاں کسی شخص نے بھی ایسا خواب نہیں دیکھا اور نہ مدینہ منورہ کا کوئی شخص اس خواب یا قصہ سے واقف۔ یہ اشتہار قطعی بے بنیاد ہے اور اس کی بعض باتیں تو بالکل قابل اعتقاد نہیں۔ اس تحریر پر آپ نے علماء مدینہ کے دستخط بھی کرا دیئے اور حافظ صاحب کے پاس بھیجدیا کہ کوئی مانے یا نہ مانے مگر تبلیغ کا فرض ادا ہو جائے۔

اپنے کسی ذی علم خادم کو اگر حضرتؒ کی رائے سے خلاف ہوتا تو حضرت اس پر گرانی نہ لاتے اور عامیانہ تقلید میں اپنی موافقت پسند نہ فرماتے تھے بلکہ ان کو بلا کر گفتگو فرماتے۔ ایک بار کسی استفتا کا جواب حضرت نے لکھوا کر دستخطوں کے لئے مدرسین کے پاس بھیجدیا۔ مولوی ظفر احمد صاحب کو شرح صدر نہ ہوا اور دستخط نہ کئے۔ حضرت نے ان کو بلوایا اور فرمایا اپنا شبہ ظاہر کرو ممکن ہے ہم ہی غلطی پر ہوں۔ ایسا ہوا تو ہم رجوع کریں گے ورنہ تم موافق ہو جاؤ گے۔ عرض کیا کہ حضرت کے سامنے ہم جاہلوں کی ہستی کیا۔ اگر دستخط کا مفہوم چونکہ اظہارِ اطمینان ہے اور وہ حاصل نہ ہوا اس لئے میں نے عذر کر دیا تھا۔ فرمایا یہ تو عین مقصود ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ کوئی فتوے یہاں سے ایسا جائے جس پر اپنوں ہی میں سے کسی کو اطمینان نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے شبہ عرض کیا اور حضرت نے اس کا جواب دیا۔ دو تین بار پھر استدلال

کیئے اور حضرت جواب دیتے رہے حتیٰ کہ ان کو اطمینان ہو گیا اور جب دستخط کر دیئے تب حضرت نے فتوے روانہ کیا۔ مولوی ظفر نے عرض کیا کہ حضرت اس وقت تو تفقہ حضرت والا پر ختم ہے کہ حق تعالیٰ نے اسی کے لیئے حضرت کو پیدا فرمایا ہے بیساختہ فرمایا میاں ظفر یہ سب گنگوہ کی حاضری کی برکت اور اپنے حضرت کی جوتیوں کا صدقہ ہے اگر یہاں گنگوہ حاضر نہ ہوتا تو نہ معلوم کس کیفیت کا بھتوا ہوتا۔ اس کلمہ کا جو اثر مجھ پر ہوا بس میرا دل ہی جانتا ہے

باایں تفقہ آپ کو اپنے کسی کمال پر ناز نہ تھا اور نہ ضد تھی۔ ایک بار آپ تھانہ بھون گئے اور فساد صلوٰۃ محاذات النساء کے مسئلہ میں مولوی احمد حسن سنبھلی کا حضرت سے مکالمہ ہوا۔ حضرتؒ تو حنفیہ کے قول کو قوی فرما رہے تھے اور مولوی احمد حسن ضعیف حضرت نے فرمایا تم پہلے میری تقریر سن لو پھر جو کہنا ہے وہ کہنا مگر مولوی صاحب نے درمیان میں آپ کا کلام قطع کرنا شروع کر دیا حضرت کو تکدر ہوا اور لہجہ میں تیزی آ گئی مولوی احمد حسن بھی تیزی پر آ گئے۔ تب آپ نے تحمل کیا اور خاموش ہو گئے۔ جب آپ ریل پر آنے لگے تو آپ نے خود ابتدا بالسلام کی اور مصافحہ کے لیئے ہاتھ بڑھا کر فرمایا اگر مجھ سے گستاخی آپ کی شان میں ہو گئی ہو تو معاف فرما دینا۔ ان بندۂ خدا نے اس پر بھی کوئی معذرت نہیں کی۔

ایک بار آپ ٹونک تشریف لے گئے اور بندہ ہمراہ تھا چند اہل حدیث ملنے آئے اور ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا۔ حضرت نے مصافحہ میں حسب عادت دونوں ہاتھ بڑھائے اور مسکرا کر فرمایا کہ مصافحہ اس طرح ہونا چاہیئے وہ بولے حدیث میں ہے صحابی کہتے ہیں وکان یدی فی یدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا ہاتھ حضرت کے دونوں ہاتھوں میں تھا آپ نے بیساختہ فرمایا پھر متبع ہم ہوئے یا تم؟ آنحضرت کے ہوتے ہوئے صحابی کے اتباع کی ضرورت؟

ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت آنکھ بند کر کے نماز پڑھنا مکروہ ہے لیکن بغیر آنکھ بند کیئے یکسوئی نہیں ہوتی۔ فرمایا شروع سے آخیر تک تمام نماز میں آنکھ بند رکھنا مکروہ ہے اور کبھی آنکھ بند کر لینا کبھی کھول لینا مکروہ نہیں آپ روضۂ مسجد نبوی میں

حجاز کے قاضی القضاۃ ابن بلیہد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سلطان عبدالعزیز ان کے برابر۔ اس زمانہ میں جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کے ساتھ لفظ سیدنا استعمال کرتا۔ نجدی لوگ اس کو مشرک کہتے اور چار طرف حرم نبوی میں یہی صدا کان میں پڑتی تھی۔ حضرت نے موقع غنیمت پاکر قاضی صاحب سے سوال فرمایا کہ آپ لفظ سیدنا کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ قاضی صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کیا اور پھر فرمایا کہ حدیث میں کہیں نہیں آیا۔ حضرت نے جواباً فرمایا کہ ہاں حدیث میں آیا ہے۔ قاضی صاحب نے ہمہ تن گوش ہو کر حیرت کے ساتھ پوچھا کہاں آیا ہے آپ نے فرمایا انا سید ولد آدم ولا فخر قاضی صاحب نے کہا ہاں اس طرح تو آیا مگر نام مبارک کے ساتھ کہیں نہیں آیا۔ حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کے ساتھ جو تعالیٰ لگاتے ہیں کہیں قرآن شریف میں آیا ہے؟ قاضی صاحب نے کہا نہیں قرآن شریف میں کہیں نہیں آیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کون کہا کرتا ہے کہ ہمارے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ استعمال کرو۔ ایک جگہ حدیث میں آگیا کافی ہے۔ سلطان اس مکالمہ کو بغور سن رہے تھے۔ اب انہوں نے قاضی صاحب سے سوال کیا کہ کہیں اس لفظ کی ممانعت آئی ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا ممانعت نہیں آئی سلطان نے فرمایا کہ ایک جگہ آگیا اور ممانعت کہیں آئی نہیں تو اس پر تشدد کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت کی قاضی صاحب اور سلطان سے یہ پہلی ملاقات تھی جس میں حضرت نے اپنا حق ادا کیا۔ اگلے دن نجدیوں میں حضرت کی گفتگو کا شور برپا رہا اور پھر مشرک کی صدا کبھی کان میں نہ آئی۔ سلطان عموماً عصر کی نماز میں شریک ہوتے اور اسی جگہ بیٹھا کرتے جو حضرت کا شروع سے بیٹھنے کا مقام تھا۔ اس قصہ کے بعد قاضی ابن بلیہد کے دل میں حضرت کے تبحر و تقویٰ کا ایک خاص احترام پیدا ہو گیا کہ اکثر مسائل میں حضرت سے مراجعت کرتے اور اپنے اساتذہ کے مثل حضرت کا ادب فرماتے تھے۔ کبھی حضرت کے مکان پر بھی تشریف لاتے اور دیر تک علمی مکالمہ ہوتا تھا۔

سلطان کی تشریف آوری سے قبل ایک قصہ یہ پیش آچکا تھا کہ شافعی امام نے

صبح کی نماز میں سجدۂ تلاوت پڑھ کر رکوع کر دیا کہ یہی قائم مقام سجدہ کے ہے سلام پھیرنے کے بعد حضرت نے امام صاحب سے فرمایا کہ یہ سجدہ ہم حنفیوں کے یہاں واجب ہے اور رکوع سے جبتک کہ اس کو سجدہ کے قائم مقام بنانے کی نیت نہ کرے ادا نہیں ہوتا اور بہتیروں کو معلوم بھی نہیں کہ یہاں سجدہ کرنا ہے اور یہ آیت سجدہ ہے لہذا احناف کے مذہب کی رعایت آپ پر واجب ہے۔ امام نے روکھا جواب دے دیا کہ ہم پر کسی کے مذہب کی رعایت واجب نہیں ہم اپنے مذہب کے موافق عمل کریں گے حضرت نے فرمایا ایسا ہے تو آپ کے پیچھے ہماری نماز نہیں ہوتی اور حضرت نے اعلان فرما دیا کہ جس شخص نے رکوع میں سجدہ کی نیت نہ کی ہو وہ اپنی نماز دوبارہ پڑھے چنانچہ بہتیروں نے نمازیں لوٹائیں۔ اس کے بعد حضرت نے مدرسہ میں اپنی علیحدہ جماعت کا اہتمام کر لیا۔ حکومت کو اس کی خبر ہوئی تو امام سے باز پرس کی اور سوء ادب پر زجر کیا اور یہ الفاظ کہے کہ حضرت کے مقابلہ میں تمہارے علم کی حقیقت ہی کیا ہے اس کے بعد تمام ائمہ کے نام حکم جاری ہوا کہ جملہ مذاہب کی رعایت کرتے ہوئے نماز پڑھائیں اور حضرت سے معذرت کی اور اطمینان دلایا کہ آئندہ ایسا نہ ہو گا۔ چنانچہ آپ پھر حرم شریف میں جانے لگے۔

خود سلطان کے دل پر بھی حضرت کے تقدس کا اثر پڑ چکا تھا۔ ایک بار سلطان نے فرمایا حضرت کبھی مکان پر تشریف نہیں لاتے؟ فرمایا میری عمر اتنی مسافت پیدل قطع کرنے کی متحمل نہیں ہوتی۔ سلطان نے فرمایا جب حضرت ارشاد فرمائیں موٹر حاضر ہو جایا کرے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ پیدل چلنے سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ سوال کروں اور موٹر کے انتظار میں بیٹھا رہوں۔ تاہم ایک مرتبہ سلطان نے حضرت کو مدعو کیا اور حضرت تشریف لے گئے۔ سلطان سے فرمایا کہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے سلطان ہمہ تن گوش ہو گئے کہ فرمائیے۔ فرمایا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جمرک کے محصول کا جواز آپ کے ہاں کس دلیل سے ہے کہ شریعت تو تمام مکوس کو ظلم بتاتی ہے۔

سلطان نے سکوت کیا اور پھر جواب دیا کہ حضرت جواز کسی طرح نہیں مگر مصارفِ سلطنت آخر کس طرح نکلیں اور حجاز میں تو آمدنی کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا بس میرا مطلب حل ہو گیا اب ملکی معاملات سے مجھے بحث نہیں نہ میں ان کے سمجھنے کا اہل ہوں۔

حضرت کو امرا اور حکام سے ملاقات میں طبعاً وحشت ہوتی تھی۔ لیکن اگر ملنا ہوا تو نہ حضرت کبھی مرعوب ہوئے نہ لچکے نہ امر بالمعروف سے چوکے اور نہ دینی نفع اٹھائے بغیر رہے۔ آپ چاہتے تو بھوپال بہاولپور اور حیدر آباد سے وظائف کا تقرر کچھ بھی دشوار نہ تھا۔ خطاب یا عہدہ کا وسوسہ تو کیا ہوتا بڑوں کی کسی ملاقات سے آپ نے دنیا کا قلیل فائدہ اٹھانا بھی کبھی گوارا نہیں کیا۔ ویسی ملاقات میں آپ کا مطمح نظر ہمیشہ دینی پہلو رہا خواہ مدرسہ کی اعانت یا مضرتِ اسلام و مسلمین کا دفع۔ یا شرعی غلطی کی اصلاح اور مردہ سنت کا احیا جس کے لئے حضرت کی طبیعت صرف موقع کی منتظر اور ہر وقت چشم براہ رہتی تھی۔ ایک مرتبہ قاضی ابن بلیہد آپ کو ہاتھ پکڑ کر اپنی قیامگاہ پر لے گئے مختلف باتیں ہوتی رہیں جب انبساط تام ہو گیا تو حضرت نے فرمایا قاضی صاحب مسجد مبارک میں جمعہ کی پہلی اذان کے بعد متصل ہی دوسری اذان خطبہ کی شروع ہو کر خطبہ شروع ہو جاتا ہے۔ جمعہ کی سنتیں پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ مالکی اور حنبلی حضرات ان سنتوں کو ضروری نہیں سمجھتے مگر ہم احناف کے نزدیک تو موکدہ ہیں۔ قاضی صاحب نے یہ سنکر حضرت سے پوچھا کہ کس قدر فصل کافی ہے؟ حضرت نے فرمایا دس منٹ قاضی صاحب نے نائب الحرم کو جو وہاں اتفاق سے موجود تھے حکم دیا کہ پہلی اور دوسری اذان میں دس منٹ کا فصل کیا جائے اتفاق سے اگلے ہی روز جمعہ تھا اور نائب الحرم اس حکم کو باقاعدہ جاری نہ کر سکے مگر جب پہلی اذان ہو چکی تو خطیب کو منبر پر جانے سے ذرا ٹھہرائے رکھا اور حضرت کو دیکھتے رہے جب حضرت نے چار سنتیں حسب عادت پورے اطمینان سے ادا کر لیں تب خطیب کو خطبہ کے لئے روانہ کیا اور دوسرے جمعہ سے باقاعدہ اس حکم کا اجراء ہو گیا کہ سنتیں پڑھنے والے بڑے سکون سے

قبل الخطبہ سنتیں پڑھنے لگے۔

ایسی جلوت اور اُمراء کی ملاقات پر ہزار خلوت و گوشہ نشینی قربان کہ ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ مگر اللہ کی شان کہ اس کی مخلوق میں ایسے بھی سطحی نظر والے تعداد میں زیادہ ہیں جو ہنر کو عیب بتاتے ہیں حالانکہ آپ ٹکوں کی خاطر اگر ایسے تو کیا، ملتے آپ کی دقیق نظر نے تو مخلصین کے ہدایا اور تحائف میں پس و پیش کا خلفشار قائم رکھا اور ذرا شُبہ ہوا تو رد فرما دیا۔ یہ آخری زمانہ اور مدینہ منورہ کا قیام کہ ہند سے جانے والے مخلصین نذر پیش کرتے مگر آپ اکثر انکار فرما دیتے اور کہا کرتے تھے کہ میں کوئی ایسا ہدیہ قبول نہیں کرتا جس سے اہل مدینہ کے نقصان یا حق تلفی کا اندیشہ ہو۔ لہٰذا کوئی کچھ نذر کرتا تو فرماتے مجھے ضرورت نہیں کہ بحمد اللہ کوئی حاجت بند نہیں اس پر بھی اس کا اصرار ہوتا تو آپ اپنے دل کو ٹٹولا کرتے تھے کہ جو رقم آپ کو ہدیہ میں دی جا رہی ہے اگر میں نہ لوں تو اہل مدینہ کو دی جائے گی یا واپس جائے گی۔ در صورت اول آپ اس کو اہل مدینہ کا حق سمجھ کر ہاتھ روک لیتے تھے کہ اہل مدینہ کی نقصان رسانی ہمسایان رسول کو ایذا پہنچانے کے حکم میں ہے۔ ہاں جس رقم میں اطمینان ہوتا کہ اہل مدینہ کو جو دینا تھا وہ دے چکے اور اب میں نے نہ لیا تو دلشکنی کے ساتھ گھر واپس لے جائیں گے تو اس کو قبول فرما لیا کرتے تھے۔ اللہ رے نظر باوجود خود مدنی بن جانے کے ہمسایگان محبوب کی اتنی رعایت ؎

کشند از برائے دلے بار ہا — خورند از برائے گلے خار ہا

مدینہ منورہ میں شویل نامی ایک مصری عالم مالکی المذہب بیس گنی تنخواہ پر دکیل قاضی تھے جو زائرین کو بہت تنگ کرتے تھے کہ جہاں کسی نے دوسری جماعت کی جھٹ اس کو حوالات بھیجدیا۔ ایک مرتبہ قاضی القضاۃ کے مکان پر حضرت نے ان سے فرمایا کہ جماعت ثانیہ کو ہم بھی مکروہ کہتے اور سمجھتے ہیں مگر جب شوافع کے یہاں اس کا جواز ہے تو اس قدر سختی مناسب نہیں کہ آخر صاحب مذہب ہیں یہ تو ظلم ہوا۔ مدینہ منورہ ہی میں ایک شافعی حاجی مقیم تھے جن کا ارادہ دوسرا حج کرنے کے بعد وطن جانے کا

تھا، شامی شافعی المذہب تھے اور حضرت کے ساتھ ان کو محبت ہو گئی تھی کہ اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دن عصر کی نماز سے فراغت کے بعد حضرتؒ حرم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ شوَیل صاحب نے اس شامی حاجی کو کشاں کشاں لاکر حضرتؒ کے سامنے کھڑا کر دیا اور کہا کہ اس نے دوسرا اسلام امام سے پہلے پھیر دیا جب اس کو منع کیا تو اس نے کہا میں نے تو حضرت کو ایسا کرتے دیکھا ہے کیا آپ ایسا کرتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا ہاں عمر کر سکتے ہیں۔ شامی غریب کا تو پیچھا چھوٹ گیا۔ شوَیل نے کہا کہ نماز کا امام حنبلی تھا اور حنابلہ کے یہاں دوسرا اسلام بھی واجب ہے حضرتؒ نے فرمایا کہ حنفی ہو یا شافعی ہم نے امام کا اقتدار کیا ہے نہ کہ تقلید۔ اس کے بعد حضرت نے پوچھا اور تمہارے مذہب میں کیا ہے؟ کیا ہمارے مذہب میں تو ایک ہی قول ہے کہ امام سے پہلے اگر دوسرا اسلام پھیر دیا تو نماز فاسد ہو گئی دوسرا قول ہی نہیں حضرت نے فرمایا اصول کے بالکل خلاف ہے میں دوسرے علماء سے استفسار کروں گا کہا جس سے جی چاہے پوچھ لیجئے یہ ایک ہی قول ہے حضرتؒ اپنی جگہ سے اُٹھے اور مولانا الفا ہاشم عالم مالکی کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے طلبہ میں بیٹھ گئے مولانا اپنی مسند سے کھڑے ہو گئے اور حضرتؒ کو اس پر بٹھانا چاہا۔ حضرت نے فرمایا میں سائل ہو کر آیا ہوں اور سائل کے بیٹھنے کی جگہ یہی ہے۔ مولانا بھی مسند چھوڑ کر برابر آ بیٹھے حضرتؒ نے مسئلہ پوچھا کہ اس بارے میں آپ کے مذہب میں کیا حکم ہے جواب دیا کہ نماز تو فاسد نہیں ہوئی البتہ اساءت ہوئی کہ ایسا کرنا نہ چاہئے تھا۔ حضرتؒ نے فرمایا مجھے کتاب میں دکھا دو وہاں کتاب موجود نہ تھی ایک طالب علم کو حکم دیا کہ گھر سے فلاں کتاب لے آؤ۔ اس کے بعد خود ہی مکان پر گئے اور کتاب لے کر تشریف لائے اور مسئلہ نکال کر حضرت کے پیش کیا حضرت کتاب لے کر اٹھے کہ مولانا شیخ عمری تشریف لے آئے حضرت نے ان سے بھی یہ مسئلہ دریافت فرمایا اور انہوں نے بھی مولانا الفا ہاشم کے مثل جواب دیا حضرت کتاب سیدت

تذکرۃ الرشید جلد اول ص۱۷۹ میں یہ مسئلہ غلط لکھا گیا صحیح یہ ہے کہ جو یہاں مذکور ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی عاشق الٰہی۔

مکان تشریف لے آئے اور اپنے دارالتصنیف میں رونق افروز ہوئے کہ ذرا دیر بعد مولوی شویل ایک رسالہ لئے ہوئے آئے۔ حضرتؒ کو اطلاع کی گئی اور حضرت نے ان کو وہیں بلا لیا حضرت نے کتاب کھول کر وہ مسئلہ دکھایا اور دونوں علماء کا قول نقل فرمایا۔ مولوی شویل غیظ میں بھر گئے اور غصہ میں سُرخ ہو کر کہا واللہ عمری[ع] اجہل من بعلی اور اپنا رسالہ لے کر وہاں سے چل دیئے۔ دو تین روز گذر لیئے اور اس کے بعد مولوی شویل حضرت کے پاس آکر بیٹھے تو حضرت نے نہایت نرمی سے فرمایا ایک مسئلہ دریافت طلب ہے ایک شخص نے قسم کھائی واللہ فلاں اجہل من بعلی وہ بعد الحلف حانث ہوا اور کفارہ واجب ہوا یا نہیں؟ مولوی شویل اپنا مقولہ بھول گئے ہوں گے کہ بیساختہ بولے ہاں حضرت وہ تو حانث ہو گیا۔ اتنا کہتے ہی ان کو اپنا مقولہ یاد آیا اور سمجھے کہ اپنی زبان سے اپنے اوپر حجت قائم ہو گئی تو لگے تاویلات کرنے اور غضبناک ہو کر جہالت پر اتر آئے۔ حضرتؒ نے تحمل فرمایا اور خاموش ہو کر سب کچھ سُنا اور اس کے بعد وہاں سے اُٹھ کر رفقاء سے کہا کہ اب روضۂ شریفہ میں جھگڑا ہونے لگا اس لیئے آئندہ محراب سلیمانی میں نماز پڑھا کریں گے۔ چنانچہ مغرب کی نماز محراب سلیمانی میں پڑھی۔ عشاء کے وقت آفندی صاحب مدیر حرم جو مولوی شویل کے محکمہ کے تھے حضرتؒ کے پاس آئے اور کہا کہ حضرتؒ کو کس نے ایذا دی جو روضہ میں نماز پڑھنا ترک فرمایا۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا تو میں اس کا خصم بنتا حضرتؒ نے فرمایا مجھے کسی نے ایذا نہیں دی۔ روضہ میں زائرین کا اژدحام ہونے لگا اور میں زحمت کا متحمل نہیں ہو سکتا...... اس لیئے یہاں نماز پڑھنے لگا۔ غرض آپ نے فتنہ کو دبا دیا مگر خدائی شان کہ مولوی شویل اپنے عہدہ سے معزول ہو گئے اور کم گنی پر تنزل ہو کر مدرس حرم بنا دیئے گئے۔

ع بخدا عمری میرے تجربے سے بھی زیادہ جاہل ہے ۱۲ مولانا شیخ عمری مالکی نے کہ حرم نبوی کے مدرس تھے تبرکاً حضرتؒ سے ابوداؤد شروع کی اور بقیہ اوائل سنا کر اجازت لی۔

یہ چند واقعات ہیں جن سے حضرتؒ کی حدیث و فقہ کے متعلق وسعت نظر اخلاص بے نفسی تبحر تواضع حلم ارشاد توافق اور اظہار کلمۃ الحق والنصح للمسلمین کا محض نمونہ کے ذخیرہ میں اظہار کیا گیا ہے ورنہ عمر شریف کے فقہی و علمی ان گنت قصے جو گویا ہر لمحہ نئی صورت میں پیش آتے تھے نہ کسی کو مستحضر اور نہ کسی کی طاقت کہ تقریر یا تحریر میں لا سکے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ حضرتؒ نے کبھی غلطی نہیں کی کیونکہ نہ میں حضرت کو معصوم سمجھتا ہوں نہ بے خطا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ حضرتؒ کا وجود باوجود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے باغ میں اپنے زمانے انداز کا ایک ایسا پُر اثمار شجر تھا جس کا جڑ سے لے کر پھلنگ تک ہر جزو کارآمد اور ہر موسم کے مناسب مختلف منفعت تھا۔ آپ حنفی تھے مگر مجتہدانہ شان رکھتے اور یوں فرمایا کرتے تھے کہ اللہ نور سے بھر دے امام ابو حنیفہؒ کی قبر کو کہ بڑا کام کر گئے اور فرمایا کرتے کہ احناف کی ہر جزئی مجھے آفتاب کی طرح روشن نظر آتی ہے۔ اور فرمایا کرتے کہ امام اعظمؒ درحقیقت اعظم ہی ہیں اور ان کی ذکاوت حسن ادب اور وقت استنباط تک بڑے بڑوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اور فرمایا کرتے کہ ائمہ مسئلہ کی ظاہری صورت پر کوئی اہل حدیث بن جائے یا غیر مقلد۔ مگر آگے چلکر حضرت امام کا خوشہ چیں بنے بغیر کسی کو بھی چارہ نہ ہوا۔ اور فرمایا کرتے کہ اشرف العلوم حدیث اور فقہ ہے کہ نجات کا مدار عمل پر ہے اور عمل کا مدار ان دو پر اور فرمایا کرتے کہ حق تعالیٰ کو دھوکا یا غلطی نہیں ہو سکتی کہ نا اہل کو اپنے محبوب کی امت کا مقتدا بنا دے اور تمام صلحاء دنیا کے قلوب میں ایسے کی عظمت ڈال دے جو اہلیت نہ رکھتا ہو۔ اور فرمایا کرتے کہ حدیث دانی محض الفاظ کے ترجمہ کا نام نہیں بلکہ اس کے لئے تمام علوم و فنون کی مہارت کے بعد ایک وہبی حذاقت درکار ہے جس کو تفقہ کہتے ہیں اور اسی نعمت الہیہ نے فقہ کو شرح حدیث بنا کر دریائے ناپیدا کنار بنا دیا کہ ضخیم کتابیں مدون ہو چکیں اور جب دیکھو اختلاف کے لئے اس کی ضرورت قائم رہی۔ واللہ دراالقائل ؎

گر مصور صورت آں دلستان خواہد کشید لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

صورت وسیرت اور عادات ومعمولات

حضرتؒ کو حق تعالیٰ نے حسن سیرت کے ساتھ بے نظیر حسن صورت بھی عطا فرمایا تھا کہ قد طول کی طرف مائل رنگ صاف جس میں سرخی جھلکتی تھی بدن دُبلا اور چھریرا نہایت نرم اور نازک۔ آپ مصافحہ فرماتے تو معلوم ہوتا کہ ریشمی کمخواب ہاتھوں میں داب لیا ہے اور معانقہ کرتے تو گویا نرم و نازک روئی نے چھاتی سے لگا لیا۔ آپ کا چہرہ بدر کی طرح چمکتا اور بلا مبالغہ ایک تازہ گلاب کا پھول معلوم ہوتا تھا۔ آپ کے بدن کا ہر عضو متناسب تھا اور کسی جزو کے متعلق بھی حسن شناس کو حرف گیری کا موقع نہ تھا آپ خندہ پیشانی تھے اور ہر وقت آپ کے دہن پر مسکراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ آواز آپ کی نہایت پیاری اور مردانہ تھی۔ گو ضعف پیری کے سبب اس میں رعشہ اور خفیف لرزہ تھا مگر تقریر بے تکان اور مسلسل ہوتی تھی۔ کوئی مضمون آپ ادا فرماتے تو مقدمہ اور تمہید کے ادا و دلنشین کرتے اور پھر مافی الضمیر ادا فرمایا کرتے۔ آپ کی صاف گوئی مشہور تھی کہ حبیب بات بے لاگ لپیٹ بات کہتے تھے اسی وجہ سے جن لوگوں کو آپ سے زیادہ سابقہ نہیں پڑتا تھا وہ اینٹھتے اور گھبراتے تھے مگر جو حضرات اس خوبی و کمال کے قدر شناس تھے وہ آپ کے شیدا تھے۔

اور آپ کی صاف گوئی پر ان کا رواں رواں کھلا جاتا تھا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ کی وفات کے متصل ہی مولوی محمد احمد کرسونی کا ایک خط آیا جس میں انہوں نے اپنا صدمہ ظاہر کیا کہ مولوی (......) صاحب یہاں تشریف لائے تو ہم پیر بھائی سمجھ کر شوق میں بھرا ہوا سخت گرمی اور لُو کی دوپہر میں دو میل مسافت قطع کر کے ان کی قیامگاہ پر پہنچا مگر میری کمر ٹوٹ گئی جب میں نے ان کے دربان سے یہ جواب سنا کہ حضرت آرام فرما رہے ہیں۔ شام کو آنا۔ حضرتؒ کے پاس

پر بہت صدمہ ہوا اور ان کو تسلی کا خط لکھدیا۔ مگر اتفاق کی بات کہ چند ہی روز بعد مولوی (.....) صاحب گنگوہ سے واپس ہوتے ہوئے آپ کی زیارت کے لئے مدرسہ میں آگئے حسب عادت مسکرا کر اور معانقہ فرما کر آپ نے ان کو اپنے پاس بٹھا لیا اور پہلی بات جو آپ کی زبان مبارک سے نکلی وہ یہ تھی کہ مجھے تم سے رنج پہنچا اور وہ یہ کہ مولوی احمد کرسوی محض اللہ واسطے اپنے پیر کی تم کو نشانی سمجھکر ملنے کے لئے سخت لُوہیں دو میل چلکر تمہاری قیام گاہ پر آئے اور تمہارے اس طرز نے کہ دروازے پر دربان رکھتے ہو ان کو تم تک پہنچنے نہ دیا۔ بھلا کیا جواب دوگے حق تعالیٰ کو جب سوال ہوگا کہ ہمارے رسول کے دروازے پر دربان نہ تھا تم نے یہ طریق کہاں سے اختیار کیا؟
مولوی صاحب نے جواب دیا کہ حضرت مجھے تو کچھ معلوم نہیں کون مولوی محمد احمد اور کیسا ان کا آنا۔ فرمایا ہاں یہی تو سوال ہے کہ جب دربان تعینات ہے تو آنے والے کا علم کس طرح ہو؟ مولانا نے فرمایا کہ حضرت یہ بات ہے ہر کہ ومہ سے ملنے پر قلب ظلمت کا اثر لیتا ہے اور اپنے رنگ میں تغیر آتا ہے۔
اس پر حضرتؒ کا غصہ تیز ہوگیا۔ پیشانی پر رگ کھڑی ہوگئی آواز میں رعشہ پڑگیا اور آپ نے فرمایا جو سمجھے ہیں جائے وہ رنگ جو رسول کے خلاف ہو، نہ معلوم وہ کون نار ہے جس کو نور سمجھ بیٹھے اور وہ مسلمان سے ملنے پر متغیر ہوتی ہے۔
میاں طالب ومعتقد بن کر کافر بھی آئے تو اس کو عزت سے لینا چاہیئے اور مسلمان تو وہ چیز ہے جس کی دلداری پر ثقلین بھی قربان حضوصاً ذاکر شاغل مسلمان ہمیں تو ہر وقت اس توقع میں رہنا چاہیئے کہ خدا نہ نے کس آنے والے مسلمان کی بدولت بیڑا پار ہو جائے نہ یہ کہ اپنے کو نورانی سمجھ کر دنیادار پیروں کا سا طریقہ لے لیں اور بدنام کریں حضرت گنگوہیؒ کے مشرب کو۔ بھائی تم ناراض تو ہوگے مگر مجھے یہ طریق پسند نہیں اور برا مانو یا بھلا یہ رنگ تمہارا سنت کے خلاف ہے اور شیطانی دھوکا ہے جو نہایت خطرناک ہے مجھ پر حق تھا اس لئے

متنبہ کر دیا کہ اب تم جاؤ تمہارا کام مولوی صاحب کو حضرت کی صاف گوئی اس
وقت گراں ضرور گذری کہ خاموش ہو کر چلے گئے مگر متاثر ضرور
ہوئے کہ دوسرے موقع پر حاضر ہو کر حضرتؒ کا ملبوس بغرض تبرک طلب کیا
اور حضرت نے سروال مبارک ان کے حوالے فرما دی۔

ایک مرتبہ بابو غلام محمد صاحب صابری سب پوسٹ ماسٹر پشاور آئے
جو پنجاب کے تمام ڈاک تھانہ والوں کی کانفرنس کے سیکرٹری تھے اور انہوں
نے اپنی کارکردگی جس سے ملازمین ڈاک خانہ کو طرح طرح کا نفع پہنچا یا دلچسپ
طریقہ سے بیان کی۔ حضرت اس کو سنتے رہے اور مسکرا کر دعا دی اس کے بعد
فرمایا بھائی حصول دنیا کے لئے تو اس قدر ٹھیک ہو کہ کچھ ٹھکانا نہیں مگر کچھ
دوسرا بھی خیال ہے کہ مرنے کے بعد کہاں جانا ہے ذرا ادھر بھی رغبت بڑھاؤ
کبھی غور بھی کیا کہ نام تو غلام محمد اور داڑھی کا صفایا۔ اس کے بعد دیر تک مزاح
وانبساط ہی کے درجہ میں آپ نے بہت کچھ نصائح فرمائیں۔ آپ عوام کی جہالتوں
کا بہت تحمل فرماتے تھے مگر ان کی خلاف تہذیب حرکت پر نرمی سے تنبیہ بھی فرماتے
کہ دیکھو ایسا نہیں کیا کرتے۔ ہاں اہل علم کی غلطیوں پر ترشی کے ساتھ اظہار
نفرت فرمایا کرتے تھے۔ اکثر آپ کا طرز نصیحت نرم اور مزاح آمیز ہوا
کرتا تھا۔ شملہ میں نائب پیش امام نے بعد نماز مسجد کی پالش کی نفاست و
عمدگی کا ذکر کر کے حضرتؒ کو اس کا معائنہ کرایا خوشی خوشی پالش پر ہاتھ پھیرتے
اور تعریف کرتے جاتے تھے حضرت نے نہایت متانت سے فرمایا پالش تو
بہت اچھی ہے مگر یہ تو بتلاؤ کہ یہ زیبائش جائز ہے یا نہیں؟ اور پھر یہ
سب چندہ جمع کر کے کی گئی ہوگی۔ بھلا چندہ دہندگان سے ایسا کرنے کی اجازت
بھی ان سے لی گئی تھی یا نہیں نائب صاحب اور تمام نمازی دنگ رہ گئے۔ ذرا
ذرا دیر کے بعد نائب صاحب نے فرمایا حضرت یہ تو پیش امام جانیں۔ فرمایا واہ کیا
خوب آرائش کی تعریف تو آپ کریں اور جواب دیں مولوی صاحب [illegible]

دھوتا کرے اور دادا جی بھرے"

حضرت کا معمول اخیر شب میں دس یا بارہ رکعتیں اور ان میں تقریباً دو پارے تلاوت فرمانے کا تھا۔ اس کے بعد آپ چارپائی پر داہنی کروٹ لیٹ جاتے اور کوئی پاس ہوتا تو اس سے باتیں کرنے لگتے تھے۔ آخر میں چائے پینے کا معمول بھی اسی وقت ہو گیا تھا۔ فجر ہوتے ہی دو سنتیں پڑھکر مدرسہ میں تشریف لاتے اور حجرہ کے قریب دیوار سے لگ کر خاموش بیٹھ جاتے۔ مہمان اور خدام بھی حاضر ہو جاتے اور سکوت کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ یہ مجلس عجیب پُرانوار ہوتی تھی کہ قلب مبارک سے بقعہ ہائے نور نکل کر اہل مجلس کو ڈھانپتے اور سکینہ و رحمت الٰہیہ کی ٹھنڈی پھوار سب پر برسا کرتی تھی۔ کوئی ضروری بات ہوتی تو حضرت مختصر لفظوں میں فرما دیا کرتے ورنہ یہ پندرہ بیس منٹ خالص سکوت میں گذرتے اور جب اسفار ہو جاتا تو آپ مسجد میں پہلی صف اور یمین امام اختیار فرما کر نماز ادا کرتے صحیح اور صاف پڑھنے والا امام آپ کو پسند تھا اور اس لئے اکثر قاری ہی امام کو آپ امام تجویز فرمایا کرتے تھے۔ شروع میں مولانا عبداللطیف صاحب امام رہے اور پھر مولانا ظفر احمد صاحب قاری عبدالعزیز صاحب وغیرہ اور آخیر میں قاری سعید احمد۔ باہر کہیں تشریف لے جاتے تو خدام کے اصرار پر کبھی آپ خود امامت فرما لیا کرتے ورنہ اکثر مقتدی بنتے اور ضعف دماغ و رعشہ صوت کا عذر فرما دیا کرتے تھے۔ مولوی عبداللہ جان صاحب لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت میری عیادت کے لئے میرے وطن لدھیانہ میں تشریف لائے۔ حافظ عبداللطیف صاحب ہمراہ تھے۔ میرے اہل وطن نے یہ سنکر کہ حضرت میرے پیر ہیں حضرت سے التجا کی کہ نماز میں امامت آپ فرمائیں حضرت نے فی البدیہہ جواب دیکر کہ یہ (یعنی حافظ صاحب) تو سہارنپور میں بھی میرے امام ہیں۔ حافظ صاحب کو آگے بڑھا دیا۔ حضرت کے اس جواب سے کہ سچا لطیفہ تھا مجھے بہت ہی لذت آئی کہ درحقیقت ان

ایام میں امامت حضرت حافظ صاحب کے سپرد تھی۔ بحالت سفر میں
بھی آپ جماعت کا اہتمام فرماتے اور حتی الوسع ریل ٹھہرنے پر نیچے اُتر کر
نماز پڑھا کرتے تھے مگر ایسی صورت میں اکثر مولوی ذکریا صاحب کی امامت
کو پسند فرماتے کہ وہ نہایت مختصر قراءت و قیام و قعود کے عادی تھے۔ باہر
نماز پڑھنے میں دشواری معلوم ہوتی تو ریل ہی میں جماعت کرتے اور استقبال
قبلہ کی ہر حال صورت نکال لیا کرتے تھے آپ نے مدنی راستہ میں اونٹ کی
سواری سے اترنے اور جماعت کا اہتمام کرنے میں بھی کبھی تکاسل نہیں فرمایا۔
اچھے اچھے جوان اور مستعد اونٹ سے اترتے ہوئے گھبراتے مگر آپ ہمیشہ
وقت مستحب پر اترتے اور اتنے وضو کرتے آپ کا اونٹ دور نکل جاتا تو آپ
لپکتے اور اس سے اتنا آگے بڑھ جاتے جتنا وہ وضو کرنے میں آگے نکلا تھا۔
وہاں پہنچکر با جماعت نماز ادا کرتے اور جب دیکھتے کہ اونٹ اب آگے
نکل گیا تو پھر لپکتے اور زیادہ آگے نکل کر سنن موکدہ ادا فرماتے اور پھر
لپک کر اونٹ پکڑتے اور اس پر سوار ہو جاتے تھے۔ اور اگر دوسری نماز
کا وقت قریب دیکھتے تو پیدل چلتے رہتے اور وقت پر اس کو بھی با جماعت
ادا فرما کر اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ اس طرح کئی کئی میل آپ کو پیادہ چلنا
پڑتا مگر آپ تکان نہ مانتے تھے اور فرمایا کرتے قصر کی قدر یہاں آکر ہوتی ہے
کہ دو رکعت میں جب اتنا بھاگنا پڑتا ہے تو چار میں کیا کچھ ہوتا۔ بڑھاپے میں
آپ کی یہ ہمت جوانوں کو غیرت دلاتی اور وہ پیچھے اتر کر ساتھ ہو لیا کرتے
تھے۔ اپنے لوگوں میں اگر کسی کو کاہل پاتے تو غصہ ضبط نہ فرما سکتے اور تیزی
کے ساتھ نماز کے اہتمام کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ حافظ سلیمان راندیری بھی
ایک سفر میں ساتھ تھے جب آپ کے پاس کو انکا اونٹ گذرا تو آپ نے
پوچھا کہ حافظ صاحب نماز پڑھ چکے؟ عرض کیا کہ حضرت اوپر ہی پڑھ لی
شغدف میں میرے ساتھ بوڑھی ماں ہے اور اس کو میرے اترنے سے تکلیف

ہوتی ہے۔ آپ نے بیساختہ فرمایا ہاں وہاں تو ساتھ نہ ہوگی جہاں نماز کا سوال ہوگا۔ جوان ہو کر تھوڑی ہی ہمت ہار دو تو اس کا کیا علاج ہم تو جب جانیں کہ پاخانہ کی ضرورت ہو اور ماں کا عذر کرکے شغدف میں بیٹھے رہو۔ حج کرنے چلو اور نمازیں چھوڑو اس سے تو بہتر تھا کہ گھر بیٹھے وقت پر نمازیں پڑھتے بھائی تم کو حضرت گنگوہی سے تعلق ہے اس لئے مجھے اس بے احتیاطی سے تکلیف ہوتی ہے۔ یا تو سفر میں رفیق نہ ہوئے ہوتے اور رفاقت کی ہے تو نماز کا اہتمام کرو چنانچہ وہ اُترے اور پھر ہمیشہ اہتمام کرتے رہے۔

اس ضعف پیری پر آپ کی رفتار اتنی تیز تھی کہ مجھے یاد ہے کہ اپنی تیز رفتاری پر ناز تھا کہ چودہ منٹ میں پورا ایک میل چلتا ہوں مگر حضرت کے ساتھ چلکر گھبرا گیا کہ حضرت تیز چلتے اور مجھے ساتھ دینے کے لئے دوڑنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ دیوبند تشریف لائے اور بندہ ہمراہ تھا۔ قبیل صبح صادق چلنا تھا کہ ریل قبل طلوع چھوٹتی تھی۔ سواری کا انتظار کیا مگر نہ ملی تو حضرت نے فرمایا چلو پیدل کہ ریل نہ چلی جائے مدرسہ کا حرج ہوگا۔ اسٹیشن قریب ایک میل تھا اور گھٹا کی وجہ سے کچھ تاریکی تھی مگر حضرت آگے اور میں پیچھے۔ چاہتا تھا کہ حضرت کے ساتھ ساتھ رہوں مگر نہ ہو سکا اور آخر اسٹیشن پر پہنچکر حضرت نے اسفاذ میں باجماعت نماز فجر باطمینان ادا فرمائی۔ مدنی راستہ میں دو مرتبہ مجھے حضرت کی ہمرکابی نصیب ہوئی اور سمجھتا تھا کہ حضرت ہندوستان ہی کی پختہ سڑک یا پگڈنڈیا پر تیز چل سکتے ہیں مگر معلوم ہوا کہ عرب کا ریگستان تو حضرت کی تیز رفتاری کو بڑھاتا اور سنگستانی نشیب و فراز آپ کی رفتار میں کچھ فرق نہیں ڈالتا۔ ایک مرتبہ آپ نے رابغ کے راستہ سے سفر کیا کہ سارا قافلہ حضرت آپ کے رفقاء کے سوا اونٹوں کا تھا۔ آپ وضو بھی کرتے تو تنہا۔ دوڑ کر لیتا اور سنسان جنگل میں کھڑے رہ جاتے تھے۔ جمالوں نے ڈرایا کہ یہاں جان کا خطرہ ہے مگر آپ نے پرواہ نہ کی۔ آخر مقرب [illegible]

تو ترکے مگر مقوم یہ دیکھکر کہ رات کا وقت ہے اور شیخ کہنا مانتے نہیں
خود اتر کر ساتھ ہوا اور جب جماعت کھڑی ہوئی تو وہ بندوق لئے ہوئے
چار طرف نظر ڈالتا اور پہرہ دیتا رہا حتیٰ کہ آپ عشا سے فارغ ہو کر تیز چلکر
قافلہ میں آئے اور اونٹ پر سوار ہو گئے۔ مدینہ منورہ تک اس کا یہی
معمول رہا کہ نہ بدوؤں کو قیام پر مجبور کیا اور نہ خود پہرہ دینے میں سستی
ہوا۔ مقوم بھلا آدمی اور منس مکھ تھا حضرت کی تیز رفتاری دیکھکر کہتا الشیخ
یطیر۔ بڑے میاں تو اُڑتے ہیں۔
فجر سے فارغ ہو کر آپ حجرہ میں تشریف لے جاتے اور اشراق تک مراقبہ
میں مشغول رہتے تھے۔ نوافل اشراق سے فارغ ہو کر جب آپ باہر تشریف
تو چہرے مبارک پر بے انتہا انوار ہوتے اور چاند کی طرح دمکتا تھا باہر سفر
میں بھی آپ کا یہ معمول اکثر قائم رہتا کہ مسجد ہی میں نماز کے بعد مراقب ہو
اور بعد اشراق مجمع میں تشریف لاتے تھے۔ اس کے بعد قضاء حاجت کو تشریف
لے جاتے اور پھر وضو فرما کر درس شروع فرما دیا کرتے تھے۔ اخیر شب میں
حضرت کو صرف پیشاب کی عادت تھی کہ بہت مختصر وقت صرف ہو۔ مسواک ہمیشہ
میں بھی کرتے کی جیب یا تکیہ کے غلاف میں رہتی تھی اور کوئی وضو آپ کا
مسواک کے بغیر نہ ہوتا تھا۔ درس گاہ میں تشریف لا کر اسباق متعلقہ کا درس
دیتے اور آخر زمانہ میں بذل کی تالیف میں مشغول ہو جاتے تھے اسی دوران
میں ڈاک آجاتی اور آپ اس کا ملاحظہ فرماتے۔ سارے مدرسہ کی ڈاک
کا لانا آپ نے فراش کے ذمہ کر رکھا تھا کہ وہ لا کر آپ کے حوالے کرتا اور آپ
اپنے خطوط نکال کر باقی مدرسین و طلبہ کے خطوط مہتمم صاحب کے پاس بھیج دیتے
تھے کہ وہ مکتوب الیہم کو پہنچا دیں۔ گرمی میں گیارہ بجے سے کچھ قبل اور سردی
میں گیارہ کے کچھ بعد نیچے اترتے اور مکان تشریف لے جاتے تھے۔ جہاں
[illegible] اہلیہ محترمہ [illegible] کھانا تناول فرماتے اور آخر میں [illegible]

ہوگئے تو مکان میں تناول فرماتے تھے کہ چپاتی گرم گرم توے سے اترتی اور
آپ کے سامنے آجاتی تھی۔ ذرا ٹھنڈی ہونے پر چبانا مشکل ہوجاتا اور پھر ہضم
نہ ہوتا تھا۔ ہاں کوئی خاص مہمان آجاتا تو اس کے ہمراہ باہر ہی نوش فرماتے
اور ایک خادم جلدی جلدی مکان سے گرم روٹی کپڑے میں لپیٹ کر لاتا رہتا
تھا۔ شوربہ چپاتی آپ کو سب سے زیادہ مرغوب تھی کہ نوالہ ڈبو کر نرم ہوسکے
گھی زیادہ پسند نہ تھا۔ اگر کبھی سالن میں زیادہ تار ہوا تو دوسرے برتن میں آپ
نے نتھار دیا اور فرمایا گھی ہی گھی ہے۔ مصالحہ کا مزہ بھی تو نہیں آتا۔ چاولوں سے زیادہ
رغبت نہ تھی مگر پلاؤ کبھی تناول فرماتے بشرطیکہ نرم ہوتا۔ مرچ اول ہی سے
مرغوب نہ تھی، اور استفراغ کی کثرت نے تو بالکل ہی چھڑا دی تھی پھولی اور
گاجر کی سوئیاں مرغوب تھیں خصوصاً آخر عمر میں کہ قبض کی شکایت بڑھ گئی تھی
جس سے درد گردہ کا اندیشہ رہتا تھا اس لئے صبح کو چائے کے ساتھ بھی
اکثر یہی نوش فرمایا کرتے کہ اس سے ہلکی سی تلیین ہوکر طبیعت صاف ہوجاتی
تھی۔ شروع میں میٹھے سے زیادہ شوق تھا اور تیز میٹھا پسند تھا مگر آخر میں
رغبت جاتی رہی اور نمکین کی طرف بڑھ گئی تھی۔ مولوی زکریا صاحب کا مذاق
مشہور تھا کہ نمکین سے رغبت ہے اور میٹھے سے وحشت۔ حضرتؒ کو ان کے
ساتھ اولاد سے زیادہ محبت تھی کہ اجنبی آدمی ان کو حضرت کا بیٹا ہی سمجھتا تھا
چنانچہ ایک دفعہ کسی نے پوچھا بھی کہ حضرت یہ آپ کے بیٹے ہیں؟ فرمایا بیٹے سے
بڑھکر ہیں۔ حضرتؒ کھانے میں اکثر ان کو بلا لیا کرتے تھے۔ وہ کہا بھی کرتے کہ
حضرت میں تو کھا چکا مگر آپ فرماتے کیا مضائقہ ہے تم تو طالب علم ہو گیا اب
تو چکھ لو اس کے لئے تو بھوک کی ضرورت نہیں۔ لطافت کے درجہ میں یہ
بھی فرمایا کرتے میاں زکریا اتنے دنوں سے پاس بیٹھتے ہیں ان کو تو میٹھے
کا شوق نہ ہوا مجھے نمکین کا ہوگیا۔ ہاں بھئی زور اور قوت کی بات ہے پھلوں
میں آپ کو آم سے زیادہ شوق تھا۔ خصوصاً دیسی ٹپکا کہ اس کے سامنے قلمی آپ

کے نزدیک کچھ نہ تھا۔ آپ کے جدّی باغ میں چند درخت دیسی آم کے تھے وہ آپ توڑوا کر منگواتے اور ان کی پال ڈالی جاتی تھی۔ کھانے کا جتنا شوق تھا اس سے زیادہ کھلانے کا تھا اس لئے ہر موسم پر ایک تاریخ مقرر فرما کر آپ اپنے مخلصین و احباب کو مدعو فرمایا کرتے اور بڑے برتن میں قسم قسم کے پال اور ٹپکے کے آم بھروا کر بیچ میں رکھ دیتے۔ خود بھی کھاتے اور جو آم مزے کا نکلتا چکھ کر خدام کو عطا فرماتے جاتے کہ لو یہ کھاؤ مزے کا ہے۔ انہیں کے تمام موسم میں کسی دن آپ کا مکان آموں سے خالی نہ رہتا۔ خصوصاً لال بیری ایک درخت کا نام تھا اس کا آم آپ کو نہایت مرغوب تھا اور خصوصیت سے آپ اس کو انبہٹہ سے منگایا کرتے تھے۔ انجیر سے بھی آپ کو رغبت تھی نیز آپ بالخصوص شوق سے کھایا کرتے تھے۔ مجھے شروع میں بیر سے رغبت نہ تھی اس لئے جب مجھے محبت و شفقت کے ساتھ حضرت عطا فرماتے تو لے لیتا مگر کھا نہ سکتا تھا۔ ایک بار عرض کیا کہ حضرت یہ چیز ایسی جس سے سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو رغبت تھی مگر میری گندی طبیعت اس سے موافقت نہیں کھاتی اس کا مجھے بڑا افسوس ہے۔ فرمایا اچھا میاں یہ تو بڑی لذیذ چیز ہے کھا کر تو دیکھو۔ میں نے کھایا تو حضرت کی کرامت تھی کہ لذیذ معلوم ہوا اور پھر رغبت بڑھ گئی۔ چائے آپ بے نمک کی پیتے تھے جس میں دودھ غالب اور شکر زیادہ ہوتی تھی۔ بعض جگہ اس میں نمک ملاتے ہیں۔ کبھی ایسی چائے سامنے آئی تو پی نہ سکے اور فرمایا چائے کو سالن بنا دیا۔ بعد اکل گھنٹہ سوا گھنٹہ قیلولہ فرما کر آپ اٹھتے اور وضو فرما کر سنت ظہر مکان ہی پر پڑھتے اور نماز کے وقت معینہ سے دس منٹ قبل مدرسہ میں تشریف لا کر حجرہ کے متصل اپنی جگہ بیٹھ جایا کرتے۔ اور جب نماز کا وقت ہوتا کہ گرمی میں تقریباً ڈھائی بجے اور سردی میں ایک بجے تو آپ نماز پڑھتے اور بعد فراغ درس میں مشغول ہو جاتے۔ اخیر زمانہ میں اس وقت کا تقریباً پون گھنٹہ تلاوت میں صرف ہوتا تھا اور اس کے بعد صبح کے آئے ہوئے خطوط کے جوابات

اور جوابات لکھواتے تھے عصر سے قبل چار نفل پڑھتے تھے آپ کا اکثر یہ معمول تھا بہت کم ایسا ہوا تھا کہ آپ نے ان کو ترک کر دیا ہو۔ آپ ہر وقت باوضو رہتے اور اس لئے عصر سے قبل وضو کرنے کا اتفاق کم ہوتا تھا۔ بعد عصر عوام و خواص کا وقت تھا کہ گرمی میں صحن مدرسہ اور سردی میں سہ دری کو آپ زینت بخشتے اور خدام چاروں طرف آ بیٹھتے تھے۔ تسبیح آپ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ حاضرین سے ہر قسم کی ظرافت و بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتے جاتے اور تسبیح بھی پڑھتے رہتے تھے اسی وقت میں کوئی اخبار آتا تو اس کو دیکھتے یا پوچھتے تھے کہ کہو بھئی کوئی نئی خبر تو نہیں؟ جنگ کے زمانہ میں اسلامی مجبوریوں کے معلوم کرنے کا آپ کو زیادہ اہتمام رہا اس کے بعد کبھی کوئی خبر دیکھ یا سن لی ورنہ محض سرخیاں دیکھ کر اخبار رکھ دیا کرتے تھے مغرب کے بعد اوابین میں ایک یا سوا پارہ پڑھتے اور پھر کھانا نوش فرمانے کے لئے تشریف لے جاتے۔ عشا کی اذان کے بعد تک مکان میں رہتے اور جو مستورات مہمان آئی ہوتی تھیں ان کی سنا کرتے تھے۔ پھر مدرسہ میں آکر ذرا ٹھہرتے اور مسجد میں تشریف لاکر دو یا چار رکعت پڑھتے تھے۔ بعد عشا کوئی خاص مہمان ہوتا تو ذرا دیر ٹھہرتے ورنہ مہمانوں کے بستر و چارپائی کو دریافت فرما کر کہ کافی انتظام ہو گیا یا کسی چیز کی ضرورت ہے مطمئن ہو جانے کے بعد مکان تشریف لے جاتے تھے

نماز عصر ہمیشہ دو مثل کے بعد حنفی متفق علیہ وقت پر پڑھتے اور عشا میں کافی تاخیر فرماتے تھے نماز فجر بالعموم طلوع شمس سے ۳۰ - ۲۵ منٹ قبل شروع فرماتے چونکہ تجوید سے خاص محبت تھی اس لئے قراء کو امامت کے لئے پسند فرماتے اور قرأت میں کچھ نقص رہتا تو بعد نماز فوراً متنبہ فرماتے تھے۔ ایک بار جبکہ امامت صلوٰۃ مولوی ظفر احمد صاحب کے ذمہ تھی فرمایا کہ مولوی ظفر تم مد میں کمی کرتے ہو ذرا اور بڑھایا کرو۔ ایک بار فرمایا تم کبھی تو ضاد کو صحیح نکالتے ہو جس سے معلوم ہوتا ہے صحیح مخرج پر قادر ہو اور کبھی دال مفخم پڑھتے ہو یہ کیا واہیات ہے جب قادر علی المخرج ہو تو اس کو ہمیشہ صحیح کیوں نہیں نکالتے اس کی پوری طرح مشق کرو۔ پھر فرمایا کہ مخرج ضاد حضرت مولانا تھانوی کا بہت

بھیجے ہے کبھی تو تمہاری قراءت میں مولانا کا رنگ آجاتا ہے کبھی ایسی جلدی کرتے ہو کہ ضاد کا مخرج تو بگڑ ہی جاتا ہے اور دوسرے حروف بھی اچھے نہیں نکلتے۔ حضرت کو اس کا بھی اہتمام تھا کہ وقف و وصل میں رموزِ مصحف کا اتباع کیا جائے کہ جہاں آیت یا علامت وقف ہے وہاں وقف کیا جائے اور جہاں وقف سے منع کیا ہے وہاں نہ کیا جائے اور فرمایا کرتے تھے کہ آج کل قراء اس کی رعایت نہیں کرتے مگر خیر و برکت اتباعِ سلف میں ہے۔

ایک مرتبہ مولوی ظفر احمد صاحب نے فلما اتھا نودی یا موسیٰ انی انا ربک فاخلع نعلیک میں یا موسیٰ پر مد کر کے انی انا ربک سے وصل کر دیا۔ تو بعد نماز حضرت نے فرمایا تم نے یا موسیٰ پر وقف نہیں کیا؟ عرض کیا کہ حضرت یہاں مجھے وصل بھی جائز معلوم ہوتا ہے حضرت نے حمائل شریف کھولی اور دیکھنے کے بعد فرمایا ہاں صحیح کہتے ہو۔ وتر عشاء کے ساتھ پڑھنا آپ کا دائمی معمول تھا اور تہجد کی بھی عادت تھی مگر وتر آپ عشاء کے بعد مسجد ہی میں پڑھتے اور یہ کمال احتیاط تھی کہ آخر شب میں اٹھنے پر اعتماد نہ فرماتے تھے فجر کی سنتیں آپ ہمیشہ گھر میں پڑھتے اور سفر میں ہوتے تب بھی قیام گاہ پر پڑھکر مسجد میں جاتے تھے کہ کمال اتباع سنت اسی میں تھا حضرت کو نماز کے ہر جزو میں سنت و استحباب کی رعایت اور فقہاء حنفیہ کے اتباع کا اہتمام تھا ایک مرتبہ مولوی ظفر احمد صاحب سے فرمایا مولوی ظفر تم ظہر کی نماز میں طوال مفصل نہیں پڑھتے؟ عرض کیا کہ نہیں بلکہ اوساط پڑھتا ہوں۔ فرمایا کہ فقہاء حنفیہ تو فجر و ظہر دونوں میں طوال کو سنت فرماتے ہیں اس کی رعایت کیا کرو۔ اس روز مولوی صاحب نے نماز ظہر میں سورۂ قٓ پڑھ دی جو نمازیوں پر بار ہوئی بعد نماز حضرتؒ نے فرمایا میرا یہ مطلب نہ تھا کہ فجر و ظہر کی قراءت برابر کرو بلکہ فجر کی اطول ہونا چاہیئے اور ظہر کی کم۔ دیکھو طوال میں سورۃ التکویر اور سورۃ انفطار بھی تو ہے۔ ظہر میں طوال کی ایسی ہی سورتیں پڑھا کرو۔ ایک بار فرمایا کہ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ الم تنزیل السجدہ اور سورۃ الدھر پڑھا کرتے تھے شافعیہ نے تو اس کا واجب کی طرح التزام

کر لیا کہ کبھی ترک ہی نہیں کرتے۔ اور حنفیہ نے اس کے ترک کا التزام کر لیا کہ
کبھی نہیں پڑھتے۔ وہ دونوں فعل سنت کے خلاف ہیں۔ اولیٰ یہ ہے کہ جمعہ کے
دن ان کو اکثر پڑھا جائے۔ احیاناً ترک بھی کر دے" مولانا نے کہا حضرت
میرے نہ پڑھنے کا سبب یہ ہے کہ مجھے سورۃ الم تنزیل حفظ نہیں۔ ہنس کر
فرمایا پھر حفظ کر لو کوئی بڑی سورت نہیں ہے تیس ہی آیتیں ہیں"۔ تو حق
حضرت کو نماز کی تعدیل و تحسین کا خاص اہتمام تھا جس کی وجہ سے حضرت کی
نماز قابل دید تھی جس کو ہر وارد و صادر تعجب سے دیکھتا اور سبق لیا کرتا
تھا کہ نماز ایسی ہونی چاہیے۔ مولوی عبد اللہ جان لکھتے ہیں ایک خاص واقعہ
جو میں نے حضرت کے متعلق ہمیشہ نوٹ کیا اور وہ میرے دل پر نہایت مؤثر
رہا ہے یہ ہے کہ ادائے نماز کی حالت میں بمصداق کانک تراہ حضرت پر وقار
اور خشوع و سکینہ کی ایک خاص حالت طاری رہتی تھی۔ بحمد اللہ بچپن سے میری
تعلیم و تربیت اور نشست برخاست علمائے کرام کی صحبت میں رہی ہے۔ مگر
حضرت کے سوا میرے ذہن میں اور کوئی مثال نہیں جس کو حضرت کی نماز کے
مماثل کہہ سکوں۔ بدن میں کھجلی لگے تو ہر شخص کو کھجاتے دیکھا ہے مگر حضرت کو
یوں معلوم ہوتا تھا کہ نماز کی حالت میں کوئی خارجی ضرورت ہی پیش نہیں
آتی۔ بلکہ میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ کبھی حضرت کو زکام یا کھانسی کی شدت
ہوئی تو نماز کے شروع کر دینے کے بعد ختم نماز تک حضرت کو کبھی کھانسی
بھی نہیں آئی۔ بارہا دیکھا کہ فارغ ہونے کے بعد حضرت کو فوراً کھانسی اٹھی
اور حضرت اٹھ کر نالی پر جا بیٹھے وہاں خوب کھانسے۔ بلغم تھوکا اور سینہ ضروریات
کو رفع کیا لیکن جب پھر نماز شروع فرما دی تو معلوم ہوتا تھا کہ کسی مرض کا
کوئی اثر آپ پر نہیں ہے۔ میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ حضور قلب اس کا نام ہے
اس کیفیت کا تجربہ ابتداءً مجھے اخیر میں ہوا تو اس کے بعد میں ہمیشہ حضرت کی نماز
کا غور [illegible] اس کا [illegible] یکساں [illegible]

کو صحت و علالت میں بیٹھکر نماز پڑھتے بھی میں نے نہیں دیکھا بجز ایک دفعہ کے کہ دو آدمیوں نے پکڑ کر حضرتؒ کی خواہش کے موافق مغرب کی نماز ادا کرائی اس وقت حضرت ایسے علیل تھے کہ جان بر ہونے کی ظاہری توقع بالکل جاتی رہی تھی۔

ہاں یہ بالکل صحیح ہے کہ حضرتؒ کی نماز جس نے دیکھی وہ کہہ سکتا ہے کہ شاید عمر بھر میں ایسی نماز نہ دیکھی ہوگی۔ قیام کی حالت میں کیا مجال کہ ادھر ادھر میلان ہو۔ سیدھے ایسے سکون کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے کہ حرکت نام کو نہ تھی۔ پھر قیام بھی طویل ہوتا تھا اور عمر بھی ضعیفی و پیری کی تھی مگر آپ کا سکون دیکھکر جوانوں کو شرم آتی تھی؎

ہر چند پیر و خستہ دل بس ناتواں شدم   ہر گہ نظر بہ سوئے تو کردم جواں شدم

اس کے بعد رکوع بھی موافق سنت سجدہ بھی موافق سنت ہر رکن میں پوری تعدیل اور ہر جزو میں کامل سکون سنن و آداب و مستحبات کی پوری رعایت کہ جی چاہتا تھا حضرت کی نماز کو دیکھے جاؤ اور کتابوں میں جو تفصیل پڑھی ہے اس کا مجموعہ مفصل نظر میں ڈال لو۔ آپ کی نماز دیکھکر کفار کو بھی اس کا احساس ہوتا تھا کہ حضرت نماز میں ایسے کھڑے ہوتے ہیں جیسے خدا کے سامنے کھڑا ہونا چاہیئے چنانچہ ایک بار آپ سفر میں تھے اسٹیشن پر ظہر کی نماز کا وقت ہوا اور جماعت کا انتظام کیا گیا۔ آپ نے ظہر کی سنتیں حسب عادت کمال اعتدال کے ساتھ پڑھیں اور پھر فرضوں کی جماعت ہوئی۔ چند انگریز بھی نماز کے منظر کو دیکھ رہے تھے۔ جماعت سے فارغ ہو کر سب نے سنتوں کی نیت باندھی اور جب اس سے فارغ ہو گئے تو ایک انگریز نے ایک نمازی سے پوچھا کہ تم کس کی نماز پڑھ رہے ہو؟ کہا خدا کی نماز پڑھتے تھے۔ انگریز نے حضرتؒ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا اور یہ کس کی نماز پڑھ رہے ہیں؟ کہا یہ بھی خدا کی نماز پڑھتے ہیں تو وہ انگریز بیساختہ بولا کہ ہاں یہ [illegible]

بیشک خدا کی نماز پڑھتا ہے مگر تم خدا کی نماز نہیں پڑھتے معلوم نہیں کس
کی پڑھتے ہو۔ ایک بار آپؒ نے خود فرمایا کہ نماز پڑھتے ہوئے نہ مجھے شور
وغل پر التفات ہوتا ہے نہ گانے بجانے پر۔ البتہ اگر کوئی قرآن پڑھنے لگے
تو منازعت ہونے لگتی ہے اور اس طرف التفات میں مضطر ہو جاتا ہوں
اس کا راز یہ ہے کہ کلام اللہ تھا کہ اس کو سن کر خود بخود طبیعت کھنچتی ہے اور
مالی انازع القرآن کی حقیقت کا انکشاف کیا کرتی تھی۔

جمعہ کے دن بعد اشراق کوئی خاص خط یا مسئلہ یا ارشاد جو ہفتہ کے دوران
میں آیا ہوا ہوتا تو اس کو تحریر فرماتے اور پھر خط بنواتے اور غسل کیا کرتے
تھے۔ عموماً آپ کی عادت شریفہ حلق راس کی تھی اور اس میں جانب راست
کی تقدیم ملحوظ رہتی تھی۔ لبوں کا بھی آپ حلق کراتے اور کبھی مقراض سے
اتنی باریک کہ گویا حلق کی ہوتی ہیں۔ داڑھی آپ کی گنجان اور بھری ہوئی نہ تھی
مگر اس میں بھی آپ کنگھا کرتے اور قبضہ سے زائد کتروا دیا کرتے تھے۔ ناخن
ترشوانے میں ترتیب مسنون کا پورا لحاظ فرماتے کہ داہنے ہاتھ کی انگشت
شہادت سے شروع فرما کر چھنگلیا تک پہنچتے اور پھر بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے
انگوٹھے تک پہنچکر آخر میں داہنے انگوٹھے کا ناخن ترشواتے تھے کہ ابتدا و ختم
یہیں پر ہوتا تھا۔ پاؤں کے ناخن جب بڑھ جاتے تو وہ بھی ترشواتے اور بغل
کا حلق کرایا کرتے تھے۔ غسل اکثر نیم گرم پانی سے فرماتے اور سخت گرمی
میں ٹھنڈے پانی سے۔ بعد غسل کھانا تناول فرما کر قیلولہ کرتے اور زوال کے
اٹھکر وضو فرما کر مدرسہ میں تشریف لاتے۔ کپڑے بدلتے چونکہ پہنتے اور
اعلیٰ سے اعلیٰ عطر لگاتے کوئی مہمان ہوتا تو مختلف قسم کے عطر کی شیشیاں
اس کے سامنے کر دیتے کہ جو پسند ہو وہ لگائے۔ عطر آپ کو عنبر کا زیادہ
پسند تھا۔ اس کے بعد گلاب مشک حنا اور اگر۔ ایک بجے کے قریب مسجد دارالعلوم
میں تشریف لے آتے اور صف اول میں امام کی داہنی جانب منبر کے سامنے

کھڑے ہو کر سکون کے ساتھ اول تحیۃ المسجد اور پھر جمعہ کی چار سنتیں پڑھتے
اور پھر تسبیح پڑھنا شروع فرما دیتے تھے۔ غسل اور کپڑے بدلنے کا اہتمام
اس قدر تھا کہ پنجشنبہ کو اگر سفر ہوتا تو دھلے ہوئے کپڑوں کا جوڑا اور
جبہ ساتھ رکھتے تھے اور قیام گاہ پر غسل فرما کر بدلا کرتے تھے کبھی ایسا نہیں
ہوا کہ اول مغسول اور پھر مستعمل کپڑے باندھنے کی دشواری سمجھ کر کپڑے بدل
کر سفر کیا ہو۔ لباس آپ کا سادہ تھا کہ نیچا کرتہ ٹخنے سے اونچا پاجامہ اور
صدری مگر نظافت زیادہ پسند تھی اس لیے سفید شفاف کپڑا پہنتے تھے موٹا
کپڑا بھی آپ کی نزاکت بدن برداشت نہ کر سکتی تھی اس لیے باریک ململ یا
تن زیب کا کرتہ ہوتا تھا اور لٹھے کا پاجامہ سفر میں بستر ساتھ رکھنے کا آپ کو
اہتمام تھا کہ میزبان کو فکر و پریشانی نہ ہو۔ بالخصوص تکیہ آپ بہت نرم رکھتے
تھے کہ ذرا سخت ہوتا تو نیند نہ آتی تھی۔ اس لیے چھوٹا تکیہ سیمبل کی روئی کا
اور مصلے جاڑے میں قالین ایرانی کا اور گرمی میں شطرنجی ضرور ساتھ ہوتا تھا
سودیشی کی تحریک میں آپ نے ولایتی کپڑے کا استعمال کبھی حرام نہیں فرمایا
ہاں ملکی نفع کی خاطر سیاسی درجہ میں کوئی ترجیح دیتا تو برا نہ سمجھتے تھے جو لوگ
دین کی محبت سے محروم اور نصرانیت سے انس کی طرف مائل ہیں ان کی یہ حرکت کہ
اپنی ہر تجویز کو دین کی چادر پہنانے کی کوشش کرتے ہیں آپ کو ہمیشہ ناپسند
ہوئی کہ سوڈا اور بڑے اُبھان یا بھوسی کی آگ کی طرح دبنے والا ہوتا ہے چنانچہ
بارہا تجربہ ہوا کہ وہ لوگ کل جس چیز کو اپنی زبانوں سے فرض کہہ رہے تھے آج
وہی اس کو حرام کہنے لگے اس لیے آپ نے کسی شورش کے وقت بھی حقیقت
اور اعتدال سے باہر قدم نہیں رکھا۔ خود کسی کی پھٹی چادر میں پاؤں ڈالنا بھی
نہ کیا کہ نقار خانہ میں طوطی کی آواز تھی مگر کلمۃ الحق کا وقت آیا تو تحریر اور تقریر
میں اظہار حق سے چوکے بھی نہیں۔ خلافت کا شور جس زمانہ میں ہوا اور مولانا
عبدالباری دہلوی کے وفد کی مزاحمت ہوئی تو آپ کو بہت صدمہ ہوا

کہ مسلمان میت کی توہین و ہتک کہاں جائز ہے۔ اسی طرح جس وقت گائے کے ذبح کا ترک شروع ہوا اور بہتیرے مولویوں نے بھی اس کو مباح قرار دے کر بمصالح دنیویہ ترجیح ترک پر فتوے دے دیئے تو آپ نے سکوت پسند نہیں کیا اور شعار اسلام ہونے کے لحاظ سے اس کی ضرورت علماً و عملاً محقق فرمائی اُس وقت آپ پر سب و شتم ضرور ہوا مگر چند ہی روز بعد اس کا نتیجہ دیکھ کر مماوعت کا فتولے دینے والے خود فرضیت کا فتولے دینے لگے۔ غرض اس اصول کے ہمیشہ آپ پابند رہے کہ ہر کارے و ہر مردے۔ دنیوی ضروریات پر جس طرح اول نظر لیڈران قوم کی جاتی ہے اسی طرح دینی ضروریات پر اوّل نگاہ پڑنا علماء و مشائخ کا منصب ہے کہ لیڈران قوم کا فتوے لے جس میں وہ علماء کو متفق کرنے کی کوشش کریں کسی طرح دین نہیں ہو سکتا۔ ایک بار آپ نے افسوس کے ساتھ فرمایا مسلمان اس شورش میں ہلاک ہو جائیں گے کہ لیڈران کو کر لیا آگے اور مولوی ہو لیے ان کے پیچھے" سر پر عمامہ آپ کی اکثر عادت تھی اور زیادہ گرمی میں ہلکی ٹوپی کم قیمت سر سے مڑھی ہوئی اور رہتے تھے جو اکثر میرٹھ سے تیار کرا کر بھیجدیتا تھا چوغہ آپ کا اتنی کشمیری بیش قیمت تھا اور جاڑے میں اکثر اس کو پہنا کرتے تھے۔ پاجامہ میں کمر بند خاص بناوٹ کا ہوتا تھا جس کا بننا آپ نے مولوی زکریا کی اہلیہ کو کہ بیٹی کے برابر سمجھتے تھے سکھلوایا اور وہ ڈھونکر حضرت کی خدمت میں پیش کیا کرتی تھی۔ اچکن پہنتے ہوئے میں نے حضرت کو کبھی نہیں دیکھا۔ جوتا سادہ یا ایک پھول کا پہنتے تھے مگر نہایت نرم جو اکثر لدھیانہ یا انبالہ سے آجاتا تھا۔ بڑا رومال ہاتھ میں رکھنے کی عادت تھی اور اخیر زمانہ میں لاٹھی بھی رکھتے تھے ہمت آپ کی نہایت وسیع تھی اور استقامت کا اثر دنیا کے ہر کام پر بھی پڑتا تھا کہ جس کام کا جس طریق پر عزم فرما لیا اُس سے ہٹتے نہ تھے۔ جس وقت پر کہیں پہنچنے کا وعدہ کر لیا اور جس وقت کے متعلق واپسی کا گھر والوں سے ذکر فرمائے گئے تھے کتنا ہی کسی کا اصرار ہو مگر اس میں تخلف نہیں ہوتا تھا کہ دوسروں کو انتظار کی تکلیف

ہو گئی۔ اور اس بارے میں حضرتؒ کو میں نے اتنا متشدد پایا کہ صدہا واقعات پر نظر رکھی اور برسوں مشاہدہ میں کبھی ایک دفعہ بھی خلاف نہیں ہوا ناواقف و ناقدردان اس کو ضد یا رکھاوٹ ویسے مروتی سمجھتے تھے کہ مشتاقوں کی الحاح پر بھی نہیں پسیجتے۔ مگر جو سمجھتے تھے کہ عزم وصدق اور وفاء وعد کی حقیقت کیا ہے وہ حضرت کے اس عمل سے سبق لیا کرتے تھے۔

ایک بار آپ نے صوفی محمد علی صاحب کی طلب پر لوٹھڑ تشریف لانے کا وعدہ فرمایا مگر راستہ میں گاڑی کا میل نہ ہونے کے سبب آپ نہ پہنچ سکے دوسری گاڑی سے تشریف لائے مگر ہم خدام انتظار دیکھکر واپس ہو لئے تھے ہاپوڑ کے اسٹیشن پر کہ لوٹھڑ وہاں سے تین میل تھا حضرت کی زیارت ہوئی اور محبوباً چند گھنٹہ وہیں ایک مسجد میں قیام کیا۔ اتفاق سے وہاں گئے تھانے دار میرے دوست تھے ان کو معلوم ہوا کہ میں اور میرے حضرت مسجد میں مقیم ہیں تو فوراً حاضر ہوئے اور اصرار کیا کہ مکان پر کھانا تناول فرما کر جائیے حضرت نے مان لیا اور فرمایا کہ واپسی جانا اسی گاڑی سے ہے۔ انہوں نے کہا بہتر اور اسباب اٹھوا کر مکان پر ملے گئے کھانے کا اہتمام شروع کر دیا کہ کئی قسم کا ہو اس میں دیر ہوئی اور حضرت نے گھڑی دیکھی کہ وقت قریب آگیا۔ دو تین بار حضرت نے تقاضا فرمایا کہ بھئی جو پکا ہو وہ لے آؤ گاڑی ہاتھ سے جاتی رہے گی مگر وہ ہاں حضور ابھی آتا ہے کہکر ٹلاتے رہے کیونکہ تیار نہ ہوا تھا۔ جب وقت بہت تھوڑا رہ گیا تو حضرت سے ضبط نہ ہو سکا اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا چلو بستر اٹھاؤ کہ اب وقت میں گنجائش نہیں ہے۔ میں ایسی صورت میں دوست کی رعایت کیا کرتا فوراً اٹھ کھڑا ہوا کہ بہتر میزبان نے یہ دیکھا تو کچا پکا جو کچھ تھا جلدی سے لا کر سامنے کر دیا حضرتؒ بیٹھ گئے اور تناول فرماتے ہوئے کہا کہ تمہارے اس تکلف ہی نے تو تمہیں اور ہمیں دونوں کو پریشان کیا۔ ایک شخص کی خاطر تین کو انتظار میں پریشان کرنا مجھے پسند نہیں۔ خصوصاً جب عرض کر دیا تھا کہ اس ہی گاڑی سے جانا ہے تو

محبت و اخلاص کا تقاضا یہ تھا کہ وقت کی گنجائش دیکھ کر جتنا ہو سکتا اتنا پکواتے شریعت نے اسی سادگی کی تعلیم دی ہے نہ کہ دوسرے کو حرج میں ڈالنا کہ اسی کا تکلف ہے جو ممنوع ہے۔

ایک بار آپ احباب کی درخواست پر منصور پور تشریف لے گئے جو اسٹیشن منافی سے تین میل تھا۔ مولوی ظفر احمد صاحب ساتھ تھے حسب وعدہ ایک دن قیام فرما کر اگلے دن واپسی کا قصد کیا تو گاؤں والے مزید قیام پر مصر ہوئے آپ نے فرمایا کہ بس اتنا ہی قصد کر کے چلا تھا مدرسہ کا حرج ہو گا اور آنے والے مہمان پریشان ہوں گے۔ گاؤں والوں نے ایک نہ سُنی اور سواری کا انتظام نہ کیا۔ جب ریل کا وقت آیا تو حضرت نے مولوی ظفر احمد صاحب سے فرمایا چلو بھئی سامان اٹھاؤ اور کچھ مجھے دے دو اور پیدل ہی چلو۔ انہوں نے عرض کیا حضرت سامان کچھ نہیں صرف ایک بستر ہے وہ میں لے لوں گا۔ چنانچہ حضرت نے گاؤں والوں سے کچھ نہ فرمایا اور پیدل چل پڑے۔ گاؤں والوں نے دیکھا کہ حضرت روانہ ہو لئے تو جلدی جلدی سواری کا انتظام کیا اور پیچھے ہو لئے مگر اس وقت پہنچے جبکہ حضرت تین میل کی مسافت قطع فرما کر اسٹیشن پر پہنچ لئے۔ حضرت نے فرمایا اب سواری کس کے لئے لائے ہیں تو ریل پر بھی آ لیا۔ اور دیکھو اس طرح کسی کو تکلیف نہیں دیا کرتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ یہاں آنے کی مجھے ہمت نہ ہو گی۔

آپ نشست و برخاست اور حرکت و سکون میں سادہ اور بے تکلف تھے مجلس میں جہاں جگہ پاتے بیٹھ جاتے۔ کوئی صدر پر بیٹھنے کا اصرار کرتا تو اس میں بھی تکلف نہ تھا اور سب کے پیچھے جگہ ملتی تو اس میں بھی گرانی نہ تھی۔ ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں مجھے اطلاع ملی کہ یہاں بدوؤں کا مشاعرہ اور قومی مفاخرت جو کبھی جاہلیت میں ہوا کرتا تھا اب بھی ہوتا ہے مجھے شوق ہوا کہ عرب کی فصاحت و ادبیت جس کا قرآن مجید سے مقابلہ کیا گیا ہے کاش دیکھتا کہ کیا رنگ ہے چنانچہ حضرت

سے عرض کیا اور عشاء کے بعد حضرت بھی میرے ساتھ ہو لئے۔ جگہ دریافت کرتے ہوئے بستی سے دور صحرا اسمٰعیل کے مقابل کھلے میدان میں بدوؤں کا اجتماع دیکھا اور اجنبی تماشائی بنے ہوئے اس میں گھس گئے۔ بدو دائرہ بنائے ہوئے کھڑے تھے اور وسط میں دری کا فرش تھا جس پر چند سرداران بدو بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں حقّہ کا دور چل رہا تھا اور دو مختلف قبیلوں کے بیچ میں مفاخرہ ہونا تھا وہیں وہیں بدو بالمقابل کھڑے تھے۔ ایک بدو آگے بڑھا اور اس نے عربی شعر پڑھا اور اس کی قوم نے اس کو متفقہ آواز میں گانا شروع کر دیا۔ یہ گویا دعویٰ اور سوال تھا کہ فریق مقابل سے اس کے جواب کا مطالبہ ہے۔ اس شعر میں اپنی قومی شرافت کا ملیح تذکرہ کرتے ہوئے دوسرے پر طعن کیا گیا تھا۔ دو منٹ نہ گذرنے پائے تھے کہ فریق مقابل کا ایک بدو اپنے جتھے سے نکل کر آگے آیا اور چھڑی ہلائی۔ اس کے نکلتے ہی سارے بدو خاموش ہو گئے اور اس نے اسی بحر اور اسی قافیہ میں شعر پڑھا جس میں خصم کے طعن کا ملیح جواب دیتے ہوئے اپنے قومی مفاخرہ کا تذکرہ اور تر بیچ تھی۔ اب اس کی قوم اس شعر کو متفقہ زبان میں گاتی اور گویا بار بار خصم سے مطالبہ کرتی تھی کہ جواب لاؤ۔ چنانچہ جماعت اولیٰ میں سے پھر کوئی شخص جلد از جلد آگے بڑھ کر چھڑی ہلاتا اور سب کو خاموش کر کے اسی بحر اور اسی ردیف میں جواب الجواب سناتا اور اس کے جتھے والے اس کو گانا شروع کر دیتے۔ وسط میں بیٹھے ہوئے سرداران قوم گویا حکم و سرپنچ تھے کہ شعر قابل مدح ہوتا تو بخ بخ کہکر تحسین کرتے اور مذموم و ناقص ہوتا تو تھو تھو کر کے تہجین و تنقیص کر دیتے تھے۔ حضرتؒ کس بیرسی کے عالم میں عامی بنے ہوئے دیر تک بندہ کے ساتھ مجمع میں کھڑے رہے اور حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ نہ پہلے سے کوئی مضمون دیا ہوا ہے نہ بحر معین کی ہوئی ہے نہ ایک فریق کو یہ معلوم ہے کہ خصم کیا طعن دے گا اور اپنا کون سا فخر ظاہر کرے گا جس کے لئے تیار ہو کر آئے ہوں۔ فوراً سوال اور فوراً ہی اسی طرز میں جواب اور پھر جواب الجواب اور پھر اس کا جواب کہ یا

سلسلہ چلتے ہوئے گھنٹہ بھر سے زیادہ گذر لیا۔ جواب میں کسی فریق کو ذرا دیر ہوتی تو پنچوں کی طرف سے عجلت کا تقاضا شروع ہوتا ورنہ ہارا اور مغلوب سمجھی جاتی تھی۔ کیا حال ہوگا پہلی فصاحت کا جس کے متعلق سنتا ہے کہ فی البدیہہ کھڑے کھڑے پچاس ساٹھ شعر بنا دیتے کوئی بات ہی نہ تھی۔ گویا پہلے سے بنائے ہوئے سنا رہے ہیں اور اشعار بھی وہ جن سے جنگ میں شراب کا کام لیا جاتا کہ سامعین مست و بیخود ہو کر جانیں لڑا دیا کرتے تھے۔ اب اتنا ضعف ضرور ہے کہ دعوے اور جواب کے لئے ایک شخص کی تحدید نہیں ہے بلکہ قوم کے دس شاعر ایک کے حکم میں ہیں۔ کہ جس کی طبیعت جلد رسائی کر جائے وہ جواب دے دے مگر شعر میں صرف وزن و قافیہ ہی نہیں بلکہ یہ تمام رعایتیں ضروری ہیں کہ الفاظ مہذب ہوں۔ بندش دلربا ہو مضمون سلیس ہو مفہوم بے غبار اور آسان ہو۔ پھر اس میں مدعی کے دعوے کا نقض مدلل ہو اس کے طعن و اعتراض کا جواب ہو اس کی مفاخرت کی تردید ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی مفاخرت کسی واقعہ سے مبرہن اور خصم پر طعن باقاعدہ ہو۔ اتنی کثیر رعایتیں اور چند منٹ کی تاخیر پر خصم کا اپنے لاجواب شعر کو بار بار گاتے ہوئے اس پر بزبان حال طعن کرنا کہ بس جواب بن نہ پڑا اونٹ چرانے والے ان پڑھ بدوؤں میں یہ ایسا دلکش نظارہ تھا کہ قرن اولی کی دشواریاں یاد دلا کر مجسم حیرت بنائے ہوئے تھا۔ آخر وقت ختم ہوگیا اور مفاخرہ آئندہ شب پر ملتوی ہوا کہ فیصلہ کے لئے تیسری شب یعنی وہ رات ہے جو ١٢ تاریخ گذر کر آئے گی۔ میں نے دیکھا کہ گھنٹہ بھر میں حضرت نے بیٹھنے کا بھی قصد نہیں فرمایا نہ اجنبیت محضہ سے اکتائے اور نہ اجڈ بدوؤں کی دھکا پیل سے گھبرائے۔ جب تھک گئے تو فرمایا چلو بھئی اب رات زیادہ گئی اور مخدوم و خادم دونوں اسی راستہ سے قیام گاہ پر واپس آگئے۔

سفر حج میں آپ پیدل چلنے پر سواری کو ترجیح دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے یہاں کی سواری میں آرام تو زیادہ ملتا نہیں بلکہ ہچکولوں سے ہڈیاں تک

دکھنے لگتی ہیں۔ اس لئے مالی اور بدنی مشقت مجتمع ہو جاتی ہے جس کے لئے حج کی وضعیت ہوئی ہے اور پیدل چلنے میں نہ مالی مشقت ہے نہ زیادہ بدنی۔ ہاں سواری ساتھ لئے ہوئے کبھی آپ پیدل بھی چلتے بالخصوص مدنی راستہ میں نماز دوں کے لئے یا آخری منزل میں دار محبوب کے قریب پہنچکر۔ آخری سفر میں مدینہ سے چار میل ورے ایک کنویں پر قافلہ کو روکا غسل کیا کپڑے بدلے خوشبو لگائی اور آستانہ محبوب پر حاضری کے لئے تیار ہو کر اونٹ پر سوار ہو لئے۔ چند قدم چلے تھے کہ مولوی سید احمد صاحب نظر آئے جو استقبال کے لئے یہاں تک آگئے تھے ان کو دیکھتے ہی آپ اونٹ پر سے اتر لئے اور خاص رفقاء نے بھی ساتھ دیا مگر جب دیکھا کہ جگہ دور ہے تو اکثر لوگ دوبارہ سوار ہو گئے مگر حضرت نے یہ چار میل نہایت بشاشت کے ساتھ پیدل ہی قطع کئے کہ بعض رفیق ساتھ رہ گیا تھا جگہ پر پہنچکر بدحال ہو گیا اور بیٹھ کر اٹھنا مشکل پڑ گیا۔ مگر حضرت نے باوجود ضعف پیری کے کچھ بھی تکان نہ مانا۔

زکوٰۃ آپ پر بجز آخری چند سال کے کبھی فرض نہیں ہوئی کہ کبھی صاحب نصاب ہی نہیں ہوئے بلکہ مقروض رہتے تھے اور جب کچھ حصہ جائداد وغیرہ کی یک مشت رقم مل جاتی تو حاضری حرمین میں خرچ فرما دیا کرتے تھے یا صدقات میں۔

مرحومہ دختر کے ترکہ میں آپ کو حصہ ملا تو آپ نے سب کا سب مدرسہ میں دیدیا۔ مرحومہ کی کوئی چادر یا استعمال شدہ کوئی اور کپڑا جس کے متعلق داخلہ مدرسہ کے بعد اس کی ماں کو خیال آیا کہ یادگار کے درجہ میں خود رکھ لیتی مگر حضرت نے فرمایا اب تو اللہ کی ملک بن چکا تجھے واپسی کا حق نہیں ہے۔ والدہ نے اپنے بھائی کی معرفت مہتمم صاحب سے کہلایا تو انہوں نے بھی صاف جواب دے دیا کہ واپسی نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ نیلام کرتے وقت قیمت بڑھا کر اور دے لو۔ بھائی نے کہا بھی کہ نیلام میں جو قیمت قرار دو وہ ہم دے دیں۔ مگر مہتمم صاحب حد سے زیادہ محتاط تھے فرمایا مجھے قیمت کا اندازہ کرنے میں غلطی کر جانا ممکن ہے کہ شاید اس سے زیادہ مل سکے اور مدرسہ کی بہتری ہے مجھے رعایت

جائز نہیں۔ ان کو غصہ بھی آیا اور حضرت سے کہا بھی کہ مہتمم بہت ہی بے مروت ہیں مگر حضرت نے فرمایا وہ ان کا منصب ہی ہے اور اعتراض میں کیا حرج ہے کہ نیلام کے وقت تم جاؤ اور لینا ہو تو اجنبیانہ حیثیت سے جس قیمت پر پہنچے بڑھا کر دو۔ چنانچہ نیلام ہوا اور بولیاں بولی گئیں۔ اتفاق کی بات کہ ان کی بولی پر چند پیسے کسی نے بڑھا دئے تھے کہ یہ سوچتے ہی رہے اور وہاں ایک دو تین ہو گیا۔ ان کو بہت ہی رنج ہوا مگر حضرت نے وہی جواب دیا جو مہتمم دے چکے تھے کہ اس میں کسی کا کیا قصور۔ کوتاہی تمہاری تھی کہ جب لینا تھا تو قیمت کیوں نہ بڑھائی۔ اب خریدار سے نہیں کہا جا سکتا کہ تمہاری بہن کی رعایت میں تم کو دیدے۔

ماہ رمضان میں آپ کی تقلیل طعام زیادہ بڑھ جاتی تھی مگر معمولات میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ نہ فتاوے بند ہوتے تھے۔ نہ خطوط کی آمد رکتی تھی نہ زائرین کی ملاقات میں کمی آتی تھی۔ ہاں مدرسہ کی تعطیل رہتی تھی اور درس کا وقت تلاوت کلام اللہ کی نذر ہو جاتا تھا۔ آپ افطار میں تعجیل فرمایا کرتے تھے اور سحور میں تاخیر۔ کہ طلوع فجر کے پندرہ منٹ قبل نوافل معمولہ سے فارغ ہو کر کھانا تناول فرماتے اور پانچ منٹ قبل پہلے گولے کی آواز پر کلی کر لیا کرتے تھے۔ روزہ کی حالت میں کبھی آپ کے چہرے یا آواز سے کسی کو یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ روزہ سے ہیں یا بھوک پیاس کی تکلیف ہے افطار آپ تمر مدینہ یا آب زمزم سے کرتے اور کبھی پھلکی دال وغیرہ کچھ افطاری بھی مکان سے آتی اور سب کو ساتھ بٹھا کر آپ کھاتے تھے۔ مغرب کی نماز کو اتنا موخر فرماتے تھے کہ روزہ دار اطمینان سے کچھ کھا پی لیں کہ اس حدیث کا صحیح محمل اور قدر و منزلت سب پر واضح ہو جائے جس میں ارشاد ہے کہ نماز پر کھانے کو مقدم کرو۔ مختصر افطار کے بعد آپ باجماعت فرض پڑھتے اور پھر ان نوافل کے ساتھ صلوٰۃ الاوابین جس کے آپ عادی تھے۔ باطمینان فارغ ہو کر مختصر سا کھانا کھاتے اور پھر وضو فرما کر عطر وغیرہ لگا کر تراویح کے لئے تیار ہو جاتے تھے رمضان کے

پہنے جامہ تو بھی عمدہ نکالی جاتی تھی اور خوشبو کا بھی اکثر زیادہ استعمال فرمایا کرتے
تھے ختم قرآن کا بڑا اہتمام تھا مگر یا خود پڑھتے یا صحیح پڑھنے والے خوش الحان کا
سنتے اور بیان فرمایا کرتے اور راتوں سے زیادہ جاگتے تھے ایک سال ۲۱-۲۳-۲۵
۲۷-۲۹ کی پانچ راتوں میں آپ نے مولانا محمد یحییٰ صاحب کا پورا قرآن تہجد کی نفلوں
میں سنا مگر جماعت میں تین چار آدمی سے زیادہ نہ ہوتے تھے کہ مکروہ ہے اور
جماعت شروع ہونے سے پہلے دو رکعتیں بھی پڑھ لیا کرتے تھے

عشرہ اخیرہ میں اعتکاف کا آپ کو بڑا اہتمام تھا کہ بجز آخری ایک دو سال
کے جس میں آپ پر ضعف کا زیادہ غلبہ تھا کبھی آپ کا اعتکاف نہیں چھوٹا معمولات
کے متعلق جو آپ کی عادت دائمی ایک عادت تھی بس وہ ایک عجیب چیز تھی
کہ نہ رمضان میں بدلتی تھی نہ شوال میں کسی خاص یوم یا مہینہ میں کوئی خاص امر کا
ممکن تھا مگر دائمی حالت میں ترمیم مفقود کہ نہ اس میں کوئی شے کم ہوتی تھی نہ وقت
بدلتا تھا ضرورت ہوتی تو آپ رمضان میں بھی سفر کیا کرتے مگر حافظ کو ضرور ساتھ
لے جاتے تھے کہ تراویح یا تہجد خود پڑھیں تو وہ سامع بنیں ورنہ ان کو امام بنا کر
سنیں کہ ختم قرآن یا اس کی ترتیب میں فرق نہ آئے شیخ رشید احمد صاحب سے
آپ کو بہت محبت تھی ان کے بچوں کے ختم قرآن کی خوشی میں آپ تشریف لائے
اپنی تراویح تو علیحدہ پڑھیں مگر ختم کے وقت مسجد میں تشریف لا کر بیٹھ گئے
اپنے خدام کی خوشی اور غمی میں شریک ہونے کا آپ کو زیادہ اہتمام تھا اور اس لیے
ولادت عقیقہ بسم اللہ نکاح افتتاح دکان بنیاد مکان ختم قرآن وغیرہ کی جس
خوشی میں آپ بلائے جاتے تو شرکت فرماتے اور کوئی معصیت نہ دیکھتے تو دیر تک
فرزند خداوندی کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے ایک بار آپ کسی تقریب نکاح میں
میرٹھ صدر تشریف لائے لڑکے والے نے درخواست کی کہ تبرکاً دولہا کو
کپڑے حضرت پہنا دیں تو آپ وہاں تشریف لے گئے جہاں دولہا غسل کر کے بیٹھا
کپڑے پہننے کا منتظر کھڑا تھا سندھی ساتھ کرتہ یا جامہ تو آپ نے اٹھا

دے دیا۔ اچکن کا نمبر آیا تو آپ نے کہا دیکھنا کیا ریشم کی ہے؟ میں نے غور سے دیکھ کر عرض کیا کہ جی حضرت ریشم ہی معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے اس کو رکھدیا اور فرمایا اس کا پہننا اور پہنانا حرام ہے۔ پھر ٹوپی دیکھی تو وہ بھی مغرق۔ اس پر حضرتؒ نے تیز لہجہ میں فرمایا یہ بھی حرام۔ لڑکے والے کچھ محتاط نہ تھے انہوں نے حضرت کے انکار کی پروا نہ کی اور خود اٹھا کر دولھا کو پہنا دیا۔ حضرت کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا مگر تحمل فرمایا اور مجھ سے یہ کہکر کہ چلو، وہاں سے واپس ہو گئے۔ اب قیام گاہ پر بھی نہ آئے اور رنج و افسوس میں بھرے ہوئے حاجی وجیہ الدین صاحب کے مکان پر آ بیٹھے فرمایا یہ کیا تعلق ہے کہ معصیت میں شریک کرنے کو بلاتے ہیں اس نکاح میں شریک ہونے والے سب گنہگار ہوں گے جہاں دولہا حرام لباس پہنے بیٹھا ہو کہ کوئی عامل ہے اور کوئی اس پر راضی۔ یہ سنکر سب میں ہل چل مچ گئی کہ برادری کا قصہ تھا اور حضرتؒ کے ساتھ کئی لوگوں کو تعلق تھا کہ نہ حضرت کو چھوڑ سکیں نہ برادری کو۔ دوڑے ہوئے گئے کہ کسی طرح دولھا کے کپڑے بدلوا دیں مگر بہتیرے تھے جن کو نہ حضرت سے تعلق تھا نہ اتباع شریعت کا اہتمام اس لیے وہ تیار نہ، لباس کو نحوست اور بدشگونی سمجھے اور کہتے تھے کہ جو دلہن کے ہاں سے جوڑا آیا ہے وہی پہننا ضروری ہے مگر یہ دوڑ دھوپ کرنے والے مصر آزردہ اور مدبر تھے آخر کامیاب ہوئے اور حاجی وجیہ الدین صاحب مصری کپڑے کی بیش قیمت اپنی اچکن نکال کر جلدی سے پہنچے کہ اس سے بہتر تو دولھا کو یہ جوڑا کیا ہندوستان میں بھی کہیں نصیب نہ ہوگا۔ وہ پہنا کر اور ٹوپی کے بجائے عمامہ بندھوا کر حضرت کے سامنے لے آئے کہ حضرت اب تو تشریف لے چلیں۔ اس وقت آپ اٹھے اور شریک عقد ہوئے۔

ایسا ہی ایک قصہ دہلی میں پیش آیا کہ بندہ اس وقت بھی ساتھ تھا اور گو عقد کی شرکت میں مدعو ہو کر حضرت نہیں گئے تھے مگر قیام دہلی میں اس عقد کا اتفاق ہوا اور دولھا کے اعزہ نے شرکت پر اصرار کیا۔ وہی دولھا کے کپڑے پہننے کا وقت آیا تو حضرت کو بلایا گیا اور حضرتؒ نے ریشمی لباس دیکھ کر اس کو ٹھنک جھٹک دیا

یہاں اتنا اضافہ اور ہوا کہ حضرت نے جب کپڑا جھٹک دیا تو فوراً دو مریدے نے
کھڑے ہو کر پہنا دیا۔ حضرتؒ وہاں سے اٹھکر حکیم جمیل الدین صاحب کے مطب میں
آ بیٹھے اور مجھ سے فرمایا کہ تانگہ لاؤ کہ چلیں اسٹیشن پر۔ یہاں صرف چند ہی تھے
جو قوم اور شریعت کے مقابلہ امتحان میں پختہ اترے کہ وہ برادری کو چھوڑ کر
حضرتؒ کے پاس آ بیٹھے ورنہ اکثر دیندار صورتوں نے کوشش ضرور کی کہ کپڑے
تبدیل ہو جائیں مگر فریق ثانی کا پلہ بھاری تھا اور حضرتؒ پر طعن تشنیع ہونے
لگا تو وہ بھی چپ ہو گئے۔ آخر دولہا کے ساتھ ہو لیے۔ اللہ جزائے خیر دے
حاجی اسمٰعیل پٹنہ والوں کو کہ ایسا باہمت عالی حوصلہ شخص میری نظر سے نہیں
گزرا۔ ہر چند کہ ان کے قریبی رشتہ دار کا قصہ تھا مگر ذرہ برابر پرواہ نہ کی۔ میں
دیکھ رہا تھا کہ اسی ادب و انبساط کے ساتھ حضرتؒ کے پاس بیٹھے حضرتؒ کا
دل بہلا رہے تھے گویا کوئی قصہ ہی نہیں ہوا۔ حضرتؒ نے کمال تاسف کے
ساتھ فرمایا ہم لوگ اسی لئے اُمرا کی تقریبات میں شرکت کے قابل نہیں ہیں
وہ لوگ اپنی رسومات میں اتنے پختہ کہ حلال حرام کا لحاظ نہ کریں اور ہم شریعت
پر پختہ ہو کر ان کی خوشی و ناراضی کی پرواہ نہ کریں تو ہم کو طعن کرتے ہیں۔ اللہ کا شکر
ہے ہم دعوتوں کے بھوکے نہیں اور نہ کسی کی تقریب میں شرکت کی اُمنگ
دلداری کو بھی جی چاہتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ معصیت کے مرتکب
ہوں جس کا دل چاہے ہم کو چھوڑ دے مگر ہم سے توقع نہ رکھے کہ خدا اور رسول
کو چھوڑ کر ان سے ملاپ کی خواہش رکھیں گے۔ حاجی اسمٰعیل صاحب اپنی عادت کے
موافق مسکرائے اور عرض کرتے تھے کہ حضرت بالکل صحیح ہے اور یہ نئی پود تو ایسی
آزاد اٹھی ہے کہ قوم کے بڑوں کا بھی ان کو لحاظ نہیں رہا جہاں شریعت کا ا
گیا وضعداری کا نام بھی جاتا رہا۔ ان سے کوئی درخواست ہی کرنا حماقت ہے
میں تانگہ لینے اٹھا تو حاجی صاحب نے فرمایا سواری موجود ہے حضرت اس
لیں جائیں گے حضرت نے فرمایا نہیں آپ کو تکلیف ہو گی۔ عرض کیا کہ حضرت میں

گھر تو اسٹیشن کے راستہ میں ہے میں ساتھ چل کر وہاں اتر لوں گا اور حضرت اسٹیشن پر چلے جائیں گے چنانچہ ریل کا وقت جب قریب آگیا تو حاجی اسمٰعیل صاحب حضرت کو اور مجھے لے کر اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور خود مکان کے قریب سڑک پر اتر کوچبان سے کہا اسٹیشن پر لے جاؤ۔

حضرتؒ کی یہ شرکت و دلداری اکثر جگہ بہتیری خرافات کی اصلاح کا سبب بن گئی اور جہاں ضد ہوئی وہاں اقل درجہ تبلیغ اور امر بالمعروف کے ساتھ اسکی تعلیم ضرور ہو گئی کہ دیندار کو کس پختگی و استقلال کا برتاؤ کرنے کی ضرورت ہے اور وہ مستحب معاشرت و دلداری کونسی ہے جس پر اجر کی توقع ہے اور مداہنت و کمزوری سے ممتاز ہے

خوشی کے مواقع پر مٹھائی وغیرہ کی تقسیم یا احباب و اعزہ کے جمع کرنے کو آپ منع نہ فرماتے اور سرور کی ان صورتوں پر آپ کو تشدد نہ تھا، یوں فرمایا کرتے تھے کہ جس بات کو دین سمجھکر کیا جائے حالانکہ وہ دین نہیں اس کا نام بدعت ہے اور اس پر تشدد ضرور ہے۔ مگر جن باتوں کو دنیا ہی سمجھکر کیا جاتا ہے ان کو بدعت کا درجہ دینا فرق مراتب سے غفلت ہے۔ نیز فرمایا کرتے کہ شرعی گنجائش پر عمل کر کے ملا جلا رہنا صلہ رحمی کو بھی قائم رکھتا ہے اور اکثر اصلاح کا بھی سبب بن جاتا ہے ورنہ اس زمانہ میں آزادی ایسی آگئی کہ ہم علیحدہ ہو کر بیٹھیں تو دوسروں کو پروا بھی نہ ہوگی وہ کہیں گے تم روٹھے ہم چھوٹے۔ اور اس طرح معاصی میں اور زیادہ ڈوبیں گے۔ اور فرمایا کرتے کہ پہلے زمانہ میں عوام محتاج تھے اور نائبین رسالت محتاج الیہ کہ جتنا بھی ان پر تشدد ہوتا وہ اس کا اثر لیتے پریشان ہوتے اور توبہ و رجوع کیا کرتے تھے مگر اب تو وہ زمانہ ہے کہ خود طالب بن کر گلے لپٹے رہو اور کچھ کام اصلاح کا نکال لو تو نکال لو ورنہ عوام کو اصلاح کی پروا تو کیا حس بھی نہیں ہے پس اصلاح امت کے لئے اللہ والوں کو خوشی کی خاطر نہ سہی رنگ بدلنے پڑیں گے کہ ؎ این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

ہاں معصیت کا ارتکاب کسی حال جائز نہیں ۔ اور فرمایا کرتے کہ پہلا منا رنگ
اختیار کرلے تو آج کوئی پاس بھی نہ پھٹکے۔ اس لئے ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کبھی
ان امور میں کبھی تشدد نہیں برتا۔ ذرا بھی کسی میں طلب پائی تو اپنے سے چپٹائے رکھنے
کی کوشش فرمائی۔ ہاں اپنے امور میں کسی خاص صورت کے پابند نہ تھے موقع
ہوا خرچ بھی کیا دعوت بھی دی زیورات اور کپڑے بھی دیئے اور اگر نہ ہوا تو سادہ
طریق پر نکاح کر دیا۔ خدام آپ کی اس سادگی کا نظارہ کرتے اور اس اصل کو سمجھ لیا
کرتے تھے کہ انسان دنیا میں اپنے اللہ کی اطاعت کے لئے آیا ہے اور یہی ایک
شے ہے جو ہر طرح مواظبت و اہتمام و پابندی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ باقی دنیا
محض اس لئے ہے کہ بقاء جسم اور حصول انبساط کا آلہ بن کر طاعت کی ماندگی و
کسل کو کھو دے۔ اس کا کوئی جزو بھی اہتمام کے قابل نہیں جیسا وقت پائے کر
گذرے اور مزاح و خوش طبعی کے درجہ میں کوئی خوشی بھی منالے تو مضائقہ نہیں
مگر اطاعت کا معمول ترک نہ ہو اور قلب کا سکون جس پر حلاوت و لذت دینی کا
مدار ہے جانے نہ پائے کہ آلہ آلہ بنا رہے اور مقصود مقصود۔ مولوی ظفر احمد
صاحب کا نکاح ہوا تو آپ نے فرمایا مولوی ظفر تمہارے گھر سے تو شاید ہم کو
یہ بلایا جائے گا کہ کسی کو بھی نہیں بلایا گیا مگر ہم ولیمہ کے دن خود ہی آئیں گے
چنانچہ جمعہ کو نکاح ہوا اور شنبہ کو حضرت خود ہی تھانہ بھون پہنچ گئے یہاں ولیمہ
بھی نہ تھا کہ دینی مصالح کی بنا پر حضرت مولانا تھانوی کا رنگ ان امور میں بھی تشدد
کا ہے جیسا کہ ہمیشہ اکابر میں رنگ کا اختلاف رہا ہے۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا میاں
ولیمہ تو سنت تھا یہ بھی نہ ہوا۔ عرض کیا حضرت ولیمہ بھی آجکل سنت کے موافق نہیں
ہوتا۔ اس لئے عملاً ظاہر کیا کہ یہ بھی ضروری نہیں ہے۔ ہاں خوشی کے طور پر مٹھائی
تقسیم ہوئی تھی۔ وہ حضرت کے لئے خاص اہتمام سے الگ لایا ہوں۔ مولوی ظفر احمد
صاحب شادی کے لئے جب سہارنپور سے چلنے لگے تو حضرت نے ان کو ایک صدری
عطا فرمائی جو ان کے شادی کے لباس سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔ مولوی ابراہیم خاں نے

آپ کو اپنے نکاح کی شرکت کے لئے ٹونک بلایا تو آپ تشریف لے گئے وہاں رسم ہے کہ جب دولہا نکاح کے لیے دلہن کے گھر جاتا ہے تو دولہن والے ساری بارات کو روک کر کھڑے ہوجاتے ہیں کہ جب تک منہ مانگا حق نہ دیدو گے جانے نہ دو گے چنانچہ حضرت بھی روک لئے گئے بندہ ساتھ تھا مسکرا کر فرمایا بھئی یہ مہمانوں کی اچھی قدر ہے کہ دو تو رہائی ملے ورنہ قید۔ ایک بوڑھے بزرگ عالم بھی ساتھ تھے وہ آگے بڑھے اور دولہن والوں نے کہا حضرت کو آپ چھوڑ دو اور تم دونوں فریق نمٹتے رہو۔ چنانچہ حضرت اور بندہ تو رہائی پاکر مکان پر آبیٹھے اور دولہا بچارہ گھنٹہ بھر بعد پہنچا۔

یہ واہیات باتیں حضرت کو ناگوار ضرور گزرتی تھیں مگر ہنس کر ٹال دیتے اور ان کا خرافات ہونا ظاہر فرما دیا کرتے تھے۔ حاجی احمد حسن صاحب کی دعوت پر آپ انبالہ گئے اور لڑکے و لڑکی کا نکاح جو بہت ہی سادہ ہوا تھا خود پڑھایا۔

اسی طرح آپ دوستوں کی غمی میں شرکت فرماتے اور صرف تحریر پر اکتفا نہ کرتے بلکہ جلد از جلد تشریف لانے کا اہتمام فرماتے کہ اس سے مصدوم کو تسلی بھی زیادہ ہوتی تھی اور اس کو حضرت سے تعلق بڑھ جاتا تھا جس کی وجہ سے تدریجاً رسومات میں بہت کچھ اصلاح ہو جاتی تھی۔ میری اہلیہ کا جس زمانہ میں انتقال ہوا تھا تو وبا پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت خود علیل تھے اور جگہ جگہ سے اعزہ و احباب کی وفات کی اطلاعیں آرہی تھیں۔ آپ فوراً تشریف نہ لاسکے مگر آپ کا یہ والا نامہ آیا۔

مکرم و محترم مدفیوضکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آج مجھ منشی حمید الدین کی زبانی اطلاع حادثہ انتقال والدہ محمود الٰہی مرحومہ معلوم ہو کر موجب کلفت ہوئی اس کے بعد ڈاک میں آپ کا خط پہنچا اور جس قدر خطوط ڈاک میں پہنچے کوئی بھی ایسا خط نہیں تھا جس میں کسی عزیز یا دوست کے حادثہ کی اطلاع نہ ہو خطوط پڑھ کر طبیعت اس قدر بے حس ہو گئی کہ کچھ صدمہ کا بھی احساس نہ رہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میری حالت یہ ہے کہ ہر وقت بخار کی حرارت رہتی ہے سینہ

جس کی وجہ سے چلنا پھرنا گیا اٹھنا بیٹھنا بھی دشوار ہے۔ ورنہ کیا ممکن تھا کہ
میرٹھ نہ آتا۔ اب سب کچھ سن رہا ہوں اور افسوس کہ ہل نہیں سکتا۔ بچوں کو
سخت صدمہ ہوگا۔ ابھی آپ تشریف آوری میں جلدی نہ کریں اور سب عزیزوں
کو دعوات سلام فرماویں۔ والسلام

فراست و ذکاوت آپ کی بے نظیر تھی۔ خدام اپنے تجارتی صنعتی معاملات اور طرح طرح کے مقدمات میں آپ سے مشورہ لیتے تو آپ یہ لکھکر کہ بندہ ان معاملات میں کیا مشورہ دے جن سے مناسبت و واقفیت نہیں ان کی تسلی کے لئے تحریر فرمادیتے کہ میرے خیال میں یوں کرلو۔ بارہا تجربہ ہوا کہ حضرت کی رائے صائب ہوئی اور انجام کار اسی میں فلاح و منفعت نکلی کہ اچھے اچھے تجربہ کار اور عقلاء حیران ہوگئے۔ یادداشت آپ کی اتنی قوی تھی کہ پچیس پچیس برس قبل صرف ایک مرتبہ ملاقات کرنے والے کو صورت دیکھتے ہی فوراً آپ نے پہچان لیا۔ ایک بار بندہ حاضر تھا کہ ایک عرب آئے آپ ان کو دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے اور بغلگیر ہوکر ملے پھر تعجب کے ساتھ مجھ سے فرمایا مولوی عاشق الٰہی پہچانا بھی؟ میں نے ان کو بغور دیکھا اور عرض کیا کہ حضرت میں نے نہیں پہچانا۔ فرمایا بھائی فلانے ہیں جو ۲۳ھ کے سفر حج میں فلاں جگہ ہم سے ملے تھے۔ وہ خود بھی حیران ہوگئے اور عرض کیا حضرت آپ نے خوب پہچانا حالانکہ اس وقت کی سرسری ملاقات کے بعد آج پچیس برس میں ملنا ہوا ہے۔ فرمایا ہاں بھئی بعض کو ایک دفعہ دیکھ لیا تو عمر بھر نہیں بھولا اور بعض کو بیس مرتبہ دیکھتا ہوں مگر بھول جاتا ہوں۔

خدام کے ساتھ آپ بہت بے تکلف رہتے ان کو ہنساتے قصے سناتے خوشدل بناتے اور کبھی کبھی مزاح بھی فرمایا کرتے تھے ایک بار فرمانے لگے ہمارے ایک چچا تھے بڑے زندہ دل اور مسخرے۔ زمین کے متعلق اپنے رشتہ داروں سے مقدمہ تھا عدالت سہارنپور میں مقدمہ ان کے حق میں فیصل ہوگیا۔ کچہری سے باہر نکلے تو ایک شخص جو فریق ثانی کا خیرخواہ تھا اینٹھتا جاتا ہوا ملا۔ اسی نے دریافت کیا پیر جی آج

مقدمہ میں کیا ہوا؟ سوکھا سا منہ بنا کر کہا میاں ہمارے گھر جا کر کہہ دیجو کہ جو اللہ کی مرضی تھی وہ ہو گیا صبر کریں۔ وہ سمجھا کہ یہ مقدمہ ہار گئے۔ دل میں بہت خوش ہوا۔ انتہے پہنچ کر ان کے ہاں پیام پہنچا دیا کہ مقدمہ ہار گئے اور فریق ثانی کے ہاں جا کر مبارک باد دی۔ ان کے ہاں تو رونا پیٹنا شروع ہو گیا اور فریق مخالف نے اگلے دن دعوت کا سامان کر کے دیگیں چڑھوا دیں ہارے ہوئے فریق جو گھر پہنچے تو دیگیں دیکھ حیران لوگ آآ کر مبارک باد دیتے تھے اور یہ ان کو گالیاں دیتے تھے اور ہمارے چچا کھڑے ہنستے تھے۔" ایک دعوت میں حضرت کے ہمراہ بعض مخلصین کھانا کھا رہے تھے ایک صاحب تبرک کے زیادہ شوقین تھے کہ جہاں حضرت نے ایک تشتری میں سے ذرا سا کھا کر دوسری تشتری کی جانب توجہ کی انہوں نے حضرت کے سامنے سے جھٹ تشتری اٹھا کر خود کھانا شروع کر دیا اور کہا حضرت کا تبرک" اس طرح زردہ پلاؤ فرینی کئی تشتریوں پر انہوں نے ہاتھ صاف کیا۔ آخر میں حضرتؒ نے دال کی تشتری بھی انہیں کے آگے سرکا دی اور فرمایا لو دال کا تبرک بھی تو کھاؤ۔" مولوی ظفر احمد صاحب کے لڑکا تولد ہوا تو حضرت نے فرمایا مولوی ظفر ہم نے تمہارے بچے کا تاریخی نام سوچا ہے مرغوب احمد۔ مگر حساب کر کے تم خود دیکھ لو کتنے عدد ہوتے ہیں۔ انہوں نے حساب لگایا اور عرض کیا حضرت آٹھ عدد زیادہ ہیں۔ بیساختہ فرمایا بس ب اور و کو حذف کر دو مرغ محمد تاریخی نام ہے۔ لوگ اس پر ہنسنے لگے تو فرمایا میاں کلاب علی سے تو مرغ محمد بہر حال اچھا ہے۔" شعر تصنیف کرنے یا پڑھنے کی آپ کو عادت نہیں تھی۔ حالانکہ ادب میں آپ کو مہارت کاملہ تھی کہ صدہا اشعار عربی کے آپ کو یاد تھے۔ ایک بار عمرہ لانے کے لئے آپ پیدل مسجد تنعیم تشریف لے گئے اور مجھے ساتھ لیا۔ راستہ میں آپ نے بیسیوں اشعار حماسہ اور متنبی کے سنائے اور ادبیت و فصاحت عرب کا کمال بیان فرماتے چلے گئے۔ مجھے حیرت تھی کہ یوں کبھی حضرت کو شعر پڑھتے نہیں سنا مگر ماشاءاللہ حضرت کو خوب یاد تھے۔ عربی بولنے پر حضرت کو پوری قدرت تھی اور کمال تھا کہ اہل عرب و اشراف سے نحوی عربی بولتے تھے اور بدوؤں سے بدوانی۔ آپکو

کبھی تعب کے بعد بدن دبوانے کی عادت تھی اور وہ بھی زور و قوت کے ساتھ کہ جو شخص دبانا جانتا تھا بس وہی دبا سکتا تھا ورنہ بجائے راحت کے تکلیف ہوتی تھی ایک بار بندہ نے بدن دبانا شروع کیا فرمایا بھئی تمہیں بدن دبانا نہیں آتا رہنے دو۔ میں نے عرض کیا حضرت مجھے معلوم ہے کہ بدن دبانا نہیں آتا مگر برکت کے لئے ہاتھ مس کرنے کو اور اس زمرہ میں شامل ہونے کو دل چاہتا ہے۔ فرمانے لگے ایک ملا تھے اپنے شاگردوں سے بدن دبوانے کے بڑے عادی تھے۔ وہ حج کو گئے اور جب واپس آئے تو خادموں نے پوچھا حضرت ہمیں یاد بھی رکھا تھا؟ فرمایا ہاں نہیں تو کسی وقت بھی نہیں بھولا۔ عرض کیا حضرت ہمارے لئے دعا بھی فرمائی؟ کہا ہاں دعا بھی کرتا تھا اور کوستا بھی تھا۔ عرض کیا حضرت یہ کیوں؟ فرمایا جب بدن میں درد ہوتا اور کوئی دبانے والا نہ ملتا تو کوستا تھا کہ نہ تم عادی بناتے نہ یہ تکلیف ہوتی۔

آپ اسپرٹ آمیز چیزوں سے وحشت کھاتے تھے۔ جب آپ کے دانت گر گئے اور تلاوت و درس میں صحیح الفاظ نکلنے دشوار ہو گئے تو آپ نے مصنوعی دانت بنوائے۔ مابچہ دہن کا لینے کے بعد آپ کو معلوم ہوا کہ یہ اسپرٹ سے پکایا گیا ہے تو آپ نے نفرت ظاہر فرمائی اور پانی منگا کر کلیاں کیں۔ پان آپ بہت کم کھاتے تھے اور وہ بھی نہایت کم چونہ کا۔ ہاں الائچی آپ کو زیادہ مرغوب تھی کہ بعض دفعہ چھالیہ کی جگہ اس کے دانے استعمال فرماتے اور جب خطبہ نکاح پڑھتے یا کسی کو بیعت کرتے تو کلی ضرور کر لیا کرتے۔ پان کھائے ہوئے ذکر اللہ آپ کو پسند نہ تھا۔ طبیعت آپ کی اس درجہ لطیف تھی کہ تمباکو کھانے والوں سے بات کرنا آپ کو مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ دہن سے نکلنے والی بو برداشت نہ کر سکتے تھے اور زبان سے بھی کچھ نہ فرما سکتے تھے۔ قیلولہ کا بھی آپ کو زیادہ اہتمام تھا کہ اس سے شب کے جاگنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ امانت کی حفاظت آپ کی مشہور تھی کہ بجنسہ پوٹلی یا پڑیہ میں باندھ کر مالک کا نام اس پر لکھ دیتے اور کہیں

سفر نہیں مدرسہ کے لیئے کچھ ملتا تو جلد سے جلد اس کو مدرسہ میں داخل فرما دیتے
تھے۔ مدینہ منورہ میں آپ کو کسی نے ہدیہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے تو بحمد اللہ ضرورت
نہیں۔ ہاں مدرسہ کو بیشک ضرورت ہے۔ عرض کیا بہتر مدرسہ میں دیدیجئے۔ مجلس
سے اُٹھتے ہی آپ اول مولوی سید احمد صاحب کے پاس آئے اور رقم عطا فرما کر کہا اس کو
جمع کر لو۔ وعظ و تقریر کرنے کی آپ کو عادت نہ تھی۔ میں نے آپ کا صرف ایک
وعظ سُنا ہے جو سیر دھنہ میں خدام کے اصرار پر گھنٹہ بھر ہوا تھا۔ ہر امر میں اتباع
سنت آپ کی عادت تھی کہ کسی وقت بھی تبدل نہ ہوتا تھا۔ مدرسہ کی ایک ضرورت
کے لیئے آپ نے بندہ کے ساتھ ایک بار مولوی یحییٰ صاحب سہسرامی کو کلکتہ بھیجا تو میرے
نام تحریر فرمایا۔ السلام علیکم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَ بَشِّرَا
وَلَا تُنَفِّرَا وَ تَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا۔ فقط والسلام خلیل احمد عفی عنہ۔ کاندھلہ میں کسی خادم نے
اپنے باغ کے درخت کا پہلا پھل آپ کو پیش کیا تو آپ نے حدیث کی دعا پڑھی اور
چھوٹا بچہ سامنے کھڑا دیکھا اس کو عطا فرما دیا۔ آپ کی نواسی کی عمر تین سال کی تھی گھٹنوں
چلتی تھی کسی نے گھر میں سے لا کر اس کو مدرسہ میں فرش پر بٹھا دیا اور وہ گرتی پڑتی
لڑھکتی آپ کی طرف چلی۔ آپ نے آگے بڑھ کر اس کو اُٹھایا اور گود میں بٹھا کر خوب
پیار کیا۔ پھر گود میں لیئے اس کو مکان لے گئے۔ شب کو سُرمہ آپ اہتمام سے لگاتے
اور ہر آنکھ میں تین تین سلائی یک رُخی استعمال فرماتے تھے۔ حجرہ میں آپ کے بخور روشن
کی جاتی اور کواڑ بند کر دیئے جاتے تھے۔ یہ آپ کو عطر سے زیادہ پسند تھی کہ کئی
کئی دن حجرہ مہکتا رہتا۔ بچوں کو آپ بے تکلف گود میں بٹھاتے اور وہ پیشاب
کر دیتے تو غصے نہ ہوتے تھے۔ رحمتی آپ کی خادمہ گھر میں روٹی پکاتی تھی۔ اسکا شیر خوار
بچہ روتا تو آپ اس کو پاس بٹھا لیتے۔ وہ روٹی پکانے میں رہتی اور آپ بچے کو بہلایا
کرتے۔ گھر والے کہتے بھی کہ پیشاب کر دے گا۔ فرماتے کیا حرج ہے دھو ڈالیں گے۔
ایک بار آپ مصلے پر بیٹھے ہوئے تھے اور بچے کو پاس بٹھا رکھا تھا کہ اس نے پیشاب
کیا اور کپڑوں کے ساتھ مصلے پر بھی چھینٹیں پڑیں۔ کسی نے بچے کو دھمکایا اور تیزی

ہے کہا بھلا اب قالین کا مصلّٰے کیسے دھلے گا۔ آپ کو یہ غصّہ گراں گذرا اور فرمایا تجھ کیا جانے کہ مصلّٰے ہے یا ٹاٹ۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو میں خود دھو لوں گا۔" کھانے کے اوّل کوئی ہاتھ نہ دھوتا اور کہتا کہ میرے ہاتھ پاک یا دھلے ہوئے ہیں یا ابھی وضو کر کے آیا ہوں تو فرماتے یہ تو کھانے کی سنت ہے۔ طہارت یا نظافت کے لئے نہیں ہے۔ مُسلمان جب کھانا کھائے تو یہ نیت اداءِ سُنّت اول بھی ہاتھ دھوئے اور بعد میں بھی۔ اسی طرح پانی یا چائے کوئی بائیں ہاتھ سے پیتا تو آپ کو بہت گراں گذرتا۔ اور وہ عذر کرتا کہ حضرت داہنا ہاتھ کھانے میں ملوث تھا تو اور زیادہ خفا ہوتے کہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ وہی کھا رہے ہیں اور اسی کا گلاس کو لگانا عیب سمجھتے اور گھنیاتے ہیں۔ دسترخوان آپ کا چمڑے کا تھا یا مدنی گول چٹائی کا جس کو سُفرہ کہتے ہیں اور اسی پر کھانا آپ کو مرغوب تھا۔ سیب انگور خوبانی یا اور کوئی پھل کوئٹہ وغیرہ کی طرف سے آتا تو آپ دوستوں کا انتظار دیکھتے اور باہر سے مخلصین آتے تو باہتمام گھر سے لا کر ان کے سامنے رکھتے۔ کبھی خود چھیلتے اور تراش کر دوستوں کو دیتے اور بمحبت و پیار و اصرار کے ساتھ کھلاتے۔ ہمیشہ سوتے وقت چراغ گل کر دیتے اور دیا سلائی کا بکس سرہانے رکھتے تھے۔ مٹّی کے تیل کی بُو ناگوار تھی اس لئے صرف راستہ میں آتے جاتے اس سے کام لیتے اور آخر شب میں موم بتی روشن فرمایا کرتے تھے سفر میں استنجے کیلئے کچے ڈھیلے اور ٹین کا ہلکا سفری لوٹا ضرور ساتھ ہوتا تھا اور ناواقف کو لوٹا دینا آپ کو ناپسند تھا ایک دفعہ ریل کے سفر میں آپ وضو کر رہے تھے کہ کسی نے لوٹا مانگا آپ نے فرمایا میں آپ کو کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ یہ کہکر آپ نے لوٹا تپائی کے نیچے رکھدیا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ وہ تاک میں تھے اور جب دیکھا کہ نماز شروع کر دی تو تپائی کے نیچے سے لوٹا اُٹھایا آپ نے نیت توڑ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا کہ یہ کیا بے عنوانی ہے۔ وہ بولے واہ واہ ذرا لوٹا دینے میں اتنا بخل کہ نماز توڑ دی۔ فرمایا نماز تو ٹوٹنے کے بعد پھر پڑھ جائے گی مگر لوٹا جانے کے بعد آنا مشکل ہے۔ اور اس کے بغیر سارے سفر میں مجھے جو تکلیف ہوگی وہ مجھ ہی کو بھگتنا

پڑے گی۔ بخل کا طعن سُننا منظور مگر وضو نماز کی تکلیف منظور نہیں۔ آخر کھسیانے ہو کر بڑبڑاتے چلے گئے اور آپ نے پھر نماز کی نیت باندھ لی۔ ملاقات میں اکثر آپ معانقہ فرمایا کرتے اور مسکراتے ہوئے اُٹھ کر آنے والے کو چھاتی سے چپٹا لیتے تھے سلام میں ابتدا اکثر آپ کی طرف سے ہوتی اور کوئی اس کا جواب آہستہ سے دیتا کہ آپ نہ سنتے تو ناراض ہوتے اور فرماتے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ ایسا تو ہو کہ دوسرا سُن لے۔ کوئی بچہ سلام کر کے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو آپ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے اور دُعا دیتے بارک اللہ وعمرک اللہ واصلحک اللہ۔ گھر میں تشریف لے جاتے تو اس خیال سے کہ شاید کوئی اجنبی عورت ہو دروازے پر ٹھہرے ہو کر فرماتے میں آؤں، اور جب پردہ ہو جاتا تو السلام علیکم کہتے ہوئے اپنے کوٹھے میں تشریف لے جاتے۔ عورتوں میں اس مسنون سلام کا رواج بہت کم ہے۔ اس لئے آپ اس کی اصلاح فرماتے اور کہتے کہ کسی نے ہمارے سلام کا جواب نہ دیا؟ ایک نے کہا کہ شرم آتی ہے۔ فرمایا دین میں کیا شرم۔ یہ تو ضعف ایمان ہے اس کا نام شرم کس نے رکھا۔ چنانچہ رواج چل نکلا اور عورتیں بھی وعلیکم السلام سے جواب دینے لگیں۔ ایک مرتبہ آپ سلام کرتے ہوئے گھر میں تشریف لائے تو عورتوں نے بجائے وعلیکم السلام کے السلام علیکم کہا گویا پیر کو خود سلام کیا۔ فرمایا کیوں ہمارا سلام قابلِ قبول نہیں تھا جو اس کا جواب نہ دیا؟ عرض کیا حضرت چھوٹوں کو سلام میں ابتدا کرنا چاہیئے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ حضرت کے آتے ہی خود سلام کریں گے مگر حضرت اس کا موقع ہی نہیں دیتے اور ہم اپنے عزم پر جلدی سے السلام علیکم کہتے ہیں۔ فرمایا اس میں چھوٹا بڑا کیا تھا سنت تو یہ ہے کہ آنے والا اول سلام کرے اس لئے اس کا جواب دو وعلیکم السلام۔ آپ کو پردہ میں تشدد تھا اور جب گھر میں عورتوں کا مجمع ہوتا تو باوجود پردہ ہو جانے کے آپ مُنہ پر رومال ڈال کر آتے اور پیٹھ پھیر کر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عورتوں نے حضرت کی اہلیہ سے کہا کہ حضرت تو اطلاع کرا کے اور پردہ کرا کے آتے ہیں پھر پردہ کے پیچھے پیٹھ پھیر کر

بیٹھتے ہیں؟ یہ بات حضرتؒ کے کان میں بھی پڑی تو آپ نے فرمایا بعض جاہل عورتوں کا خیال ہوتا ہے کہ پیر کی صورت دیکھنا ضروری ہے اور ثواب ہے۔ بلکہ بعض تو دلیل بھی لاتی ہیں کہ صورت نہ دیکھی تو قیامت کے دن پیر کو پہچانیں گے کیسے؟ اس لئے میں احتیاط کرتا ہوں۔ اور اب تو اس کا ثبوت بھی مل گیا کہ میرا خیال ٹھیک ہے ورنہ بغیر جھانکے انہیں خبر کیسے ہوئی کہ میں بیچھ پھیرے بیٹھا ہوں" ہاں پردہ کے پیچھے سے بات کرلینے کی اجازت تھی اس لئے جو کچھ کہنا یا مسئلہ پوچھنا ہوتا تو وہ حضرت سے خود کہہ لیتیں۔ مگر اس میں بھی اتنی احتیاط تھی کہ یا اماں جی پاس ہوتیں تب آپ بات کرتے یا عورت کا محرم حضرت کے پاس بیٹھا ہوتا۔

عورتوں کو بات سمجھانے میں حضرت ان کے فہم کی رعایت زیادہ فرماتے اور بہت سادہ و صاف لفظوں میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ عورت کا بغیر محرم کے سفر کرنا کھڑا جوتا یا مردانہ صدری پہننا اور نامحرم کے سامنے آنا حضرت کو بہت ناگوار گزرتا تھا۔ ایک دفعہ کسی نے کھڑا جوتا پہننے کی بابت دریافت کیا آپ نے فرمایا حرام ہے۔ انہوں نے بہتیرے عذر پیش کیئے کہ سفر میں بھدّی جوتی سے چلنا مشکل ہے کہ پاؤں سے نکل نکل جاتا ہے۔ مگر حضرت نے ایک نہ سنی آخر میں فرمایا اچھا میں تم سے پوچھتا ہوں اگر ایڑی میں زخم ہو جائے تو کیا کرو گی؟ عرض کیا وہ مجبوری ہے ایڑی دبا کر دھجی باندھ لیں گے۔ فرمایا پھر آخرت کا عذاب تمہارے خیال میں دنیا کے زخم سے بھی کم ہے۔ حدیث میں آیا ہے ایک شخص ایسا ہوگا کہ قیامت کے دن اس کو صرف آگ کے جوتے پہنائے جائیں گے اور دوزخ میں نہ ڈالیں گے۔ اس کا حال یہ ہوگا کہ دماغ اس کا مثل ہانڈی کے پکیگا اور وہ سمجھے گا کہ میرے برابر کسی کو بھی تکلیف نہیں۔ یہ مضمون حضرت نے اس طرح بیان فرمایا کہ سننے والیاں رونے لگیں اور توبہ کی کہ آئندہ مردانہ جوتا کبھی نہ پہنیں گے۔ اس کے بعد واسکٹ اور مردانہ صدری کا ذکر ہوا۔ آپ نے فرمایا یہ بھی ناجائز ہے اور جس میں بھی مردانہ صورت وضع حاصل ہو وہ عورت کے لئے حرام ہے۔ کسی نے ایک عالم کی بیوی کا حوالہ

دیگر کہا فلاں کو ہم نے پہنے خود دیکھا ہے۔ فرمایا کسی کا نام لینے سے کیا حاصل۔ جو چیز ناجائز ہے وہ کسی کے بھی پہننے سے جائز نہیں ہو سکتی۔ اگر دنیا میں ایک نفس بھی حلال و حرام پر عمل کرنے والا نہ رہے تب بھی جو چیز حلال ہے وہ حلال ہے اور جو حرام ہے وہ حرام ہے۔ صرف جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فعل اور عمل البتہ حجت ہے۔ آپ کی بیبیوں کا فعل بھی حجت نہیں۔ پھر مولانا کی بی بی اور میری بی بی کی تو ہستی کیا ہے۔ اللہ میاں کے سامنے کوئی یہ کہکر سرخرو نہ ہو سکے گا کہ میں نے ازواج مطہرات کے فعل پر عمل کیا تھا۔ ایک عورت نے مسئلہ پوچھا کہ حضرت پھوپھی اور خالہ کی زندگی میں تو پھوپھا اور خالو کے سامنے آجاتے ہیں کوئی حرج نہ ہونا چاہیے کیونکہ پردہ تو اُن سے کرنا چاہیے جن سے نکاح جائز ہو۔ حضرت نے فرمایا اچھا اگر سارے مرد چار چار نکاح کرلیں کہ ان کے ہوتے ہوئے پانچویں سے نکاح کرنا اسے ناجائز ہے تو ان سب کے سامنے آنے لگو گی؟ عرض کیا نا حضرت یہ کیسے طرح ہو سکتا ہے؟ فرمایا پھر اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ خالو اور پھوپھا کے سامنے آؤ۔

عورتوں کا اپنی اولاد کو کوسنا آپ کو نہایت ناگوار تھا اور آپ تشدد کے ساتھ اس کی نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ زبان سے جب کوئی لفظ نکالو تو اچھا لفظ نکالو۔ بددعا اگر پوری ہوگئی تو سر پکڑ کر روؤگی۔ عورتیں عرض کرتیں کہ حضرت جب بچے ستاتے ہیں تو کوسنا ہی زبان سے نکلے ہے۔ فرمایا تمہیں بھی تمہاری ماؤں نے پالا ہے وہ تم کو کوستیں تو آج نہ تم زندہ ہوتیں نہ اولاد کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی۔ اور موت زندگی تو اللہ کے اختیار ہے مثل مشہور ہے۔ کوؤں کے کوسے ڈھور نہیں مرتے مگر بُری بات زبان سے بکنے کی جب عادت ہوجاتی ہے تو اس کی نحوست سائے سے گھر کو گھیر لیتی ہے اور ایسی بد زبان عورت کبھی خوشحال نہیں رہ سکتی۔ شوہر کی اطاعت کا آپ عورتوں کو خاص طور پر امر فرماتے اور اس کی زیادتیوں پر صبر و تحمل کی تلقین فرما کر کہتے کہ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے یہاں نہیں تو آخرت میں اس کا مزہ پاؤگی۔ عورتیں اکثر آپ سے اپنے دُکھ درد کی لمبی چوڑی کہانیاں گھنٹوں کہتی تھیں نہ آپ

سب کی سُنتے اور تسلّی و تسکین دلاتے۔ بلکہ خاص تعلق والوں سے نام لے کر خود پوچھا کرتے کہ کہو بیٹی کوئی بات تو کہنا نہیں۔ آخری سفر سے قبل جگہ جگہ سے حضرت کی خادمات حاضر ہوئیں اور آپ نے شفقت پدرانہ کے ساتھ رخصتی وصیتیں ان کو فرمائیں۔ میری اہلیہ بھی حاضر تھی مگر خاموش۔ بعد تہجد اس کو حضرت نے پردہ کے پیچھے بلا کر فرمایا بھئی تم نے کچھ نہ کہا تم بھی تو کچھ کہہ لو۔ عرض کیا حضرت مجھے تو کچھ کہنا نہیں اور کہنا ہے بھی تو ہمت نہیں۔ حضرت نے باصرار فرمایا کہ نہیں ضرور کہو۔ عرض کیا حضرت کہنا یہ ہے کہ یہاں تو آپ کی پدرانہ شفقت دیکھکر ماں باپ کو بھول گئی۔ کہ جب چاہتی ہوں بے تکلف آتی اور میکہ سمجھکر رہتی ہوں۔ اب اپنے اللہ سے ملنے کا وقت قریب آگیا بس یہ دعا فرما دیجئے کہ وہاں بھی اس قابل رہوں کہ جب چاہوں اسی یگانگت کے ساتھ حضرت کے محل میں آسکوں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کہیں ہوں اور میں کہیں یہ سُنکر حضرت پر ایک کیفیت طاری ہو گئی چشم نم ہوئے اور چند منٹ خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ بھئی خدا کرے دونوں کو ایمان کے ساتھ دُنیا سے اُٹھنا نصیب ہو تو انشاء اللہ وہاں بھی ایک ہی جگہ رہیں گے ۔ چھوٹی لڑکیاں آپ کے پاس آجاتیں تو آپ ان کے سر پر ہاتھ رکھکر ان کو پاس بٹھا لیتے نام پوچھتے اور میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتے۔ ان کے لباس میں کوئی غیر مشروع یا انگریزیت کی وضع پاتے تو انھیں سے فرماتے یہ کپڑے تمہاری اماں نے پہنائے ہوں گے ۔ بُری وضع ہے اماں سے کہو ہمیں مسلمانوں کے سے کپڑے پہناؤ۔ پھر مٹھائی وغیرہ کوئی چیز ہوتی تو آپ ان کو دیتے اور یہ لینے میں جھجکتیں تو ماں سے کہتے بھئی انہیں اجازت دو ہماری درخواست تو منظور نہیں ہوتی۔

لڑکیوں کو آپ بیعت نہ فرماتے البتہ حامد یار خاں بریلوی کی لڑکی نفیسہ کو جس کی عمر ۶ برس تھی جب والدین کے ساتھ مدینہ منورہ حاضر ہوئی تو یہ فرما کر کہ میں نے لڑکیوں کو کبھی بیعت نہیں کیا مگر تجھے ضرور کروں گا، بیعت میں شامل فرما لیا جس پر وہ فخر کیا کرتی ہے۔ عملیات سے آپ کو مناسبت نہ تھی ہاں کوئی

درخواست کرتا تو تعویذ لکھدیا کرتے اور سائل کی ضرورت کے موافق جو آیت شریف یا حدیث اس وقت ذہن میں آتی وہ کاغذ پر تحریر فرما کر ان کو دیدیتے تھے کہ موم جامہ کر کے گلے میں ڈال لو یا بازو پر باندھ لو۔ ایک دفعہ کوئی صاحب آئے اور عرض کیا گھر والی کو چھاتی میں دودھ رُک جانے کی وجہ سے کل تمام دن اور رات بھر تکلیف رہی اور اس وقت تو درد و کرب کا ٹھکانا ہی نہیں۔ حضرت کوئی عمل بتائیں۔ فرمایا بھائی مجھے عمل وغیرہ تو آتا نہیں۔ صرف اللہ کا نام آتا ہے کہو تو پڑھ دوں ورنہ کسی عامل کو تلاش کر لو۔ انہوں نے معافی مانگی اور عرض کیا حضرتؒ عجلت میں زبان سے نکل گیا مقصود صرف دعا کرانا ہے۔ آپ نے پانی منگا کر اس پر دم کیا اور ان کو دے دیا۔ وہ کہتے تھے کہ دو ہی گھونٹ کے پلانے سے مریضہ کی تکلیف رفع ہو گئی اور دودھ جاری ہو گیا۔ پانی پر دم کرنے کے بعد آپ اس میں سے ایک گھونٹ خود پی لیا کرتے تھے کہ سؤر بن جائے جس کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے شفا فرمایا ہے۔ اکثر آپ بچوں کی بدخوابی دودھ نہ پینا اور زیادتی گریہ وغیرہ کی شکایت پر یہ لکھا کرتے تھے اُعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق وصلی اللہ تعالیٰ علےٰ خیر خلقہ محمد و آلہٖ وبارک وسلم۔ اور عام امراض کے لئے اکثر آپ حروف سریانی کا یہ مشہور تعویذ لکھتے تھے ٥ ااا ح H ااااھ ماجبں کو عامل ١٥ کا تعویذ بتاتے اور اس رباعی سے ادا کرتے ہیں ؎

صفر و سہ الف، سا ثیا نے بر سر ۔ جیم کج و کور نردبانے بدو در
چہار الف مساوی ہا و واو معکوس ۔ ایں ست ز اسمائے الہ اکبر

کبھی تو دل جمیل سے کوئی گنڈہ بھی بنا دیتے یا اجازت دے دیا کرتے تھے کہ ہمارے خاندان میں یہی معمول ہے۔ اس کو دیکھکر خود گنڈا بنا لو۔ ایک مرتبہ دفع سحر کے لئے خصوصیت کے ساتھ آپ نے مجھے اس کی اجازت دی کوئی شخص معوذتین برابر تین شب بہ نیت زکوۃ پڑھے اور تین روزے بھی رکھے۔ اگر ان ایام میں ایک

اناج کھائے تو اچھا ہے۔ بعد زکوٰۃ صبح و شام بہ نیت رد سحر تین تین بار پڑھکر مریضہ پر دم کرے انشاء اللہ سحر دفع ہوگا اور ساحر ہلاک۔ آپ خود پڑھیں یا کسی محتاط سے پڑھوائیں۔ نیز اس کے ساتھ دوسرا عمل تحریر فرمایا سُبحان اللہ القادر القاھر القائم الکافی اعوذ من شر عند وھو اقوی منی برب ھو اقوی منہ۔ یہ دُعا اگر مریضہ پڑھ سکے فبہا ورنہ آپ پڑھ کر اس پر دم کریں تعداد ۱۱۱ بوقت دفع ہر بلا اور رد سحر کے لئے بھی نافع ہے فقط۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ حضرتؒ کا وجود باجود مستقل تعویذ تھا اور کوئی مشکل کیسی ہی ان حل ہو جب آپکی خدمت میں پیش کی جاتی اور آپ کا اس سے دل دُکھتا تو ایسی جلد حل ہوتی تھی گویا بادل پھٹا اور غبار صاف ہوتا گیا۔ میرا تیس ۳۰ سال کا تجربہ ہے کہ جب کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا تو کچھ نہ سُوجھتا بجز اس کے کہ حضرت کو صاف صاف لکھوں بارہا ایسا ہوا کہ خط لکھکر ڈاک میں ڈالا اور قلب کو سکون ہوکر بادل پھٹنا شروع ہوگیا۔ ورنہ حضرت کا جواب آنے پر تو امن و یسیر نصیب ہو ہی جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اہل وطن شیعہ ہیں میرے خلاف شورش برپا ہوئی اور اتفاق سے کوتوال شہر شیعہ آگیا جن پر نازاں ہوکر انھوں نے کوشش کی کہ مجھ پر آفت آئے میں نے پریشان ہوکر وطن چھوڑنا چاہا اور حضرت کو لکھا تو جواب آیا بالکل نہ ڈرو۔ دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تراست۔ وطن کیا محلہ بھی چھوڑنے کی ضرورت نہیں میں دعا کرتا ہوں انشاء اللہ بال بھی بیکا نہ ہوگا اور دشمن خائب و خاسر ہوگا بس میرے لئے تو لاکھ تعویذ کا یہی ایک تعویذ تھا کہ دل کو اسی وقت سکون ہوگیا اور چند ہی روز گذرے تھے کہ کوتوال کا بدنامی کے ساتھ تبادلے کا حکم آگیا مولوی لطیف احمد صاحب لکھتے ہیں بندہ جب سنہ۱ھ میں ضلع سورت میں ملازم ہوکر آیا تو ایک دیندار شخص حافظ عبدالرحیم نام آئے اور کہنے لگے تم مولانا خلیل احمد صاحب سے بھی واقف ہو؟ میں نے کہا خوب اچھی طرح۔ کہنے لگے مولانا کی ہستی اس وقت بے نظیر ہے بارہ ۱۲ سال ہوئے مجھے ایک مصیبت پیش آئی اور میں گھبرا گیا غیبی مدد کہ ایک

ردی کاغذ پڑا پایا۔ اس کو اٹھا کر دیکھا تو اس میں لکھا تھا مولوی خلیل احمد مستجاب الدعوات ہیں اور ان کی کوئی دعا رد نہیں ہوتی۔ اس وقت میں نے مولانا کو جوابی خط لکھا اور اپنی مصیبت کا حل چاہا۔ ادھر جواب آیا اور ادھر میری مشکل حل ہو گئی اس وقت مجھے پھر حضرت کو خط لکھوانا اور دعا کرانی ہے۔ چنانچہ میں نے ان کی طرف سے خط لکھا اور چونکہ میں بھی اس وقت سخت مشکلات میں مبتلا تھا اس لئے وہ بھی لکھیں۔ حالانکہ اس وقت تک مجھے حضرت سے بیعت کا تعلق نہ تھا مگر حضرت کا جواب مسرت بخش آیا اور اس کے آنے کی ہی دیر تھی کہ ان کا اور میرا کام ایسا ہوا کہ خود مجھے بھی تعجب ہے۔ پھر بندہ بیعت بھی ہوا اور کچھ مدت بعد حضرت راندیر تشریف لائے تو حضرت نے انتہی شفقت فرمائی کہ آدمی بھیجکر مجھے اطلاع دی اور یاد فرمایا۔ بندہ زیارت کے لئے حاضر ہوا اور اس علاقہ کی بدعات سے وحشت کا تذکرہ کیا۔ فرمایا بھائی تم لوگ تو اب بڑے آرام میں ہو۔ پہلے اس علاقہ میں ہو کر ہم لوگوں کا جانا بھی مشکل تھا۔

بے روزگاری یا قرض کی شکایت پر آپ ۱۱۱ بار یا مغنی پڑھنے کو فرمایا کرتے کہ اول آخر گیارہ بار درود شریف اور مقدمہ وغیرہ کی پریشانی پر حسبنا اللہ و نعم الوکیل بعد عشا ۵۰۰ بار۔ مرض لاعلاج کے متعلق فرماتے کہ سفید طشتری پر سورۂ فاتحہ مع بسم اللہ لکھکر یَا حَیُّ حِیْنَ لَا حَیَّ فِیْ دَیْمُوْمَۃِ مُلْکِہٖ وَ بَقَائِہٖ یَا حَیُّ لکھا جائے اور آب جاری یا زمزم میں گھول کر قبل طلوع آفتاب چالیس دن متواتر مریض کو پلایا جائے۔ ایک شخص پر کوئی سنگین مقدمہ تھا آپ نے فرمایا کچہری میں جانے سے قبل تین یا سات دفعہ سورۂ قریش پڑھکر سینہ پر دم کرو اور پھر بسم اللہ کہکر اندر قدم رکھو۔ آپ کا کسی کو کچھ بتا دینا ہی علامت تھی انشاء اللہ کامیابی مقدر ہے اور ان سب کی اصل آپ کی دعا و توجہ تھی کہ ایک مقبول بندہ اپنے آقا سے عرض کرتا اور قبولیت اس کا استقبال کیا کرتی تھی۔

حافظ فخر الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں ایک جوان لڑکا اپنے والدین سے

بیزار ہو کر کہیں نکل گیا اور مدت سے پتہ نہ تھا کہ کہاں ہے۔ اس کی ماں بے حد پریشان تھی۔ میں نے حضرت کی خدمت میں لکھا تو آپ نے ایک آیت تحریر فرما دی کہ اس کو مکان میں کسی اونچی جگہ پر لٹکا دیں یا رکھدیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا اور دوسرے تیسرے دن لڑکا آ گیا۔ اور کہنے لگا دو روز سے طبیعت بے چین تھی کہ کسی طرح گھر چل کر ماں سے ملوں۔ آج بازار میں کسی ضرورت سے نکلا تھا کہ بے اختیار اسٹیشن کی طرف کو مڑ لیا اسی وجہ سے نہ کوئی سامان سفر ساتھ ہے نہ کپڑے بدل سکا "

ایک شخص اپنی عورت کو بہت مارتا اور تکلیف پہنچاتا تھا۔ بندہ نے حضرت کی خدمت میں لکھا۔ حضرت نے ایک تعویذ روانہ فرمایا کہ عورت اس کو بازو پر باندھے یکدم شوہر کی حالت بدل گئی اور ہر طرح کا پیار اخلاص ہونے لگا مگر عرصہ گذر جانے پر عورت نے وہ تعویذ بے پروائی سے گم کر دیا تو پھر وہی پہلی حالت لوٹ آئی اور رات دن بیچاری کی درگت ہونے لگی۔ ایک بار میں نے اپنے ایک عزیز کی اہلیہ سے ناموافقت کا تذکرہ کر کے حضرت سے دعا کی درخواست کی مگر حضرت نے جواب دیا کہ بھائی اپنے ہی قلب پر قابو نہیں ہے۔ دوسرے کے قلب کو کوئی کیونکر پھیر سکے جو مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا۔ یہ سنکر بندہ بالکل مایوس ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر طلاق و انقطاع کلی کی نوبت پہنچی۔ حضرت کے ایک ذاکر شاغل خادم ایک مدرسہ میں مدرس تھے ان کو امرد لڑکے سے تعلق ہو گیا کہ اسکی صورت دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا۔ ہر چند کہ معصیت کا وسوسہ بھی نہ تھا مگر رات بھر گھر سے باہر جنگل میں ٹہلا کرتے کہ اس تصور نے ان کے قلب کو گھیر لیا۔ میں نے ان کو میرٹھ بلایا اور اتفاق سے وہ میرے بہر اور اصرار پر عین اس وقت پہنچے کہ حضرت تشریف فرما تھے۔ شرم و خوف کے مارے وہ حضرت کے سامنے نہ گئے اور واپسی کا عزم کیا۔ میں نے ان کو نیچے مسجد میں بٹھایا اور طرح طرح کی ملاطفت کی پھر حضرت کو سارا حال سنایا اور بالحاح عرض کیا کہ حضرت ان کے ساتھ مجھے محبت ہے اور مرض

لاعلاج ہے اللہ واسطے خاص توجہ فرمائیں۔ بار بار عرض کیا مگر حضرت ٹالتے رہے آخر ارشاد فرمایا ممکن ہو تو میرے پاس بھیجدو کہ چند روز سہارنپور رہیں۔ چنانچہ بہزار تدبیر میں نے ان کو سہارنپور پہنچایا اور آخر مہینہ بھر بعد حضرت نے ان کو رخصت کیا کہ وہ مطلوب کو دیکھتے اور وحشت کھاتے تھے۔ چند روز بعد وحشت بھی جاتی رہی اور وہ بھی ایسا ہو گیا جیسے سب لوگ۔

الحاصل اکل و شرب سکوت و تکلم بول و براز نوم و یقظہ اور ہر حرکت و سکون آپ کا سانچہ اتباع سنت میں گویا ڈھلا ہوا تھا اور اس بنا پر طاعت کے حکم اور عبادت کے تحت میں داخل تھا۔ شریعت پر عمل آپ کی طبیعت ثانیہ بلکہ فطرت اصلیہ بن گیا تھا کہ کبھی ذہول بھی ہوتا تو فطرت کا نور آپ کو فوراً متنبہ کر دیا کرتا تھا عدن پر جہاز ٹھہرا تو کشتی والے طرح طرح کی چیزیں فروخت کرنے کے لئے لائے بینڈک جیسا ایک جانور جس کو بیچ میں سے چاک کر کے گوشت کا عضلہ سا بنا لیتے ہیں بکثرت فروخت ہوتا اور عرب اس کو خاص رغبت سے کھاتے ہیں۔ حضرت کو مچھلی سے رغبت تھی اور عرب نے شوق دلایا کہ اس کو کھا کر دیکھئے مچھلی سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ آپ نے اس کو خریدنے کے لئے مجھ سے فرمایا۔ چنانچہ میں نے دو آنے کشتی میں ڈالدیئے کہ جتنا آئے دیدے۔ وہ جہاز پر آنے نہ پایا تھا کہ آپ دفعۃً گھبرائے اور فرمایا مولوی عاشق الٰہی ذرا ٹھہرو میرے خیال میں تو یہ حرام ہے کہ مچھلی نہیں ہے کوئی دریائی جانور ہے۔ مگر احناف کے نزدیک سوائے مچھلی کے کوئی بحری جانور حلال نہیں ہے۔ چنانچہ تحقیق ہوا کہ حضرت کا خیال صحیح ہے اور عرب چونکہ زیادہ تر شافعی المذہب ہیں اس لئے اس کو حلال سمجھتے اور ان کی دیکھا دیکھی سب خرید کر بے تکلف کھاتے ہیں کہ حلت و حرمت کی تحقیق کا واہمہ بھی نہیں ہوتا۔ ایک بار حرم شریف میں تلاوت قرآن مجید کی آواز آئی جس کی طرف بے اختیار دل کھینچتا تھا۔ ذرا دیر میں ٹھٹ لگ گئے...... آپ بھی چلتے چلتے رک گئے اور سننے لگے مگر شاید ایک منٹ پورا نہ ہوا تھا کہ آپ یہ فرما کر کہ پڑھنے والی عورت معلوم ہوتی ہے سننا جائز نہیں سے وہاں

سے چل دیئے۔ منہ پر چونکہ نقاب تھا اس لئے عورت مرد کی شناخت ناممکن تھی مجھے حیرت ہوئی اور میں نے عرض کیا حضرت نے کیسے سمجھا کہ یہ عورت ہے؟ فرمایا اس کی کنکری بتارہی ہے کہ مرد کی آواز نہیں ہے مجھے کرید ہوئی اور معلوم ہوا کہ بیشک وہ عورت مصریہ تھی۔

غرض قدرت نے آپ کو عادات طبیعیہ اور معمولات جسدیہ کا کچھ ایسا بہترین مشغلہ نصیب فرمایا تھا کہ حاضرین وزائرین علماء وعوام کو آپ کے ہر لمحہ اور ہر آن کے حرکت وسکون میں اس کا علمی وعملی سبق ملتا تھا کہ انسان دنیا میں کس غرض کیلئے آیا ہے اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کس حیات طیبہ کی تعلیم کے لئے یہاں تشریف لائے تھے آپ کے مشاغل حسنہ دیکھکر غبطہ ہوتا اور بے اختیار زبان سے نکلتا تھا ؎

کُلُّ امْرِءٍ فِی اُمُورِ الدَّہرِ مُشْتَغِلٌ ۔۔۔ وَاَنْتَ عَنْ کُلِّہَا فِی اَحْسَنِ الشُّغُلِ

کمالات وکرامات

حضرتؒ کے کمالات کا بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے کہ اُن کا ادراک مجھ جیسے ناکارہ کی تو کیا حقیقت ہے بڑوں کو بھی مشکل تھا۔ مولوی ظفر احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں حضرت مولانا تھانوی نے ایک بار فرمایا کہ جب حضرت مولانا گنگوہیؒ کا وصال ہوگیا تو میں نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے عرض کیا کہ مجھے اب تک جو کچھ بھی دریافت کرنا ہوتا تھا حضرت مولانا گنگوہی سے دریافت کر لیا کرتا تھا حضرت کے بعد اب جو کچھ مجھے دریافت کرنا ہوگا وہ جناب والا سے دریافت کیا کروں گا اور حضرت والا کو جواب کی تکلیف کرنا ہوگی۔ اور مولانا محمد یحیی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میاں ظفر آج جتنے بھی تمہارے سامنے بزرگ ہیں گنگوہ میں ان سب کے ساتھ میری دل لگی اور ہنسی رہا کرتی تھی بجز حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے کہ ان کا ادب میں اس وقت بھی بہت کرتا تھا حالانکہ خود حضرت مولانا

مجھ سے بہت بے تکلف تھے مگر میں کبھی بے تکلف نہیں ہوا ایک بار فرمایا تم سمجھ سکتے ہو کہ میں حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں بارہ سال رہا ہوں اور حضرت کے ساتھ جو تعلق مجھے اور جو حضرت کو مجھ سے تھا وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ اس صورت میں غور کر لو کہ مجھے حضرت گنگوہی کی معرفت کس قدر ہو سکتی ہے۔ اس پر جو میں نے حضرت کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب کو اپنا شیخ بنایا اور ان کی طرف رجوع کیا ہے اس سے جو کچھ نتیجہ نکلتا ہے تم خود سمجھ سکتے ہو۔ میاں ظفر بات یہ ہے کہ خدا کے نزدیک مراتب کا کم زیادہ ہونا تو کسی کو معلوم نہیں لیکن میرے نزدیک معرفت وسلوک میں مولانا خلیل احمد صاحبؒ کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ میں نے اعلیحضرت حاجی صاحب کا ایک والا نامہ حضرت کی بیاض میں خود دیکھا ہے جس میں حضرتؒ کی نسبت تحریر فرمایا تھا تم میرے سلسلہ کے فخر ہو۔ مجھے تم سے بہت خوشی اور مسرت ہے

حج پنجم میں جس وقت حضرتؒ مسجد الحرام میں طواف قدوم کے لئے تشریف لائے تو اعقر مولانا محب الدین صاحبؒ کے پاس (جو کہ اعلیحضرت حاجیؒ کے خاص خلفاء میں تھے اور صاحب کشف مشہور تھے) بیٹھا تھا۔ مولانا اس وقت درود شریف کی کتاب کھولے ہوئے اپنا ورد پڑھ رہے تھے۔ کہ دفعتہً میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے اس وقت حرم میں کون آ گیا کہ دفعتہً سارا حرم انوار سے بھر گیا میں خاموش رہا کہ اتنے میں حضرتؒ طواف سے فارغ ہو کر باب الصفا کی طرف سعی کے لئے چلے تو مولانا محب الدین صاحب کے پاس کو آئے کہ وہی جگہ مولانا کی نشست کی تھی۔ مولانا کھڑے ہو گئے اور ہنس کر فرمایا میں بھی تو کہوں آج حرم میں دن آ گیا یہ کہکر مصافحہ ومعانقہ ہوا اور حضرت سعی کے لئے آگے بڑھ گئے۔ مولانا محب الدین صاحب اپنی جگہ بیٹھ گئے اور مجھ سے فرمایا میاں ظفر مولانا خلیل احمد صاحب تو نور ہی نور ہیں۔ ان میں نور کے سوا کچھ نہیں۔ پھر فرمایا کہ میں نے مولانا رشید احمد صاحبؒ کو نہیں دیکھا اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ وہ قطب الارشاد تھے مگر میں نے مولانا کے خلفاء کو دیکھکر سمجھ لیا کہ واقعی وہ قطب الارشاد تھے جو ایسے ایسے

کامل بنا گئے۔ میں نے جرأت کر کے دریافت کیا کہ مولانا عبدالرحیم صاحب کیسے ہیں؟ فرمایا بڑے قوی النسبت ہیں کہ ان کے پاس چاہے کوئی کیسا ہی دل سے کرائے سب جھاڑ جھنکاڑ کو ایک دم صاف کر دیتے ہیں۔"

مولوی عبداللہ جان صاحب جرمن انگلستان مصر حجاز وغیرہ ممالک دیکھے ہوئے سہارنپور کے مشہور وکیل اور مردم شناسی و استقلال رائے میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ برسوں حضرت کی خدمت میں آتے اور دوستانہ درجہ میں کچہری سے شام کو فارغ ہو کر مدرسہ پہنچنے کے عادی رہے ہیں فرماتے ہیں کہ مولوی محمد یحییٰ صاحب کے ماموں ڈپٹی علاءالحسن صاحب میرے دوست تھے جو میرے ہی پاس قیام کیا کرتے اور ان کی وجہ سے مولوی محمد یحییٰ صاحب کا آنا جانا میرے مکان پر ہو گیا۔ پھر یہاں تک مراسم بڑھے کہ مولانا کا معمول ہو گیا جمعرات کی شام کو میرے مکان پر تشریف لاتے اور رات یہیں گزارتے۔ وہ وقتاً فوقتاً مجھے ترغیب دیتے رہتے تھے کہ میں مولانا خلیل احمد صاحب سے بیعت ہو جاؤں۔ مگر ان کی تلقین کا میرے دل پر کبھی کچھ اثر نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ ڈپٹی علاءالحسن صاحب تشریف لائے اور مولانا محمد یحییٰ صاحب نے اپنے سلسلہ کے ایک بزرگ سے ان کو بیعت کرایا۔ میں نے معترضانہ لہجہ میں مولانا سے کہا کہ اپنے ماموں کو تو آپ نے ان بزرگ سے بیعت کرایا اور مجھے آپ ہمیشہ یہ تلقین فرمایا کرتے ہیں کہ میں مولانا خلیل احمد صاحب سے بیعت کروں۔ مولانا نے ایک جوش کے ساتھ جواب دیا تم نے تو میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ ارے میاں یہ ماموں تو ابھی مبتدی ہیں میں نے ان کو اسکول کی ابتدائی جماعت میں جس کے قابل ان کو سمجھا داخل کرا دیا اور تم کو تو میں اپنے ساتھ بی اے کا طالب علم سمجھ کر کالج میں داخل کرانے کا ساعی ہوں۔ تم نہیں دیکھتے کہ میں گھر بار چھوڑ کر حضرت کی خدمت میں پڑا ہوا ہوں اور تمہیں بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں مولانا کے اس حوصلہ افزا جواب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور اگلے دن جمعہ کو اپنے زعم میں رسم بیعت کی مخالفت پر تیار ہو کر حسب معمول

مدرسہ میں پہنچ کر حضرت سے پوچھا کہ حضرت بیعت کی حقیقت اور ضرورت کیا ہے میں نے تو خیال میں مخالفت پر کمر باندھ کر یہ سوال کیا تھا مگر حضرت نے اس کو نہایت معمولی سوال قرار دے کر جواب دیا۔ کہ بیعت میں مرید اللہ تعالیٰ سے اجتناب منہیات اور تعمیل اوامر شرعیہ کا عہد کرتا ہے اور مراد اس عہد کا گواہ بنتا ہے اور بس " مراد کا لفظ پیر کے معنوں میں اسی روز میں نے پہلی دفعہ سنا۔ اس جواب پر میں مبہوت سا ہو کر دم بخود رہ گیا۔ مگر دل میں یہ خدشہ گذرا کہ خداوند کریم کو جس کی شان ہے یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور کسی گواہ کی کیا ضرورت ہے۔ مگر فوراً ہی منجانب اللہ یہ آیت کریمہ ذہن میں آئی الیوم نختم علٰی افواھہم وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون اور خیال ہوا کہ وہ ذات پاک فعال لما یرید ہے اگر وہ قیامت کے دن انسان کے ہاتھ پیروں سے استشہاد کرے گا تو یہاں اس کے ساتھ معاملہ کرنے میں کسی صالح شخص کا استشہاد کیوں بیجا ہو۔ یہ سوچکر میں چپ ہو گیا۔ اور میرے سارے خیالی اوہام واعتراضات کا خاتمہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے حضرت سے عرض کیا کہ آج جمعہ ہے اور قبل مغرب میں حضرت سے بیعت کر لینا چاہتا ہوں حضرت نے فرمایا میرے خیال میں تو اس کی زیادہ ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ بیعت سے جو مقصود اصلی ہے ان میں اکثر چیزیں اللہ تعالیٰ نے وہبی طور پر تم کو عطا فرما رکھی ہیں۔ مگر میں اپنے ارادہ پر تلا بیٹھا تھا میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے تو کبھی کوئی کام ضرورت دیکھکر نہیں کیا۔ انگریزی معاشرت رکھتا ہوں۔ انگریزی لباس پہنتا ہوں۔ انگریزی کھانا کھاتا ہوں۔ کوٹھی بنگلہ میں رہتا ہوں۔ انگریزوں سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہوں یہاں تک کہ ایک میم سے بلا ضرورت شادی بھی کر لی تھی۔ جہاں اور ہزار کام بلا ضرورت کرتا ہوں ایک بیعت بھی سہی مگر آج اس کا سر انجام کر لینا ضرور ہے۔ حضرت خاموش ہو رہے۔ نماز عصر کے بعد صحن میں حسب عادت تشریف فرما تھے اور احباب کا مجمع جمع تھا کہ حضرت اٹھے

اور اشارہ سے مجھے طلب فرمایا۔ میں پیچھے پیچھے ہولیا۔ حضرت مسجد میں تشریف لائے اور میں ساتھ تھا۔ حضرت نے فرمایا۔ آؤ پھر وہ کام کرلیں چنانچہ بالکل تنہائی میں حضرت نے مصافحہ کے طور پر میرے اور اپنے ہاتھ ملاکر مجھے بیعت کیا اور آخری جملہ یہ کہلا کر میں بیعت کرتا ہوں (حضرت مولانا) خلیل احمد کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کھینچ لئے اور فرمایا کہ بس یہ ہے بیعت "میرے دل پر دوران بیعت میں مطلق کوئی اثر کسی قسم کا نہ تھا مگر اس آخری جملہ پر دفعتہً میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور خود مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔ حضرت فوراً مدرسہ میں اپنی جگہ تشریف لے آئے۔ اور پیچھے پیچھے میں چلا آیا مگر میری صورت دیکھکر احباب تاڑ گئے کہ بیعت کرکے آیا ہوں۔ پھر مولوی محمد یحیٰ صاحب کے اصرار پر جب میں نے حضرت سے ورد و وظیفہ پوچھا تو فرمایا تم کو اور کسی ورد و وظیفہ کا وقت و موقع کہاں ہے تم صرف اسم ذات باری تعالیٰ کو جب بھی وقت ملا کرے ورد کیا کرو اور اشراق و اوابین وغیرہ جو نوافل مسنون ہیں جو چاہو شروع کرو مگر شروع کرنے سے پہلے اپنی حالت کا اندازہ کرکے یہ مصمم عزم کرلو کہ جن نوافل کو شروع کرو ان کو مرتے دم تک نہایت التزام اور ثبات و استقلال سے نباہ دو۔

مولوی عبداللہ جان صاحب ... کا شہادت کوئی عالمانہ شہادت نہیں مگر دنیا چھانے ہوئے اور اکثر ممالک دیکھے ہوئے تھے۔ عدم تقلید کی طرف مائل بلکہ تشدد لئے ہوئے تھے کتب بینی کے عادی و خوگر اور ذکی و فہیم تھے کہ ہر مذہب کی کتابوں کو دیکھتے اور پرکھتے تھے اپنے پیشہ اور زمانہ کے رنگ سے متاثر انگریزی معاشرت میں غرق تھے اور تصوف کے ہر پہلو کو مخالفانہ و معترضانہ نگاہ سے دیکھتے تھے لہذا ان کی عقیدت و بیعت اس درجہ میں ایک دقیع شہادت ہے کہ الفضل ما شہدت بہ الاعداء۔ تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے سب سے اول حضرت کی خدمت میں حاضری کا موقع اپنے پیشہ میں کسی مقدمہ

کی پیروی کے لیے مسئلہ طلاق کے متعلق روایات فقہیہ کی پوچھ گچھ کی ضرورت سے تصدیب ہوا کہ میرا مؤکل حضرت کا رشتہ دار تھا اور میں اپنے اشکالات حل کرنے کے لیے مدرسہ مظاہر علوم میں پہنچا۔ حضرت نے جس اطمینان و بشاشت کے ساتھ میرے ہر سوال کا جواب دیا اور اس کی سند کے طور پر مختلف اور مستند کتب فقہیہ سے اس کی تائید ثابت کرکے دکھلائی اس سے حضرت کے تبحر علمی اور صدق نیت کا میرے دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ عین اسی صحبت میں حضرت کی عظمت و محبت کا میرے دل میں گویا بیج بو یا گیا۔ میری اور میرے موکل کی غرض و غایت صرف یہ تھی کہ جس طرح ہو ہم کو مقدمہ میں کامیابی حاصل ہو مگر حضرت نے ہماری ایسی تمام کوشش کی مخالفت فرمائی جس کو حضرت اعانت علی الاثم والعدوان یا بر سر باطل سمجھتے تھے اور ہم کو ہر قسم کی حیلہ جوئی اور واقعات اصلیہ کے اخفا سے یہ فرماکر روک دیا کہ یہ صداقت کے خلاف ہے۔ حضرت کی محبت و عظمت کا یہ اثر ہوا کہ میں روزمرہ عادی ہو گیا کہ کچہری سے واپسی پر سیدھا حضرت کی خدمت میں پہنچتا تھا۔ تکان و ضعف پیری اور مرض کی وجہ سے مجھے لیٹنے کی ضرورت ہوتی اور حضرت میری یہ حالت دیکھ کر فرط شفقت سے مجھے تکیہ دیدیا کرتے تھے کہ اس پر آرام کرو۔ میری جسارت کا یہ عالم تھا کہ بلا تکلف تکیہ پر لیٹ کر اپنا داہنا پیر بائیں گھٹنہ پر رکھ لیا کرتا۔ شام کو چائے معمولاً حضرت کے یہاں سے ملتی اور میں بلا حجاب پی لیا کرتا۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ حضرت نماز مغرب کے بعد فرمادیا کرتے کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں ٹھہر جاتا اور اس روز رات کا کھانا حضرت کے ہمراہ کھا کر گھر آنا ہوتا۔ جب اس معمول کو میں نے اکثر اور متواتر دیکھا تو حضرت اس ارشاد پر کہ ذرا ٹھہر جاؤ میں فوراً سمجھ لیتا تھا کہ آج یہیں کھانا ہوگا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے شاید صرف دو دفعہ حضرت کی دعوت کرکے حضرت کو اپنے یہاں بلانے اور کھانا کھلانے کی تکلیف دی ہے اور میں نے بہت ہی دفعہ حضرت کے ہاں کھانا کھایا ہے جس کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہوگی۔ فقط۔

بندۂ ناچیز نے جہاں تک غور کیا حضرتؒ میں بڑا کمال استقامت اور عزم و علو ہمت پایا کہ موسم پلٹتے تھے کبھی جاڑہ کبھی گرمی اور کبھی برسات حالات بدلتے تھے کبھی صحت کبھی مرض کبھی سفر کبھی حضر کبھی خلوت کبھی جلوت کبھی عسر کبھی یسر کبھی اشتغال کبھی فرصت زمانہ گردش کرتا تھا کبھی جوانی کبھی بڑھاپا کبھی ضعف کبھی قوت انقلاب حوادث اپنا اثر دکھاتا تھا کہ کبھی خوشی کبھی رنج کبھی کسی کی ولادت کبھی کسی کا مرنا غرض سب کچھ ہوتا تھا مگر آپ کے معمولات شرعیہ میں کوئی فرق نہ آتا اور کسی ایک امر پر بھی کوئی اثر قوی نہ پڑتا تھا مجھے آپ کے ساتھ سفر میں بارہا معیت نصیب ہوئی ریل اور جہاز اونٹ اور بہل سب آپ کے معمولات لیلیہ و یومیہ کے لئے ایک حکم رکھتے تھے۔ انسان ایک مٹی کا پتلا ہے جس کی مشین کے پرزے ہاتھ پاؤں ایک خاص عادت اور سکون و راحت کے محتاج ہیں کہ جب ان عادت و راحت میں فرق آئے گا۔ تو ان کی رفتار سے جس کا نام عمل ہے ضرور فرق آئے گا۔ اچھی اچھی قابل اعتماد مشینیں کسی غیر معتاد حادثہ پر بند ہو جاتی ہیں۔ اور بڑے بڑے منتظم محکمے اور کارخانے اتفاقیات کے ہاتھوں چلتے چلتے رک جاتے ہیں۔ قوی سے قوی ہستیوں کو بھی آرام کرنے کے لئے تعطیل کی ضرورت ہوتی ہے اور مستعد سے مستعد توانوں کو بھی راحت حاصل کرنے کے لئے اپنے معمول میں فرق ڈالنا پڑتا ہے مگر نہیں فرق دیکھا تو حضرتؒ کے معمولات میں کہ چھ چھ مہینے متواتر و مسلسل سفر میں ساتھ رہنے کا مجھے اتفاق ہوا مگر میں نے ایک دن بھی نہیں دیکھا کہ نماز باجماعت ترک یا وقت مستحب سے ہٹی ہو۔ یا ایک شب بھی تہجد کے لئے وقت معمول پر اٹھنے میں چند منٹ کی تاخیر ہوئی ہو۔ قرنطینہ کامران میں شب کو میری آنکھ کھلی اور میں نے گھڑی دیکھنے میں غلطی کھائی کہ دو بجنے کو چار سمجھ لیا۔ گرمی کا موسم تھا چاندنی رات تھی میں سمجھا صبح صادق ہوا چاہتی ہے اٹھ کر حضرتؒ کو دیکھا کہ بے خبر سو رہے ہیں سمجھا کہ آج داخلہ قرنطینہ میں کامل آٹھ گھنٹے تعب کا اثر حضرت نے لیا ہے۔ اس لئے آنکھ نہیں کھلی۔ اس خیال سے کہ برسوں کا معمول ترک ہونے کا حضرت

کو قلق زیادہ ہوگا اٹھکر حضرت کے پاؤں دبانے لگا کہ حضرت کو جگانے کا طریق یہی تھا۔ پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہی حضرت نے آنکھ کھول لی اور گھڑی اٹھائی جس کو حضرت ہمیشہ تکیہ کے پاس رکھکر سویا کرتے تھے۔ کیا بتاؤں کہ اس وقت میری شرم کے مارے کیا حالت ہوئی۔ جب حضرت نے گھڑی دیکھکر فرمایا کہ ابھی تو ڈھائی گھنٹے رات باقی ہے۔ شاید چاندنی سے تم کو دھوکا ہوا اور یہ فرماکر پھر سو گئے۔ یہ بات حضرت کے پاس چند روز رہنے والے کو بھی محقق ہوگئی تھی کہ کی نیند اختیاری تھی کہ پانچ منٹ کے لئے سونے کا ارادہ فرماتے تو پانچ ہی منٹ میں آنکھ کھل جاتی اور آپ اُٹھ بیٹھتے تھے۔ جہاز میں بندہ نے اپنا بستر حضرت کے سامنے اور متصل بچھایا تھا کہ آخر شب میں وضو کے لئے پانی دے سکوں گا۔ میں نے بارہا دیکھا کہ حضرت کی آنکھ کھلی اور گھڑی دیکھکر فرمایا کہ ابھی تو پانچ منٹ باقی ہیں۔ پھر فوراً سو گئے اور دوبارہ آنکھ کھلی تو شاید چھٹا منٹ شروع ہوگیا ہو مگر ختم نہ ہوتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے سونے کے لئے صرف ارادہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ بعض دفعہ نیند کا ارادہ کرنے کے بعد تکیہ پر سر رکھنے کی بھی مجھے خبر نہیں ہوتی۔ آپ نے شب کو سفر حجاز جاتے ہوئے ریل کا سفر کیا اور جگہ جگہ اسٹیشنوں پر خدام کا زیارت و مصافحہ کے لئے ہجوم تھا مگر اسٹیشن آتے ہی گاڑی ٹھہرنے نہ پاتی تھی کہ آپ اُٹھ جاتے اور اکثر نیچے اتر کر حاضرین کو چھاتی لگاتے اور حال پوچھتے اور جو ضروری بات کہنا ہوتی وہ کہہ کر ریل میں سوار ہو جاتے۔ اور پھر ریل اسٹیشن کو چھوڑنے نہ پاتی تھی کہ سو جاتے تھے۔ رات میں دس دس مرتبہ ایسا جاگنا اور سونا ہوتا مگر آپ پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ رفقاء سے فرمادیا کرتے تھے کہ مجھے جاگنے میں تعب نہیں ہوتا اور نہ پھر سونے میں دیر لگتی ہے اس لئے جب ضرورت ہو بے تکلف جگا لیا۔ سفر میں ایسا بھی اتفاق ہوا کہ نا وقت کھانا کھایا اور کئی کئی راتیں مسلسل ایسی گذریں کہ گھنٹے سوا گھنٹے سے زیادہ آپ کو سونا نہیں ملا اور وہ بھی متفرق بار بار جاگ

کر۔ مگر صبح صادق سے دو گھنٹے قبل اٹھنے کا آپ کا جو معمول تھا اس میں کبھی فرق نہیں آیا۔ نوجوان بیٹے اور بیٹیوں کی وفات کے متواتر تین صدمے آپ کو پیش آئے اور ممتد تیمارداری بھی ہوئی کہ گھر میں یا آپ تھے یا آپ کی اہلیہ مگر تہجد کا معمول نہ تیمارداری میں چھوٹا نہ موت کی شب میں۔ مدنی راستہ میں آپ کو بخار ہوا اور شدید ہوا کہ بدن پر ہاتھ رکھنا مشکل تھا۔ آپ شغدف میں تھے اور فرط حرارت سے گویا بے ہوش تھے۔ مگر نصف شب میں بخار ہلکا ہوا۔ اور آخر شب میں حسب معمول آپ ہمت کرکے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ کھڑے ہوکر اور کچھ بیٹھکر نفلیں ادا کیں اور لیٹ رہے۔ شب میں قافلہ چلتا تو آپ شغدف ہی پر وضو کرتے اور پورے نوافل ادا فرماتے۔ رات کے بارہ ایک بجے آپ کو ریل میں بیٹھنا ہوا کہ نہ ادھر اطمینان سے سونے کا وقت نہ اُدھر آرام کا کافی وقت۔ مگر نصف شب کے بعد کا وقت ریل میں ہوتا تو اندر ورنہ باہر اسٹیشن پر آپ آٹھ دس نوافل ادا فرماتے اور ریل آنے پر اس میں سوار ہو جاتے۔ اگر میری آنکھوں کا اور وہ بھی بیسیوں دفعہ کا مشاہدہ نہ ہوتا اور کوئی مجھ سے لاکھ کہتا کہ ایک ایسا بھی انسان ہے جس کی نیند اختیاری ہے اور اس پر تغیرات عادت کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو مجھے ہرگز یقین نہ آتا اور میں کہتا کہ ناممکن و محال ہے عادت کے خلاف تغیر ہو اور طبیعت اُس سے متاثر ہوکر معمولات میں فرق نہ ڈالے۔ مگر حضرت کے متعلق اس مشاہدہ نے میرے دعویٰ کو توڑ دیا اور اب تک جب تصور آتا ہے میں حیران ہو جاتا ہوں کہ آخر وہ کون قوت اندرونی تھی جو طبیعت انسانیہ پر غالب آگئی تھی۔ ایک مرتبہ شب کو ۱۲ بجے بغیر اطلاع آپ میرٹھ تشریف لائے اور میرے مکان کے سامنے مسجد ہے اس کے فرش پر لیٹ رہے۔ آخر شب میں مجھے خواب نظر آیا کہ حضرت کنوئیں پر کھڑے اپنے ہاتھ سے پانی کھینچ رہے ہیں فوراً آنکھ کھلی اور ڈول کے پانی پر پڑنے کی آواز آئی۔ سمجھ رہا تھا کہ خواب ہے مگر جلدی سے اٹھکر باہر آیا تو دیکھا واقعہ ہے حضرت پانی کھینچ رہے ہیں

جلدی سے لپک کر میں نے رسّی تھام لی۔ پانی کھینچا اور حضرت سے خواب عرض کیا کہ یہ بھی کیا عجیب اور سچا خواب ہے اور حضرت نے نہ تشریف آوری کی اطلاع دی نہ آواز ہی دی کہ حاضر ہو جاتا مسکرائے اور فرمایا خواب مبارک ہو۔ سفر میں میرٹھ کو عبور ہوا تو دل نے نہ چاہا کہ ملے بغیر جاؤں۔ اور جگانے کی تکلیف کیوں دیتا۔ گرمی کا موسم تھا فرش پر لیٹ کر خوب نیند آئی کہ خمار رفع ہو گیا۔ ایک مرتبہ لاہور جلسہ میں جانا تھا اور ڈاک گاڑی کا سفر تھا جو شب کو ۱۲ بجے چلکر صبح ۷ بجے لاہور پہنچتی تھی۔ زحمہ بھی تھا اور گرمی تھی مگر حضرت ذرا سی جگہ میں پاؤں سمیٹ کر سوئے اور اپنے وقت پر اٹھکر وضو کر کے اس تنگ جگہ میں نفلیں پڑھنے لگے۔ مولوی اسحاق مرحوم حضرت کے خادم ساتھ تھے اور معلوم تھا کہ حضرت کو نوافل سے فارغ ہو کر چائے پینے کی عادت ہے۔ دودھ مصری اور خشک چائے وسماوار ساتھ لائے تھے۔ خدا ان کو غریق رحمت کرے آفرین ہے ان کی ہمت پر جس کا سبق حضرت سے لیا تھا کہ تیز چلتی گاڑی میں انہوں نے اپنا پلندہ کھول کر کوئلہ سُلگایا اور سماوار گرم کیا اور پوری مقدار چائے تیار کی کہ حضرت کے فارغ ہوتے ہی انہوں نے فنجان بھپا دئے اور حضرت نے مع چار پانچ رفقاء کے چائے نوش فرمائی۔ لاہور میں دن بھر جلسہ کے اندر گذرا کہ دن کو بھی لیٹنا نہ ملا مگر شب کو پھر وہی وقت تھا اور وہی معمول۔

نوافل پر جس کو اتنی مواظبت ہو اس کے سُنن و واجبات کے اہتمام کا کیا پُوچھنا۔ مولوی ظفر احمد صاحب جو مدت تک مدرسہ میں مدرس رہے ہیں لکھتے ہیں کہ میں حضرت کی خدمت میں چھ سال رہا ہوں مجھے یاد نہیں کہ حضرت کی تکبیر تحریمہ کبھی فوت ہوئی ہو۔ البتہ ایک دن صبح کو وضو کرتے ہوئے آپ کے دانتوں میں سے خون آنے لگا اور دیر تک اس کا سلسلہ چلتا رہا تو مسجد میں خادم کو بھیجا کہ نماز میں میری وجہ سے دیر نہ کی جائے۔ میرے دانتوں سے خون جاری ہے جو بند نہیں ہوتا۔ اس روز بے شک عذر کی وجہ سے حضرت

کی تکبیر تحریمہ فوت ہوئی مگر رکعت اس روز بھی فوت نہیں ہوئی احقر کو اس چھ سال میں حضرتؒ کے ساتھ سفر و حضر کا بارہا اتفاق ہوا مگر میں نے حضرت کا تہجد ناغہ ہوتے کبھی نہیں دیکھا۔ ایک بار آپ کو بخار تھا اور گھر میں مہمان مستورات کی وجہ سے مدرسہ ہی میں آرام فرمایا تھا۔ اس بخار کی حالت میں بھی آپ نے تہجد پڑھی کہ کچھ رکعتیں کھڑے ہو کر اور کچھ بیٹھ کر۔

حاجی احمد حسن ڈپٹی مجسٹریٹ انہار گنگ جو حضرت مولانا رائپوری سے بیعت اور ماشاءاللہ نہایت سلیم القلب صالح الاحوال شخص ہیں۔ جس طرح اپنے فرائض دُنیوی میں ضرورت سے زیادہ مستعد اور محتاط و ہوشیار ہیں کہ قدردان افسروں نے صوبہ کا منتخب کارگذار سمجھ رکھا ہے اسی طرح دینداری و معمولات شرعیہ میں صاحب استقامت اور ہر شعبہ میں متورع و مستعد ہیں کہ دنیا داروں بالخصوص اُن ملازم پیشہ مسلمانوں کو ان کی پابندی جماعت و تہجد و وظائف و زکوٰۃ و صوم و حج سے سبق لینا چاہیئے جو فرائض کے متعلق بھی عذر کر دیتے ہیں کہ ملازم بن کر ادائے فرائض مشکل ہے۔ ان کو سہارنپور میں ڈپٹی مجسٹریٹی پر کئی سال تک حضرت کے قریب ہی کرایہ کا مکان لے کر رہنے کا اتفاق ہوا وہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت کے پاس خلوت میں جلوت میں حضر میں سفر میں حاضر رہنے کا اکثر اتفاق پیش آیا ہے لیکن کبھی ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرتؒ کے معمولات میں ذرا بھی فرق پایا ہو۔ میں نے اپنی عمر میں نماز اس وقار کے ساتھ پڑھتے کسی کو نہیں دیکھا جیسا حضرت پڑھا کرتے تھے۔ ایک موقع پر میں نے اپنا یہ خیال حضرت کے سامنے ذکر کر دیا۔ بیساختہ فرمایا۔ ہمارے حضرت اس سے بھی زیادہ وقار سے نماز پڑھا کرتے تھے (یعنی حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ)

مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی کو اخیر سفر میں حضرت کے ساتھ معیت کا مدینہ منورہ میں اتفاق ہوا وہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ مجلس میں تذکرہ ہوا کہ سفر حجاز بالخصوص بدوی راستہ میں نماز پڑھنا دشوار ہے کہ بدوا ونٹوں کو

ٹھہراتے نہیں اور اونٹ سے اتر نا گوارے دارد۔ حضرت نے فرمایا الحمد اللہ میں نے ہمیشہ اونٹ سے اتر کر با جماعت نماز پڑھی ہے۔ احقر نے عرض کیا حضرت آپ کی وجاہت کے سبب سے آپ کو سہولت رہتی تھی فرمایا میں نے اس زمانہ میں بھی تو سفر کیا ہے جب کوئی خصوصیت اور وجاہت نہیں تھی۔ نیز فرماتے ہیں احقر جس زمانہ میں مدینہ منورہ میں مقیم تھا گرمی نہایت شدید تھی اور مسجد نبوی کی پہلی اور دوسری صف میں نماز پڑھنا نہایت دشوار تھا۔ مغرب اور عشا بلکہ فجر کی نماز میں ہزارہا نمازی اندرون مسجد کو چھوڑ کر صحن مسجد میں نماز ادا کرتے تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت ہمیشہ پنج وقتہ صف اوّل میں منبر مبارک کے متصل نماز ادا کرتے تھے۔ نماز کے بعد جب احقر مکان پر حاضر ہوتا تو بطور خوش طبعی و ظرافت کے فرماتے کہو سید صاحب آج کونسی صف میں نماز پڑھی؟ احقر مطابق واقعہ چوتھی یا پانچویں صف میں نماز پڑھنا بیان کرتا اور کہتا تھا کہ حضرت پہلی اور دوسری صف میں گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ فرماتے کہ بھائی یہاں تم ضعف اور بڑھاپے کی وجہ سے گرمی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔" یہ حضرت کی لطافت طبع تھی کہ احساس نہ ہونے کا سبب ضعف و پیری کو قرار دیا ورنہ شوق و محبت اور استحضار فضائل کثیرہ احساس نہ ہونے دیتا تھا یا باوجود احساس کے برداشت اور تحمل تکالیف پر مستعد کرتا رہتا تھا۔ ایک مخلص ہندوستانی نے جو موٹر کمپنی میں کارکن تھے ایک موٹر لاری عصر کی نماز کے بعد ایک روز ہوا خوری کے لئے حاضر کی بسبب متوسلین ہمراہ ہوئے۔ مدینہ منورہ سے باہر پندرہ بیس میل نکل گئے ایک باغ میں تھوڑی دیر ٹھہرے۔ واپسی میں خلاف امید اتنی تاخیر ہوگئی کہ مسجد نبوی میں جماعت شروع ہو گئی۔ کچھ بازار کے ہجوم کی وجہ سے مسجد تک پہنچنے میں دقت ہوئی بلکہ احقر نے ہاتھ پکڑ کر احتیاط سے جماعت پہنچایا۔ دو رکعتیں رہ گئیں اور صرف تیسری رکعت امام کے ساتھ ملی۔ اگلے روز احقر نے عرض کیا حضرت پہلے بھی کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے؟ فرمایا کبھی نہیں (یعنی بیماری کی وجہ سے بعض

مزید مکان پر نماز پڑھنے کی نوبت تو ضرور آئی مگر یہ نہیں ہوا کہ مسجد میں آنا ہوا اور کوئی رکعت رہ گئی ہو) احقر نے عرض کیا کہ بمقتضاء عجز و عبدیت ایک واقعہ ایسا بھی ہونا چاہیئے تھا۔ تبسم فرما کر خاموش ہو گئے۔ آپ مرض کی وجہ سے جب مسجد میں حاضر ہونے سے معذور ہوتے تو مولانا سیّد احمد صاحب مہاجر کو نماز کے وقت طلب فرما کر گھر میں جماعت سے نماز ادا فرماتے۔ وارد و صادر اور غیر مہاجر لوگوں کے لئے حاضری مسجد کو ضروری سمجھ کر خاص طور سے خیال رکھتے یہاں تک کہ حاجی مقبول احمد صاحب کو بھی اپنی جماعت کے لئے گھر میں نہیں روکتے تھے کیونکہ انہوں نے اس وقت تک ہجرت کی نیت نہیں کی تھی۔

آپ کو حق تعالیٰ نے سات حج نصیب فرمائے جن میں پہلا سفر حج ۱۲۹۳ھ میں تنہا بھوپال سے اور دوسرا ۱۲۹۷ھ میں بمعیت مولوی شمس الدین صاحب بہاولپور سے مذکور ہو چکا۔ باقی پانچ حج آپ کے ملازمت مظاہر علوم کے زمانہ میں سہارنپور سے ہوئے۔ پہلا ۱۳۲۳ھ میں اہل کو ساتھ لے کر کہ ان کے پاس شوہر اوّل کا عطیہ زیور تھا جس کو تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ میں فروخت کر کے زمین خریدی تھی۔ اور پھر ۱۳۲۳ھ میں اس کو بعوض پانچسو روپیہ فروخت کر دیا۔ بیع کا تمام ہونا تھا کہ حضرت نے فرمایا کہ تم پر حج فرض ہو گیا اس کے ادا کرنے کا اہتمام کرو۔ اگرچہ محرم بن کر صرف حج آپ بھی اس رقم میں کر سکتے تھے مگر آپ کے لئے سفر حج کا محرک جب کبھی ہوا وہ آستانہ محمدیہ کی حاضری کا شوق ہوا ہے اس لئے آپ نے مطرقۃ الکرامہ کے نسخے یک مشت فروخت کرنے کی سعی کی کہ صرف وہی آپ کا راس المال تھا اور اس کی رقم لے کر آپ مع اہلیہ اور اپنی لڑکی کے کہ شوہر کے مجنون ہو جانے کے سبب محزون و مضمحل زیادہ رہتی اور اپنے بدن کا زیور فروخت کر کے والدین کے ساتھ عرب جانے کو تیار ہو گئی تھی آخر شوال میں روانہ ہوئے اور بعد حج تیئیس دن مدینہ منورہ میں قیام فرما کر صفر میں واپس وطن تشریف لے آئے پھر ۱۳۲۸ھ میں جب حضرت مولانا رائپوری کو آپ نے دہلی تک مشایعت فرما کر حجاز روانہ

کیا تو شوق حاضری حرمین کا پھر غلبہ ہوا اور شاہ زاہد حسین صاحب رئیس بہہٹ نے آپ سے خواہش کی کہ ساتھ تشریف لے چلیں تو آپ نے منظور فرما لیا اور مولوی یحییٰ صاحب کو اپنا قائم مقام بنا کر اہلیہ کو مکان پر چھوڑ کر وسط ذیقعدہ میں بمبئی روانہ ہو گئے ۔ ۱۸ ذی الحجہ کو آپ مکہ پہنچے اور ۸ محرم کو براہ رابغ مدینہ منورہ حاضر ہوئے ۔ بائیس ۲۲ دن قیام فرما کر وطن کو مراجعت فرمائی اور آخر صفر میں سہارنپور تشریف لے آئے ۔ ان دونوں سفر میں بندہ کو ہمرکابی کا شرف نصیب ہوا اور دوسرے سفر میں میرٹھ سے حافظ فصیح الدین صاحب مرحوم مع اہل اور ان کے بھائی حاجی وجیہ الدین صاحب مع والدہ و اہل و دیگر حضرات تقریباً سولہ نفر حضرت کے ساتھ ہو گئے جنہوں نے حضرت کا فوری قصد سنکر دفعۃً ارادہ کیا اور چل کھڑے ہوئے تھے مولانا ظفر احمد صاحب و مولانا عبد اللطیف صاحب بھی مکہ مکرمہ میں حضرت کے ساتھ ہو گئے کہ روانگی دونوں صاحبوں کی رامپوری قافلہ سے بھی قبل ہو چکی تھی ۔ حکیم حافظ یعقوب صاحب اور آپ کی والدہ محترمہ دختر اعلیٰ حضرت گنگوہی نے جو حضرت مولانا رامپوری کے ساتھ گئی تھیں مکہ مکرمہ سے حضرت کی معیت اختیار کی ۔

تیسرا سفر ۳۳ھ میں بماہ شوال اس وقت ہوا جبکہ ترکی و برطانیہ میں جنگ عظیم برپا تھی اور طرح طرح کے فساد رونما تھے دہلی سے آپ کے پاس ایک استفتا آیا تھا جس میں مسلمانان ہند کا ترکی سے جنگ کرنا جائز لکھکر حضرت سے تصویب چاہی گئی اور آپ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور آپ نے اپنے خالص لوگوں سے کہا کہ اگر یہ دھمکی صحیح ہے اور گورنمنٹ مجبور کرتی ہے کہ اسلام کے خلاف فتویٰ دیں تو ہندوستان میں رہنا جائز نہیں اور ہجرت کرنا فرض ہے ۔ اپنے اس خیال کو آپ نے شائع تو نہیں کیا مگر خود ارادہ پختہ کر لیا کہ میں ایسی حالت میں ہندوستان کو دار الامن نہیں سمجھتا ۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ بھی سفر کا ارادہ فرما چکے تھے اور حضرتؒ کا قصد مولانا کی معیت کا تھا مگر مولانا کے سفر میں کچھ تاخیر ہوئی تو حضرت نے بایں اندیشہ کہ دستخط کرنے سے انکار کرنے پر کوئی فتنہ پیدا نہ

ہوجائے انتظار کو پسند نہ کیا اور وسط شوال میں روانہ ہو کر ۲۲ ذیقعدہ کو مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ بعد حج ۱۰ محرم کو مدینہ منورہ پہنچکر قیام فرمایا مگر وقت اتنا نازک تھا کہ آپ کے ساتھ خفیہ پولیس کی نگرانی تھی جو ہر حرکت و سکون کو قلمبند کرتی رہتی تھی۔ اور ادھر گورنمنٹ ترکی کو ان حضرات کی طرف سے برطانوی رعایا ہونے کی بنا پر بدگمانی ہوئی۔ چنانچہ آپ نے ترکی افسر سے فرمایا بھی کہ عجیب بات ہے۔ برطانوی حکومت ہم کو بحیثیت اتحاد مذہب ترکی کا خیرخواہ سمجھکر بدگمان ہے اور ترکی حکومت محض ہندی باشندہ ہونے کے لحاظ سے ہم پر مطمئن نہیں۔ پھر آخر مسلمان اپنی مذہبی زندگی عافیت کے ساتھ گذارنے کے لئے کونسا ملک ڈھونڈیں؟ مگر اس کا کوئی جواب نہ ملا اور آخر آپ کو تو مہینہ بعد شعبان ۱۳۳۴ھ میں ہندوستان واپس آنا پڑا۔ بمبئی بندر پر اترے تو آپ کو روک لیا گیا اور سیاسی تحقیق کے لئے مع اہلیہ کے بالا بالا نینی تال بھیجدیا گیا وہاں آپ سے طرح طرح کے سوالات ہوئے اور یہ بھی پوچھا گیا کہ کیا آپ نے ہندوستان کو دارالحرب بتایا ہے کہ یہاں رہنا مسلمانوں کو حرام اور ہجرت کرنا واجب ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں ضرور کہا مگر اس وقت جبکہ دہلی سے اطلاع ملی کہ گورنمنٹ ہم کو ہمارے مذہب اسلام کے خلاف حکم دینے پر مجبور کرتی ہے مفتش نے کہا یہ آپ کو غلط باور کرایا گیا نہ وہ استفتا گورنمنٹ کی سے تھا اور نہ گورنمنٹ کسی کو خلاف مذہب پر مجبور کرتی ہے آپ اس کا اعلان کر دیں کہ یہ خبر غلط تھی اور مسلمانوں کو اطمینان دلا دیں کہ وہ خلاف مذہب قول یا فعل پر ہرگز مجبور نہ کئے جائیں گے۔ چنانچہ ہر قسم کی صفائی کے بعد آپ کو آزاد کر دیا گیا اور آپ بعافیت وطن واپس تشریف لائے کہ آپ کی گرفتاری سے خدام کو خصوصًا اور عام مسلمانوں کو عمومًا جو اضطراب تھا وہ رفع ہوا۔ دفعۃً یہ خبر سنکر کہ آپ کو گرفتار کر کے نینی تال بھیجدیا گیا خدام میں کہرام مچ گیا اور بعض باوجاہت ذی مقدرت متوسلین نے وہاں پہنچنا چاہا مگر آپ نے بذریعہ تحریر سب کو تسلی دے کر ممانعت

لکھی کہ یہاں آنے کا کوئی صاحب قصد نہ کریں مقدمہ پرش کر رہے ہیں۔

حضرت کی مراجعت چونکہ براہ میرٹھ ہوئی اس لئے بندہ بھی سہارنپور تک کے لئے ہمرکاب ہو گیا تھا جس وقت حضرت اسٹیشن سہارنپور پر پہنچے ہیں تو سارا پلیٹ فارم زائرین سے لبریز تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دس ہزار کا مجمع تھا یا بیس ہزار کا مگر مجھے اندیشہ تھا کہ ازدحام میں دو چار کا پس جانا بعید نہیں۔ میری تو کیا ہمت تھی کہ زحمہ کے دھکوں کا تحمل کرتا اس لئے الگ کھڑا ہو گیا مگر الحمد للہ حضرت کا استقلال کہ سفر پر سفر کا تعب اٹھاتے آرہے تھے مگر سب ہی سے مسکرا کر مصافحہ و معانقہ کیا اور باہر سواری میں بیٹھتے وقت اسی طمانینت سے دریافت کیا کہ میرے رفقاء بھی سوار ہو لئے یا نہیں۔ اور جب اطمینان ہو گیا کہ سب بیٹھ گئے تب آپ کی سواری آگے بڑھی۔ دوسرے دن آپ نے بھرے مجمع میں اپنے واقعات سفر و گرفتاری مفصل سنائے اور مسٹر برن کا پیام کہ اس دھمکی کا انتساب گورنمنٹ کی طرف غلط تھا۔۔۔ تمام حاضرین کو پہنچایا اس قصہ میں بھی آپ پر بہت کچھ بدگمانیاں اور گورنمنٹ سے تنخواہ ملنے کی بہتان بندیاں ہوئیں جن کا تذکرہ فضول ہے کہ ہر شخص اپنے افعال و اقوال کا جواب دہ ہے اور جزا و سزا مرتب ہونے کا وقت قریب آلگا ہے۔

یہ بھی عجیب بات تھی کہ حضرت کو خفیہ کا ملازم کہنے والوں سے جب پوچھا جاتا کہ تم کو علم کیونکر ہوا تو اُن کا راوی صرف خفیہ پولیس ہی ہوتی تھی۔ پس اگر خفیہ میں ہونا ثقاہت و صداقت پر اثر نہیں ڈالتا تو حضرت پر کیا الزام؟ اور اس سے ثقاہت و دیانت و صداقت باطل ہوتی ہے کہ اس عہدہ کا مدار ہی اخفاء حال و کتمان حقیقت پر ہے تو پھر ان کی روایت و نقل کیونکر معتبر ہوئی چہ جائیکہ اس پر اتنا یقین کہ ایک بڑی مقدس ہستی کے علمی و عملی غرض تمامی کارنامے یک لخت حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ ایک وقت تھا کہ شبہ کا نفع مجرم کو دیا جاتا اور مسلمان کو بری کرنے کے لئے احتمال و شک بھی کافی سمجھا جاتا تھا اور ایک وقت ہے کہ ذہنی

اختراع اور شیطانی افواہ کو وحی ربانی کے حکم میں لا کر اس کی پرواہ بھی نہیں کی جاتی کہ یہ بے دلیل بہتان کس مقدس پر باندھا جا رہا ہے۔ مگر آپ کا استقلال عجیب تھا جب آپ کے سامنے ذکر ہوتا کہ لوگ یوں کہتے ہیں تو آپ ہنس دیا کرتے۔ زیادہ سے زیادہ آپ کا جواب یہ ہوتا تھا کہ میاں معاملہ بندے کا خدا سے صاف ہونا چاہیئے، دنیا کو کہنے دو جو چاہے کہے۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔ کچھ گناہوں میں ہی کمی ہو گی۔

چوتھا حج ۳۸ھ میں ہوا کہ آپ شعبان میں روانہ ہوئے اور شہرت ہو گئی کہ بہ نیت ہجرت تشریف لئے جا رہے ہیں، اس لئے عام بے چینی پھیل گئی اور ہمراہیوں کی وہ کثرت ہوئی کہ الامان۔ مولوی محمد زکریا صاحب مولوی منظور احمد صاحب قاری عبدالعزیز صاحب اور مولوی لطیف الرحمٰن صاحب نے بھی عزم کر لیا۔ مولوی محمد اسحاق مرحوم مولوی حبیب احمد نانوتوی بھی ساتھ ہوئے اور حضرت مع اہلیہ و حاجی مقبول احمد اپنے قافلہ کو لے کر شعبان میں بمبئی روانہ ہو گئے۔ شیخ محمد یٰسین صاحب بریلوی بھی بمبئی میں جا ملے۔ یہ صاحب داروغہ آبکاری تھے اور انگریزی لباس و وضع کے دلدادہ، ہیٹ لگاتے پتلون پہنتے تھے۔ بیعت ہونا تھا کہ کایا پلٹ گئی۔ نوکری بھی چھوڑی اور لباس بھی چھوڑا۔ اچھے خاصے ملّا بن گئے۔ بمبئی میں اتفاق سے ایک پرانے دوست مل گئے غور سے دیکھ کر بولے کیا مسٹر محمد یٰسین صاحب ہیں؟ بولے اب تو مسٹر نہیں صرف محمد یٰسین ہوں۔ حضرت کی روانگی سے شکر مقیاب ہو گئے اور ریل کھڑے ہوئے۔ قصد تھا کہ رمضان مکہ مکرمہ میں گذاریں۔ مگر جہاز کی روانگی میں تاخیر ہوئی کہ جہاز میں چاند نظر آگیا اور ۷ار رمضان کو مکہ مکرمہ پہنچے۔ یہ زمانہ شریف حسین کی حکومت کا آخری زمانہ تھا کہ استبداد و خودرائی اپنا سکہ جما رہی اور علماء ہند کی مقدس ہستیاں مشتبہ نظروں سے دیکھی جاتی تھیں مولانا محمود حسن صاحب گرفتار ہو کر مالٹا پہنچ گئے تھے اندرون ملک میں عام ناراضی پھیلی ہوئی تھی۔ اس لئے آپ نے اپنے قافلہ کو مدینہ منورہ بھیج دیا کہ

نہ معلوم کیا مقدر ہے تم لوگ پہلی مرتبہ آئے ہو زیارت آستانہ سے محروم نہ جاؤ اور خود مکہ مکرمہ ٹھہرے رہے۔ ایک دن حرم شریف میں عمامہ کا سلام پھرا اور ایک شخص نے کہ نہ معلوم مجنون تھا یا مغلوب الحال شور مچانا شروع کیا قیامت ٹوٹے اور آسمان پھٹے اس حکومت پر کہ مولوی خلیل احمد جیسے محترم مقتدی ہوں اور یہ ایسا اور ویسا شخص امام بنے" وغیرہ وغیرہ جو منہ میں آیا کہا۔ اس شخص کے تو اگلے دن مرنے کی اطلاع ملی اور حضرت کے متعلق اندیشہ ہوا کہ شریف کو سب اطلاع مل چکی ہے عجب نہیں آپ پر بھی ہاتھ صاف ہو۔ آپ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ مسلمان حاکم کی شکایت انگریزی قنصل سے کر کے پناہ لیں۔ اور نہ بسکون سے رہنا نصیب تھا۔ کہ خدا جانے اس کے بعد کیا فتنہ برپا ہو۔ اس لئے مولوی محب الدین صاحبؒ کے اصرار پر کہ ہندوستان جلد جاؤ آپ آخر محرم ۳۹ھ میں روانہ ہو کر شروع صفر میں سہارنپور پہنچ گئے۔ آپ کا شوق وفات فی المدینہ میں بار بار حجاز جانا اور مشیت الہیہ عوارض پیش آنے پر واپس ہندوستان آنا آپ کے امتحان رضا بر قضا کا عجیب حیرت بخش منظر تھا کہ کبھی آپ اداس ہو کر فرماتے بھلا اس قابل کہاں کہ اس مٹی میں ملوں۔ اور کبھی منامی بشارات پر آپ کو امید بندھتی کہ قدرت کے نزدیک کیا بعید ہے وہ اہلیت بخشے اور خوش نصیب بنائے یہ جہاں ان واپسیوں میں آپ کی یہ ترقیات باطنی مضمر تھیں وہیں یہ برکات مستتر تھیں کہ یہاں کے قیام میں علمی وعملی عام نفع کے علاوہ بیسیوں ناقصین سلوک کی تکمیل اور صدہا محرومین کو داخل سلسلہ ہو کر ہدایت دلتقین ہوتی تھی حتیٰ کہ آپ پانچویں حج کو جو کہ عمر شریف کا ساتواں حج تھا ۱۶ شوال کو حیدرآباد ہوتے ہوئے بمبئی پہنچ گئے اور تقریباً دسو رفقاء کے امیر بن کر ثانی جہاز میں حجاز روانہ ہوئے۔ بعد حج ۱۲ محرم کو مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور یہ داخلہ وہ تھا جس کے بعد خروج کا طرف وہی وقت ہے جبکہ سرور عالم وعالمیان صلے اللہ علیہ وسلم اپنے پڑوسیوں کے امیر بن کر صلہ وانعام دلانے کے لئے بارگاہ واہب العطیات کی طرف قدم اٹھائیں گے۔

ان ساتوں حج میں حضرتؒ کے ساتھ صدہا خدام و متوسلین کا مجمع رہا جن کو حضرت نے حج مبرور و مسنون کا عملی سبق پڑھایا۔ زیادہ تر حضرت کے رفیق سفر علماء ہوتے اور یہ دیکھکر کہ حج جیسی عبادت میں جو کہ عمر بھر میں ایک مرتبہ فرض ہے حضرت کو ان جزئیات کا ہر وقت اور تمامی سنن و مستحبات کی پوری رعایت کا اہتمام رہتا ہے جن کی طرف اچھے اچھے مولویوں کی نظر بھی نہیں جاتی وہ حیران ہو جایا کرتے تھے طواف کی دو رکعت کے بعد استلام حجر اسود گویا آجکل متروک ہے مگر فقہاء نے اس کے استحباب کی تصریح کی ہے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضرت نے ترک فرمایا ہو۔ ۱۳ ذی الحجہ کو منیٰ سے واپسی میں محصب پر نزول حضرت کا کبھی نہیں چھوٹا حالانکہ اکثر حجاج محصب سے واقف بھی نہیں کہ کہاں ہے ۹ کو منیٰ سے چلنے میں آپ کی نظر جبل ثبیر پر رہتی اور جب سورج کی شعاع اس پر چمکتی اور اشرق ثبیر کا مصداق نظر آتا تو آپ عرفات کی طرف متوجہ ہوتے۔ اسی طرح واپسی میں مزدلفہ پر صبح کی نماز غلس میں پڑھتے اور بیٹھے رہتے حتیٰ کہ اسفار ہوتا اور اس وقت آپ منیٰ ہو کر سیدھے جمرۃ العقبہ پر رمی کے لئے پہنچتے تھے۔ ایک مرتبہ بابِ مکہ کے قریب پہنچکر آپ نے فرمایا کہ مسنون راستہ حجون کا ہے چلو سنت ادا کریں۔ چنانچہ آپ نے قافلہ چھوڑ دیا اور پہاڑیوں کو قطع کرتے ہوئے جنت المعلیٰ کے متصل نکل کر باب السفلیٰ سے مکہ میں داخل ہوئے مجھے اسی دن علم ہوا کہ حجون کیا ہے اور اس کا راستہ کونسا ہے۔ دخول کے لئے غسل کا آپ نے اہتمام فرمایا اور شہر سے باہر قہوہ خانہ میں ٹھہر کر ہم کو ایک کنستر پانی خرید فرما کر غسل کیا۔ ۹ ذی الحجہ کو عرفات میں بھی غسل کا اہتمام فرمایا اور روزہ تو رکھا نہیں مگر ایک پیالی چائے کے سوا کچھ کھایا بھی نہیں کہ صوم عرفہ اور افطار فی العرفات کو جمع فرمایا۔ رمی جمار کے بعد آپ کا وقوف دعا کے لئے باوجود اتنی دھکا پیل کے کہ تو جوانوں کا پاؤں جمنا مشکل تھا ہمیشہ ہوا اور مسنون مقدار تک ہوا کہ کمی نہیں آئی۔ فتنہ و سکون اور قلت و کثرت حجاج گرمی سردی برسات غرض ہر موسم میں مختلف طبیعت والے اشتراف دو الیان کے زمانہ

حکومت میں آپ کو اسفارِ حج پیش آئے مگر یہ امر مشترک کہ حج بطریق مسنون ادا ہو کسی وقت کے کسی حج میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ نماز تو آپ کی ہر جگہ آنکھوں کی قرۃ العین تھی پھر کیا پوچھنا نماز مسجد الحرام کا کہ آپ کے صدہا رفیقوں میں کوئی ایک بھی نہیں بتا سکتا کہ فلاں نماز میں آپ کی تکبیر تحریمہ یا صف اوّل یا امام کی جانب یمین آپ سے فوت ہوئی ہو۔ سخت گرمی میں جبکہ فرش پر پاؤں رکھنے سے چھالے پڑتے تھے آپ ظہر میں انگلیوں کے بل تیز چلکر مصلّے حنفی پر پہنچتے اور صف اوّل میں امام کا قرب لیا کرتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے ایک مرتبہ بعد نماز مغرب بارش خوب زور کی ہوئی اور رفقاء کی زبان پر یہ آیا کہ الا صلوا فی الرحال پر عمل کا وقت حق تعالیٰ نے دکھایا۔ مگر حضرت نے اذان کی آواز کان میں پڑتے ہی مجھ سے فرمایا چلو بھئی نماز کو ہر چند کہ میری ہمت بھی پست تھی مگر لالٹین ہاتھ میں لے کر ساتھ ہو لیا اور حضرت نے پانی بھرا ہوا لوٹا ہاتھ میں اٹھا لیا میں بالکل نہ سمجھا کہ باوضو ہوتے ہوئے اس کی کیا ضرورت ہے مگر حضرت نے فرمایا ممکن ہے پاؤں کو کیچڑ لگے اس لئے دروازے پر پاؤں دھو لیں گے کہ حرم شریف ملطخ نہ ہو اس سے قبل مجھے مکہ کی کیچڑ اور بارش کا منظر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ نیچے اتر کر سڑک پر آئے تو زمین پاؤں کو پکڑ لیتی تھی۔ ہر قدم پر میری تمنا ہوتی تھی کہ کاش حضرت رخصت پر عمل فرمائیں اور میں سمجھتا تھا کہ حضرت بھی اس تکلف کو برداشت نہ کر سکیں گے مگر ہر قدم حضرت کا مجھ سے آگے رہا۔ ہر ایک کے سر پر چھتری جدا تھی اور میرے ہاتھ میں لالٹین تو حضرت کے ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا۔ بازار ختم ہوا تو سڑک پر تا دیوار مسجد الحرام پچیس تیس فٹ پہاٹ کا دریا بہہ رہا تھا اور اس زور سے پانی چل رہا تھا کہ دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ یہاں حضرت ٹھہرے اور میں سمجھا کہ اب واپسی کا حکم فرمائیں گے۔ مگر حضرت بولے چھتریاں تو اب کرلو بند اور پائینچے کو چڑھا جوتے لو بغل میں اور ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال لو کہ سنا ہے زد میں پتھریاں آتی ہیں اور گر جانے کا ڈر رہتا ہے وہ پیارا منظر بھی اب تک نظر کے سامنے

ہے کہ برہنہ پا گھٹنوں تک پائنچے چڑھائے قینچی کی طرح باہم ہاتھ ملائے چھتریاں بازو پر لٹکائے چلے اور بسم اللہ مجریہا کہکر رود میں قدم ڈالدیئے چونکہ نشیب کا رُخ تھا اس لئے چھوٹی بڑی کنکریاں پانی کے ساتھ بہتی ہوئی اس زور سے آتی تھیں جیسے مٹھیاں بھر کر کوئی گولیاں مارتا ہے آگے بڑھے تو گھٹنوں تک پانی آگیا اور قریب تھا کہ میرا پاؤں پھسلے مگر حضرت نے بازو تھام رکھا تھا کہ گرنے نہ دیا اور خدا خدا کرکے باب الصفا پر چڑھے۔ وہاں پہنچکر پہلی سیڑھی پر اول پاؤں دھوئے اور ابواب لی المادی میں جوتے رکھے اس کے بعد بسم اللہ اللّٰہُمَّ افتح لی ابواب رحمتک پڑھکر حضرت نے مسجد میں قدم رکھا اور میں حضرت کا اتباع کرتا رہا۔ نماز پنجگانہ کے اہتمام کی خاطر حضرت کبھی جبل ثور پر نہیں گئے حالانکہ شوق ظاہر فرماتے اور کہا کرتے تھے کہ بھئی ہر چیز بدل گئی اور تیرہ سو برس میں وہ زمین جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پڑا کرتے تھے خدا جانے کتنے گز نیچے دب گئی مگر دنیا میں دو چیزیں ابھی موجود ہیں جن کو جسد محمدی کے مس کی عزت حاصل ہوتی ہے۔ ایک حجر اسود دوم غار ثور کے پتھر کہ یہی حجر اسود ہے۔ جس کو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لبہائے مبارکہ لگے تھے۔ اور غار ثور کے پتھر بھی ابھی تک وہی پتھر ہیں جن سے مس کرتا ہوا آپ کا بدن غار ثور میں پہنچا تھا۔ مگر جگہ دور ہے اور فجر کے بعد چل کر ظہر تک آجاتا کہ حرم شریف کی نماز فوت نہ ہو طاقت سے باہر ہے اس لئے ہمت نہیں ہوتی۔" میں نوجوان تھا اور سمجھتا تھا کہ تیز چلنا کون دشوار ہے ایک قدم رکھا اور دوسرا اٹھایا۔ اس لئے حضرت سے عرض کیا کہ مجھے اجازت ہو تو میں ہو آؤں۔ حضرت کو معلوم تھا کہ تیز رفتار ہوں اس لئے ذرا سکوت فرما کر کہا بہتر ہے مگر دیکھو ایک لاکھ نماز کا ثواب نہ جاتا رہے میں نے کہا نہیں حضرت انشاء اللہ سویرے واپس آؤں گا۔ غرض صبح کو راضی کیا کہ راہبر بن کر چلے اور دو تین بادہ نوجوان مستعد رفقاء ساتھ ہو لئے تو ان سے بھی کہدیا کہ فجر شافعی کا سلام پھیرتے ہی چل پڑیں گے۔ مگر صبح ہوئی تو صبی ندارد۔ چونکہ عزم کر

چکا تھا اس لئے بنام خدا رفقاء کو ساتھ لے خود نکل کھڑا ہوا کہیں کہیں راستہ پوچھا اور آخر نصاب دیکھکر سمجھ لیا کہ یہ راہ ثور کی علامات ہیں تو قدم اٹھا کر تیز چلا۔ تین میل چلکر تین ہی میل جبل کی چڑھائی ختم کی اور نصف گھنٹہ غار میں لیٹ کر بیٹھکر واپس ہوا اور اپنی انتہائی رفتار پر قدم ڈالے کہ ایک رفیق بھی ساتھ نہ رہ سکا مگر افسوس کہ دروازہ حرم پر قدم رکھتے ہی تکبیر کی آواز آئی السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گھٹنے ٹوٹ گئے اور وہیں بیٹھ گیا۔ بعد میں حضرتؒ سے ملا تو فرمایا بس اسی اندیشہ سے تو میری ہمت کبھی نہ ہوئی۔

مکہ کی گرمی مشہور ہے اور ایسی گرمی کا زمانہ حضرت نے وہاں گذارا ہے جو ناقابل برداشت تھی۔ ہر چند آپ کے متعلقین اور رفقاء نے اصرار کیا کہ چند روز کے لئے طائف تشریف لے چلیں۔ مگر آپ نے جب فرمایا یہی فرمایا کہ بھئی ہندوستان چھوڑ کر تو مسجد الحرام ہی کی خاطر آئے ہیں۔ اس کو چھوڑ کر طائف جائیں تو ہندوستان ہی چھوڑنا کیا ضرور تھا۔ سیر کے لئے تو وہاں بھی شملہ و منصوری موجود ہے تو کہیں جاتے نہیں دکھ سکھ گذر ہی جائے گی؛ میں نے یہ بھی دیکھا کہ حضرت حرم شریف میں داخل ہوتے وقت اعتکاف کی نیت فرماتے اور اس کو نہایت ہی برا سمجھتے تھے کہ حرم شریف کو راستہ بنایا جائے کہ چکر سے بچنے کے لئے مثلاً باب العمرہ کے پاس والے مسجد میں عبور کر کے سوق شامی یا باب السلام کے راستہ نکل کر بازار جائیں۔ اسی طرح کسی مسجد کو تماشا گاہ بنانا حضرت کو بہت ناپسند تھا۔ دارالطلبہ کی مسجد گلتومیہ تیار ہونے پر بعض عورتیں پردہ کرا کے دیکھنے آئیں تو آپ نے فرمایا جو وہاں جائے تحیۃ المسجد ضرور پڑھے۔

جلیپور میں بعض احباب کے اصرار پر آپ مشہور قلعہ جو پہاڑ پر بنا ہوا ہے دیکھنے کو تشریف لے گئے اس کے قریب ایک پرانی یادگار شاہی مسجد ہے اس میں آپ نے قدم رکھا تو فرمایا مولوی عاشق الٰہی وضو کرلو دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کر لیں کیونکہ مسجد کو تماشا گاہ بنانا جائز نہیں۔ یہ عبادت کے لئے ہے نہ کہ یادگار سمجھکر دیکھنے کیلئے

ہر سفر میں ایک دو دن کا اعتکاف مسنون بھی آپ مسجد الحرام میں ضرور کرتے اور زمزم شریف خاص رغبت و احترام کے ساتھ چاہ پر حاضر ہو کر ڈول سے چھک کر پیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ مولوی محب الدین صاحب کے خلوہ میں معتکف تھے اور بندہ ساتھ تھا کہ تہجد سے فارغ ہو کر فرمایا چلو آج زمزم کا سب سے پہلا ڈول پئیں گے سنا ہے اس میں خالص کچے دودھ کا مزہ آتا ہے چنانچہ چاہ پر پہنچکر دیر تک انتظار کیا اور قفل کھلتے ہی اندر تشریف لے جا کر پہلا ڈول اول خوب شکم سیر ہو کر خود پیا اور پھر مجھے پلایا، زمزم پلانے والے جو مسجد میں پھرتے تھے کہ پلا کر پیسے مانگتے تھے اُن سے پانی لینا آپ کو پسند نہ تھا اور فرمایا کرتے کہ یہ تو بیع و شرا ہے جو مسجد میں حرام ہے خصوصاً مسجد حرام میں۔ کاش یہ نہ کیا کریں کہ پلانا ان کے لئے ثواب ہو اور صدقہ دینا معطی کے لئے سبب اجر۔ مگر بیع کی صورت نے اس کو خرید و فروخت بنا دیا جس سے معطی بھی غافل ہے کہ نیکی برباد گناہ لازم کے مصداق بنتے ہیں۔ اپنے دوستوں کو صاحبزادے مولانا محمود حسن کی طرف متوجہ فرماتے کہ مسائل حج میں جو کچھ پوچھنا ہو حضرت مولانا سے پوچھنا اور خود بھی پابندی کے ساتھ مولانا کے پاس آتے اور کسی مسئلہ میں کوئی اشکال پیش آتا تو حل فرمایا کرتے تھے۔ یہ بھی فرمایا کہ مولانا کو مسائل حج کے جزئیات اتنے مستحضر ہیں کہ آج کوئی نظیر نظر نہیں آتی۔ مولانا نے مناسک حج میں سات برس کے اندر ایک رسالہ غنیۃ الناسک تالیف فرمایا تھا، حضرت نے اس کو تقاضے کے ساتھ نقل کروایا اور جب بندہ حاضر حرمین ہوا تو تاکید فرمائی کہ نقل اپنے ساتھ ضرور لیتے آنا چنانچہ بندہ نے نقل کا خود مولانا کے ساتھ اصل سے مقابلہ کیا اور ساتھ لا کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا، حضرت نے بعض احباب کو ترغیب دے کر سو سو نسخے کا حصہ دار بنایا اور ایک حصہ خود لیا اور اس کو طبع کرایا کہ محفوظ و نافع ہے کیونکہ موجودہ ضروریات

۱؎ حضرت ممدوح علاقہ سوات کے باشندے حضرت گنگوہی کے شاگرد عرصہ سے مہاجر و مقیم مکہ تھے۔ فقہ میں بالخصوص مناسک حج کی واقفیت میں بے مثل تھے ۱۲

کے لئے مناسک حج میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ حج میں مسلمان اتنا روپیہ خرچ کرتے اور اتنی مشقت اٹھاتے ہیں مگر افسوس ہے کہ حج کو بطریق مسنون ادا کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ سارا روپیہ اور محنت ٹھکانے لگے۔ عوام جب حج کو جاتے تو حضرت تاکید فرماتے کہ کسی دیندار فقیہ عالم کی مرافقت تلاش کرو اور علماء جاتے تو آپ وصیت فرماتے کہ یہ جدید مطبوعہ مناسک ضرور اپنے ساتھ رکھو اور شروع سے جس نسک کا وقت قریب ہو اس کا باب دیکھنا اور بار بار مطالعہ کرنا لازم کرلو۔ مولانا محمد حسن صاحب کا زہد کہ سال بھر میں پچاس روپیہ سے زیادہ خرچ نہیں رکھتے اور توکل کہ کسی سے بطمع ملنا بھی پسند نہیں کرتے اور مستعدی کہ باوجود ضعف بصر اور زمانہ پیری کے نماز کی تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہوتی تھی حضرت کی نظروں میں بڑا پیارا تھا اور حضرت فرمایا کرتے کہ بس ہجرت تو ایسے لوگوں کی ہے۔ حضرت کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا نے بھی وصال فرمایا اور غنیۃ الناسک اپنی یادگار اور باقیات صالحات چھوڑ کر جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے رحمہ اللہ واطاب ثراہ۔

حضرت نے باوجودیکہ حج سات کئے مگر اس لحاظ سے کہ آپ کا دل ہر سال حاضری حرمین شریفین کا متمنی و مشتاق رہتا اور زندگی کا ہر لمحہ اسی تمنا و شوق میں گذرتا تھا۔ گویا آپ کا بدن بھی دل کی طرح بیت اللہ وبیت الرسول ہی پر پڑا رہتا تھا۔ آپ کے واقفین میں جب کوئی حج کو جاتا تو آپ اس کو اجازت دیتے اور بحسرت فرماتے کاش مجھے بھی یہ دن نصیب ہوتا۔

جب کبھی سنتا ہوں جاتا ہے کوئی حج کیلئے — حسرت آتی ہے کہ یہ شخص ہمیں کیوں نہ ہوئے

بندہ نے [illegible] میں جب مع اہل کے حج کا قصد کیا اور حضرت کی اجازت کے بعد دعا کی درخواست لکھی تو حضرت کا جواب آیا۔ آپ اس مبارک سفر میں جا رہے ہیں۔ اب بھی دعا کرتا ہوں اور انشاء اللہ تا واپسی آپ کے لئے دعا کرتا رہوں گا اللہ تعالیٰ شانہٗ آپ کو دینی اور دنیوی مکارہ سے محفوظ رکھے اور صحت وعافیت واستقامت

لہ اس کتاب کے چند نسخے باقی ہیں قیمت ایک روپیہ دو آنے مجلد ایک روپیہ ۶ آنے ہے ۱۲

مرافق بنا دے۔ اور تمام اعمال قبول فرمادے۔ بمبئی میں جب میں میاں ضیاء الاسلام وغیرہ سے ملنے گیا تھا جہاز تیار دیکھکر بے اختیار دل چاہتا تھا کہ ساتھ ہولوں اب آپ کی روانگی پر بھی طبیعت میں یہی رغبت ہوتی ہے۔ خوابوں میں بھی یہی خیالات ہیں لیکن جب کشش ہوگی اسی وقت ظاہر حاضری ممکن ہوگی۔ بہرحال آپ جارہے ہیں اور بے اختیار آپ کے ہمراہ دل بھی کشاں کشاں جارہا ہے اللہ متعکم حیث ما کنتم "۔ آپ کو اپنے متبعین کے ساتھ باپ سے زیادہ شفقت تھی کہ سفر میں بالخصوص آپ کا دھیان انہیں میں پڑا رہتا تھا۔ حافظ فخر الدین صاحب مع اہلیہ رمضان مکہ مکرمہ میں گذارنے کی نیت سے اسی سال حج کو روانہ ہوئے مگر جہاز نہ ملنے کی وجہ سے مسافر خانہ بمبئی میں اتنا قیام کرنا پڑا کہ اہلیہ کا دل گھبرا گیا اور قصد کیا کہ یہاں پڑے رہنے سے کیا حاصل گھر ہی چلیں کہ بچوں سے مل کر بعد عید جہاز جانے کے وقت آجائیں گے۔ حضرت نے منع کیا اور تحریر فرمایا کہ تم سفر حج پر ہو گویا حج ہی میں ہو واپسی کا قصد نہ کرو اور ان شاء اللہ تم سے وہیں آکر ملوں گا چنانچہ آپکو راندیر کا سفر پیش آیا اور آپ گنجائش نکال کر بمبئی پہنچے حاجی ضیاء الاسلام کاندہلوی بھی جارہے تھے اور انہوں نے ڈاک کے جہاز کا ٹکٹ لے لیا تھا۔ بمبئی اسٹیشن پر اترتے ہی آپ کو اطلاع ملی کہ ضیاء الاسلام جہاز پر روانہ ہو لئے چنانچہ آپ سیدھے بندر پر آئے اور بعد کوشش و تدبیر جہاز پر پہنچکر ان سے ملے۔ جب جہاز چھوٹ لیا تو آپ مسافر خانہ میں آئے اور حافظ فخر الدین صاحب سے ملکر ان کی اہلیہ کو تسکین دلائی اور بچوں کی طرف سے ہر طرح مطمئن ومسرور بنا کر دیر کے بعد اپنی قیام گاہ پر آکر آرام فرمایا۔

وہ سال کچھ زیادہ شورش و بد امنی کا تھا کہ ہمارا قافلہ مدینہ منورہ جاتا ہوا منزل خیف میں محبوس ہو گیا اور پورے اٹھائیس دن ہم پانچسو اونٹوں کے مسافر کھلے میدان میں قید رہے کہ جیتک دشمنی فی شغدف نذدیں گے آگے نہ جاسکیں گے۔ قافلہ میں چاروں طرف سے عورتوں کے نوحہ و بین کی آوازیں آتیں اور اچھے اچھے

مرد سراسیمہ دکھائی دیتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ ہندوستان میں میری وجہ سے سب میں زیادہ پریشان ہونے والا صرف روحانی باپ کا دم ہے کہ خلافِ عادت خط نہ پہنچنے سے خدا جانے کیا کیا واہمے لاتے گا مگر مجبور تھا کہ خود گرفتار تھا پھر خط ڈاک خانہ میں کیسے پہنچا تا خط لکھنا پہلے ہی دن شروع کر دیا اور روزانہ کے حالات قلمبند کرتا رہتا تھا مگر حضرت تک پہنچانا قابو کی بات نہ تھی۔ ایک سانڈنی سوار بدو کو معاوضہ دے کر خط بھی دیا کہ ینبع کے ڈاک خانہ میں ڈال دے۔ مگر واپسی کے بعد معلوم ہوا کہ وہ خط نہیں پہنچا۔ میرا خیال صحیح نکلا کہ حضرت کو جب ولایتی ڈاک میں یکشنبہ کے دن کوئی خط نہ ملا تو پریشان ہو گئے اور ہفتہ میں کئی بار فرمایا اس ڈاک سے عاشق الٰہی کا خط نہیں آیا نہ معلوم کیوں۔ دوسرا ہفتہ خالی گیا تو اور پریشانی بڑھی حتیٰ کہ تیسرے ہفتہ حجاز کی خیر انواہ کے درجہ میں پھیلی کہ مدنی قافلہ کو بدوؤں نے قید کر لیا اور بہت آدمی مارے گئے اس خبر پر تو حضرت کی پریشانی کا کچھ ٹھکانا نہ رہا۔ حضرت اکثر مغموم و متفکر بیٹھے رہتے اور کبھی کبھی ٹھنڈے سانس بھرا کرتے تھے۔ میرے مکان پر بھی اعزہ کو پریشانی تھی اور انہوں نے تین ہفتہ خط نہ آنے پر حضرت کو لکھا کہ حضرت کے پاس کوئی خط ضرور آیا ہوگا ہم لوگوں کو خیریت سے مطلع فرماویں۔ اس کا جواب حضرت نے فوراً دیا اور لکھا کہ میں خود نہایت پریشان ہوں اور اس افواہ نے تو کمر توڑ دی۔ بجز اس کے کہ اپنے اللہ پر بھروسہ کیے بیٹھا ہوں کچھ نہیں کر سکتا۔ دل گواہی دیتا ہے کہ لخت جگر انشاءاللہ بخیریت ہے لیکن آنا کب مقدر ہے یہ نہیں بتا سکتا۔ میں بھی دعا کر رہا ہوں تم بھی دعا کرو۔ میری اہلیہ اس وقت سخت بیمار تھی کہ شغدف سے نیچے اترنا بھی دشوار تھا اور اس کی زندگی سے مایوسی تھی مگر الحمدللہ اس قدر مستقل مزاج تھی کہ ایک لمحہ کو بھی اسے ہراس نہ ہوا۔ ہاں جب بدوؤں کا اصرار ہوا کہ لاؤ اور قافلہ کا انکار ہوا کہ پیسہ بھی پاس نہیں تو دفعتہً اعلان ہوا کہ حملہ ہو کر قتل عام ہوا چاہتا ہے۔ اس خبر نے چار طرف گریہ و بکا کا کہرام مچا دیا اور اس وقت اس کی بھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

اور یہ کہکر یا اللہ عصمت اور آبرو تیرے ہاتھ ہے۔ کاش شوہر سے پہلے مجھے قتل ہونا نصیب ہو۔ رونے لگی۔" اس پریشانی میں اس کی آنکھ لگ گئی اور اس نے خواب دیکھا کہ حضرت موجود ہیں اور اونٹ کی مہار تھام کر پہاڑ کے اوپر چڑھ رہے ہیں۔ ادھر بندہ نے خواب دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ اور غایت حزن میں گردن جھکائے بیٹھے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حذیفہؓ سے کوئی قصہ ہوا ہے اس لئے میں اس سعی میں ہوں کہ صفائی کراؤں تاکہ حضرت کا ملال رفع ہو۔" آنکھ کھلی تو رہائی کا سامان شروع ہو چلا۔ آخر سعی میں مجھے اٹھانا پڑا کہ بدوؤں اور اہل قافلہ میں سمجھوتہ ہو۔ ۱۰ محرم کا محبوس قافلہ ۱۰ صفر کو مدینہ میں داخل ہو لیا۔ وہاں سے بقیہ حالات کا ڈالا ہوا خط حضرت کو ملا مگر ایسے وقت کہ چوتھے دن میرا تار پہنچ گیا کہ میں براہ سہارنپور آرہا ہوں۔ کیا ٹھکانا حضرت کی مسرت کا کہ گاڑی آتی تھی ایک بجے مگر حضرت مدرسہ سے فارغ ہو کر بارہ ہی بجے اسٹیشن پر پہنچ لئے اور پوری دعوت کا تیار کھانا ساتھ۔ گاڑی آئی تو ادھر حضرت مجسم انتظار ایک ایک گاڑی پر نظر ڈال رہے تھے اور ادھر میں کھڑکی سے منہ نکالے حضرت کی صورت کا متمنی تھا کہ دفعتہً آمنا سامنا ہوا اور میں کھڑکی ہی سے نیچے کود پڑا۔ حضرت نے لپک کر چھاتی سے لگایا مگر آنسو میری آنکھوں میں بھی تھے اور حضرت کی آنکھوں میں بھی۔ ایک مرتبہ بندہ حضرت سے اجازت لے کر مدینہ منورہ سے حجاز ریلوے میں دمشق چلا گیا۔ مدنی اسٹیشن تک حضرت پہنچانے آئے اور جس وقت گاڑی آجانے پر رخصتی معانقہ فرمایا تو اس حالت کو میں عمر بھر نہیں بھول سکتا کہ حضرت کی آنکھوں میں آنسو تھے اور قلب میں غیر معتدل حرکت۔ گرامی نامہ دست مبارک کا لکھا ہوا پیچھے پیچھے پہنچا جو مجھے بیت المقدس میں ملا اس میں تحریر فرمایا تھا آپ انشاء اللہ مع الخیر منزل مقصود پر پہنچ لئے ہوں گے مگر آپ کے چلے جانے سے میں تو بیکار محض ہو گیا۔ ع از دیدہ برفتی و نرفتی ز دل ریش۔" واپس وطن آیا تو حضرت ۲۵ دن قبل وطن پہنچ لئے تھے مگر میرے اعزہ کو لکھ چکے تھے کہ تار آتے

ہی مجھے خبر دینا کہ اسی دن ملنے کے لیے آسکوں چنانچہ حضرت تشریف لائے۔ اور واپسی کے وقت فرمایا اب سہارنپور پہنچکر اقامت کی نیت کروں گا کہ اب تک تیرے انتظار میں کرتا۔ جانے کس دن آجائے مسافر ہی بنا رہا اور نیت اقامت نہ کر سکا۔

میری ہی خصوصیت نہیں بلکہ حضرت کو اپنے خدام و منتسبین کے ساتھ بالعموم اس درجہ محبت تھی کہ ہر شخص یوں سمجھتا تھا میرے برابر حضرت کو کسی سے بھی تعلق نہیں ہے۔ مگر بایں شفقت سیاست و اصلاح سے غفلت نہ ہوتی تھی کہ کسی سے کوئی عجب و ناز یا کوتاہی دیکھتے تو زبان سے تو بہت کم فرماتے مگر بے رخی و اعراض کا برتاؤ زیادہ فرماتے جس سے طالب بے چین ہو کر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتا اور بزبان حال کہتا تھا ؎

از فراق تلخ مے گوئی سخن ! ہر چہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

میرے متعلق بھی ایسا پیش آیا کہ بعض حاسد لوگوں نے حضرت کے کان میں میرے متعلق کچھ ڈالا اور میں نے اپنے ضعف قلب کی وجہ سے اس معاملہ کی صفائی سے وحشت کھائی جس پر یہ گمان صحیح ہو گیا کہ میری طرف جس خطا کا انتساب ہوا وہ بجا اور ٹھیک ہے۔ چنانچہ حضرت نے خط بھیجنا بند کر دیا۔ اور بندہ نے مسلسل تین خط نہایت بے چینی میں لکھے مگر حضرت نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ آخر پریشان ہو کر چوتھا خط لکھا تو جواب تیز آیا کہ اوّل معاملہ کی صفائی کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ حاضر خدمت ہوا اور بالمواجہہ قائل سے دعوی کی تنقیح و صفائی ہوئی حضرت کو جب علم ہو گیا کہ مجھ پر بیجا الزام اور اس کو سچ ثابت کرنے کے لیے ایک گہری چال چلی گئی تھی تو حضرت کی شفقت کا کچھ ٹھکانا نہ رہا اور پہلے سے بدرجہا زیادہ توجہ و کرم فرمانے لگے اور فرمایا غلطی سے دنیا میں کوئی بشر خالی نہیں۔ مجھ سے بھی غلطی ہوئی اور اب بالکل اطمینان رکھو انشاء اللہ آئندہ ایسی نوبت کبھی نہ آئے گی۔ دو ڈھائی ہفتہ کا وہ تلخ زمانہ مجھے اب بھی یاد آتا ہے تو طبیعت پریشان ہو جاتی ہے مگر اس کے ثمرات و برکات

پر نظر ڈالتا ہوں تو شاکی کو اپنا محسن سمجھتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اس کو میرے لئے وسیلۂ خیرات بنایا۔

حضرت ہمارے بطئ الغضب اور سریع الفئ تھے کہ غصہ بدیر آتا اور جلد اتر جاتا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی جب میں دیکھتا تھا کہ حضرت کو غصہ آیا اور تیز لہجہ میں دھمکا رہے ہیں مگر جس وقت معتوب نے گردن جھکا کر زبان سے اتنا لفظ نکالا کہ حضرت بے شک مجھ سے خطا ہوئی اور آئندہ انشاء اللہ ایسا کبھی نہ ہوگا تو گویا حضرت کو غصہ آیا ہی نہ تھا۔ نہ آواز میں تیزی رہی نہ چہرے پر سرخی یہ فرما کر کہ بس بہت اچھا اسی محبت کے ساتھ باتیں کرنے لگتے جو آپ کا معمول تھا۔ ہاں اگر اس کو ندامت نہ ہوتی تو حضرت پر اس کا اثر بڑھ جاتا اور اگر کسی کی قسمت میں شقاوت مقدر ہوتی تو وہ حضرت کے غصہ کو جو کہ محض اس کی اصلاح نفس کے لئے ہوتا تھا ناگواری کے ساتھ دیکھتا اور کشیدگی اختیار کرتا تھا۔ اول اول حضرت اس کا تذکرہ تاسف کے ساتھ اپنے دوستوں سے فرماتے اور آخر خالی الذہن ہو کر ہمیشہ کے لئے یکسو ہو جاتے تھے۔ مگر ایسا بہت کم شاید ایک یا دو ہی کے ساتھ پیش آیا ہو ورنہ حضرت کا شفقت آمیز غصہ ہمیشہ بادآور اور مثمر حسنات ہوا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اپنی مخلوق کی اصلاح کے لئے نعمت و نقمت کو توام بنایا اور ہر دو ابتلا میں ثابت قدم رہنے کو اخلاص اور بے نفسی جانچنے کی کسوٹی قرار دیا ہے جس سے کسی زمانہ میں کوئی مرشد و مصلح حتیٰ کہ وجود باجود سرور عالم و عالمیان صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی خالی نہیں رہا۔

حضرتؒ کی سخاوت بھی حیرت بخش تھی کہ اکثر خدام تبرک کے خواہشمند ہوتے تھے اور اس وقت سائل کی حیثیت کے موافق حضرت جو کچھ بھی پاتے بے دریغ عطا فرمایا کرتے تھے۔ مولوی حبیب الرحمٰن سہواروی شرم کی وجہ سے حضرت کی خدمت میں تو عرض نہ کر سکے مگر حاجی مقبول احمد سے کہ حضرت کے سالے تھے کہا کہ حضرت سے ایک عربی رومال تبرکاً لینا چند روز بعد یہ رات کی گاڑی

سے مہارنپور آئے اور حضرت سے قبیل فجر ملاقات ہوئی جبکہ حضرت حسب معمول مکان سے تشریف لائے۔ مصافحہ و مزاج پرسی کے بعد اول ہی حضرت نے فرمایا حافظ جی تم نے حاجی جی سے رومال کو کہا تھا۔ اور اتنا فرما کر فوراً سر مبارک سے رومال اتار کر ان کو عطا فرما دیا کہ بیش قیمت بھی تھا اور حضرت کا مستعمل ہونے کے سبب تو بے بہا ہو گیا تھا۔ ایک بار مجھے بھی شوق ہوا کہ حضرت سے کوئی تبرک لیتا اور دبی زبان سے عرض کیا۔ حضرت نے فوراً ہی چادر مبارک جس کو اوڑھے ہوئے تھے اتار کر لپیٹی اور خادم سے فرمایا بھیجی پر ان کے بیگ میں رکھ دینا۔ مولوی عبداللہ جان صاحب فرماتے ہیں کہ رمضان کا مہینہ تھا اور اتفاق سے میری ساری گھڑیاں مرمت کے لئے گئی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے ایک گونہ تکلیف تھی۔ حضرت کے پاس حاضر ہوا تو سرسری طور پر اس کا ذکر آگیا۔ حضرت خاموشی کے ساتھ اٹھے اور حجرہ میں سے ایک جیبی گھڑی لا کر مجھ کو دیدی۔ اس وقت میں نے بطیب خاطر لی کہ مستعار سمجھا تھا اور ضرورت بھی تھی مگر عید کے دن جب اس کو واپس کرنا چاہا تو حضرت نے فرمایا کیا واپس لینے کے لئے دی تھی؟ تب مجھے معلوم ہوا کہ یہ عطا تھی اور میں نے اس کو اپنی ملک بنا لیا مگر اس کو معمولی گھڑی سمجھا۔ کچھ دنوں کے بعد گھڑی ساز میرے مکان پر گھڑیاں دیکھنے آیا تو میں نے یہ گھڑی بھی اس کو دکھائی۔ اس نے کہا کہ تمہاری جتنی بھی گھڑیاں ہیں اس کے سامنے سب کھلونا ہیں اور یہ گھڑی اصلی انگلش لیور ہے جو بدرجہ اتم سو روپیہ کے لگ بھگ قیمت کی ہے تب تو میری آنکھیں کھلیں اور اس گھڑی کی وقعت میری نظروں میں ہو گئی پھر میں نے مختلف گھڑی سازوں کو دکھایا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ یہ تو بڑی نادر الوجود گھڑی ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں نے غصہ میں ناراض ہو کر باہر صحن میں بیٹھے ہوئے بہت زور سے یہ گھڑی نوکر کے مارنے کے لئے اس کی طرف پھینکی جو برآمدہ میں کھڑا تھا۔ نوکر کے تو لگی نہیں۔ بلکہ دیوار سے ٹکر کھا کر زمین پر گر گئی۔ میں نے جی میں سمجھ لیا کہ گھڑی تو ٹوٹ ہی گئی مگر یہاں مرمت

نہ ہو سکے گی۔ کسی انگریزی کارخانہ میں بھیجوں گا۔ اگلے دن جو دیکھتا ہوں تو گھڑی
چل رہی ہے اور وقت صحیح دے رہی ہے۔ میں حیرت سے مبہوت ہو کر رہ گیا
وہ دن ہے اور آج کا دن کہ گھڑی بدستور چل رہی ہے اور مرمت کا نام بھی
نہیں آنے دیتی" ایک مرتبہ کوئی بزرگ تشریف لائے اور ان کو نعلین کی ضرورت
تھی جیسے ہی حضرت کو یہ معلوم ہوا حضرت نے اٹھکر اندر سے جوتوں کا ایک نیا
جوڑا لاکر نذر کیا اور ان بزرگ نے اسی وقت اس عطیہ کو لے کر سر پر رکھ لیا
شیخ محمد یعقوب صاحب نائب تحصیلدار پٹیالہ مؤلف عشرۂ کاملہ ایک بار حاضر
خدمت ہوئے اور خود عرض کی ہمت نہ پا کر حاجی احمد حسن صاحب کی معرفت
مستعمل ملبوس کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت مسکرائے۔ سبب پوچھا۔ عرض کیا کہ
حضرت کچھ طبیعت ہی کا تقاضہ ہے۔ ململ کا کرتہ زیب بدن تھا حضرت نے
فرمایا اچھا بھئی یہ ہملا حاجی کرتہ ہے جو گذشتہ سفر حج میں پہنا تھا یہی لے جاؤ
گاڑی کا وقت قریب تھا انہوں نے عرض کیا حضرت میں اسی گاڑی سے جا رہا ہوں
آپ اٹھکر حجرہ میں تشریف لے گئے اور دوسرا کرتہ پہنکر پہلا کرتہ ان کو عطا فرما
دیا۔ حضرت کے بدن کا بالائی حصہ بھی کبھی مکشوف نہیں ہوتا تھا الا بضرورت خاص
کہ کبھی جمعہ کے دن گرمی میں کسی خادم سے کمر ملواتے تو تنہائی میں کرتہ اتار دیا
کرتے ورنہ غسل کے بعد باہر تشریف لاتے تو اندر ہی کپڑے پہن کر تشریف
لایا کرتے تھے۔ عمامہ حضرت متوسط طول کا باندھتے تھے مگر نہایت خوبصورت۔ شملہ
دو سوا دو بالشت پیچھے چھوڑتے اور اکثر مشروع یعنی گلیوری کا سبز یا کاہی ہوتا تھا
ہمیشہ آپ کھڑے ہو کر عمامہ باندھتے اور اس کے پیچ داہنی طرف سے بائیں جانب
جاتے تھے۔ آپ کہیں سفر میں جاتے تو آپ کا معمول تھا کہ تمامی مخلصین کے
لئے ہدایا اور سوغات لایا کرتے تھے جس میں اس پر بھی نظر رہتی تھی کہ کسی کو
کیا شغف، خوب یا کس چیز کی ضرورت ہے۔ چنانچہ رنگون سے آپ واپس تشریف
لائے تو دو بڑے بکس آپ کے ساتھ تھے۔ تمامی مدرسین کے لئے ایک ایک،

جو ٹخنے کا کپڑا ان میں بند تھا اور کسی کے لئے بنیان تھا کسی کے لئے ٹوپی مجھے
اونچی ٹوپی پہننے کی عادت تھی جب حاضر ہوا تو حضرت ایک خوبصورت بید
کی بنی ہوئی ٹوپی اور ایک رنگین خوبصورت کھڑاؤں نکال کر حجرہ سے باہر
تشریف لائے اور فرمایا تمہیں اُونچی ٹوپی مرغوب ہے اس لئے تمہارے لئے
یہ لایا ہوں اور گھر میں کے لئے کھڑاؤں۔ ڈیرہ غازی خاں سے حضرت کی تشریف
آوری پر حاضر ہوا تو حضرت نے وہاں کے بنے ہوئے خوبصورت پنکھے عطا
فرمائے کہ موسم گرمی کا تھا۔ غرض اتباع سنت کے علاوہ یہ دیکھکر حیرت ہوتی
تھی کہ حضرت کو کسی وقت بھی اپنے مخلصین سے ذہول و نسیان نہیں ہوتا سفر
حج سے واپس تشریف لاتے تو چار چار کنستر زمزم اور کھجوریں لاتے اور
عرصہ تک آپ کے پاس خدام کی آمد رہتی مگر کوئی بھی حضرت کے تبرک سے محروم
نہ جاتا۔ مدرسہ کے طلبہ و مدرسین کی کثیر جماعت تو حضرت کے قریبی روحانی
رشتہ دار تھے ہی کہ ایک ایک طالب علم کو خالص زمزم عطا ہوتا تھا پھر باہر
سے جو کوئی بھی جب کبھی آتا پہلا لفظ حضرت یہی فرماتے کہ بھئی ان کو زمزم پلاؤ
اور مدنی کھجور کھلاؤ۔ اس کے علاوہ مخصوص خدام اور محترم دوستوں کے
لئے عمدہ تسبیح شامی رومال جامہ وار یا اور کوئی قیمتی چیز جس کو وہاں کی ہوا
لگی ہو خرید کر لاتے۔ حضرتؒ اپنے مخلصین کے ہدایا نہایت مسرت سے قبول فرماتے
تھے مگر جس قدر ہدایا حضرت نے خود تقسیم فرمائے شاید قبول فرمانے کی نوبت
اس سے چوتھائی بھی پیش نہ آئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی حضرت چونکہ صاف گو بہت
تھے اس لئے بے تکلف خدام سے ہدیہ کا عیب ظاہر بھی فرما دیا کرتے تھے۔ ایک
بار کسی نے لکھنؤ کے خربوزے بھیجے جو شیریں نہ تھے آپ نے تحریر فرمایا تم پیسے
خرچ کرکے چیز بھیجو اور مجھے شیریں معلوم نہ ہوں اس سے کیا فائدہ۔ ایک صاحب
نے آم بھیجے اور جب انہوں نے حاضر ہوکر دریافت کیا کہ حضرت آم کیسے تھے؟
بے ساختہ فرمایا کچھ نہیں۔ تم نے تکلیف اٹھائی اور مجھے پسند نہ آئے۔ ترشی

غالب تھی۔ دنیاداروں کا ہدیہ قبول کرنے میں آپ کو دریغ ہوتا اور جس ہدیہ میں اخلاص نہ ہوتا اس کو آپ رد فرماتے تھے۔ بمبئی میں ایک سیٹھ نے آپ کے حج کو جاتے وقت ملازم کے ہاتھ سو روپیہ بھیجے کہ مجھے حاضری کی فرصت نہیں اس لئے روپیہ آدمی کے ہاتھ بھیجتا ہوں قبول فرمائیں آپ نے واپس فرما دیا کہ بحمد اللہ مجھے ضرورت نہیں۔ آخر وہ خود آیا اور معذرت کی تب آپ نے قبول کیا۔ اگر کسی غریب کا کوئی ہدیہ ہوتا تو آپ اس کی بڑی عظمت فرماتے اور ایسے قبول فرماتے تھے گویا اس کے محتاج ہیں۔ ایک شخص نے ٹوپی پیش کی جو شاید ۸ سے زیادہ کی نہ ہوگی آپ نے مسکرا کر اس کو لے لیا اور اسی وقت اوڑھ کر اپنی ٹوپی کو بکس میں رکھوا دیا۔ آپ قاضی عبدالمجید صاحب کی درخواست پر شملہ تشریف لے گئے ہیں نے بھی دعوت کا اصرار کیا آپ نے فرما دیا کہ بھئی ہماری دعوت تو عبدالمجید نے سہارنپور میں کردی تھی اس لئے ہمیں تو دوسرے کی دعوت منظور کرنے کا حق رہا نہیں۔ دعوت کے ذمہ دار تو یہ ہیں ان سے کہو یہ اپنے ہاں کھلائیں یا دوسرے کے ہاں ہمیں تو کھانے سے بحث ہے۔ ان سے کہا جاتا تو یہ منظور کرتے نہ تھے کہ دو دن کے لئے تو یہ دولت نصیب ہوئی جو کچھ بھی برکت ہو وہ گھر میں رہے کچھ دیر بعد ایک لڑکا آیا اور اس نے اپنی بوڑھی ماں کا سلام پہنچا کر درخواست دعوت پیش کی۔ استفسار حال سے حضرت کو معلوم کہ وہ بیوہ ہیں اور حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہیں اور اسی تعلق پر دعوت کر رہی ہیں حضرت نے بڑی خوشی سے منظوری بخشی اور یوں فرمایا کہ میرا سلام کہنا اور یہ کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں راستہ ہے پہاڑ کا جس کے اتار چڑھاؤ دونوں مصیبت نیز پھر رات کا وقت ہوگا اور جگہ ہے دور اس لئے خوشی سے یہ گوارا فرمائیں کہ صرف میرے لئے کھانا پکائیں اور مجھے یہیں بھیجدیں۔ انہوں نے اس کو قبول کر لیا اور حضرت نے قاضی عبدالمجید سے فرمایا کہ قاضی جی ان کی دعوت رد نہ کر سکا کہ عورت ذات ہیں اور پھر بیوہ ناحق ناراض ہوتیں اور طرح طرح

دہاں وہ لاتیں کہ غریب بیوہ کے ہاں کا کھانا کیوں کھاتے جبکہ بڑے لوگ خاطر تواضع کے لئے موجود ہیں۔ چنانچہ مغرب کے بعد ہی حضرت مکان پر تشریف لے آئے اور کھانے کا انتظار فرمایا۔ دیر ہو گئی اور کھانا نہ آیا حتیٰ کہ عشا کی اذان کان میں پڑی تو آپ نے فرمایا قاضی جی کھانا تو خدا معلوم کس وقت پہنچے میں نے تو ان کو کہلا کر بھیج دیا تھا کہ میں یہاں پر دوسروں کا مہمان ہو کر اور ان کا بلوایا ہوا آیا ہوں۔ تم کیوں ناحق دردسری کرتی اور بار اٹھاتی ہو۔ تم تو خود بیوہ ہو تمہاری تو امداد ہونی چاہیئے نہ کہ الٹی تمہیں تکلیف دی جائے۔ مگر وہ نہ مانیں اور اصرار ہوا تو اس اندیشہ سے کہ ناراض نہ ہو جائیں دعوت منظور کر لی۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔

انہوں نے عرض کیا کہ حضرت وقت زیادہ گذر لیا اور نماز کا وقت بھی قریب آ گیا بھوک بھی زیادہ لگ رہی ہے مگر اتفاق سے اس وقت گھر میں صرف خشکہ اور دال پکا ہوا ہے اور وہ بھی دن کا کہ اتفاق سے میرے ایک دوست کا لڑکا چار منزلہ مکان کی چھت سے گر گیا اور میری گھر والی اس اطمینان پر کہ حضرت تو دعوت منظور فرما چکے وہاں چلی گئی۔ سوچ رہا ہوں کہ اس تنگ وقت میں کیا چیز پیش کروں۔ حضرت نے شفقت و سنجیدگی سے فرمایا یہ تو میرا اپنا گھر ہے جو کچھ بھی ہو بے تکلف کھانا میرا فرض ہے۔ اور بھئی خشکہ تو بڑی لذیذ نعمت ہے خصوصاً جبکہ اس کے ساتھ دال ہو۔ جاؤ جلدی سے نکال لاؤ پھر نماز کو چلیں گے۔ چنانچہ وہ دال خشکہ لائے اور حضرت نے نہایت ہی رغبت اور بشاشت کے ساتھ کھایا کہ بار بار الحمد للہ فرماتے اور آخر میں کہا کہ آج تو خوب سیر ہو کر کھایا برتن سمیٹ سماٹ نماز کی عجلت میں مکان سے باہر نکلے کہ لڑکا کھانا لے کر آ پہنچا حضرت نے فرمایا واہ واہ خوب وقت پر آئے۔ اچھا ہوا ہماری موجودگی میں آ گئے ہم نے تو بہت انتظار کیا اب تو نماز کا وقت ہو گیا مسجد کو جا رہے ہیں اور قاضی عبدالمجید سے فرمایا بھئی کھانا لے کر گھر میں رکھوا دو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت واپس ہی نہ کر دیا جائے کہ اب تو ضرورت نہیں رہی۔ فرمایا نا بھئی

واپس نہیں کر سکتے بلکہ لاؤ اس میں سے ایک لقمہ لڑکے کے سامنے کھا لوں چنانچہ ایک لقمہ کھا کر کلی کی اور یہ فرمایا کر کہ صاحبزادے اپنی والدہ سے کہدینا کہ میرے سامنے ایک لقمہ کھایا تھا اور بہت خوش ہوئے تھے" لڑکے کو رخصت کر کے تیز قدم مسجد کو روانہ ہوئے راستہ میں فرمایا یوں اور غریب کا دل تھوڑا ہوتا ہے اس لیئے میں نے لقمہ کھا لیا کہ بچہ خوش ہو گیا اور اب یہ جا کر اپنی ماں سے کہے گا ورنہ بیچاری کو خیال ہوتا کہ خرچ بھی کیا تیار کرنے میں تکلیف بھی اٹھائی اتنی دور بچہ لے کر بھی گیا اور پھر بھی نہ کھایا۔

خدام کی دلداری کا حضرت کو خاص اہتمام تھا بعض مخلصین انبہ یا برسات کے موسم میں حضرت کو تشریف آوری کی تکلیف دیا کرتے اور حضرت اس کو بخوشی منظور فرماتے۔ بلکہ جہاں غایت بے تکلفی ہوتی تو اپنے خواص مخلصین کے نام لے کر فرماتے کہ فلاں فلاں کو بھی دعوت دے دو۔ چنانچہ مولوی محمد جلیل اور حاجی ریاض الاسلام کی دعوت پر ہر سال آپ کاندھلہ ضرور تشریف لے جاتے اور مجھے بھی تاریخ کی اطلاع کے ساتھ دعوت ضرور آتی۔ اس لیئے حاضر ہوا کرتا تھا حضرت آم اور دعوت کھانے سے اتنا خوش نہ ہوتے جتنا اپنے دوستوں کو ایک جگہ بے تکلفی کے ساتھ جمع ہوتا ہوا دیکھکر خوش ہوتے تھے۔ سب کو ساتھ لے کر آپ بیٹھتے خوش طبعی فرماتے مسکراتے اور جو آم شیریں نکلتا کبھی ادھر اور کبھی ادھر خدام کو دیتے اور فرماتے میاں تم نے تو آم کھانے کا نام ہی کیا۔ ایک طالب کہا کرتے تھے کہ جب تک پلنگ پر بیٹھکر اتنے آم نہ کھائے کہ پٹی تک چھلکے آ جائیں تو اس نے کیا آم کھائے۔ اور ایک جگہ تو مشہور ہے فلاں شخص نے ایک لنگی آم کھائے اور فلاں نے دو لنگی۔ کسی نے عرض کیا حضرت اس کا کیا مطلب؟ فرمایا کھاتے کھاتے دست آنے لگیں کہ لنگی خراب ہو جائے۔" مولوی حبیب الرحمن صاحب لکھتے ہیں حضرت بتقریب تبلیغ ہر سال سیوہارہ تشریف لایا کرتے مگر کمال یہ تھا کہ نہ کبھی گنا کھاتے تھے نہ رس پیتے تھے نہ راب کا شوق تھا نہ گڑ کا

کھیر بھی تو شاید ایک دو چمچہ نوش فرماتے ہوں۔ مگر اخلاق و شفقت کا یہ حال تھا کہ خدام کی دعوت کبھی رد نہ فرماتے تھے۔ آخری سفر سے کچھ قبل جب آپ سیوہارہ تشریف لائے تو میرے والد حافظ مختار احمد صاحب نے آپ کے لیے ایک من بورا تیار کرایا کہ رمضان اور سفر حج میں کام آئے گا۔ حضرت کے عزم واپسی کے وقت بورا تیار نہ ہو سکا تو والد صاحب نے اصرار کیا کہ حضرت ایک گاڑی اور رک جائیں۔ بورا بھی تیار ہو جائے گا اچھا ہے حضرت کے ساتھ چلا جائے۔ فرمایا میں سہارنپور اسی گاڑی میں واپسی کو کہہ آیا ہوں۔ اگر میں نہ گیا تو وعدہ خلافی ہو گی گھر والوں کے علاوہ مہمان بھی انتظار کریں گے۔ دوسرے یہ کہ میں تو آپ حضرت سے ملاقات کو آیا ہوں نہ کہ بورا لینے کے لئے۔ بس ملاقات کا مقصد حاصل ہو گیا۔ آخر جب زیادہ اصرار ہوا تو آپ حاجی مقبول احمد کو چھوڑ گئے مگر اپنے عزم میں فرق نہ ڈالا اور اس ضعف میں تنہا سفر فرمایا۔ ایک بار مدینہ منورہ میں میرے سامنے ایک صاحب نے جائے نماز پیش کی جس پر خوبصورت نقوش تھے اور سرنامہ پر غالباً حضرت کا نام یا اور کچھ لکھا ہوا تھا حضرت نے بخوشی قبول فرمایا مگر یہ کہکر کہ جائے نماز پر لکھنا منع ہے۔ تمہاری دلداری کی بنا پر قبول تو کرتا ہوں مگر اس لکھے ہوئے کو مٹا دوں گا اس کو باقی نہ رکھوں گا۔

سفر میں حضرت اپنے رفقاء کی راحت کا بہت خیال رکھتے اور ایسے بے تکلف بن جاتے تھے جیسے برابر کے دوست۔ سامان اٹھانے میں خود بیکتے اور اکثر ایسی چیز اٹھانے کی کوشش فرماتے تھے جس کے اٹھانے میں دوسروں کو جھجک ہو۔ کامران سے چلنے کا وقت آیا تو سامان اٹھا کر کشتی تک لانا پڑا حضرت نے اٹھکر جلدی سے وہ دیگچہ اٹھا لیا جس میں کھانا پکتا تھا کہ اوپر سے سیاہ ہو رہا تھا اور اندر سے چکنا۔ پھر ہر چند خدام عرض کرتے کہ آپ رہنے دیں آدمی بہت ہیں سب اٹھالیں گے مگر ایک دو چیز حضرت لے ہی لیتے اور فرماتے

بھی مجھے بھی تو کچھ اٹھانا چاہیئے۔ کیا تم مجھے آدمی نہیں سمجھتے"۔ ایک بار مجھے لاہور
ساتھ لے گئے اور میں نے عرض بھی کیا مگر نہ مانا اور کرایہ آمد و رفت خود ادا
فرمایا۔ حافظ فخر الدین صاحب کو بھی چند مرتبہ ساتھ لیا اور کرایہ دیا۔ بالخصوص
عرب کے سفر میں امیر ہوں یا غریب تمام رفقاء سفر کی ضروریات کا خود دھیان
رکھتے اور ہر ایک کی دلجوئی فرمایا کرتے۔ ایک مرتبہ خلاف عادت مجھے دوران سفر بخار
ہوا اور میں چادر سے منہ ڈھانپ کر انجن کے قریب پٹڑی پر لیٹ رہا کہ تپ
لرزہ کا اثر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ غنودگی آگئی اور مجھے معلوم ہوا کہ کوئی میرا
بدن باقاعدہ داب رہا ہے۔ چادر ہٹا کر دیکھتا ہوں تو حضرت ہیں۔ شرم کے مارے
پسینہ آگیا اور حضرت نے فرمایا کہنا مانو ذرا لیٹے رہو کہ میں بدن دبا دوں کسل رفع
ہو جائے گا۔ مگر مجھ سے نہ ہو سکا اور میں اٹھ بیٹھا۔ ایک مرتبہ آپ سے گئے مطوف نے
آکر کہا کہ حضرت آپ کے بعض رفقاء شکایت کرتے ہیں کہ تم حضرت کا خیال زیادہ رکھتے
اور سواری وغیرہ کا انتظام پہلے کر دیتے ہو اور ہماری خبر بعد میں لیتے ہو حالانکہ سب
تمہارے حاجی ہیں۔ آپ نے فرمایا آئندہ اس کا خیال رکھو کہ اُن کا انتظام پہلے ہو
اور ہمارا سب کے بعد۔ چنانچہ مدینہ منورہ جانے کے لئے جب سارا قافلہ تبریز
پہنچ لیا تو آپ اور آپ کے خاص رفقاء سب کے اخیر میں روانہ ہوئے۔ رفقاء میں
کوئی بیمار ہو جاتا تو اہتمام کے ساتھ آپ اس کے پاس جاتے اور دوا کا انتظام
فرماتے۔ تسلی و تشفی دیتے۔ اخیر زمانہ میں آپ کو فالج کے اثر سے چلنا مشکل تھا
کہ حرم شریف آنے میں بھی جوتے کو ذرا کھینچکر چلنا پڑتا تھا مگر کسی خادم کو معمولی بیمار
بھی سنتا تو خود تشریف لے جاتے۔ ایک سفر میں پہنچ پہنچکر شب کو میرے پیٹ میں
درد ہوا کہ بیتاب ہو گیا۔ حضرت فوراً تشریف لائے اور پیٹ پر ہاتھ رکھکر پڑھتے
اور دم کرتے رہے حتیٰ کہ جب سکون ہو گیا تب جا کر لیٹے۔ ایک طالب علم بیمار ہوا
اور حضرتؒ تمام رات اس کو چھاتی سے لگائے بیٹھے رہے کہ اس کو اپنی ماں بھی
یاد نہیں آئی۔

اہل عرب کا آپ احترام بہت زیادہ فرماتے تھے بالخصوص اہل مدینہ کا۔ آپ کے رفقاء اور کسی جمال میں نزاع ہوتا تو آپ جمال کی طرفداری کرتے اور حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے کہ لوگوں کو ان کی قدر نہیں معلوم بھی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دربار تک پہنچانے والے ہیں۔ یہ محبوب کے ہم وطن ہیں۔" حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے نواسے مولوی عبدالکریم کو حضرت اصرار کے ساتھ صاحبزادی صاحبہ سے لے کر اپنے ساتھ لائے کہ بحرالعلوم کا خاندان علم دین سے بے بہرہ ہوا جاتا تھا۔ مولانا پانچ سال مدرسہ میں رہے مگر حضرت نے بیٹا بنا کر رکھا کہ ساتھ کھلاتے اور قریب ہی کا حجرہ قیام کے لئے تجویز فرمایا۔ ایک بار معاملات عرب اور تبدیل حکومت کے متعلق حاجی مقبول احمد صاحب نے کوئی نا ملائم لفظ کہدیا جس کا ان کو بہت صدمہ ہوا۔ حضرت کو خبر ہوئی تو اس قدر متموم ہوئے کہ شاید اس سے زیادہ صدمہ کا اثر حضرت پر کبھی نہ ہوا ہو۔ مولوی عبدالکریم کی دلجوئی فرمائی اور بار بار معذرت کی۔ انہوں نے کہا حضرت حاجی صاحب نے مجھے گالی دی۔ فرمایا تمہیں گالی نہیں دی مجھے گالی دی۔ آخر جب مولوی صاحب کو راضی کر لیا تب سکون ہوا۔" مدنی فتنہ کے زمانہ میں جب سید عبدالتواب صاحب مزدور پریشان ہو کر ہندوستان آئے تو حضرت نے ان کو خاص مہمان بنا کر رکھا اور جگہ جگہ ان کی سفارش فرما کر معقول رقم نقد ان کے لئے فراہم کی اور پچیس ۲۵ روپے ماہوار کا تقرر کرایا جب تک بھی وہ ہندوستان میں رہیں۔" حرمین شریفین میں حضرت کی سخاوت بہت زیادہ بڑھ جاتی اور اتنی وسعت و فراخدلی سے صدقات فرماتے تھے کہ اُمرا بھی حیران ہو جاتے تھے جمالوں کو جہاں حجاج ہر بار بخشش دیتے ہوئے مُنہ بناتے ہیں۔ حضرت ہر ایک جمال کو ایک روپیہ یومیہ دیتے۔ اپنے ساتھ بٹھا کر ان کو کھانا کھلاتے اور خوش طبعی فرمایا کرتے تھے۔ کسی جمال نے اگر ذکر کیا کہ حضرت ہمارا حاجی تو ہم دیتا ہے یا کچھ نہیں دیتا تو حضرت کو افسوس ہوتا اور گنجائش پاتے تو حاجی کو نصیحت فرماتے

کہ ان کے دینے میں تحمل نہ کرو۔
عرب کے آدمی ہی نہیں بلکہ ہر چیز بالخصوص مدینہ منورہ کی مٹی تک آپ کو بہت پیاری تھی۔ زائرین کو آپ ابیار سبعہ کا پانی اور تراب مدینہ لے جانے کی ترغیب دیا کرتے اور فرماتے کہ ان میں شفا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی فرماتے کہ مٹی کھانا نہیں۔ کیونکہ ناجائز ہے۔ ہاں لیپ وغیرہ میں استعمال کر لینا۔ بندہ حضرت کی معیت میں تھا اور میرے ساتھ چچا صاحب مرحوم تھے۔ مدینہ منورہ پہنچکر وہ مرض ماشرہ میں مبتلا ہو گئے کہ طبیب نے حرکت کرنا اور ہوا لگنا سخت مضر بتایا۔ واپسی کا وقت قریب تھا حضرت اُن کے پاس آئے اور فرمایا حافظ صاحب گھبرانا نہیں۔ جبتک تندرست نہ ہو جاؤ گے میں سفر نہ کروں گا۔ قافلہ جاتے چلا جاتے میں تمہارے ساتھ یہاں ٹھہروں گا۔ مرحوم کا دل کمزور تھا اور وہ طرح طرح کے خیالات لیتے تھے۔ کہنے لگے حضرت پاس خرچ بھی کم رہ گیا ہے اور موسم نکل چکا پھر اونٹوں کا انتظام بھی دشوار ہوگا۔ فرمایا خرچ کا کیا، مگر جو لوگ واپس ہوں گے وہ مکان پر اطلاع دیکر روپیہ کا حوالہ کر دیں گے اور رہا اونٹوں کا انتظام سو جیسے چاہیں گے ہو جائے گا۔ مگر مرحوم ٹھہرنے پر راضی نہ ہوئے اور کہا کہ نہیں حضرت جیسے بھی بن پڑا سفر کروں گا۔ مجھے زیادہ فکر تھا کہ حضرت کی معیت میں اول تو اکثر حصہ حضرت کے پاس گذرتا ہے پھر بدوانی عربی زبان کی مہارت کے سبب قافلہ کا زیادہ بوجھ بار مجھ پر رہتا ہے کہ بدو اور حاجی کا نزاع دور کرنے میں گھنٹوں اپنے اونٹ پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں چچا صاحب کی دیکھ بھال اور اونٹ پر ان کا ردیف بن کر بیٹھنا بہت مشکل ہو گا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ تیسرے دن قافلہ چلدیا اور حکیم رفاقت علی مرحوم سے کہ فوجی ڈاکٹر تھے راستہ کے لئے دوائیں وغیرہ لے کر بمشکل تمام چچا صاحب کو شقدف میں لٹا دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سخت تاکید کی کہ منہ پر ہر وقت روئی لپیٹی رہے کہ ہوا نہ لگنے پائے۔ ورنہ جان کا خطرہ ہے۔ پہلا پڑاؤ بناحد میں ہوا کہ شہر سے ایک میل ہے۔ نماز کے لئے حضرت مسجد نبوی کو چلے اور مجھے ساتھ

لیا۔ میں نے راستے میں اپنی پریشانی عرض کی کہ حضرت میرا قلب بہت ضعیف ہے چچا صاحب تو آج ہی کے برائے نام سفر میں کچھ کے کچھ ہو گئے دیکھئے مقدر کیا پیش لائے اور کس طرح دور دراز کا سفر اونٹوں پر طے ہو۔ ذرا سکوت کے بعد فرمایا بھئی اللہ کی مشیت میں کسی کا چارہ نہیں اور غیب کی خبر کسی کو نہیں کیا ہوتا ہے۔ ہاں اس کا مجھے بھی فکر ہے کہ سفر میں ہوا سے بچنا بہت مشکل ہے اور تیمارداری اس سے زیادہ مشکل۔ مگر گھبراؤ نہیں اللہ سب آسان فرما دے گا۔ میرا خیال یوں کہتا ہے کہ اب واپسی میں آستانہ شریفہ کی مٹی لے لو اور وہ منہ پر ملو۔ میں نے کہا حضرت وہاں مٹی کہاں۔ فرمایا قالین کے نیچے زمین پر جو بھی گرد غبار ہو وہ ہاتھ کو مل لیجو اور سمیٹ لیجو مگر روضہ شریف کے قریب کی لیجو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور بعد نماز واپس آ کر اپنے ہاتھ سے ان کے چہرے پر ملکر روئی لپیٹ دی۔ نماز عصر کے لئے حضرت کے ساتھ پھر حرم شریف میں آیا اور اب حضرت عشا سے فارغ ہو کر واپس ہوئے کہ جا کر واپس آنے کی گنجائش نہ تھی اور مسجد نبوی کی نماز سے زیادہ حضرت کو کوئی چیز پیاری نہ تھی۔ بعد عشا واپس آیا تو ڈر رہا تھا کہ چچا صاحب خفا ہوں گے اور کہیں گے یہیں پرواہ نہیں کرتا گھنٹوں غائب رہتا ہے آگے کیا امید۔ مگر پاس آ کر مزاج پوچھا تو چچا صاحب نے مسرت کے ساتھ فرمایا ذرا میرا منہ کھول کر دیکھو مجھے تو نصف مرض گیا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ سوزش ہے نہ کرب۔ اس تراب نے تو اکسیر سے زیادہ کام دیا۔ بس دوائیں سب پھینک دو اور اب جاؤ اور تھوڑی سی مٹی اور لیتے آنا کہ ایک دفعہ ملنے کی اور حاجت ہے۔ میری مسرت کا کچھ ٹھکانہ نہ رہا اور فوراً حضرت کے پاس حاضر ہو کر قصہ سنایا نوافل سے فارغ ہوتے ہی اندھیرے میں جب حضرت نماز فجر کے لئے حرم شریف کو چلے تو پھر ساتھ ہوا اور رخصتی صلوٰۃ و سلام کے بعد خاک آستانہ اچھی مقدار میں فراہم کر کے ساتھ لایا۔ یہاں واپس آتے ہی قافلہ اٹھ کھڑا ہوا اور حق تعالیٰ نے ساری پریشانی کا اس طرح خاتمہ فرمایا کہ دوسری منزل پر چچا صاحب شغف

سے خود اتر گئے اور فرمایا بھوک زیادہ لگ رہی ہے کچھ کھانے کا انتظام جلدی کرو تیسرے پڑاؤ پر بالکل تندرست تھے کہ سارے سُرخ دانے مُرجھا کر سیاہ پڑ چکے تھے۔ اور بجز نقاہت کے مرض کا نام نہ رہا تھا۔ تمر مدینہ سے حضرت کو گویا عشق تھا اور ہر نوع رغبت سے کھاتے تھے بالخصوص عجوہ۔ اور ہر نوع سے پُوری واقفیت رکھتے تھے کہ یہ فلاں کھجور ہے اور اس کا نام یہ ہے اور اس کی یہ خاصیت ہے۔ آخری قیام میں چونکہ آپ کو کھجور کا پُورا موسم دیکھنا نصیب ہوا اس لئے ابھی کچی ہی تھی کہ آپ نے ایک ڈبہ میں تازہ کھجور بند کر کے کپڑا سلوا کر نام اور پتہ لکھوا کر یہاں بھیجا کہ لو تم بھی کھاؤ۔" کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ روضہ مطہرہ میں روشن ہونے والا موم خدام روضہ سے تبرکًا لینا کیسا ہے؟ فرمایا بڑا موجب برکت ہے مگر مال وقف ہے کہ وہیں کے استعمال کے لئے بھیجا جاتا ہے اس لئے یوں کرو کہ اپنے طور پر بازار سے موم بتی خرید کر خدام کو دے دو کہ وہ روشن کر دیں اور پھر اس کو لے لو آستانہ محمدیہ پر حاضری کے وقت حضرت کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ آواز نکلنا تو کیا مواجہہ شریفہ کے قریب یا مقابل بھی آپ کھڑے نہیں ہوتے تھے خوفزدہ مؤدبانہ دبے پاؤں آتے اور مجرم و قیدی کی طرح دور کھڑے ہوتے بکمال خشوع صلوٰۃ و سلام عرض کرتے اور چلے آتے تھے۔ زائرین جو بیباکانہ اونچی آواز سے صلوٰۃ و سلام پڑھتے اس سے آپ کو بہت تکلیف ہوتی اور فرمایا کرتے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حیات ہیں اور ایسی آواز سے سلام عرض کرنا بے ادبی اور آپ کی ایذا کا سبب ہے۔ لہذا پست آواز سے سلام عرض کرنا چاہیئے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ مسجد نبوی کی حد میں کتنی ہی پست آواز سے سلام عرض کیا جائے اس کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں۔ ایک صاحب نے اس پر اشکال پیش کیا کہ جسد مبارک تو چند دیواروں میں محفوظ ہے پست آواز کس طرح مسموع ہوگی۔ فرمایا یہ اشکال تو چیخنے چلانے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے کہ قبر کے اندر تو کتنا

ہی کوئی باہر سے چلاتے اور پکارے مگر آواز نہیں پہنچے گی۔ بھئی یہ تو خصوصیات میں سے ہے جس پر یہاں کا قاعدہ جاری نہیں ہو سکتا۔

تیر اندازی کا اس زمانہ میں صرف نام ہی رہ گیا ہے مگر میں حیران ہو گیا جبکہ ایک دفعہ حضرت نے کمان اور تیر کا نقشہ کھینچ کر اس کے ایک ایک جز کی حقیقت بیان فرمائی کہ اس عربی لفظ کا مصداق یہ ہے اور اس اسم کا مسمیٰ یہ حصہ ہے۔ اور اس کا یہ۔ گویا آپ نے برسوں تیر اندازی سیکھی ہے۔ بندوق شاید کبھی چلائی ہو مگر اچھی بری کی شناخت اتنی زیادہ تھی کہ دہلی شیخ رشید احمد صاحب کی دکان اسلحہ پر تشریف لے گئے تو پستول رائفل اور مختلف کارخانوں کی برچ لوڈ اور کارتوسی بندوقوں کا بڑے شوق اور غور کے ساتھ ملاحظہ فرمایا اور ان کے وہ حسن و قبح بیان فرماتے رہے جن کو سنکر شیخ صاحب بھی حیران تھے۔ میں نے بندوق کا لائسنس لیا تو بڑے شوق سے فرمایا اپنی بندوق دکھاؤ اور ملاحظہ فرما کر طریقہ تعلیم فرمایا کہ یوں اٹھانا اور یوں رکھنا چاہیئے۔ آپ کا کبھی شکار کھیلنا مجھے یاد نہیں مگر شکار کا گوشت بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ ایک دفعہ اجراڑہ ساتھ گیا اور بندوق ساتھ لے لی تو بعد ظہر فرمایا بھئی جنگل ہو آؤ دیکھو کوئی مور یا کبوتر مل جائے تو شکار ہی ہو جائے۔ یہی حالت نباتات سے واقفیت کی تھی کہ ایک بار آپ نے گاؤں کے راستہ میں جتنی خود رو جڑی بوٹیاں پڑتی گئیں بیان فرماتے رہے کہ یہ فلاں گھاس ہے اور اس کا یہ نام ہے اور یہ خاصیت ہے۔ طب میں آپ کو مہارت نہ تھی مگر نبض شناسی میں کمال تھا کہ خفیف حرارت نبض پر ہاتھ رکھتے ہی بتا دیتے تھے۔ مزارات پر حاضری کے لئے سفر کرنا آپ کو پسند نہ تھا۔ ہاں کسی سفر میں اپنے بزرگان سلسلہ کا مزار پڑتا تو حاضر ہو کر روحانی استفاضہ کا جو اصل طریق ہے اس پر عمل فرما لیتے اور منکرات پر نکیر فرمائے بغیر نہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ مولانا رحیم بخش صاحب کے ساتھ ایک بزرگ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ وہاں کے سجادہ نشین نے مولانا کے ساتھ حضرت کو بھی چائے نوشی کے لئے مدعو کیا۔ چائے سے فارغ ہو کر اٹھے اور باہر

نکلے تو سجادہ صاحب نے دو سبز رومالوں میں مزار شریف کا چڑھاوا اٹھائی اور نقل وغیرہ پیش کیا۔ مولانا رحیم بخش صاحب گو حضرت گنگوہی سے بیعت تھے مگر عقیدت ومحبت کا تعلق حضرتؒ سے اتنا تھا کہ گویا حضرت ہی سے بیعت ہیں ہر چند کہ حضرت کو بھی مولانا کے ساتھ بے حد محبت تھی اور احترام بھی فرمایا کرتے تھے مگر مولانا حاضر ہوتے تو بس حضرت کا مُنہ تکا کرتے اور زیارت جمال میں محو و مستغرق ہو جاتے تھے مجھے یاد ہے جب حضرت کا آخری سفر ہوا تو مولانا حیدرآباد جاکر حضرتؒ سے ملے اور پھر بمبئی ساتھ گئے اور تین دن قیام فرما کر آخری رخصت ہوئے۔ حضرت ان کو سوار کرانے کے لیے اسٹیشن پر آئے تو بندہ ساتھ تھا جس وقت ریل نے سیٹی دی تو وہ منظر بھی عجیب تھا۔ مولانا لپک کر حضرت کو چپٹ گئے اور حضرت نے آغوش میں دبا لیا۔ یہ چلتی ریل میں مولانا سوار ہوئے کہ آنکھوں میں آنسو اور ادھر پلیٹ فارم پر حضرت چشم نم تھے۔ ڈاک گاڑی تیز جا رہی تھی مگر دو نظروں کی ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی حتی کہ نگاہ سے اوجھل ہو گئی اور وہ نظارہ دنیا کا آخری نظارہ بن کر چشم زدن میں ہی ختم ہو لیا غرض مولانا کا ادب جو کہ عادت بن گیا تھا گوارا نہ کرتا تھا کہ کسی امر میں حضرت سے تقدیم کریں اس لئے آپ نے پھر حضرت کی طرف اشارہ فرمادیا سجادہ صاحب حضرت کی طرف بڑھے اور حضرت رُکے۔ فرمایا کیا ہے؟ عرض کیا حضرت صاحب مزار کا تبرک ہے۔ حضرت کی صاف گوئی تو دنیا بھر میں بے نظیر تھی۔ بیساختہ فرمایا سجادہ صاحب آپ کو معلوم بھی ہے کہ ما اہل لغیر اللہ ہے اس کا لینا بھی حرام اور کھانا بھی حرام۔ یہ فرما کر حضرت چل دیئے کہ پیچھے پیچھے مولانا رحیم بخش صاحب تھے اور سجادہ صاحب خاموش حجرہ میں تشریف لے گئے

ایک بار حضرت رائدیر جاتے ہوئے اجمیر اترے کہ شیخ الطائفہ کے مزار پر حاضر ہوں۔ حضرت مولانا تھانوی اور بندہ ساتھ تھے۔ میزبان چونکہ زائرین کے حالات سے واقف تھے کہ طواف اور سجدہ کراتے ہیں اس لئے حُسن تدبیر کے ساتھ کام کیا اور بعد عصر کا وقت تجویز ہوا ہم سب حاضر ہوئے اور اندر کٹہرے کے قریب

کھڑے ہو گئے۔ حضرتؒ تو جاتے ہی بیٹھ گئے اور مراقب ہو کر ایسے مستغرق ہو گئے کہ خبر ہی نہ رہی کہاں بیٹھے ہیں۔ چونکہ بیٹھنا وہاں کمال بے ادبی سمجھا جاتا ہے اس لئے چاروں طرف سے حضرت پر تیز اور ترچھی نظریں پڑنے لگیں۔ بیچارے میزبان کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں کہ کوئی شورش برپا نہ ہو جائے۔ گھبرا کر انہوں نے مولانا تھانوی سے کہ حضرت کے پاس کھڑے تھے چپکے سے عرض کیا کہ حضرت کو اٹھا دیجئے اندیشہ ہے فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ مولانا نے فرمایا اس حالت میں میری ہمت نہیں کہ مخل ہوں اور حضرت کو اٹھنے کے لئے کہوں اور میری طرف اشارہ کیا کہ اس سے کہو یہ حضرت کی خدمت میں زیادہ جری ہے۔ وہ میرے پاس آ کے دم گویا دکر کہا کہ میرا دم ہوا ہو رہا ہے حضرت سے کہو جلدی اٹھ بیٹھیں دیکھو مجاوروں کا رنگ بدلا جاتا ہے اور پھر میرے سنبھالے نہ سنبھلے گا۔ میں نے کہا کہ حضرت مولانا کی ہمت نہیں ہوتی تو میں کیسے ہمت کروں۔ مگر وہ اس درجہ سراسیمہ تھے کہ ہوش باختہ تھے کہنے لگے خدا کے واسطے جلدی کرو ایک دو حرف پڑھ نہ ٹالو۔ آخر میں نے حضرت کے شانہ مبارک پر ہاتھ رکھا اور عرض کیا حضرت بس تشریف لے چلیں۔ فوراً حضرت کو افاقہ ہو گیا اور اٹھ کر ساتھ ہو لئے۔ راستہ میں حضرت کو قصہ سنایا۔ مگر حضرت نے فرمایا مجھے کچھ خبر نہیں اور ایسا تھا تو پہلے ہی مجھے اطلاع کیوں نہ کر دی۔

حضرتؒ کی فراست قابلِ حیرت تھی۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے وصال پر مخلوق پریشان تھی۔ جمعہ کا وقت تھا آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ آہ وزاری کر رہا اور حضرت کا عاشق و دلدادہ بنا ہوا پکار رہا ہے۔ ہائے مجھے حضرت کی زیارت تو کرا دو۔ لوگوں کو نماز پڑھنا مشکل ہو گیا مگر اس کو حضرتؒ کا جان نثار محب سمجھتے تھے اس لئے کچھ نہ بولے۔ حضرتؒ نے مسجد میں جا کر مولانا محمود حسن صاحب سے کچھ آہستہ آہستہ باتیں کیں اور پھر باہر تشریف لا کر غصہ کے ساتھ اس کو ڈانٹا کہ میں جانتا ہوں تجھے بہت صدمہ ہے، میں جانتا ہوں تو حضرت کا عاشق ہے، پھر فرمایا اس کو مسجد سے نکال دو۔ یہ نہ حضرت کا خادم ہے نہ اس کو حضرت کی محبت ہے۔

۱ عاشق الٰہی میرٹھی کتابت اللہ صاحب گنگوہی

حاضرین کو تعجب تھا کہ ایسے عاشق بیتاب کے متعلق کیا فرما رہے ہیں مگر اے بسا ابلیس آدم روئے ہست۔ بعد میں تحقیق ہوا کہ کوئی بدعتی تھا جو ہاتھ میں اس قسم کا پوڈر لگا کر آیا تھا کہ چہرے پر ملنے سے سیاہ ہو جاتے۔ حضرت گنگوہیؒ کی کرامت تھی اور حضرتؒ کی فراست کہ وہ اپنی روسیاہی کی چال نہ چل سکا اور مسجد سے نکال دیا گیا۔

صدمات میں حضرت کا صبر بے نظیر تھا آپ کے اکلوتے صاحبزادے ابراہیم مرحوم کی شدت علالت سُن کر عیادت کے خیال سے بندہ چلا تو اسٹیشن سہارنپور پر اترتے ہی منتظر تھا کہ کوئی مل جاتے تو حال پوچھوں۔ لکھنؤ جانے والے ایک دوست ملے جو حضرت ہی کے پاس سے آرہے تھے دریافت کرنے پر انہوں نے اطلاع دی کہ انتقال ہوگیا اور مغرب سے قبل دفن بھی کر چکے۔ نیز کہنے لگے مجھے تو بیماری کا علم بھی نہ تھا میں حضرت کے پاس حاضر ہوا تو حضرت حسب معمول حجرہ کے پاس بیٹھے تھے اُسی محبت سے معانقہ فرما کر باتیں کرنے لگے اور میں اپنی ضروریات پیش کرتا رہا۔ دو گھنٹے بعد آدمی نے آکر کہا حضرت چلیے جنازہ تیار ہے۔ حضرت اٹھے اور اتنا فرما کر روانہ ہوئے گھر میں سے ابراہیم کا جنازہ لے آؤں آپ تشریف رکھیں۔ میں نے حاضرین سے دریافت کیا جنازہ کس کا؟ اور یہ معلوم ہو کر کہ صاحبزادے کا ذکر ہے مجسم حیرت بن کر اپنے کو نفرین کرنے لگا کہ ایسی حالت میں حضرت سے فضول باتیں کرتا رہا مگر کسی انداز سے پتہ ہی نہ چلا کہ گھر میں بیٹے کو غسل و کفن دیا جا رہا ہے اور حضرت باہر اپنے مہمانوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ حضرتؒ جنازہ لے کر تشریف لائے کہ دوسروں میں اور حضرت میں کوئی فرق معلوم نہ ہوتا تھا۔

صلہ رحمی اور عزیزوں کو مصیبت کے وقت تسلی دینا اور مال سے مدد دینا آپ کی فطرت تھی۔ آپ کے چچازاد بھائی مولوی انوار احمد صاحب پر ہردوئی میں انجنیئر کی طرف سے ایک فوجداری مقدمہ دائر ہوگیا جس میں انکی ٹھیکہ داری کی ساری کمائی خرچ ہوگئی اور پریشان ہوگئے۔ حضرت نے بار بار خط سے تسلی دی اور دُعا کا وعدہ فرمایا اور پچاس روپے ان کے حقیقی بھائی مولانا صدیق احمد صاحب نے

بھیجے تو پچاس روپے ہی آپ نے بھیجے جو اعانت کے لیے تھے نہ کہ قرض۔ حالانکہ زمانہ وہ تھا جبکہ آپ کی گذران بھی تنگی و عسرت سے ہوتی تھی۔ ان معنوی کمالات کے سامنے حسّی کرامتوں کی نہ کچھ وقعت ہے اور نہ کبھی اس پر نظر گئی کہ آپ کی کرامات حسّیہ کو ضبط کیا جائے ورنہ آپ کے خدام میں ہر شخص کے ساتھ آپ کا معاملہ جُدا تھا اور اس کی ضروریات و پریشانی میں آپ کے ظلِ عاطفت و برکات توجہ سے منجانب اللہ ہر طرح کی مدد ہوتی رہتی تھی کہ اسی کا نام کرامت ہے۔ ۱۳۲۸ھ میں جب حضرت نے سفرِ حج کیا تو دارالطلبہ زیرِ تعمیر تھا۔ آپ نے چلتے وقت مستری سے بتاکید فرمایا کہ غربی دیوار کے شمالی گوشہ میں جو حجرہ بنایا جائے اس کی دیوار پختہ نہ کرنا اور نہ اس میں الماریاں زیادہ بنانا بلکہ پشت کی جانب دروازے کی محراب رکھ دینا۔ حضرت کے اس ارشاد کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ حجرہ بھی دیگر حجرات کی طرح پختہ بنادیا گیا۔ واپسی پر حضرت نے حجرہ کو دیکھا تو فرمایا تم نے یہ کیا کیا۔ میں تو تاکید کر گیا تھا کہ پشت دروازہ لگا کر چھوڑ دینا۔ عرض کیا کہ حضرت میں بالکل بھول گیا۔ کیونکہ میرے ذہن میں اس ارشاد کی کوئی وجہ آئی نہیں۔ فرمایا کوئی بات بلا وجہ بھی مان لیا کرتے ہیں۔ مدت کے بعد اس کی وجہ اس وقت سمجھ میں آئی جبکہ پشت کی افتادہ زمین خلد آشیاں کلثوم جہاں بیگم جاگیردار بھوپال نے خرید کر وہاں عالیشان مسجد بنوادی اور اسی حجرہ کو توڑ کر دارالطلبہ سے مسجد جانے کا دروازہ رکھا گیا۔ سالانہ جلسہ میں ایک دفعہ دیہاتی مہمان اُمید سے زیادہ آگئے کہ کھانا تیار شدہ نصف کو بھی بمشکل کافی ہوتا۔ کارکنان مدرسہ گھبرا گئے کہ نہ تیار کرانے کا وقت ہے کیونکہ جلسہ سے ایک بجے فراغ ہوا تھا اور نہ کوئی انتظام جنس وغیرہ کا فراہم ہو سکے۔ حافظ عبداللطیف صاحب نے حالت حضرت سے عرض کی اور یہ بھی کہ باورچی بھی تھک گئے ان میں پکانے کی ہمت بالکل نہیں۔ حضرت نے فرمایا کھانے کو چادروں سے ڈھانک دو میں آتا ہوں۔ چنانچہ حضرت نے تشریف لا کر کچھ پڑھا اور کھانے پر دم کر کے دعاء برکت فرمائی اور حکم دیا کہ کپڑا دیگ

کے منہ سے نہ ہٹایا جائے اور نیچے سے کھانا نکال کر کھلانا شروع کر دیا جائے۔ الحمد للہ کہ سب مہمان فارغ ہو گئے اور کھانا بہتیرا بچ رہا۔

ایک مرتبہ ایک بزرگ[ع] مع خدام کے حضرت کے مہمان ہوئے مگر یہ شرط کر لی کہ کھانا ریل ہی پر کھاؤں گا مدرسہ نہ آسکوں گا۔ چنانچہ کھانا اسٹیشن پر بھیج دیا گیا مگر ان بزرگ نے کھانا تھوڑا دیکھکر واپس کر دیا اور فرمایا کہ واپس کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ اگر ماما نے دیا ہوگا تو گھر والوں کو معلوم تو ہو جائے گا کہ ماما نے کیسی حماقت کی کہ اتنے آدمیوں میں اتنا ذرا سا کھانا بھیجا۔ کھانا واپس آیا تو حضرت پر بہت گراں ہوا اور فرمایا جیسے یہ احتمال ہوا کہ ماما نے کھانا کم اتارا یہ احتمال بھی تو ہونا چاہیئے تھا کہ شاید میزبان کا اللہ تعالیٰ سے کوئی خاص معاملہ ہو کہ وہ اس کے تھوڑے کھانے میں بہت برکت دیدیتے ہوں پھر فرمایا بھائی ہمارا کام تو برکت ہی سے چلا اور چل رہا ہے ورنہ جتنے مہمان میرے یہاں آتے ہیں ان کے لیے میری آمدنی کافی نہ تھی۔ پھر فرمایا برکت کا احتمال نہ ہوا تھا تو کم از کم یہی احتمال ہونا چاہیئے تھا کہ شاید آج گھر میں آٹا کم ہو کہ ایسا اتفاق بھی ہو جاتا ہے اور میزبان کا یہی فرض ہے کہ اس کے گھر میں جو کچھ ہو مہمان کے سامنے رکھدے تھوڑا ہو یا بہت اور جو کھانا بھیجا گیا تھا اس کو دستر خوان پر رکھکر بسم اللہ کر کے کھایا جاتا تو انشاء اللہ سب کو کافی ہو جاتا۔

مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سہواروی لکھتے ہیں جب ۴۵ھ میں بندہ نے حضرت کی خدمت میں مدینہ منورہ عریضہ لکھا کہ حضرت دُعا فرمائیں کہ حرمین کو زیارت حرمین شریفین نصیب ہو۔ حضرت کا جواب یہ آیا کہ تم یہ لکھو کہ مدینہ منورہ حج سے پہلے آؤ گے یا بعد کو میں دُعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہ تم کو مع اپنے رفقاء خاندان کے میری زندگی میں یہاں پہنچا دے تاکہ ایک مرتبہ پھر ملاقات ہو جائے۔ مجھے یہ جواب پڑھکر بڑا تعجب ہوا کہ نہ اب تک میرا ارادہ سفر عرب کا ہوا نہ میں نے حضرت کو اپنا ارادہ لکھا اور حضرت کے انداز تحریر سے ظاہر ہو رہا ہے گویا ارادہ

ع از مولانا الحاج ظفر احمد صاحب تھانوی

کر چکا اور صرف تعین باقی ہے کہ مدینہ منورہ پہلے جاؤں یا بعد میں۔ پھر میرا ہی نہیں بلکہ خاندان اور دوستوں میں رفقاء بھی حج وزیارت کی نعمت سے مالا مال ہونے والے ہیں۔ خدا کی شان کہ دو مہینہ بعد دفعتہً ایسے سامان مہیا ہوئے کہ میں اور میرے ساتھ وطن وخاندان کے بعض اعزہ واحباب سفر کے لئے تیار ہوئے اور حضرتؒ کی بھی آخری زیارت نصیب ہوئی کہ پھر دوبارہ مقدر نہ ہوا۔

پانچویں سفر حج ۱۳۳۳ھ میں حضرت کا جہاز عدن پہنچا تو وہ نازک زمانہ تھا جبکہ جنگ عظمیٰ کے سبب جگہ جگہ سنسر اور بحری سفر میں طرح طرح کی دشواریاں تھیں جہازوں کو عدن سے کوئلہ بھرنا پڑتا تھا اور وہاں کوئلہ کے ساتھ مزدوروں کا بھی بڑا قحط تھا۔ آپ کے جہاز سے قبل اسی کمپنی کا جہاز جہانگیر چار دن عدن بندر پر پڑا رہا اور جب اس کو کوئلہ نہ مل سکا تو مجبوراً وہ کوئلہ لینے کے لئے پورٹ سوڈان روانہ ہوا۔ رفقاء کو پریشانی ہوئی کہ دیکھئے کے دن پڑے رہیں اور پھر کوئلہ کے لئے کہاں جانا پڑے۔ حضرت نے فرمایا بھئی پریشانی سے کیا نتیجہ اللہ کارساز ہے خدا کی شان آپ کے جہاز نے ایک شب عدن سے باہر لنگر انداز رہ کر اگلے دن گودی میں قدم رکھا کہ علی الصبح ایک سٹیمر کوئلہ کی دو بڑی کشتیاں بھری ہوئی کھینچتا ہوا لایا اور کپتان سے کہا یہ کوئلہ لو۔ کپتان نے کہا لاؤ مگر پہلے مزدور لے آؤ۔ چند منٹ میں مزدور بھی آگئے۔ اور کپتان یہ حکم دے کر کہ کوئلہ جلد جہاز میں داخل کردو ایک بوٹ میں سوار ہو عدن چلا گیا۔ کوئلہ بھرا جا رہا تھا کہ نورنگ جہاز کا کپتان گھبرایا ہوا آیا اور کہا کہ یہ کوئلہ تو ہمارا ہے تم نے اپنے جہاز میں کس کے حکم سے لیا۔ ہم نے تو چار دن میں اپنے خلاصیوں بوٹ میں بھروا کر مزدوروں کا بمشکل انتظام کیا تھا کہ آج جہاز میں لاد دیں۔ نائب کپتان نے کہا ہمیں کچھ معلوم نہیں خود بوٹ والا ہمارے پاس آیا اور بولا یہ کوئلہ لو ہم نے کہا لاؤ۔ نورنگ کے کپتان نے کہا اب کام روک دو باقی کوئلہ ہمارے جہاز پر جائے گا۔ نائب نے کہا ہمارے کپتان کو آ لینے دو وہ حکم دے گا تو ہم روک دیں گے۔ کپتان شام تک غائب رہا اور آخر اِدکاٹی ہمراہ

لے کر آیا تو اس وقت جبکہ سارا کوئلہ جہاز پر چڑھ لیا۔ قیمت و مزدوری کا حساب کر کے اس نے فوراً لنگر اٹھا دیا اور چوتھے دن جدہ بھی پہنچ گیا۔ تو رنگ اپنے دس رنگ دکھانے کو عدن کی گودی ہی پر کھڑا سجتا رہا۔

ڈپٹی احمد حسن صاحب کے داماد میاں عبدالحکیم پروفیسر لاہور نے جب ایس اے وی کا پرائیویٹ امتحان پنجاب یونیورسٹی میں دیا تو اتفاق ایسا ہوا کہ یہ امتحان کی تیاری کچھ نہ کر سکے اور پرچے آئے ایسے سخت کہ تیاری کرنے والے طلبہ بھی گھبرا گئے۔ انہوں نے جوابات لکھے مگر ایسے کمزور کہ خود کامیابی سے مایوس تھے۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ پرچوں کی وجہ سے تو ناکامی یقینی ہے لیکن حضرت دُعا فرمائیں تو شاید پاس ہو جاؤں۔ چونکہ ان کی داڑھی اور وضع قطع خلاف شرع تھی حضرت نے ٹلا دیا اور نصیحت فرمائی کہ مسلمانوں کی سی وضع رکھو اور صوم و صلوٰۃ کے پابند بنو۔ یہ مایوس ہو کر وطن آ گئے۔ حُسن اتفاق سے حضرت انبالہ گئے اور دو تین دن قیام ہوا۔ عبدالحکیم نے موقع کو غنیمت سمجھا اور لگے حضرت کی خدمت میں ہر لحظہ و ہر آن حاضر رہنے اور جہاں موقع ملتا بہت لجاجت سے عرض کرتے کہ حضرت میری کامیابی کے لئے دُعا فرمائیں۔ آخر ایک دن حضرت نے خوش ہو کر فرمایا کہ اچھا جاؤ انشاء اللہ پاس ہو جاؤ گے لیکن بھئی اپنا معاملہ حق تعالیٰ سے درست کر و۔ خدا کی قدرت کہ نتیجہ نکلا اور یہ بہت اچھے نمبروں پر کامیاب ہوئے۔ اپنے خسر کو لکھا میرا فیل ہونا تو یقینی تھا مگر حضرت نے دُعا کر کے پاس کرا ہی دیا۔

ڈپٹی صاحب کے بڑے صاحبزادے میاں سعید احمد کہ ماشاء اللہ اسم بامسمیٰ اور باپ جاہ دینوی باپ کی طرح صورت اور سیرت دونوں میں مسلمان بنائے ہوئے ہیں ڈگشنیٔ محکمہ ڈاک میں ملازم تھے کہ ترقی کا دروازہ بہت تنگ تھا۔ حضرت کو اس جوان صالح سے محبت تھی کہ قدرت نے سعید بنایا تھا۔ شملہ جاتے ہوئے آپ نے ڈگشنیٔ اتر کر ڈیڑھ دن قیام فرمایا اور میاں سعید کی بہتری کے لیے دُعا فرمائی

دو ہی مہینے گذرے تھے کہ ان کے افسر نے از خود ان سے کہا کہ اس محکمہ میں ترقی بہت محدود ہے عنقریب گورنمنٹ آف انڈیا میں مقابلہ کا امتحان ہونے والا ہے جس میں ٹائپسٹ اور لوئر ڈویژن کے لئے امیدوار لئے جائیں گے تم اس امتحان میں قسمت آزمائی کر دو۔ انہوں نے عذر کیا مگر افسر نے اصرار کیا اور زبردستی ان کی جانب سے درخواست بھجوا دی۔ اب یہ حیران کہ ٹائپ جانتا نہیں۔ گورنمنٹ کے دفتر کے کام سے بالکل ناواقف۔ امتحان کا وقت اتنا تنگ کہ باوجود ہمہ تن کوشش کے تیاری ناممکن چہ جائیکہ روزمرہ ڈاک خانہ کا کار منصبی بھی انجام دیتا ہوں عجب پریشانی تھی کہ افسر نام بھیج چکے شرکت امتحان کی منظوری آ چکی۔ تاریخ امتحان سر پر آ گئی مگر یہ ابھی بھی دریافت کرتے پھرتے ہیں کہ امتحان کس کس مضمون میں ہوگا۔ ایک معمولی سا ٹائپ مشق کے لئے ایک دوست سے مستعار لیا مگر کب؟ جبکہ ڈگشائی سے امتحان دینے کے لئے دہلی روانہ ہوئے راستہ میں سہارنپور اترے اور سارا ہی قصہ حضرت کو سنایا۔ حضرت نے بہت خوش ہو کر فرمایا بھئی گھبراہٹ کی کیا بات ہے حق تعالیٰ شانہ کو سب قدرت ہے اللہ پر اعتماد رکھو اور اس کے آپ نے کچھ پڑھنے کو بتایا اور تاکید فرمائی کہ جس دن جس مضمون کا امتحان ہو اس سے ایک دن پہلے اس مضمون کا نام اور امتحان کے وقت سے بذریعہ خط مجھے اطلاع دیتے رہنا۔ غرض حضرت کی دعا و توجہ لے کر دہلی روانہ ہوئے۔ امتحان کا کوئی نصاب مقرر نہ تھا۔ دنیا بھر کی معلومات عامہ اور اس کے ساتھ قدیم و جدید تاریخ و جغرافیہ۔ ریاضی و ہندسہ اور تمامی دفاتر کے پیچیدہ مسائل غرض ہر شعبہ کے سوالات جنکی طرف وسوسہ و خیال بھی جانا مشکل۔ میاں سعید کہتے تھے کہ پرچہ امتحان پڑھتا تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک سوال کا جواب بھی نہ دے سکوں گا مگر قلم اٹھاتے ہی مضامین کی اس قدر آمد ہوتی تھی کہ گھبراتا تھا پہلے کونسی بات لکھوں۔ شرح صدر کی یہ کیفیت تھی کہ مشکل سے مشکل سوال پانی بن جاتا تھا کہ غلطی کا واہمہ بھی نہ ہوتا تھا۔ امتحان ختم نہ ہونے پایا تھا کہ کامیابی کی توقع ہو چلی اور امنگ بڑھ گئی تھی۔ دیکھتا تھا کہ تمام ہندوستان کے قابل لوگوں

کا مقابلہ ہے جن میں ہندوستانی بنگالی مدراسی پنجابی ہندو مسلمان اور انگریز سب ہی تھے کہ سینکڑوں کی تعداد میں ایم اے۔ اس کثیر تعداد میں تحریری امتحان نے غالباً صرف اسّی کو پاس کیا جن میں میرا نمبر نمایاں تھا۔ مگر ضرورت تھی صرف چالیس کی اس لئے چوتھے دن تقریری امتحان کا نمبر آیا۔ یہ تحریری سے بھی زیادہ مشکل تھا۔

ممتحن چند افسر تھے جن کو اختیار تھا کہ اپنے اپنے مذاق کے موافق امیدوار کی قابلیت کا اندازہ کرنے کے لئے ملکی اخلاقی سیاسی مذہبی ہر طرح کے سوالات کریں۔ نیز امیدواروں کی نقل و حرکت انداز گفتگو طریقہ جواب وضع قطع لباس نشست برخاست عزم استقلال سلیقہ ہر بات کا جائزہ لیں اور جو چاہیں سوال میں سے سوال پیدا کرتے چلے جائیں۔ اللہ کی قدرت کہ نمبروار چار دن ممتحن سوالات سے اس طرح فارغ ہوئے کہ میاں سعید کے ہر جواب پر مسرور و محظوظ ہو کر ہنس ہنس پڑتے تھے۔ ایک ماہ بعد سب سے اول ایک دوست کے مبارکبادی کے تار اور اگلے دن انگریزی اخبارات کی اشاعت سے معلوم ہوا سینکڑوں امیدواروں میں سب سے اول رہنے کا سہرا حق تعالیٰ نے دعاء خلیلی ہی کے سر رکھا کہ میاں سعید مجموعہ ہی میں نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر ہر مضمون میں اول رہے۔ چنانچہ فوراً ہی معقول تنخواہ پر تقرر ہوا اور اب ماشاء اللہ گورنمنٹ آف انڈیا میں اسسٹنٹ ہیں۔

ایسے واقعات اگر شمار کئے جائیں تو صدہا بلکہ ہزاروں نکلیں گے مگر آپ کے معنوی کمالات بالخصوص استقامت علی الدین اور اتباع سنت محمدیہ میں فنائیت کے سامنے ان کی نہ کوئی وقعت ہے نہ شان۔ اس لئے مجھے خود اس سے دلچسپی نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی طبیعت کو قدرت نے اتباع سنت نبویہ کا سانچہ بنا دیا تھا اور اللہ و رسول کے ساتھ وہ محبت جو خون کی طرح آپ کی رگ رگ میں جاری و ساری تھی آپ کی مبارک طویل زندگی کے لمحہ لمحہ کو ایک بے نظیر مستقل کرامت بنائے ہوئے تھی۔ آپ کا عمر بھر دینی خدمت میں انہماک حدیث

میں تبحر فقہ میں اجتہاد تحریر و تقریر میں اشاعت دین حرکت و سکون میں اظہار حق قیام و قعود میں اتباع سنت لازمی و متعدی نفع دینی کا وہ بے پایاں سمندر تھا جس میں کوئی بھی غوطہ لگانے والا غواص موتیوں سے کبھی محروم نہیں رہا۔ اور اس بنا پر مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ ہے

اولئک ابائی فجئنی بمثلھم   اذا جمعتنا یا جریر المجامع

تربیت و تصرفات اور وصیت و وفات

بھوک ہر چند کہ ایک تکلیف ہے کیونکہ معدہ کی اس کھرچن کا نام ہے جو انسان کو غذا کی طلب پر مجبور کرتی ہے اور ہر قسم کے تعب اور مشقت کا تحمل بناتی ہے مگر درحقیقت بڑی نعمت ہے کہ یہ نہ ہو تو غذا کی طلب نہ ہو اور غذا نہ ملے تو انسان مر جائے پس انسانی زندگی کا مدار صرف بھوک پر ہے اور اسی نے عالم دنیا کو آباد بنا رکھا ہے۔ ورنہ گورستان بھی دنیا میں ہے جہاں ہم جیسے بیسیوں قرن جا چکے ہیں۔ مگر چونکہ بھوک سے خالی ہیں اس لئے سنسان شہر اور عالم خموشاں کے باشندے ہیں۔ بھوک کی حالت میں انسان سوکھے ٹکڑے بھی کھاتا ہے۔ تو اس میں مزہ آتا ہے اور وہ خون بن کر طاقت پہنچاتے ہیں مگر بھوک کے بغیر بریانی و متنجن بھی کھائیے تو نہ لذت آتی ہے اور نہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ عجب نہیں بدہضمی پیدا ہو کر ہلاکت کا سبب ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جب اپنی بھوک میں کمی محسوس کرتا ہے تو طبیب کی طرف رجوع کرتا اور دوا و پرہیز کو لذت پسندی پر ترجیح دیتا ہے کہ کسی طرح بھوک کھل جائے جو غذا کی طلب پر مجبور و مضطر کرے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے روح انسانی میں بھوک کا مادہ رکھا ہے جو اس کو روحانی غذا کی طلب پر مجبور کرتا ہے اور وہ پیٹ کی بھوک سے زیادہ اور بڑی نعمت ہے کہ اس پر آخرت کی زندگی کا مدار ہے جب نفسانی خواہشات میں پڑ جانے یا ناجنس بد دینوں کی صحبت میں رہنے یا اس بھوک سے

بے وا ہو کر کاہلی دعفلت کی عادت ڈال لینے سے وہ بھوک بند یا کمزور ہو جائے تو ضرورت ہے معالجہ کی کہ کسی طرح وہ پیدا ہو اور روح اپنی غذاؤں کو طلب کر کے اپنی زندگی قائم رکھ سکے۔ جسمانی غذاؤں میں مفید اور مضر کی کوئی فہرست مرتب نہیں ہے۔ اُن کا مدار صرف تجربہ پر یا کچھ طبی کتابوں کے احسان پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر دھوکا کھاجاتا اور مفید غذا سمجھکر بھوک میں ایسی مضر چیز کھا بیٹھتا ہے جو اس کی زندگی کو ختم کر دیتی ہے۔ مگر روحانی غذاؤں کی مکمل فہرست جس میں تمامی مفید اور مضر چیزوں کی پوری تفصیل موجود ہے حق تعالیٰ نے اپنی آسمانی کتابوں میں بھیجدی ہے جس کو شریعت اور مذہب کہتے ہیں۔ اور اسلام نے تو اس تفصیل کو اتنا حد پر پہنچایا ہے کہ ہر مفید و مضر غذا کے نفع و نقصان کے درجے بھی بتا دیئے۔ چنانچہ استعمال کے لئے فرض واجب سنّت مستحب مباح کے مراتب قائم فرماکر ضرورت کی نوعیت دکھائی تو پرہیز کے لئے حرام مکروہ تحریمہ کراہت تنزیہہ اور خلاف اولیٰ کی تقسیم سے بچنے کی ضرورت کے مدارج بتادیئے اور الیوم اکملت لکم دینکم نازل فرماکر اطمینان دلادیا کہ اب اندیشہ نہیں کہ شاید کسی مضر کو مفید سمجھکر کھالینے سے ہلاک ہوجائیں۔ اس عطا کردہ مکمل فہرست پر صرف عمل کی ضرورت ہے اور وہی نجات کی کفیل ہے۔ مگر بھوک کا سوال اب بھی باقی ہے کہ روح میں طلب صادق ہوگی تو وہ روحانی غذاؤں کے استعمال اور شریعت پر عمل کی محرک بنے گی ورنہ بادل ناخواستہ کیسی ہی قوی غذا کا استعمال کرے وہ بیکار بلکہ عجب نہیں منافقوں کے اعمال کی طرح مہلک و مضر ہو۔ چونکہ بھوک کے بغیر غذاؤں کی فہرست پر عمل دشوار تھا اس لئے حق تعالیٰ نے طبیب و معالج بنا کر اپنے پیغمبروں کو بھیجا کہ یہ کہیم ہے ان کی شان معالجہ بیان فرمائی مخلوق کو بتایا کہ ان کی صحبت میں رہنا ان کی عقیدت و محبت رکھنا قدرتی قانون کے موافق تمہاری روح کو ان کی روحانی قوت میں منجذب کرے گا اور جو سچی بھوک ان کے قلوب میں ہے وہ تمہارے قلوب میں اس طرح آجائے گی جیسے لوہے میں

مقناطیس کے ساتھ صحبت و تعلق رکھنے سے مقناطیسی کشش پیدا ہو جاتی ہے اور پھر تم کو خود محسوس ہوگا کہ اتباع شریعت اور مرضیات الٰہیہ پر چلنے کی طلب تم کو بر غبت ہے یا کسی شرم و دباؤ کے لحاظ میں۔ پس اب یہ کوئی علمی سوال نہیں جس میں مباحثہ کی ضرورت ہو بلکہ مشاہدہ اور تجربہ کے متعلق بات ہے کہ اپنے قلب کو خود ٹٹولو۔ اگر وہ عبادات و مرضیات الٰہیہ کا ایسا طالب ہے جیسا روزہ دار شام کو سچی بھوک لگنے کے وقت افطاری کا طالب ہوتا ہے تو بیشک تمہاری بھوک قائم ہے اور تم کو معالج کی مطلق ضرورت نہیں۔ اور اگر ایسا نہیں بلکہ برعکس ہے تو گویا تمہاری بھوک بند ہے اور اندیشہ ہے پوری ہلاکت یعنی سوء خاتمہ کا۔ یا رغبت تو ہے مگر پوری اور کامل نہیں ہے تو بھوک میں کمی ہے اور وہ بھی خطرہ سے خالی نہیں کہ مبادا بڑھ کر مرض کو لاعلاج نہ بنا دے۔ اللہ کے پیغمبروں کے قلوب ایک برقی قوت کے مخزن اور مقناطیسی کشش کے سرچشمہ ہوتے ہیں اس لئے قلوب کو اپنی طرف منجذب کر کے اول ان میں بھوک پیدا کرتے اور پھر دوسروں میں بھوک پیدا کرنے والی برقی قوت پیدا کرتے ہیں۔ جن میں یہ طاقت معتدبہ آجاتی ہے وہ شیوخ طریقت کہلاتے ہیں۔ اپنے معدن یعنی مشکوٰۃ قلب محمدیؐ سے روحانی بھوک کی پیدا کرنے والی استعداد حاصل کر کے اپنے زمانہ کے مریضوں کو پاس بٹھا کر سینہ بسینہ لگا کر۔ کچھ دوا اور کچھ پرہیز کا پابند بنا کر ان کے قلوب میں بھوک پیدا کرتے ہیں۔ اسی کا نام سلوک و طریقت ہے اور یہی بیعت و انتساب کا مقصود ہے۔ پس طریقت درحقیقت شریعت ہی پر عمل کا نام ہے کوئی شے زائد نہیں۔ مگر بشرطیکہ اس کی بھوک ہو کہ رغبت و شوق کے ساتھ اس پر عمل ہو۔ لہٰذا اگر پیر خلاف شرع ہے تو مرضیات الٰہیہ کا خود بھوکا نہیں وہ کسی قلب میں اس بھوک کو کس طرح پیدا کر سکے گا۔ آں را کہ خود گم است کرا رہبری کند۔ اور اگر خود متبع شریعت ہے مگر دوسروں میں بھوک نہیں پیدا کر سکتا تو گو تندرست ہے مگر معالج طبیب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اسی بھوک کا نام فطرت

ہے۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ۔ ہر بچہ اس بھوک کو اپنی زندگی بھر کا رفیق بنا کر اپنے ساتھ لاتا ہے کہ ماں کے پیٹ سے جُدا ہو کر گہوارۂ دُنیا میں قدم رکھتے ہی غذا کی طلب میں چیختا چلاتا اور ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے۔ شفیق ماں اس کی ناتوانی اور احتیاج و طلب کو دیکھکر اسے اٹھا لیتی اور آغوش میں لے کر وہ پستان اس کے مُنہ میں دے دیتی ہے جس میں مادرانہ محبت کی وجہ سے دودھ جوش مارتا اور بچہ کے ذرا چُوسنے سے اُبل اُبل کر اس کے منہ میں بھرتا چلا جاتا ہے۔ یہی حال روحانی بھوک کا ہے کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی قلب میں پیدا ہوتی ہے اور بڑے ہو کر بُری صحبت یا عادت اور رواج میں ڈوب کر کم یا بالکل بند ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ۔ ہاں اگر وہ بھوک قائم رہے اور اپنی غذا کی طلب میں ذرا بھی بلبلائے اور ہاتھ پاؤں ہلائے تو رحمت الٰہیہ میں جوش آجاتا اور وہ ماں سے زیادہ اس کی مربیہ بن کر اپنے آغوش لطف و کرم میں اس کو پرورش کرنے لگتی ہے۔ اپنی محبت اس کو عطا فرماتی اور اپنے اولیاء کے قلوب سے انوار قدسیہ اس کے قلب میں پہنچاتی اور اس کو جوان بنا دیتی ہے پس طریقت اور سلوک معالجہ روحانی کا نام ہے جس سے روح کی ظلمت و کثافت دور ہو کر وہ بھوک اصلی حالت پر آجائے جو فطرت میں ودیعت ہے۔ اور اسی لئے عمروں کا تفاوت مزاجوں کا اختلاف مشاغل کا تنوع طبائع کا تخالف اور زمانہ کا انقلاب طریق معالجہ کو بدلتا رہتا ہے کہ ہر طبیب مقصود صحت قلب کو مدنظر رکھتے ہوئے جو طریق بھی جس مریض کے لئے مناسب پاتا ہے اس کو عمل میں لاتا ہے جیسے جہاد کا مقصود ہے کفار کو مغلوب کرنا۔ مگر طریقۂ جنگ میں امیر لشکر کو اختیار ہے کہ جو صورت غلبہ کے لئے مفید پائے خواہ تیر اندازی ہو یا توپ و تفنگ کی گولہ باری اس کو اختیار کرے اس کو کوئی عاقل بدعت نہیں کہہ سکتا۔ اب بھوک کے ساتھ ایک اور چیز بلاؤ یعنی محبت کیونکہ بھوک کا کام صرف اتنا

ہے کہ غذا کی طلب پر مجبور کرے اگرچہ وہ غذا ادنیٰ اور اتنی قلیل ہو جس سے صرف معدہ کی کھرچن جاتی رہے۔ مگر محبت میں قدرت نے طلب کا کچھ ایسا مادہ رکھا ہے کہ سمندر کے پانی کی طرح جتنا بھی پیا جائے وہ پیاس کو بڑھاتا اور کسی حالت پر بس نہیں کرنے دیتا۔ بھوک میں طالب کو اپنا تعب و نقصان محسوس ہوگا مگر محبت میں طالب کو بجائے تعب کے لذت آئے گی اور اس کو طلب محبوب میں اپنی جان کا دینا بھی پیارا معلوم ہوگا۔ مجنوں کا قصہ سنو لیلےٰ کی محبت میں اس کا حال اتنا شکستہ ہو گیا تھا کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا تھا مگر اس نے کبھی ایک لحظہ کے لئے بھی یہ خواہش نہیں کی کہ یہ محبت اس کے دل سے نکل جائے جس نے اس کو تکلیفوں کا تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ اس کے باپ نے مرض کو لاعلاج پاکر آخری تدبیر یہ کی کہ اپنے ساتھ حج کو لایا اور بیت اللہ کا دامن پکڑوا کر اس سے کہا کہ دعا مانگ یا اللہ میری خطاؤں کو معاف فرما اور لیلیٰ کی محبت میرے دل سے نکال دے۔ مگر وہ دعا مانگتا ہے ؎

الٰہی تبت من کل المعاصی   الیک فقد تکثرت الذنوب
واما من ھوی لیلی و ترکی   زیارتہا فانی لا اتوب

یا اللہ سارے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں مگر لیلیٰ کی محبت اور اس کی زیارت کے شوق سے توبہ نہیں کرتا۔ پس طریقت میں جہاں روحانی غذاؤں کی بھوک پیدا ہوتی ہے وہیں ساتھ ساتھ حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے طالب ہر دم امتثال امر محبوب کے لئے تیار اور ہر وقت اس کی رضا جوئی میں ڈوبا رہتا ہے۔ ساری شریعت پر عمل اس کو آسان نظر آتا اور محض بھوک رفع کرنے کی خاطر نہیں بلکہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کا متمنی ہوتا ہے کہ اس جیسی ہزار شریعتیں بھی ہوں تو ان پر عمل کر دوں گا۔ اور عمر کا لحظہ لحظہ بھی ایک نئے حکم سے جکڑا ہوا ہو تو اس کی تعمیل میں زندگی ختم کر دوں گا۔

فرہاد سے شیریں کی فرمائش ہوئی کہ پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر اس کے مکان

تک لا ئے ۔ تو اس نے یہ بھی نہ پوچھا کہ ایسا ہونا ممکن ہے یا نا ممکن ۔ بلکہ کام میں لگ گیا اور کوہ کنی میں لذت معلوم ہوئی ۔ جب فانی مخلوق کی ذلیل محبت کا یہ اثر ہے تو کیا پوچھنا حق تعالیٰ شانہٗ کی محبت کا کہ اس میں مر کھپنا تو عین حیات ہے ۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے باغ میں کروڑہا بلکہ ان گنت پھول کھلے اور مہکے جن کو اولیاء اللہ کہتے ہیں ۔ اور گو رنگ سب کے مختلف اور بو سب کی جدا تھی مگر ان کی سرشت و آب یاشی صرف اسی محبت سے ہوئی تھی کہ دنیا کی ہر چیز ان کی نظروں میں ہیچ اور امتثالِ امر محبوب کے سوا ہر شے ان کو بے وقعت نظر آئی ۔ کتابوں کے اوراق الٹو اور ان محبت والوں کے قصے پڑھو تو مجسمِ حیرت بن جاؤ گے اور تمہارے دل میں ایک گدگدی اٹھے گی ۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ تمہارے دلوں میں بھی محبت کا مادہ رکھا ہوا ہے اور ہر جنس اپنے ہمجنس کی طرف کشش کیا کرتی ہے ۔ مسلمان تو مسلمان کسی کافر کا دل بھی اس مادہ سے خالی نہیں ۔ مگر چونکہ وہ اپنے مرکز سے بھٹک گیا اور مقصود سے غافل ہو کر محبوب حقیقی سے بہت دور جا پڑا ہے اس لئے اس کا یہ اضطراری جوش یا سیم و زر کی طرف جھک جاتا ہے یا دنیا کے مٹ جانے والے حسن کی طرف کوئی باغات کا شیدا بن جاتا ہے کوئی تعمیرات کا کسی کو چٹے چمڑے والی عورتوں کے ساتھ گرویدگی ہوتی ہے اور کسی کو نرم و نازک کپڑوں کے ساتھ عشق ہوتا ہے ۔ بہر حال کوئی نفس نہیں جو کسی نہ کسی چیز کی طرف کشش نہ کرتا ہو ۔ بس یہی مادہ جب بازاری حسین کسبیوں سے متنفر ہو کر ایک گھر کی مالک عفت مآب خاتون کی طرف کھنچ آتا ہے تو ہر گندے مرض اور خطرناک نتیجہ سے امن مل جاتا اور اس وقت بدچلن عیاش کا نام نیک وضع پاکدامن قرار پا جاتا ہے

محبت ایک عجیب الخاصیۃ اکسیر ہے جو کبر و نخوت کے جھاڑ جھنکاڑ کو جن میں ہزاروں مہلک حشرات الارض چھپے ہوئے ہیں یکدم صاف کر دیتی ہے خشوع و مسکنت کا بیج بوتی ہے ہمت بلند کرتی تواضع اور زہد کا سبق پڑھاتی طاعت

میں اخلاص پیدا کرتی۔ رضا جوئی کا مشاہدہ کراتی فانی اور باقی کا فرق ظاہر کرتی اور جس قلب کو اپنا گھونسلہ بناتی ہے اس کے جسم کو انسانیت کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے کہ کسی عضو اور کسی حاسہ سے بھی کوئی کام خلاف انسانیت سرزد نہیں ہو سکتا۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تمامی کمالات جن کے ذکر کرتے سے بھی دل کو فرحت ہوتی اور مزہ آتا ہے اسی محبت کے ثمرات تھے۔ اور آپ کی عمر شریف کے ہر لمحہ اور ہر آن کا کارنامہ جو آج قانون اور اصول موضوعہ بنا ہوا ہمارا راہبر ہے وہ اسی آتش سوزاں کا دھواں تھا جس کو مخلوق کے دلوں میں سلگانے کے لئے آپ تشریف لائے تھے کہ ٹھنڈے سیاہ کوئلہ کو اپنے سلگتے ہوئے انگارہ سے چپٹائیں اور پھونک مار کر اس کو بھی سلگائیں۔ یہی ایک چیز ہے جو سینوں میں سلسلہ بسلسلہ سلگتی چلی آئی کہ سلسلہ کے ہر شیخ کو طالب کے قلب میں آتش محبت سلگانے کے لئے اپنی چھاتی سے چپٹانا ضرور ہوا۔ محبین خدا کے قصوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں مگر خود محبت چونکہ بھوک کی طرح ایک وجدانی چیز ہے اس لئے دنیا میں وہ الفاظ نہیں جن سے اس کی حقیقت بیان ہو سکے۔ ہاں خود حق تعالیٰ فرماتے ہیں یحبہم ویحبونہ اور والذین امنوا اشد حبا للّٰہ اس لئے اس میں شک نہیں کہ محبت کوئی چیز ضرور ہے۔ نیز یہ کہ ایمان درحقیقت اسی شدت محبت کا نام ہے جس کو اصطلاح دنیا میں عشق کہتے ہیں کہ مومن اس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اور جو اس سے خالی ہو اُسے اس کا حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ مومن کا مصداق بن سکے۔ البتہ اس کے مراتب غیر متناہی ہیں جن میں ادنیٰ درجہ الفت اور میلان قلب کا ہے اور انتہائی درجہ ولہ کا۔ پھر اسی کی کیفیت بڑھتی رہتی ہے اور کسی حد پر بس نہیں کرتی۔ یہ درجہ صرف سرور عالم فخر عالمیان صلے اللہ علیہ وسلم کو نصیب ہوا تھا جس کی وجہ سے آپ خطاب محبوبیت سے نوازے گئے البتہ نیچے کے مراتب میں جس خوش نصیب کے لیے جتنا مقدر تھا وہ عطا ہوا اور اتنے ہی میں ان پر وہ احوال طاری ہوئے کہ دیکھنے والے

قیس اور فرہاد کے قصوں کو بھول گئے۔
محبت کے ثمرات عجیب و غریب ہیں کہ محبوب کی طرف دل کھچتا ہے اور اس کے پہلے ہی حملہ میں وہ عقل و ہوش جن کے بل بوتے دنیا کی طلب میں مرکھپ رہا تھا رخصت ہو جاتے ہیں۔

حدیث حسن او تا گہ فرو خواندند در گوشم　　درآمد عشق یکبارہ ببرد از عقل و از ہوشم

بیچارہ بیتابیٔ دل کو چھپاتا ہے مگر چھپ نہیں سکتی۔

ہر چند مے دارم نہاں در سینہ سر تو جاناں　　لیکن ہمی گردد عیاں از چشم و از رخسارہ

پھر دیدار محبوب کی تمنا اور قرب کی آرزو پیدا ہوتی ہے مگر نہیں سمجھتا۔

ہزاراں سر درآنجا پائمال است　　نظر در روے ورین جا خود محال است

باایں ہمہ نہ جان کا اندیشہ کرتا ہے نہ مال آبرو کا۔ آگے بڑھتا اور اس تمنا میں مر جانا بھی حصول مراد سمجھتا ہے۔

اگر فرہاد را حاصل نشد پیوند با شیریں　　ہم آخر جان شیریں بیش برآمد در تمنایش

ہجر و دوری سے گھبرا کر محبوب تک اپنی خبر پہنچاتے اور خود محبوب کی خبر معلوم کرنے کا مشتاق ہو کر رسول تلاش کرتا اور قاصد کا دامن پکڑتا ہے اور نہیں پاتا تو دیوانہ وار نسیم و صبا کو مخاطب کرتا ہے۔

کفی حزنا انی مقیم ببلدة　　وانت باخری بالیک سبیل
وان لم یکن بینی و بینک مرسل　　فریح الصبا منی الیک رسول

پھر تضرع و زاری اور منت و سماجت سے محبوب کو اپنے حال پر ترس دلاتا اور عرض کرتا ہے۔

تنم بپوسد و جانم بزیر خاک شود　　ہنوز مہر تو باشد ز راستخواں اے دوست

پھر اپنے نفس کی مخالفت کرتا اور یہاں تک بڑھتا ہے کہ نفس جس چیز کو تکلیف بتا رہا ہے یہ اس کو راحت کہہ رہا ہے۔ اور نفس جس کو لذت کہہ رہا ہے یہ اس کو تلخی بتا رہا ہے کیونکہ اس کے لئے لذت اسی میں ہے جو محبوب کی

طرف سے آئے ؎

ہر درد و رنج کز تو رسد بر دل حزیں آں محض راحت است مرا عین عافیت

آتش شوق شعلہ زن ہوتی ہے تو فریاد کرتا ہے ؎

مشتاقی و صبوری از حد گذشت یارا گر تو شکیب داری طاقت نہ ماند مارا

اور قلق و اضطراب کے ہاتھوں گھبراتا ہے تو چیختا ہے ؎

کارم ز اشتیاق تو جانم بلب رسید واز تو ہنوز مژدۂ وصلے نمے رسید

اب اس کی زبان محبوب کے ذکر سے اور تخیل محبوب کے فکر سے مانوس ہو جاتا ہے ؎

اے نام تو آرام شفاء امراض ! در یاد تو آرام حصول اغراض

اور کہتا ہے ؎

واللہ ما طلعت شمس ولا غربت الا و ذکرک مقرون بانفاسی
ولا ہممت بشرب الماء من عطش الا رائیت خیالا منک فی الکاس

اور کہتا ہے ؎

اے نام تو راحت دہانم وز یاد تو پر شکر دہانم
گر بر سر من تو تیغ رانی جز نام تو بر زبان نرانم

یہ ہے وہ ذکر اللہ جو اللہ کو پیارا ہے اور جس پر ثمرہ مرتب فرمانے کا وعدہ ہے کہ فاذکرونی اذکرکم۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ کیونکہ محبت محبوب پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی آج جو بیچارہ محب ہے امتحان کے سچا ثابت ہونے کے بعد محبوب بنے بغیر نہیں رہ سکتا چنانچہ ارشاد ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ خود سوچو کیا فرق ہے گھڑی کی رفتار کی طرح اللہ کا نام رٹتے ہیں کہ دل کہیں ہو اور خیال کہیں۔ اور محبانہ و عاشقانہ اشتیاق سے اللہ جل جلالہ کا نام پاک لیتے ہیں۔ کہ وہ محبان دنیا کی عادت و خو ہے اور یہ محبان خدا کی طلب و جستجو۔ بھوک کی طلب کا مدار پھر بھی خود غرضی پر ہے اور وہ شکم سیری پر ختم ہو جانے والی ہے۔ مگر محبانہ طلب خاص مخلصانہ طلب ہے اور غیر متناہی

ہے کہ مر مر کر ہزار بار بھی زندہ ہو تو یہ طلب ترقی سے نہ رکے گی۔ اسی لئے اس کا صلہ بھی محبوب کی طرف سے غیر متناہی راحت یعنی خلود فی الجنۃ ہے کہ جیسا کام ویسا انعام۔ غرض یہ محبت جب قلب میں اس درجہ پیوست ہو جاتی ہے کہ محبوب کا خیال ہمہ وقت قائم رہنے لگے اور کسی وقت بھی دل سے نہ ہٹے تو اس کا نام نسبت یادداشت ہے اور ایسی حالت ہو جاتی ہے جیسے دن میں انسان سب کچھ کرتا اور اس کا یقین رکھتا ہے کہ سورج نکلا ہوا ہے اور جو کچھ کر رہا ہوں اسی کی روشنی میں کر رہا ہوں اسی کا نام یقین اور حضور ہے اور ان مختلف اثرات کو رنگہائے نسبت کہتے ہیں کہ ایک ہی باغ محبت کے گوناگون پھول ہیں جن کی بو جدا جدا ہے مگر مہک واحد اور سب میں مشترک ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش من انداز قدت را مے شناسم

مگر سب رنگوں میں پیارا رنگ وہ ہے جو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ محبت کا اثر امتثال محبوب پر بکمال اعتدال تھا اور جو شان زر خرید غلام کی اپنے مولا اور آقا کے سامنے ہونی چاہیئے وہ آپ کی اپنے جل جلالہٗ کے سامنے تھی ہمہ وقت آقا کے دروازے پر حاضر ہر لحظہ حکم کے منتظر ہر امر میں اطاعت کے لئے تیار اور اس کے ہر تصرف و انقلاب میں راضی و مسرور نماز میں دل لگایا تو پاؤں ورم کر آئے گویا اسی کے لئے پیدا ہوئے تھے اور روزہ دار بنے تو ایسے کہ مہینہ مہینہ مسلسل ہو گیا اور چھوڑنے کا قصد نہ کیا۔ غنی بنے تو لاکھوں درہم و دنانیر کے ڈھیر نظر اور ہاتھوں سے گذار دیئے اور زاہد و فقیر بنے تو ایسے کہ گھر میں ایک دینار رکھکر رات گذارنا دشوار ہو گیا۔ عیال بنائے گئے تو نو بیبیاں رکھیں اور بار نفقہ کا فکر پاس نہ آیا۔ اور سپہ سالار لشکر بنے تو ایسے کہ کوہ و حنین کو لرزہ آیا۔ درزی کی سوئی کو تامل ہوتا ہے کہ ململ میں چل کر ٹاٹ میں مشکل سے چلے لیکن آپ کو حق تعالیٰ نے بادشاہ سے لے کر گداتک ہر شخص کو جتنے بھی مختلف حالات دنیا میں پیش آسکتے ہیں سب ہی میں چکر دیا مگر آپ یکساں تھے اور گویا مرکز سے

بندھی ہوئی رسّی کے طول پر دائرہ کا چکر لگار ہے تھے کہ جنوب ہو یا شمال اور مشرق ہو یا مغرب مگر آپ کا رُخ ہر حال اور ہر وقت مرکز پر ٹھہرا ہوا تھا موسم بدلے زمانہ بدلا حالات پلٹے وقت پلٹا کبھی عُسر ہوا کبھی یُسر کبھی راحت ہوئی کبھی تکلیف کبھی دن ہوا کبھی رات کبھی گرمی ہوئی کبھی سردی کبھی کوئی پیدا ہوا کبھی کوئی مرا کبھی فتح ہوئی کبھی شکست کبھی تمول ہوا کبھی فقر کبھی جوانی ہوئی کبھی بڑھاپا کبھی سفر ہوا کبھی حضر کبھی بیماری لاحق ہوئی کبھی صحت کبھی سب وشتم ہوا کبھی اعزاز واحترام گردش فلک نے پیچھے جو کچھ ہونا چاہیئے سب ہی کچھ ہوا مگر آپ اپنی غلامی وعبدیت کے متوالے ہر حال میں مسلوب الارادہ تھے کہ بجز ہاں حضور اور لبیک یا اللہ کچھ جانا ہی نہیں ؎

روزہا گر رفت گو رو پاک نیست   تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

اس کا نام نسبت عبدیت ہے اور یہی ترکۂ پدری ہیں ان خواص اولیاء کو دی جاتی ہے جن کو اقطاب کہا جاتا ہے کہ آپ کے خاتم النبیین ہونے کے سبب اصلاح امت کے لیے جانشینی کا کام انہیں سے لیا جاتا ہے۔

بات بہت دور چلی گئی مگر بلا اختیار۔ حاصل یہ ہے کہ سلوک طریقت کا مقصود صرف یہ ہے کہ سالک کے قلب میں مرضیات الٰہیہ کی ایسی طلب پیدا ہو جائے جیسی بھوکے کو غذا کی طلب ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے ضرورت ہے خاص تعلیم کی کہ مجاہدہ وریاضت کرے۔ تاکہ بداخلاقیوں کے وہ عوارض دُور ہو جائیں جنہوں نے فطرۃ کو مغلوب کر کے اس بھوک کو بند کر دیا اور اس تعلیم پر عمل کے ساتھ ضرورت ہے شیخ کے ساتھ اُنس اور تعلق کی کہ اس کے محب خدا قلب سے مرتبط ہو کر اپنے سیاہ کوئلہ قلب میں محبت کی چنگاری لگ جائے اور وہ بڑھتی رہے اور پہنچے جہاں تک بھی پہنچنا اس کے لیے مقدر ہوا۔ اس محب خدا کا شریعت پر عمل نہ جنت کی ہوس میں ہو گا نہ دوزخ کے خوف میں بلکہ اس لیے ہو گا کہ اللہ جل جلالہٗ محبوب ہے اور وہ جنت ودوزخ پیدا

نہ فرماتا تب بھی مستحق تھا کہ مطلوب بنتے اور ہم طالب و شیدا۔ اور اس کے ساتھ ہی چونکہ اس کی رضا اتباع شریعت ہی میں ہے کہ خود ارشاد فرما چکا لہٰذا جائز نہیں کہ اس سے سرمو قدم ہٹائیں ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم — الا حدیث یار کہ تکرار میکنیم

مولوی ظفر احمد صاحب کو جب حضرت نے بیعت فرمایا تو حجرہ میں لے گئے اور تصوف کی حقیقت مختصر مگر جامع الفاظ میں اس طرح فرمائی۔ سلوک کا مقصود یہ ہے کہ بندہ کا دل حق تعالیٰ کی مرضیات کا ایسا طالب ہو جائے جیسا کہ جسم غذا کا طالب ہے اور اس کو عبادت کی ایسی خواہش ہو جیسی جسم کو غذا اور پانی کی خواہش ہوتی ہے۔ اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ دل حق تعالیٰ کی عظمت و محبت سے پُر ہو جائے اور ماسوائے اللہ کی محبت و عظمت سے خالی ہو جائے۔ جب تک اغیار کی محبت و عظمت اس درجہ میں قائم ہے کہ عظمت و محبت حق سے مزاحمت کرتی ہے اس وقت تک وہ مرضیات حق کا طالب نہیں ہو سکتا اور نہ معاصی سے پوری طرح بچ سکتا ہے۔ پس اب دو چیزیں ضروری ہوئیں۔ ایک تخلیہ کہ دل کو اغیار سے پاک کیا جائے اور دوسرے تحلیہ کہ دل کو محبت و عظمت حق سے پُر کیا جائے۔ پہلے زمانہ میں مشائخ ان دونوں کی الگ الگ تعلیم کرتے تھے۔ مگر اب چونکہ عمریں قصیر ہیں اور افکار و مشاغل بھی زیادہ ہیں اس لئے اس وقت مشائخ نے ایسا طریقہ تجویز کیا ہے جس میں دونوں مقصود ساتھ ساتھ حاصل ہو جاتے ہیں اور وہ طریقہ کثرت ذکر ہے کہ طالب حق تعالیٰ کے ذکر میں اس درجہ مشغول ہو کہ یاد الٰہی اس کے بُن بُن مو میں سرایت کر جائے اس سے دل محبت و عظمت حق سے پُر ہو جاتا اور اغیار کی محبت و عظمت سے خالی ہو جاتا ہے۔ اور اسی سے مرضیات الٰہیہ کا شوق بڑھتا ہے اور اس کی طلب دل میں مستحکم اور معاصی سے نفرت ہو جاتی ہے کیونکہ جب وہ کسی معصیت کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک وحشت ضیق اور ظلمت

دبے چینی ایسی پیدا ہوتی ہے جو غیر ذاکر کے دل کو محسوس نہیں ہوتی۔ اس سے پریشان ہوکر وہ معصیت پر اقدام کرنے سے رک جاتا ہے۔ اور اگر اتفاقاً معصیت کا صدور ہو جائے تو وحشت و دل تنگی ترقی پکڑ کر اس کو بہت جلد توبہ کی طرف مضطر کرتی ہے کہ بدوں سچی توبہ کے اس کو چین نہیں پڑتا۔ اور کثرت ذکر کے دو طریقے ہیں۔ ایک وہ جو مشائخ کا معمول ہے۔ مثلاً ذکر نفی اثبات اور ذکر اسم ذات وغیرہ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جو دعائیں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات اور مختلف حالات کے متعلق ارشاد فرمائی ہیں ان پر مواظبت کی جائے۔ میرے نزدیک ان دونوں کو جمع کرنے کی ضرورت ہے اس کے بعد آپ نے اپنے دست مبارک میں میرے ہاتھ سے کر حسب معمول بیعت فرمایا اور پھر دو سو بار ذکر نفی اثبات اور دو ہزار مرتبہ اسم ذات کی تلقین فرمائی اور خود باقاعدہ کر کے دکھلایا کہ چار زانو بیٹھکر آنکھیں بند کر کے لا الہ کو ناف سے کے ساتھ گردن کی دائیں طرف سے جا کر الا اللہ کو قلب پر ہلکی ضرب کے کے ساتھ ختم کیا۔ دو تین بار اسی طرح کر کے دکھلایا اور فرمایا کہ مشائخ کا معمول یوں ہی ہے اور اسی طرح سکھلاتے آئے ہیں۔ اس طرح نفع زیادہ اور جلدی ہوتا ہے اس کے بعد ذکر اسم ذات بھی خود کر کے دکھلایا اور پھر فرمایا کہ حصن حصین سے ادعیہ ماثورہ متعلقہ اوقات و حالات مختلفہ معلوم کر کے ان کا بھی ورد کیا جائے۔ اور چلتے پھرتے تسبیح ہاتھ میں رکھکر شغل پاس انفاس کی مشق کی جائے۔ اوپر کے سانس میں اللہ اور نیچے کے سانس میں ھو کا تصور کیا جائے۔ یہ بہت مثمر انوار و برکات ہے۔ نیز ذکر اسم ذات میں یہ تصور کیا جائے کہ لفظ اللہ کے ساتھ ایک نور منہ سے نکلتا ہے جو میرے سارے جسم کو محیط ہے اور پھر احاطہ کو اس قدر وسیع کیا جائے گویا تمام عالم کو محیط ہے اور تم اس میں فانی و لاشئے ہو۔ اور لا الہ میں یہ تصور کیا جائے کہ قلب سے تمام ظلمات علائق ماسوے اللہ کو پس پشت پھینک رہا ہوں اور الا اللہ میں یہ تصور کیا جائے کہ قلب انوار

محبت و عظمت حق سے پُر ہو گیا۔

حضرت کے سوانح عمر بتار ہے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو نسبت عبدیت سے نوازا تھا کہ اتباع شریعت میں گھُل مل جانے کے سوا آپ پر کسی حال کا غلبہ نہ تھا۔ اور صرف استقامت کا رنگ آپ پر چڑھا ہوا تھا کہ آپ کی زبان آپ کا دل اور آپ کے بدن کا رُواں رُواں یہ پکارتا تھا کہ اتباع سنت میں فنا ہو جاؤ اور عادات ہوں یا عبادات ہر حال اور ہر امر میں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل کو اپنا امام اپنا ہادی اپنا پیشوا اپنا راہبر بناؤ کہ بجز اس کے کوئی صورت بھی فلاح کی نہیں۔ سنت محبوب ہی وہ قلعہ ہے جس کے چار طرف قدرت نے سر بفلک دیواروں کا حصار کھینچ دیا ہے اور دروازے پر امین و قوی پہرہ دار کھڑے کر دیئے ہیں کہ اس کے اندر شیطان کی کسی طرح رسائی نہیں ہو سکتی۔ پس ہر طرح کا امن چاہتے ہو تو اپنے آپ کو حصار کے اندر لے آؤ ورنہ اندیشۂ ہلاکت سے محفوظ نہ رہو گے،

آپ کی ساری تعلیم کا خلاصہ صرف یہی تھا اور جس طرح آپ نے اس حال پر اپنی عمر شریف کے لمحات و ایام گذارے آپ چاہتے تھے کہ آپ کے منتسبین بھی اسی کے عاشق بن کر اپنی زندگیاں ختم کر دیں۔ اور اس کے سوا کسی دوسرے رنگ کا مزہ بھی نہ چکھیں۔ حضرت امام ربانی مولانا گنگوہی قدس سرہ نے آپ کی نسبت کے متعلق جو ارشاد فرمایا وہ اس کی شہادت ہے کہ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے میرے قرۃ العین سعید ازلی خلیل احمد کو نسبت صحابہ سے نوازا ہے اور یہ کہ تمہاری نسبت کو میری نسبت سے زیادہ قرب و مناسبت ہے۔

چونکہ محبت میں یہ خاصیت ہے کہ مغایرت کو پسند نہیں کرتی اور کان نمک کی طرح ہر شئے کو اپنے رنگ میں لے آتی ہے چنانچہ المرء مع من احب سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہی سلوک کا اصل الاصول ہے جس کی ابتدا بیعت سے ہوتی ہے۔ پس آپ اس تعارف و تعلق کو سالک کے قلب میں بڑھانے کی اوّل ہی سے کوشش

فرماتے اور اس کو تعلیم کرتے تھے کہ شیخ سے ملنا جلنا بڑھائیں خط بھیجنے کا پابندی سے خیال رکھیں اور جہاں اوراد و اذکار کے پابند ہوں وہیں حب مع الشیخ کے وسائل اختیار کرنے کی سعی کرتے رہیں۔ بعض لوگ بیعت ہو کر جاتے اور مراسلت سے غفلت کرتے تو آپ کو یہ رسمی بیعت ناگوار گذرتی اور جب موقع پاتے اس پر تنبیہ فرماتے تھے۔ بمبئی میں ایک صاحب آئے اور میں نے یہ سمجھکر کہ حضرت نے پہچانا نہیں ان کی تقریب کی کہ یہ حضرت کے خدام میں ہیں۔ حضرت نے ان پر غور کی نظر ڈالی اور شکایت کے درجہ میں فرمایا کہ میرے پاس تمہارا کبھی کوئی خط بھی نہیں آیا پھر بھلا پہچانوں کیسے؟ عرض کیا کہ حضرت خط بھیجنے کی مجھے عادت نہیں ہے۔ بے ساختہ فرمایا مجھے بھی عادت نہیں کہ جو خط نہ بھیجے اسے یاد رکھوں ''

مولوی محمود الدعانی صاحب کرسوی کا خط بعد مدت آیا تو تحریر فرمایا عرصہ دراز کے بعد عنایت نامہ متضمن خیریت موجب مسرت ہوا۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ آپ نے ہم کو بالکل بھلا دیا مگر خیر اس خط سے معلوم ہوا ابھی کچھ تعلق باقی ہے جو موجب یادآوری ہوا۔

محبت شیخ چونکہ پہلی سیڑھی ہے محبت الٰہیہ کی کہ جس طرح ایک نل سے وابستہ ہو کر دوسرے نل میں پانی آتا ہے اسی طرح شیخ کے منور قلب سے فیضان محبت سالک کے قلب میں پہنچے گا۔ بشرطیکہ قلب طالب میں مستعدانہ تہذیب اور قلب شیخ کے ساتھ پوری محبانہ بندش ہو۔ اس لئے اس کے حصول کی جو صورت حق تعالیٰ نے عالم اسباب میں تجویز فرمائی ہے اس کو آپ عمل میں لاتے اور نتیجہ مولیٰ کریم کے حوالے فرماتے تھے۔ کہ درحقیقت قلب میں محبت ڈالنا بطن مادر میں جنین کے اندر روح ڈالنے کی طرح اسی کا کام ہے

آپ روحانی معالج تھے اور معالجہ میں حاذق ہونے کے ساتھ حق تعالیٰ نے دست شفا بھی آپ کو مرحمت فرمایا تھا اس لئے جو کوئی بھی آپ کے دامن سے وابستہ ہوا وہ بالعموم کامیاب و صحتیاب ہوا۔ چونکہ یہاں طبیب کا مطب بیان کرنا مقصود نہیں ہے اور نہ وہ دوسروں کے لئے مفید کہ ہر مرض کا علاج جدا ہے اور

ہر فہم کی تشخیص الگ ۔ ہاں بالاجمال اتنا ضرور سمجھ میں آیا کہ آپ کا مطمحِ نظر
ہمیشہ یہ رہا کہ دوا کی مقدار نہایت قلیل ہو مگر زود اثر اور کثیر النفع ہو۔
پس میرے علم میں آپ کا کوئی خادم بھی ایسا نہیں جسے آپ نے متقدمین کے
موافق چوبیس ہزار دفعہ ذکر اسم ذات تلقین فرمایا ہو۔ آپ زیادہ تر اول ذکر
نفی اثبات اور اس کے ساتھ دو ہزار یا تین ہزار یا چھ ہزار جیسی بھی سالک طبیعت
اور اس کی فرصت و گنجائش دیکھتے ذکر اسم ذات بتلاتے اور بعض کو صرف چار سو
مرتبہ ذکر لا الہ الا اللہ کی تعلیم پر اکتفا فرماتے ۔ البتہ دو باتوں کی بہت تاکید
فرمایا کرتے تھے ایک یہ کہ ذکر میں عجلت نہ ہو بلکہ پورے اطمینان اور شوق کے ساتھ
پورا کیا جائے دوم مواظبت اور پابندی ہو کہ کسی حال میں ترک نہ کیا جائے کیونکہ
ایک قطرہ جو ہمیشہ پڑتا رہے آخر ایک دن پتھر میں سوراخ کر دے گا مگر بارش
کے کروڑوں قطرے جو موسلا دھار بن کر ادھر برسیں اور ادھر ختم ہو جائیں۔
خاک بھی اثر نہ کریں گے ۔ نیز آپ کا معالجہ زیادہ تر مرکبات سے ہوتا تھا جو معجون
کا حکم رکھتی تھیں اور ان میں متعدد امراض اور مختلف قوتوں کی رعایت ایک
وقت میں جمع کر دی جاتی تھی ۔ چنانچہ آپ اکثر ذکر ہی کے ساتھ مراقبہ تعلیم فرما
دیتے تھے ۔ مثلاً یہ کہ ذکر میں لفظ اللہ کے ساتھ یہ تصور کرو کہ منہ سے ایک
نور نکل رہا ہے جو ذاکر کو اور تمام عالم کو محیط ہے ۔ اور جب اس کے اثرات
ظاہر ہونے لگتے تو مراقبہ معیت تعلیم فرماتے کہ ذکر کے وقت معیت حق کا تصور
کرو کہ اللہ میرے ساتھ ہے ۔ اور پھر اس تصور کو ہر وقت اور ہر حال قائم رکھو
کہ اللہ ساتھ ہے مگر نہ جسم ہے نہ جہت نہ کوئی صورت ہے نہ کیفیت ۔ ان
تصورات کے قائم ہو جانے پر طالب کی جو حالت ہوتی تھی اس کو وہی خوب
جانتا ہے جس پر گذری اور جس نے اس طریق کو طے کیا ہے مجھے جہاں تک
علم ہے انہیں تصورات قائم ہو جانے پر حضور مع اللہ کی شان پیدا ہو جاتی
تھی اور پھر حضرت منتظر رہتے تھے کہ اس میں قوت اور شان تمکین پیدا ہو جائے

کہ کسی وقت بھی ذہول و غفلت نہ ہو اور کوئی مشغلہ خواہ دنیا کا ہو یا دین کا اور کوئی حادثہ خواہ موت کا ہو یا ولادت کا اس حضور کو نہ مٹا سکے۔ اسی کو اصل نسبت فرمایا کرتے اور اسی کے پختہ ہو جانے پر بیعت کی اجازت عطا فرما دیا کرتے تھے جب تک اس حضور کا تمکن اور جذر قلب میں بیٹھ جانا حضرت نے اپنی فراست و روحانیت سے جانچ نہیں لیا کتنے ہی حالات عجیبہ اور واردات حسنہ سالک پر کیوں نہ پیش آئے ہوں مگر آپ مجاز طریقت ہرگز نہ بناتے۔ ہاں دلدہی فرماتے اس کے شوق کو بڑھاتے واردات سے اس کی نظر ہٹاتے اور گویا محبت کے ساتھ فرماتے کہ بچو آگے بڑھو اور چلو چلو کہ مقصود ابھی آگے ہے یہ جو کچھ دیکھ رہے ہو راستہ کے مناظر اور شاہی باغ کی تفریح گاہیں ہیں عنقریب وہ محبوب نظر آیا چاہتا ہے جس کے نظارہ سے مست ہو کر تمہیں اپنی بھی خبر نہ رہے گی کہ کون ہو اور کہاں ہو عزیز و دوستو لیکو لیکو کہ بس چھاتی سے لگانے والی ماں صرف ایک ہے اور وہ اتنا دیکھنا چاہتی ہے کہ تم اس کے طالب ہو اور اس کے آغوش کی تمنا میں پریشان حال بکھرے بال یہ جنگل قطع کر رہے ہو۔ دیکھو ذرہ مت گھبراؤ مت آیادہ وقت کہ نگاہ دو چار ہوئی اور ماں خود لپک کر تم کو فرش خاک سے اٹھالے گی۔ اور لوریاں دے کر کہے گی کہ آ میرے بچھڑے ہوئے لال جس کے پاؤں میں میری خاطر چھالے پڑ گئے۔ اس مزہ کے سامنے راستہ کی ساری کلفت بھول جاؤ گے تمہارا قلب محبت کا لذت چشیدہ بن جائے گا۔ کہ اب وہ تم کو آغوش سے جدا کرے گی تو تڑپ جاؤ گے اور ایڑیاں رگڑ کر اسی کی طرف ہاتھ پھیلاؤ گے۔ وہ کہے گی کہ ایک قلب میں دو کی گنجائش نہیں اور رقابت و شرکت مجھے ناپسند ہے۔ مگر آنا چاہو تو ہمارے سوا ہر شے کی محبت دل سے رخصت کر کے آؤ تو کیسی دنیا اور کیسی اس کی ترقی سب کو پس پشت ڈالو گے اور پروانہ وار لپک کر التجا کرو گے کہ بارالٰہا پروردگارا ہم کو اپنا بنا لیجئے اور آستانہ سے دھکے نہ دیجئے جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب نے خوب فرمایا ہے ؎

سب تمنا دل سے رخصت ہو گئی   اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی
دل میں داغوں کی یہ کثرت ہو گئی   آرزو تا اک شانِ وحدت ہو گئی
ایک تم سے کیا محبت ہو گئی!   ساری خلقت ہی سے وحشت ہو گئی
جی رہا ہوں موت کی اُمید میں   مر ہی جاؤں گا جو صحت ہو گئی

آہ یہ وہ ٹھنڈی آگ ہے جس کی سوزش میں لذت جس کے درد میں مزہ جس کی ناریت میں نور اور جس پر مرمٹنے میں بقا و حیات ہے کسی کا منہ نہیں کہ جو کام کرنے سے تعلق رکھتا ہے اس کو لکھ کر سمجھا سکے اور نقطوں میں بتا سکے کہ حضرت اللہ کو کہاں پہنچانا چاہتے تھے اور کس راستہ سے جاتے اور اس کی مرافقت کا کیا حق ادا فرمایا کرتے تھے جس نے دنیا کے کسی سفر میں حضرت کے ساتھ رہ کر اس کا اندازہ کیا ہو کہ آپ نے اس کے دُکھ درد میں کتنا ساتھ دیا وہ سمجھ لے کہ یہ صرف نمونہ اور عکس تھا اس مرافقتِ طریق حق کا جس کے لئے حضرت دنیا میں آئے تھے اور ہزاراں ہزار مخلوق کو ہر طرف سے پکڑتے تھامتے سنبھالتے دائرہ کے چکر پر اپنے ساتھ دوڑاتے پکاتے لئے چلے گئے حتیٰ کہ خود تو اپنے مرکز پر پہنچ کر جس پاک مٹی سے پیدا ہوئے تھے اس میں جا ملے مگر محور پر چلنے والوں کو صحیح راستہ بتا گئے کہ اس دائرہ سے ایک نقطہ بھی اندر یا باہر نہ جھکیں ورنہ مرکز سے رُخ پھرتے ہی خدا جانے مقصود سے کتنا دُور چلے جائیں گے۔

حضرت بالعموم ابتدا میں ذکر بالجہر کی تعلیم فرماتے تھے مگر متوسط کہ سونے اور سننے والوں کو تکلیف نہ ہو اور فرمایا کرتے تھے کہ اس سے مذکور کی طرف میلان اور شوق میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ فخر الدین صاحب کو تحریر فرمایا "اذکار میں آواز متوسط بلند ہونا چاہیئے مگر ضرب قوت کے ساتھ ہو اور اگر ذوق شوق میں آواز زیادہ بلند ہو جائے تو مضائقہ نہیں"۔ چونکہ یہ سلوک کی ابتدا تھی اس لئے شیطان رخنہ اندازی شروع کرتا اور تذبذب میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتا تھا۔ کوئی کہتا کہ حضرت ذکر بالجہر سے تو شرم آتی ہے تو

فرماتے کہ بھائی یہ شیطانی وسوسہ ہے اس کو تعوذ دفع کرو اور ہمت کے ساتھ اپنے کام میں لگو۔ ایک خادم نے لکھا کہ حضرت ذکر بالجہر میں شہرت کا اندیشہ ہے کہ لوگ کہیں گے بزرگ ہو گئے اور ریا کا احتمال ہے اس لئے مناسب ہو تو ذکر خفی تعلیم فرمائیں۔ جواب تحریر فرمایا۔ انشاء اللہ شہرت اور ریا کا اندیشہ نہیں۔ اس زمانہ میں تو ایسے لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کا نام لیں۔ یا علم دین پڑھیں پاگل سمجھتے ہیں پھر ریا کا کیا موقع ہے۔ ریا تو ان افعال میں ہوتی ہے جو لوگوں کے نزدیک اچھے سمجھے جائیں ؎

کار کن کار بگذر از گفتار   کاندریں راہ کار آید کار

نیز فرمایا کرتے کہ ذکر باوضو ہونا چاہیئے بلکہ درویش سالک کو ہر وقت باوضو رہنا چاہیئے۔ اور اسم ذات ہو یا نفی اثبات اطمینان کے ساتھ خوب ٹھہر ٹھہر کر کرنا چاہیئے اور معنی کا بغور لحاظ رکھنا چاہیئے اور بہتر ہے کہ آخر شب میں اٹھکر تہجد کے بعد ذکر ہونا چاہیئے کہ برکت اور قبولیت کا وقت ہے اور طبیعت پر اس وقت سکون وانبساط بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ہاں کبھی عذر کی وجہ سے کبھی آنکھ نہ کھلے تو دن میں جس وقت موقع پائے پورا کرلے۔ وہ آخر شب میں اٹھنے کا خاص اہتمام کرے کہ سلوک کی پہلی سیڑھی یہی ہے۔ کسل کو پاس نہ آنے دے۔ ہمت کو بلند کرے کہ آنکھ کھلتے ہی اٹھ بیٹھے۔ جہاں کسمسایا اور خیال کیا کہ اب اٹھوں اب اٹھوں بس وقت ہاتھ سے گیا کہ پھر سوکر اٹھنے کی ہمت نہ ہوگی۔

سالک کو خواب نظر آتے تھے کہ حج کو جا رہا ہوں۔ بزرگوں کے مجمع میں بیٹھا ہوں۔ بغیر کشتی وجہاز کے سمندر عبور کر رہا ہوں۔ حرم شریف میں نماز پڑھ رہا ہوں۔ فرشتوں سے مصافحہ کر رہا ہوں۔ ہوا پر اڑ رہا ہوں۔ ایک قوت پرواز ہے جو زمین سے اوپر اٹھائے ہوئے خلا میں چلا رہی ہے یا مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یا اور کسی نبی کی زیارت ہوتی یا مثلاً باشنہ متبرکہ میں کسی مقام کی۔ تو ایسے تمام خوابوں پر آپ مبارک باد لکھتے

اور تحریر فرماتے کہ الحمد للہ حسنِ احوال کی علامت ہے۔ اور کوئی پریشان خواب لکھتا کہ سانپ پکڑے ہوئے ہوں یا شیر مجھ پر حملہ کر رہا ہے یا کتا بھونک رہا ہے وغیرہ تو اطمینان دلاتے کہ یہ سب شیطانی اثرات ہیں ڈرو مت۔ انشاء اللہ دفع ہو جائیں گے اور جب ایسا خواب دیکھ کر آنکھ کھلا کرے تو اعوذ پڑھ کر بائیں طرف تھو تھو کر کے کروٹ بدل لیا کرو۔" ایسے وحشت ناک خواب زیادہ تر اُن لوگوں کو نظر آتے تھے جو کسی نااہل پیر کی بیعت توڑ کر ادھر متوجہ ہوتے تھے۔ کیونکہ اُن کے ذہن کا یہ تخیل و اندیشہ کہ فسخ بیعت سے کوئی مصیبت نازل نہ ہو جیسا کہ متروک پیر غصہ ہو کر دعوٰی کے ساتھ کہہ رہا ہے اُن کے دماغ میں متخیل ہوتا اور پھر شیطان اس میں سہارا لگاتا اور حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے اس کی طلب صادق اور پختگی وہمت کا امتحان لیا جاتا تھا۔ پس ایسی صورت میں آپ اُس کا بہت زیادہ خیال رکھتے اور قلباً و جسداً لساناً و قلماً ہر طرح اس کو سنبھالتے اور پھسلنے سے بچایا کرتے تھے۔ یورپ کی ایک مسماۃ کو یہی صورت پیش آئی اور اتنی وحشت ناک خوابوں کا سلسلہ بندھا کہ خدا کی پناہ۔ حضرت سے تجدید کرتے ہی۔ کبھی خواب دیکھا کہ نجاست بھرے ہوئے سنڈاس میں کو گزر رہی ہوں۔ کبھی دیکھا گھر میں آگ لگ گئی اور جان بچا کر باہر جنگل کو بھاگ رہی ہوں۔ کبھی دیکھا الہ آباد کے اسٹیشن پر ریل کی منتظر ہوں مگر ریل آکر چلی گئی اور میں حیران پریشان بیٹھی رہ گئی وغیرہ وغیرہ۔ وہ بیچاری بلکہ دوسرے سننے والے بھی یہی تعبیر دیتے کہ فسخ بیعت کے وبال میں وصول الی اللہ سے محرومی ہوئی اور گندگی و آتش عذاب میں پڑ گئی۔ مگر اللہ رے استقلال۔ وہ یہی کہتی رہی کہ جو پیر عورتوں کے مجمع میں مُنہ کھول کر آئے اور پردہ نشین جوان مریدنیوں سے کہے کہ میرا مُنہ دیکھو تاکہ قیامت کے دن مجھے پہچان سکو تو وہ پیر بننے کے ہرگز قابل نہیں ہے۔ اگر بیعت کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کی محبت اور اس کے احکام کی تعمیل نصیب ہو تو پیر کا مریدوں سے زیادہ متبع شریعت ہونا ضروری ہے۔ پس یاد رکھو کہ پردہ کا حکم شریعت میں نہیں ہے

اور اگر یہ غلط ہے تو بے پردہ پیر ہرگز بیعت کے قابل نہیں ہے۔ کئی مہینے تک اس بیچارے کو یہ ابتلا رہا۔ آخر فضل الٰہی نے دستگیری کی کہ خواب دیکھا گھر میں آگ لگی اور گھبرا کر باہر نکلی۔ کوئی تعاقب کر رہا ہے کہ ہلاک کرے اور یہ بدحال پریشان بھاگ رہی ہے کہ جائے پناہ تلاش کرے۔ کچھ فاصلہ پر چند نورانی صورتیں نظر آئیں اور یہ ان میں گھس گئی کہ دشمن سے بچائیں۔ ایک بزرگ کھڑے ہوئے ہیں اور انہوں نے غصہ کے تیز لہجہ میں تعاقب کرنے والوں کو دھتکارا۔ وہ معدوم و فنا ہو گئے اور آنکھ کھل گئی۔ خواب ہی میں قلب پر وارد ہوا کہ یہ بزرگ مولانا گنگوہی تھے۔ بس وہ دن آفتوں کے ختم کا دن تھا کہ اس کے بعد نورانی خواب نظر آنے لگے اور قلب کا سکون بڑھتا چلا گیا۔

جن منتسبین کو آپ ہونہار پاتے ان کی طرف خصوصی توجہ فرماتے اور اولاد سے زیادہ ان کو محبوب سمجھتے تھے۔ حافظ فخرالدین صاحب کو بیعت کے بعد صرف تسبیحات بلا قید وقت وغیرہ پڑھنا تعلیم فرمایا اور حالات کی اطلاع دیتے رہنے کا حکم دیا۔ طبیعت میں استعداد پا کر کچھ ہی دنوں بعد نفی اثبات اور ایک ہزار بار اسم ذات کا ذکر تلقین فرمایا اور چار سال تک یہی چلتا رہا کہ بحمد اللہ کامیاب ہوئے اور مولوی محمد یحییٰ صاحب کے ہاتھ سے اجازت نامہ لکھوا کر بھیجدیا۔ اثنائے سلوک میں ان پر ایک خاص حالت حزن کی پیدا ہوئی کہ کھانے پینے سے بے رغبتی بڑھ گئی خوراک کم ہو گئی۔ طبیعت ہر وقت مضمحل رہنے لگی کہ بیوی سے بولنے کو دل چاہے نہ بچوں سے ہنسنے کو۔ دوستوں سے ملکر وحشت ہوتی اور اکیلے پڑے رہنے میں مزہ آتا۔ رونے کو دل چاہتا اور جنگل کی طرف نکل جانے کی طلب ہوتی تھی۔ ہر وقت طبع پر حزن کا غلبہ دیکھکر ماں کو پریشانی ہوئی اور ان کے والد نے حضرت کو لکھا کہ بچے کی ایسی حالت سے ماں بہت متفکر ہے۔ حضرتؒ نے ان کو جواب لکھدیا کہ چند روز کی مشقت ہے اس کا خیال نہ کریں۔ انشاء اللہ جلد کامیابی ہوگی اور یہ صورت نہ رہے گی۔ خود حافظ صاحب

نے اپنا حال بذریعہ تحریر پیش کیا تو آپ نے جواب لکھا مبارک حالت ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم متواصل الاحزان پس حزن خواہ اپنے نقصان پر ہو یا محبوب حقیقی سے مہجوری پر ہو یا خوف و رجا کی وجہ سے ہو بہرحال اچھا اور عمدہ ہے نیز ذاکر کا قلب جب ذکر کے ۔ تو منقبض ہو جاتا ہے تو لذائذ دنیویہ سے طبع میں افسردگی پیدا ہو جاتی ہے الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ نعمت میرے لخت جگر کو نصیب ہوئی" اس کے بعد جب آپ خورجہ تشریف لائے کہ حافظ صاحب وہاں اسٹیشن پر ملازم تھے تو مسرت کے ساتھ فرمایا حافظ جی تمہارے ساتھ تو ہمارا پرانا تعلق نکلا عرض کیا حضرت وہ کیسے؟ فرمایا تمہارے والد صاحب سے خط کتابت رہی اور معلوم ہوا کہ انہوں نے تو غدر سے پہلے مولانا مملوک علی صاحب سے تحصیل علم کیا ہے اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ میرے نانا تھے بعض خدام پر کشف زمانی و کشف کونی کا دروازہ کھلتا کہ رات کو واقعہ خواب میں دیکھا اور صبح کو اس کا ظہور بجنسہ ہو گیا مگر آپ اس کی مقصودیت کبھی ذہن میں نہ جمنے دیتے تھے بعض پر حقائق علمیہ کا انکشاف ہوتا اور طرح طرح کے نکات و دقائق احادیث و آیات قرآنیہ کے متعلق منکشف ہوتے تو آپ مبارک باد دیتے۔ مگر فرماتے کہ مقصود ابھی آگے ہے۔ کسی پر مخلوق سے وحشت اور خلوت کی محبت کا غلبہ ہوتا تو آپ سنبھالتے اور صحرا نوردی سے روکتے تھے مولوی لطیف احمد صاحب حضرت مولانا رائپوری سے بیعت تھے اور بچپن سے حضرت رائپوری کے زیر سایہ پرورش پائی تھی مگر طبیعت میں آزادی تھی کہ شرارتوں کی وجہ سے حضرت نے کئی بار سزا بھی دی آخر آوارہ گردی کی دھن میں وطن سے نکل پڑے اور برسوں بنگال کی طرف مارے پھرے کہ اسی درمیان میں حضرت رائپوری کا وصال ہو گیا اس مدت میں سیدوں پیروں کے پاس پہنچے اور سب ہی نے چاہا کہ مرید کریں۔ ایک بدعتی فقیر نے تو اتنا زور دیا کہ پچیس[۲۵] دن تک روکے رکھا اور جانے کی اجازت نہ دی مگر حضرت رحمہ کے انتساب کی برکت تھی کہ کسی حال میں نہ پھنسے اور آخر بیسویں دن شب کو چوری سے نکل بھاگے۔ اور اب گجرات کی

سیر و سیاحت شروع کی اس اثنا میں ایسے ناقابل بیان واقعات پیش آئے کہ عیاذاً باللہ ارتداد
کی طرف میلان ہوا اور ایک معزز یوروپین پادری کا رقعہ لے کر احمد آباد کے پادری
مسٹر مارٹن کے پاس جانے کی نوبت آئی۔ آخر معمولی میلان پر حضرتؒ سے بذریعہ
تحریر بیعت ہوئے تو کایا پلٹ گئی اور خود لکھتے ہیں کہ حضرتؒ کا روحانی تصرف
ہے جو آج یہ غلام مسلمان ہے ورنہ عرصہ سے کسی گرجا کا پادری بنا بیٹھا ہوتا
الحمد للہ کہ حضرت کی دعا سے میری تمامی دنیوی مشکلات کا خاتمہ ہو گیا ان کی بیعت
حضرت کے قیام ہندوستان کے اخیر زمانہ کی ہے اور بیعت کے بعد شاید حضرت
کی زیارت کا اتفاق راندیر میں ایک یا دو ہی دفعہ اور پھر آخری سفر حج کے وقت
حیدرآباد میں ہوا باقی جو کچھ تعلیم ہوئی وہ بذریعہ تحریر ہوئی اور اب ان کے احوال حسنہ
قابل مبارکباد ہیں۔ بے روزگاری سے ان کو پریشانی لاحق ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ
وساوس و خطرات کا ہجوم ہو کر ذکر کے اثر سے جنگل میں جا بیٹھنے کا شوق بڑھا تو حضرت نے تحریر
فرمایا تمہاری پریشانی اور بیکاری سے کلفت ہے حق تعالیٰ شانہ تمہارے لئے رزق کا باب مفتوح
فرمائے تمہاری پریشانیوں کو رفع فرمائے اور اہل وعیال کو صحت عطا فرمائے وساوس و
خطرات کا کچھ فکر نہ کریں۔ نہ اس کے دفعیہ کے درپے ہوں جب اطمینان قلب نصیب ہوگا
پھر سب خطرات رفع ہو جائیں گے جس وقت فرصت ہوا کرے مراقبہ کر لیا کریں جنگل میں
جا کر بیٹھنا اور کھانا پینا ترک کرنا راہبوں کا کام ہے اسلام میں یہ نہیں ہے۔ فقط والسلام۔

دوسرے خط میں تحریر فرمایا آپ التزام اور استقامت کے ساتھ اپنا
ورد اور وظائف پڑھتے رہیں اور پورے کرتے رہیں۔ کیفیات کے پیچھے نہ پڑیں
جنگل کے نکل جانے کا خیال صرف خیال ہی کے درجہ میں رہنا چاہیئے۔ البتہ کبھی
کسی وقت تفریح کے طور پر تھوڑی دیر کے لئے چلے جانے کا مضائقہ نہیں۔
ذکر جہار تو بیٹھ کر کرنا چاہیئے۔ مراقبہ کے لئے کوئی بیٹھک مخصوص نہیں ذکر اسم
ذات ایک ضربی کرنا چاہیئے۔ خواب میں حضرت گنگوہی کی زیارت موجب برکت
ہے۔ والسلام۔ رخصت کے وقت حضرت نے ان کو مشورہ دیا کہ عاشق الٰہی

کے ساتھ مراسلت رکھیں۔ انہوں نے شکایت کی کہ وہ تو جوابی خط کا بھی جواب نہیں دیتے۔ فرمایا تم نے کیسا پتہ لکھا تھا؟ عرض کیا خیر نگر دروازہ میرٹھ۔ فرمایا یہی تو خرابی ہے پتہ بھی غلط لکھا اور پھر خود بندہ کا پتہ تحریر فرما کر ان کے حوالے کیا اور فرمایا میرے لوگوں میں سب سے زیادہ انتظام جواب کا اسی کے ہاں ہے۔

لگی ہوئی ملازمت کا ترک آپ کو بالکل پسند نہ تھا اور کبھی اجازت نہیں دیتے تھے کہ خود کوئی ملازمت یا سلسلۂ معاش کو چھوڑ دے کہ کفران نعمت ہے اور اس کے وبال میں آدمی بہت پریشان ہوتا ہے۔ ذکر و شغل تو کیا نماز بھی اطمینان سے نصیب نہیں ہوتی "پراگندہ روزی پراگندہ دل" اسی طرح لوگ اپنے اہل وطن اور اعزہ کی طرف سے کوفت و کلفت پا کر خواہش کرتے کہ وطن چھوڑ کر دوسری جگہ جا رہیں تو یہ بھی آپ پسند نہ فرماتے اور لکھا کرتے کہ بھائی پریشانی سے دنیا میں کوئی بھی خالی نہیں ہے۔ پریشانیاں تو انسان کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں کہ جب تک انسان رہے گا پریشانیاں اس کے ساتھ رہیں گی اس لئے منہ سر لپیٹے پڑے رہو۔ اپنی طرف سے کہیں جانے کا خیال نہ کرو کہ باہر جا کر خدا جانے کن پریشانیوں میں مبتلا ہو گے مولوی لطیف احمد کو اہل بدعت کی طرف سے روحی تکالیف کے ساتھ بدنی تکلیف بھی پہنچی تو آپ نے کہا۔ السلام علیکم۔ آپ کی اور قاری نظام الدین صاحب کی تکلیف جو آپ صاحبان کو پہنچی موجب کلفت اور موجب مسرت ہوئی۔ کلفت تو اس وجہ سے کہ دوستوں کی تکلیف موجب کلفت ہوا ہی کرتی ہے۔ اور مسرت اس وجہ سے کہ جو کچھ تم صاحبوں کو تکلیف پہنچی ہے وہ فی سبیل اللہ تھی۔ تم نے حدیث میں دیکھا ہو گا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشت مبارک مجروح ہوئی تھی تو آپ فرماتے تھے هَلْ اَنْتِ اِلَّا اِصْبَعٌ دَمِيْتِ. وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا لَقِيْتِ۔ اہل اللہ کو یہ تکالیف قدیم سے اٹھانا پڑی ہیں یہاں تک کہ قتل تک ہوئے ہیں پس اگر ہم کو یا ہمارے دوستوں کو کوئی تکلیف پہنچے تو موجب مسرت ہونا چاہیئے۔ "میراث پدر خواہی علم پدر آموز" حضرت کی تحریر

مختصر مگر جامع اور ایسی بابرکت سیدھی سادی ہوتی تھی کہ دو فقروں میں بڑے بڑے مسائل دم چلے طے فرما دیتے تھے "تکلیف جسمانی ہو یا روحانی موجب کلفت بھی رہے ہے کہ اجر کا مدار اسی پر ہے اور شان تسلیم و رضا بھی مرتب ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ان دو اضداد یعنی رنج و خوشی کے ایک جگہ جمع ہونے کا عملی سبق آپ نے دو سطر میں پڑھا دیا۔ بعض سالکین پر بغض فی اللہ کا غلبہ ہوتا کہ وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ جن کو معاصی یا بدعقیدگی میں منہمک پاتے کوئی تعلق نہ رکھ سکتے تھے تو آپ اس کو اعتدال پر لانے کے لئے فرمایا کرتے کہ میاں خدا بن کر تو تم نہیں آئے۔ اس کی مخلوق ہے وہ جو چاہتا ہے ان سے کام لیتا ہے اللہ کی مشیت یہی ہے کہ کافر اور مومن۔ فاسق اور صالح سب اس دنیا میں آباد رہیں کہ شروع سے عالم کو اسی طرح چلایا ہے۔ نرمی و شفقت کے ساتھ ان کو سمجھاؤ کوئی نہ مانے تو یہ سمجھ کر کہ اللہ کی مشیت یوں ہی ہے چپ ہو جاؤ مگر قطع رحمی نہ کرو" خود مجھ پر یہ حالت گذری کہ اپنے خاندان کے بعض بزرگوں کو مبتلائے بدعات یا بے نمازی دیکھتا تو اندر ہی اندر گھٹا کرتا تھا کہ نہ زور کے ساتھ نصیحت پر قدرت تھی اور نہ اُن کی یہ غفلت ضبط ہو سکتی تھی۔ حضرت کو لکھا تو آپ کا والا نامہ آیا۔ "السلام علیکم۔ بقول رسول خداوند تعالیٰ جل و علیٰ شانہ نے دنیا میں کافر اور مسلم دیندار اور بددین حسن اور قبیح پیدا فرمائے اور ہر ایک کو لما خلق له کی طرف رغبت دی۔ تم کسی پر داروغہ کر کے نہیں بھیجے گئے۔ تم بقدر وسعت امر بالمعروف کے مامور ہو اور جب نہ کر سکو تو خدا کی مخلوق کو خدا کے حوالے کرو۔ پھر کسی کی حالت کا مشاہدہ آپ کے لئے کیوں سوہان روح ہے۔ دنیا میں جو چیز پیدا ہوئی ہے کتنی ہی قبیح ہو حکمت سے خالی نہیں ہے پھر قاضی شہر کے اندیشہ سے کیوں دُبلا ہو"

حضرت اپنے منتسبین کو نشست برخاست خواب بیداری دخول خروج یوں ہی از صبح تمام دن رات غرض ہر وقت اور ہر حال کے متعلق جو دعائیں

حدیث میں آئی ہیں ان کی مواظبت پر اہتمام کی تعلیم دیتے اور عادات میں بھی اتباع سنّت محمدیہ کے ہمہ وقت دھیان و لحاظ قائم رکھنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے کہ اس کی برکت سے محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت قلب میں پیدا ہوتی تھی۔ اور چونکہ آپ ہی دربار خداوندی کے فیوضات تقسیم فرمانے کا واسطہ و وسیلہ ہیں اس لیئے برکات محبوبیت کی بارش برسنے لگتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دوسرے پیدل یا بہلی میں یا تانگہ پر یا موٹر میں یا ریل پسنجر پر راستہ قطع کرتے تھے تو آپ کے منتسبین اُس میل ٹرین میں سفر کرتے تھے جس کا زبردست انجن آندھی کی طرح بیسیوں اسٹیشنوں کو چھوڑتا ہوا جاتا تھا کہ سوئے تھے وطن کے اسٹیشن پر اور آنکھ کھلی تو منزل مقصود پر کھڑے نظر آئے اور راستہ کا کوئی جنگل پہاڑ بستی باغ دریا جھیل شہر یا گاؤں کچھ بھی نظر نہ آیا۔

ہاں دوا کے ساتھ آپ کو پرہیز کا بہت اہتمام رہتا تھا کہ سب سے زیادہ آپ بدعت سے بچنے کی تاکید فرمایا کرتے اور سمجھاتے تھے کہ دوا کھا کر ضد کا استعمال کیا تو دوا کا نفع کیا خاک ہوگا۔ قلب کی ساری صلاحیت کا مدار ہے حق تعالیٰ کی محبت پر اور اس کا طریق صرف وہ ہے جو اس کے اپنے محبوب اکمل نے تعلیم و تعمیل کے ذریعہ زبان سے کہکر اور بدن سے کر کے مخلوق کو دکھا دیا۔ پس اس کے خلاف ذرہ برابر بھی دوسروں کی تجویز کو پسند کیا تو نہ وہ نور و برکت رہے گی جو سنّت محمدیہ پر موقوف تھی اور نہ وہ حصار و امن رہے گا جو معمولات محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہے پس بدعت کا ارتکاب تو بڑی چیز ہے اس کی رغبت اور قلب میں اس کی طرف سے وحشت کی کمی کو بھی سالک کے لیئے آپ سم قاتل فرماتے تھے کہ لاکھ دوائیں اور مقویات استعمال کرے مگر ساتھ میں ذرا سا سنکھیا کھالے تو انجام ظاہر ہے کہ مرنے سے بچ بھی گیا تو خشکی کا دوسرا مرض اتنا قوی ہوگیا جس کے سبب قوی دواؤں کا اثر بھی کمزور پڑ گیا اور اب معالجہ بھی مشکل ہوگیا۔ سالک جتنا بھی سنّت کے دامن سے چپٹے گا اسی قدر باران رحمت میں جوش آئیگا۔

اور جتنا اس سے قلباً یا جسداً ہٹے گا اسی قدر شیطان اس پر قابو پائے گا آپ کی تعلیم کا سارا راز ان دو حرفوں میں مستتر تھا کہ عادات ہوں یا عبادات اللہ کے محبوب کی ہر ادا کو دانتوں سے مضبوط تھامو۔ اس پر عمل کرو۔ اور محبت و شوق کے ساتھ عمل کرو کہ ہمارے اللہ کے محبوب پیغمبر کا طریقہ ہے۔ اس طرح اول محبوب کی محبت قلب میں آئے گی اور وہ پہنچائے گی محب یعنی اللہ جل جلالہ کی محبت تک۔ کہ اس کی وجہ سے شوق ہوگا اللہ کو راضی رکھنے کا اور طلب ہوگی مرضیات کی فہرست معلوم کرنے اور اس پر چلنے کی۔ لہذا شریعت کے علم اور عمل کا شیدا بن کر اپنی زندگی کے لمحات اسی حالت پر گزارے گا جو آفرینش بنی آدم کی غایت ہے اور جس کی تعلیم کے لئے آنحضرت روحی فداہ دنیا میں تشریف لائے تھے۔ اسی کا نام حیات طیبہ ہے اور یہی شریعت کی روح اور طریقت کا مقصود ہے۔

اعمال میں آپ کی نظر زیادہ ان امراض پر جاتی تھی جو وبائی بن کر عموم پھیلتا اور آندھیاؤں کی طرح نہ آگ دیکھیں نہ پانی سب کو مکدر و مغلوب بناتے چلے جاتے ہیں مثلاً سود دینا کہ سود لینے کو سب حرام سمجھتے ہیں مگر سود دینا اتنا آسان ہو گیا کہ معمولی ضرورت بلکہ خرافات اور حظ نفس میں بھی بے دریغ اس پر جھکتے ہیں کہ قلوب سے بھی اس کی حرمت و وحشت کا اثر جاتا رہا۔ لہذا آپ کسی کو سنتے کہ اس پر سود و قرض ہے تو بہت زیادہ تاکید فرماتے کہ اس بلائے بے درماں سے جہاں تک ممکن ہو جلد نکلو اور فاقہ کرو تنگی جھیلو ضروریات کو بند کرو مگر اس وبال سے کسی طرح نجات پاؤ جو شعلہ نار کی طرح سارے گھر پھوس کو ایک آن میں راکھ بنا چھوڑے گی۔ اسی طرح داڑھی کا منڈانا یا کتروانا کہ ایک مشت سے کم ہو جائے آپ کے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھا میں نے بارہا دیکھا کہ کوئی اجنبی آتا جس پر خفگی کا کوئی حق نہ ہوتا تو آپ اکراہ اس سے گفتگو کرتے اور گرانی کے سبب منہ پھیر لیا کرتے کہ ایسی حالت کا دیکھنا آپ کو برداشت نہ ہوتا تھا۔ کوئی ایسا شخص بیعت ہوتا تو سب سے اول اور سب سے زیادہ تاکید اسی کی ہوتی تھی کہ آئندہ کبھی داڑھی نہ کتروانا۔ اور کسی خادم کو اس کا مرتکب پاتے تو اول تیزی

سے اور پھر غصہ سے نصیحت فرماتے اور آخر تیسری بار صاف فرما دیا کرتے تھے کہ میرا تعلق داڑھی کے ساتھ ساتھ ہے۔ یہ رہے گی تو وہ بھی رہے گا اور یہ قطع ہے تو اسی وقت وہ بھی قطع ہے۔" نیز فرمایا کرتے کہ نصرانیت کا لباس داڑھی منڈانا یا کتروانا عورتوں کا مردانہ وضع سے انس کھڑا جوتا پہننا۔ پردہ میں کمی کرنا وغیرہ طاعون اور ہیضہ کی طرح وبا عام بن کر پھیلے ہوئے ہیں کہ جسے دیکھو اس مرض میں مبتلا ہے الا من شاء اللہ۔ ان کے نزدیک گویا داڑھی رکھنا شعار اسلام اور طریقہ محمدیہ ہی نہیں اور اسلام کی صورت سے بھی وحشت ہے۔ ایسی حالت میں محبت حق کا حصول ناممکن ہے۔ حضرتؒ کی تعلیم سالکین کے طبائع کی رعایت پر مختلف ہوتی تھی جو کسی ایک صورت میں محدود نہیں۔ اور اس کا مدار محض آپ کی حذاقت تشخیص اور فہم خداداد پر تھا کہ کسی کو چشتیت کی تعلیم فرمائی اور کسی کو نقشبندیت کی۔ کسی کو مراقبۂ صمدیت تلقین فرمایا کسی کو مراقبہ معیت۔ کسی سے ذکر کا کام زیادہ لیا کسی سے شغل کا۔ کسی کو اوراد زیادہ تعلیم کئے کسی کو محض ایام بیض کے روزے اور تہجد و اوابین و اشراق کے نوافل۔ مگر یہ امر مشترک سب میں ملحوظ رہتا تھا کہ عادات میں اور احوال مختلفہ کی ادعیۂ ماثورہ میں سنت کا اتباع اور خیال و دھیان ضرور رکھیں اور جادۂ شریعت سے چاول برابر بھی قدم نہ ہٹائیں۔ اور سالکین کے لئے تو تاکید تھی کہ صغیرہ گناہ کو بھی سانپ بچھو سمجھیں اور گنجائش چھوڑ کر عزیمت پر عمل کریں۔

حافظ فخر الدین ریلوے ملازم تھے اور اکثر ریلوے ملازمین کو بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی عادت ہے۔ آپ ان کو سفر میں ساتھ لیتے تو ٹکٹ دینے کے دروازہ پر پہنچ کر آپ ان کو آگے بڑھاتے کہ چلو اور اس طرح نظر ڈالا کرتے کہ ٹکٹ لیا تھا یا نہیں۔ خدام کو ساتھ کھانا کھلاتے تو دیکھا کرتے کہ پانی کا برتن سیدھے ہاتھ میں اور کس طریق سے لیا یا سکون و آرام کے ساتھ۔ چائے پلاتے تو نظر رکھتے کہ پیالی داہنے ہاتھ سے اٹھائی یا بائیں سے۔ بہرحال یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ حضرت کے متوسلین کو کیا کیا تعلیم ہوئی۔ عوام سے زیادہ آپ کی طرف علماء اور اہل ذوق کا رجوع ہوا کہ اس جماعت کے ایک محقق

کی اصلاح گویا ہزاران ہزار کی اصلاح تھی ۔ اس لئے آپ کی نسبت عبدیت کا وہ
نور جو آپ کی پیشانی میں چمک رہا تھا اُن قلوب کو زیادہ کھینچتا تھا جو ایک قوم
کے مقتدا ہیں یا آئندہ بننے والے ہیں ۔ نیز آپ کی توجہ زیادہ تر اپنے مرشد مولانا
گنگوہیؒ کے اُن متوسلین کی طرف زیادہ مبذول ہوئی جن کا کسب ناتمام رہ گیا تھا یا
صرف بیعت ہو کر اس کے ثمرات سے ناآشنا تھے ۔ اور ان کی تکمیل کو آپ اپنے
اُوپر منجملہ حقوق شیخ سمجھ کر واجب الاداء سمجھے ہوئے تھے ۔ حضرت کے یہاں کوئی رجسٹر نہ تھا
کہ مریدین کے نام لکھے جاتے اور صحیح شمار ہو سکتی ۔ مگر جہاں تک مجھے علم ہے اطراف ہند
میں حضرت کے منتسبین بڑی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں اور آخر زمانہ میں تو اتنا رجوع بڑھا
کہ ایک دفعہ میں کئی کئی سو کو آپ نے اس طرح بیعت کیا کہ عمامہ دُور تک پھیلا دیا اور
طالبین اس کو پکڑتے چلے گئے ۔ جو سفر بھی آپ کا ہوا جہاں آپ نے دینی مدرسہ کی
بقا اور زائرین کی تعلیم دین کا نفع اس سے اٹھایا وہیں سلسلۂ روحانیہ کی تخم ریزی
بھی فرمائی اور بدعات و معاصی سے توبہ کرا کے اتباع سنت پر جمے رہنے کا عہد
لیا ۔ پھر جس نے کسب کرنا چاہا اس کو تعلیم دی ورنہ برکات دخول سلسلہ سے مالامال ضرور
کر آئے چنانچہ حاجی محمد یوسف صاحب کی دعوت پر آپ رنگون تشریف لے گئے تو ان کی
درخواست پر پورا رمضان وہاں گذارا اور دس بارہ تاجر داخل سلسلہ ہوئے جن
میں محمد ابراہیم ملا سیٹھ ابراہیم محمد متی اور محمد جیوا کڑوا صاحب قابل ذکر ہیں ۔
میرٹھ دہلی کا تذکرہ گلاؤٹھی وغیرہ کا تو پوچھنا ہی کیا کہ بارہا تشریف لانا ہوا اور حضرت
کی جوتیوں کے صدقے اچھے اچھے پھلدار درخت پیدا ہوئے ۔ ہاں میوات کا منظر جو
آپ کی سکونت ہند کے آخری سال کا آخری نظارہ تھا ضرور قابل ذکر ہے ۔ جو
قصبۂ نوح کے سیدھے سادے مسلمان باشندوں محراب خاں اور نصر اللہ خان پٹواری
نے لکھکر بھیجا ہے یہ طویل وعریض علاقہ میو قوم سے آباد ہے جو مسلمان ضرور ہیں
مگر جہالت اور مذہبی ناواقفیت کے سبب ان کو مسلمان کہنا مشکل ۔ کوئی عالم اس
علاقہ میں گیا بھی تو تقدیر سے بدعتی اور زر پرست کہ گاؤں کے گاؤں مرید کئے مگر

کسی مرید کو اس سے زیادہ بیعت کا کوئی مقصد ہی معلوم نہ ہوا کہ جب چھٹے چھ مہینے پیر کا
دورہ ہوا تو ہر مرید نقد نذرانہ لے کر حاضر ہو گیا اور پیر کی نذر قبول کر لینے کو جنت کی
قیمت سمجھ لیا کہ جو چاہے کروں اور جہاں چاہے رہوں۔ اوّل مولانا محمد صاحبؒ نے
اور پھر ان کے بھائی مولانا محمد الیاس صاحب نے اپنی مخلصانہ توجہ اس کی اصلاح اور
ظلمت جہالت دور کرنے کی طرف مبذول کی اور بحمد اللہ برسہا برس کے بعد اس ملک
میں جو علم دین کے نام سے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھتا تھا جگہ جگہ مکاتب قرآن مجید کھل
گئے اور نوعمر بچے ان میں پڑھنے کو آنے لگے۔ حضرت وہاں کی حالت سن کر ہمیشہ مسرور
رہتے اور قلبی توجہ سے اندر ہی اندر کام لیتے ہوئے مولانا محمد الیاس کو تاکید فرماتے
رہتے تھے کہ اس طرف توجہ بڑھاتے رہیں۔ آخر جب آپ نے ہندوستان چھوڑنے
کی دل میں ٹھان لی تو باوجود ضعیف اور علیل ہونے کے آپ نے میوات جانے کا عزم
کیا اور تشریف لے گئے۔ یہ ایک قدرتی کشش تھی کہ آپ کا پہلا سفر اور انجان لوگوں
میں جانا مگر مخلوق آپ کا نام ہی سن کر زیارت کے شوق میں گھروں سے نکلی تو یہ عالم تھا
کہ قصبہ نوح ہی کے نہیں بلکہ گرد و نواح کے دیہات اور دور دور کے ہندو مسلمان بچے
اور جوان ہزاراں ہزار کی تعداد میں گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور اس شوق
میں کہ پہلے ہم زیارت کریں بستی سے باہر سڑک کے دونوں طرف قطار باندھ کر دور
تک پرے باندھ لئے۔ حضرت کی موٹر وہاں پہنچی تو حضرت اتر لئے اور مخلوق پروانہ
وار گری تو خدام کو اندیشہ ہوا کہ حضرت گر نہ جائیں مگر اللہ رے ہمت سبھی سے آپ نے
مصافحہ کیا اور آگے بڑھے۔ کہ دس ہزار کی گویا تپ پیچھے تھی اور ہر شخص کی زبان پر بے اختیار
یہ لفظ جاری تھے واہ واہ پیر کیا ہیں فرشتہ ہیں۔ دل چاہتا ہے اس نور کے مکھڑے کو دیکھے
ہی جاؤ۔ پیر بہت دیکھے مگر ایسا موہنا پیر کبھی نہیں دیکھا۔ جمعہ کا دن تھا نماز ہوئی تو مسجد
اندر باہر سے لبریز۔ چھت ساری پُر۔ راستے دور تک بند کہ کبھی سارے ملک کو یوں دیکھا نصیب
نہ ہوا تھا۔ نماز کے بعد وعظ شروع ہوا اور حضرتؒ قیامگاہ پر تشریف لے آئے کہ واعظ
مرعوب نہ ہو۔ دل کے دل وعظ چھوڑ کر حضرتؒ کے پیچھے ہو لئے کہ یہاں تو وعظ میں یہ مزہ

نہیں آتا جو پیر کی صورت دیکھنے میں آتا ہے کہ نور کی شعاعیں نکل رہی ہیں گلاب کا پھول کھلا ہوا مہک رہا ہے خدا جانے کتنی دیر کا مہمان ہے ـ بس پیر کی تو صورت دیکھتے ہی جاتے پھر دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو ـ پھر اس بیشمار مخلوق نے الٹی پلٹی باتوں کی اپنی گنواری زبان میں پوچھ گچھ جو شروع کی تو سننے والے پریشان ہوتے جاتے تھے مگر حضرتؒ ہر بات کا جواب مسکرا کر دیتے اور ان کی دل لگتی دلیل سے ان کو سمجھاتے تھے۔ آخر بیعت کا وقت آیا تو ایک پر ایک گرتا اور ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ سعادت سب سے اوّل مجھے حاصل ہو۔ مگر صد ہا کا مجمع اور حضرتؒ کے دو ہاتھ اس لیے عمامہ دور تک پھیلا دیا گیا اور ایک کافی نہ ہوا تو دوسرا اور تیسرا عمامہ اس میں باندھ دیا گیا اور دو طرفہ صف اس کو تھامے ہوئے دُور تک چلی گئی ـ تب حضرت نے خطبہ پڑھا اور آیت ان الذین یبایعونک تلاوت فرمائی ـ پھر سب کو بیک زبان کلمہ طیبہ پڑھا کر ایمان کی تجدید کرا کے توبہ کرائی کہ کہو عہد کیا ہم نے کفر نہ کریں گے ـ شرک نہ کریں گے ـ بدعت نہ کریں گے چوری نہ کریں گے زنا نہ کریں گے جھوٹ نہ بولیں گے کسی پر بہتان نہ دھریں گے ـ پرایا مال ناحق نہ کھائیں گے اور کوئی گناہ چھوٹا ہو یا بڑا ہرگز نہ کریں گے اور اگر ہو جائیگا تو فوراً توبہ کریں گے ـ بیعت کی ہم نے خاندان چشتیہ میں نقشبندیہ میں قادریہ میں سہروردیہ میں خلیل احمد کے ہاتھ پر ـ یا اللہ ہماری توبہ قبول فرما اور ہم کو اپنے نیک بندوں کی جماعت میں محشور فرما ـ اس طرح دو مرتبہ میں تقریباً ایک ہزار میواتی داخل سلسلہ ہوئے اور ایک ہی نظر کیمیا اثر میں نماز روزہ کے پابند اور اتباع سنت پر اتنے پختہ کہ جان جائے مگر ایمان نہ جائے ـ

حضرتؒ کی نسبت میں کشش بہت تھی ـ بارہا تجربہ ہوا کہ حضرتؒ نے کسی کو سہارنپور میں یاد کیا اور فوراً ہی اس کے دل میں حاضری خدمت کے لیے بے چینی و اضطراب پیدا ہوا ـ مولانا عبداللہ صاحب مرحوم بعض دفعہ رات کو تھانہ بھون میں اٹھے اور سہارنپور چلنے کی تیاری کی ـ لوگ کہتے کہ ریل نہیں مل سکتی کہ صرف دس منٹ باقی ہیں اور اسٹیشن دو میل ہے ـ مگر فرماتے کہ مجھے جانا ضروری ہے ریل ملے یا نہ ملے ـ مگر ریل مل جاتی

اور واپسی پر احباب دریافت کرتے تو فرماتے کہ حضرت نے یاد فرمایا تھا اسلئے قلب میں بے چینی پیدا ہوئی اور اسی وجہ سے ریل مل جانیکا مجھے پورا وثوق بھی تھا، چنانچہ حضرت نے دیکھتے ہی فرمایا میں تو یاد ہی کر رہا تھا" حاجی محمد خاں مرحوم خورجوی جو گھوڑوں کی تجارت کے سلسلہ میں کابل گئے اور امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم کی ملاقات سے مشرف ہوئے تھے کہتے تھے کہ میں خورجہ میں تھا کہ دفعۃً قلب پر تقاضہ ہوا بلند شہر چل ہر چند اس تقاضہ کو رد کیا مگر بے سود ہوا آخر اسٹیشن پر آیا اور مجھے اپنے اوپر مرض کا شبہ ہوا کہ آخر اخراج سفر کس لیے کر رہا ہوں اور بلا وجہ یہ تقاضا کیوں ہے؟ معلوم ہوتا ہے مجھے مراق ہو گیا یا ہونے والا ہے ۔ اسی اُدھیڑ بن میں ریل پر سوار ہو کر بلند شہر کے اسٹیشن پر اترا۔ دیکھتا ہوں کہ ایک بنچ پر حضرت اور مولانا محمود حسن صاحبؒ بیٹھے ہیں۔ میرا دل خوش ہوا کہ خیر یہ سفر بیکار نہ گیا۔ پاس آکر حضرتؒ سے مصافحہ کیا تو مسکرا کر فرمایا میں تو تمہیں یاد ہی کر رہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی یاد نے تو مجھے ایسا مضطرب بنایا کہ مجھے اپنے دماغ پر مرض کا شبہ ہو گیا تھا۔ اور اگر اس وقت جناب نہ ملتے تو مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا" مولوی ظفر احمد صاحب اپنے بالائی حجرہ میں بیٹھے مشغول ذکر تھے کہ دفعۃً نیچے آنے کا دل پر تقاضا ہوا۔ ذکر ملتوی کر کے نیچے آئے تو دیکھتے ہیں کہ حضرت کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ عرض کیا حضرت کیا مجھ سے کچھ ارشاد فرمانا ہے؟ فرمایا ہاں ذرا چارپائی بچھا دو میں لیٹوں گا کچھ تعب سا معلوم ہوتا ہے" ایسے واقعات صدہا ہیں اور یہی قوت تھی جو سالکین و منتسبین کو منجذب کرتی اور بہت اپنے رنگ میں رنگ لیا کرتی تھی۔

ہمت بھی حضرت کی بہت عالی اور عزم اتنا قوی تھا کہ دنیوی معاملات میں بھی آپ جو ارادہ کر لیتے اُس سے ہٹتے نہ تھے تو اور دینی امور بالخصوص تربیت سالکین میں تو آپ کی توجہ اور ہمت ایک بڑی چیز تھی کہ قوی تر انجن بن کر ہزار ہا من بوجھ سے لدی ہوئی بیسیوں گاڑیوں کو یکدم محرک بنا دیتی اور آن کی آن میں کہیں کا کہیں پہنچا دیا کرتی تھی مگر اس کا تعلق صرف انہیں سے ہے جنکو اس کی ضرورت ہوئی اور انہوں نے شاہد کیا

بمبئی میں سیٹھ محمد عمر صاحب کہ بچپن سے آزادی لئے ہوئے تھے وطن سے نکل کر ایسی خرافات میں مبتلا ہوئے کہ ان کے عزیزوں کو پہچاننا مشکل تھا کہ ہندو ہے یا مسلمان۔ تمام بمبئی میں لچوں اور شہدوں کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی کہ عزت آبرو والے ڈرتے تھے۔ جس کے چاہا سر بازار جوتے مار دیئے اور پولیس بید اگھبراتی تھی کہ اوباشوں کا بڑا جتھہ زیر فرمان تھا۔ آخر جب وقت آیا اور حضرت سے مرید ہوئے تو ایک ہی نظر تیر کا کام کر گئی اور مسجد کا ملّا بنا دیا۔ ہر شخص حیران تھا کہ یہ محمد عمر وہی ہے جو پہلے تھا یا کوئی دوسرا ہے۔

وہ لوٹ پوٹ ہی دیکھا نگاہ کی جس پر کسی کے بس کا ترا تیر بے کماں نہ ہوا

آپ کے متعلق کوئی خواب دیکھتا یا مکاشفہ بیان کرتا تو آپ تواضع کے مضمون سے اس کو ٹال دیتے تھے۔

مولوی حبیب احمد نانوتوی نے خواب دیکھا کہ حضرت مجھے بیدوں سے مار رہے ہیں کہ میں دو دو گز پرے جا پڑتا ہوں اور پھر مار کا مزہ لینے قدموں میں آپڑتا ہوں صبح کو حضرت سے خواب عرض کیا تو فرمایا ہاں بھئی کام کسی کا اور نام کسی کا۔ حضرت رحمہ کو حاضرین کے خواطر و وساوس پر بھی بہت جلد اطلاع ہو جاتی تھی ایک مرتبہ آپ مولوی عبداللہ جان کے پاس جانے لگے اور مولوی ظفر احمد صاحب کو ساتھ لیا۔ راستہ میں ان کے قلب میں یہ خطرہ گذرا کہ حضرت ایسے جنٹلمینوں کے پاس از خود کیوں تشریف لے جاتے ہیں۔ اگر وہ التجاء و درخواست کرتے تو مضائقہ بھی نہ تھا۔ فوراً ان کی طرف متوجہ ہو کر حضرت نے فرمایا مولوی عبداللہ جان کا دل بہت اچھا ہے گو ظاہر دنیادار وں جیسا ہے۔ مولوی ظفر احمد صاحب پر یہ سنکر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سہوارنوی حضرت رحمہ کے سفر حج سے قبل حاضر خدمت ہوتے تو خیال ہوا کہ سلسلات کی اجازت حضرت مجھے بھی عطا فرما دیتے۔ حضرت نے ادھر منہ کر کے فرمایا مولوی حبیب الرحمٰن تم بھی طلبہ میں جا بیٹھو سلسلات کی اجازت لے لو۔ خوشی سے پھولے نہ سمائے مگر ساتھ ہی خیال ہوا کہ صحاح کی اجازت بھی مل جاتی تو حضرت نے پھر متوجہ ہو کر فرمایا۔ صحاح کی بھی اوائل سنا دو اجازت دے دونگا۔ دوسری خوشی ہوئی مگر تکدر ہوا کہ کوئی

شناسا بھی نہیں کتابیں کس سے مانگوں تو تیسری بار حضرت نے ادھر رُخ فرمایا اور کہا جاؤ کتب خانہ سے کتابیں لے لو، سچ ہے بن مانگے موتی ملیں اور مانگے ملے نہ بھیک۔ فرحاں و شاداں اٹھے اور حسب مُراد اجازت حاصل کی۔

حضرتؒ ابتدا بیعت میں سائل کی طلب کا امتحان ضرور لیا کرتے اور چونکہ روحانی نفع کا مدار اسی طلب پر ہے اس لئے جب تک فراست و وجدان سے اس کا اطمینان نہ فرمالیتے اس وقت تک بیعت نہ کرتے تھے۔ بارہا دیکھا کہ کسی کو حضرت نے درخواست کرتے ہی بیعت فرمالیا اور بعض کو مہینوں ٹالا اور یہی جواب دیا کہ تھانہ بھون جاؤ یا یہ کہ رامپور جاؤ۔ آخر معلوم ہوا کہ حقیقۃً اسکو تذبذب تھا اور جب تو حید مطلب حاصل ہو کر یک درگیر محکم گیر کا مضمون حاصل ہوا اسی وقت حضرت نے بیعت فرمالیا۔ سیّد شیر محمد صاحب نے کہ خلیفہ ہیں مولانا تھانوی کے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت یہ پیرزادے اور مولوی اکثر محروم کیوں رہتے ہیں؟ فرمایا پیر زادے تو باپ کے بعد اپنے کو پیر سمجھ بیٹھتے ہیں اور مولوی تحصیل علوم کر کے عالم خاص ہو جاتے ہیں کہ آئندہ کسی شے کی ضرورت نہیں سمجھتے حالانکہ جب تک بزرگوں کی جوتے سیدھے نہیں کئے تب تک حالت نہیں بنتی۔

علم محض آلہ و ذریعہ ہے عمل کا اور عمل کے بعد ایک درجہ ہے حال کا۔ کہ عمل کو اعضاء بدن سے تعلق ہے اور حال کو قلب سے کہ عمل کا محرک قلب ہو اور یہ نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ حق تعالیٰ کی محبت و عظمت قلب میں راسخ اور جاگزین نہ ہو جائے یہ جس طرح بادام میں ایک پوست ہے کہ محافظ ہے گری کا مگر گری کے اندر ایک روغن ہے کہ گری سے مقصود وہی ہے۔ اسی طرح علم اگرچہ صورت عمل ہے مگر عمل سے بھی مقصود صرف وہ حال ہے جو عمل میں اپنا گھلا ملا ہے جیسے گری میں تیل۔ کہ وہ نہ ہو تو چھلکا جلانے کے قابل ہے اور گری پھینک دینے کے قابل۔ چونکہ عمل کا روغن یعنی شوق و اخلاص اور حلاوت و حسن نیت سلوک کے بغیر نصیب نہیں ہوتا اس لئے علماء کو خانقاہوں میں معیت و اکتساب کی ایسی ضرورت ہے جیسے پڑھنے کے بعد گننے کی اور سیکھنے کے بعد مشق و تمرین کی۔ ورنہ ایم اے پاس کرنے والا بھی تعلیمی یا تجارتی یا صنعتی کام میں نہ گھُل مل سکتا ہے نہ بے تکلف کھلکر آزادانہ اس کو انجام دے سکتا ہے۔ مگر علماء یا تو علم ہی کو مقصود بالذات

سمجھ لیتے ہیں کہ عمل کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اور آگے بڑھے بھی تو بس عمل کو کافی سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ابھی ان کو آخری درجہ اور طے کرنا ہے جو سب میں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر علم موجب وبال ہے اور عمل پوست بےمغز کی طرح ردی و بےکار۔ اور جب اس کی ضرورت ہی ذہن میں نہ ہو تو طلب نہ ہوگی اور طلب کے بغیر قوی النسبت شیخ کے بیٹے اور بیوی کو بھی کچھ نہیں ملا اجنبی کو دس بیس سال رہنے سے تو کیا مل سکتا ہے۔ ہاں عورتوں کی بیعت میں اتنی طلب کا آپ امتحان نہ لیتے بلکہ ادنیٰ درخواست پر بیعت فرما لیا کرتے تھے کہ صنف ضعیف ہے اور مردانہ تعلق و تصنع سے خالی۔ یا کوئی مبتلائے بدعات ہوتا تو اس کے اظہار طلب پر بھی آپ زیادہ کرید نہ ہوتی تھی کہ مبادا بدک نہ جائے اور سلسلہ میں جکڑ بند ہو جانے کے بعد سیدھا ہو جانے کی توقع غالب ہوتی ہے۔ ایک بار سالانہ جلسہ کا موقع اور مہمانوں کے کثیر مجمع کا اژدحام تھا مگر دیکھا کہ آپ گھبرائے ہوئے ایک شخص کو تلاش فرما رہے تھے کہ فلاں کہاں ہے وہ بیعت ہونے کو کہتا تھا۔ عادت کے خلاف اس الٹی طلب و تلاش پر دیکھنے والوں کو حیرت بھی ہوئی مگر بعد معلوم ہوا کہ ان کی عمر بدعات میں گذری تھی چنانچہ بیعت ہو کر ان کی کایا ہی پلٹ گئی کہ خود متبع سنت ہو کر اکثر اہل خاندان کو متبع سنت بنا چکے

بیعت کے بعد عموماً آپ نماز باجماعت کی پابندی کا حکم فرماتے کہ معراج المومنین یہی ہے اور قلب میں سب سے اول اسی کا تخم جمتا ہے جو چند روز بعد ایسا سایہ دار مضبوط درخت بنتا ہے جس کے نیچے ہزارہا پیادہ و سوار آرام لیتے ہیں۔ پھر داڑھی وغیرہ کے متعلق کوئی عملی ضعف یا کسی بدعت میں ابتلا کا اعتقادی نقص ہوتا تو اس کی تصریح فرما کر نصیحت کرتے اور ہر امر میں اتباع شریعت کا لحاظ رکھنے کی تاکید فرما کر ہر نماز کے بعد کچھ وظیفہ پڑھنے کو بتلاتے تھے۔ مثلاً یہ کہ فجر و مغرب کے بعد سو سو مرتبہ کلمہ تمجید اور ظہر کے سو مرتبہ لاحول اور عصر کے بعد تین تسبیح درود شریف اور عشا کے بعد سو مرتبہ استغفار۔ نیز فرائض پنجگانہ کے بعد تسبیح فاطمہ اور کم سے کم ایک پارہ قرآن مجید کی روزانہ تلاوت اور حزب الاعظم کی ایک منزل کہ حزب الاعظم سے آپ کو خاص محبت تھی اور اس کی مواظبت کو بہت زیادہ موجب برکت سمجھتے تھے۔ کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان

مبارک سے نکلی ہوئی دعائیں ہیں جن میں آپ نے ہر خوبی اپنے اللہ سے مانگ لی اور
ہر عیب و مضرت سے پناہ چاہ لی ہے۔ نہ اس سے زیادہ جامع کوئی دعا ہے نہ اس سے
زیادہ کسی دوسرے کی تصنیف کی ہوئی دعا یا درود میں حسن ادب اور مقبولیت و
حلاوت پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر اگر مرید عالم ہوتا تو تہجد و اوابین کی نوافل بنا کر علم دین
کی تعلیم یا دوسری طرح اشتغال بالعلم کی تاکید فرماتے۔ کہ تدریس اور دماغ کا بہترین
شغل ہے اور یہی اس کے سلوک کا طریق بن کر صورتِ نشان حضور ہو جاتا تھا۔ وزنہ
دوازدہ تسبیح ذکر بالجہر یا اس کے مناسب مزاج آپ کا نورِ فراست جو کچھ بھی تجویز
کرتا وہ اس کو خوب سمجھا کر تلقین فرماتے تھے۔ ہاں اس تلقین میں کہ تربیت و اکتساب
کہلاتا ہے پھر دوبارہ آپ طلبِ صادق کو جانچتے تھے کہ طلب کے بغیر مداومت و التزام
نہیں ہو سکتا اور پھر بتایا بے سود اور بچوں کا کھیل بنا جاتا ہے۔ مولوی محمد زکریا صاحب
نے ایک مرتبہ کسی مخلص دوست کے متعلق حضرت سے عرض کیا کہ فلاں کو حضرت کے ساتھ
محبت ہے مگر اس نے کچھ کرنا شروع نہیں کیا۔ حضرت اس کو کچھ تلقین فرمائیں۔ بیساختہ
فرمایا وہ کچھ پوچھے بھی یا یوں ہی بتلا دوں؟ عرض کیا حضرت سے اس کو تعلق ضرور ہے مگر
یا شرم و حجاب مانع ہے یا بے توجہی اور جب تعلق ہے تو حضرت از خود ہی ارشاد فرمائیں
تب آپ نے تیز لہجہ میں فرمایا میں تو نہیں بتاتا تم بتلا دو۔ عرض کیا حضرت توبہ توبہ میں کیا
بتا سکتا ہوں۔ ارشاد ہو تو اسے لکھ دوں کہ پوچھے۔ فرمایا اپنی طرف سے جو چاہو لکھو
میری طرف سے نہیں۔ چند روز بعد مولانا عبدالقادر صاحب سے کہ حضرت مولانا رائپوری
کے خلیفہ و جانشین ہیں اور حضرت کے ساتھ وہی محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے ہیں جو
حضرت کے منتسبین کو حضرت کے ساتھ ہے اسی قسم کا تذکرہ آ گیا تو فرمانے لگے کہ مولوی
صاحب مجھے تو اسکی بڑی غیرت ہے کہ بلا طلب کے بتلاؤں۔ کسی کو دس دفعہ غرض ہو تو پوچھے
ورنہ میری پاپوش سے۔ مگر ان باوا بیٹوں کا یہ اصول ہے کہ دوسرے ایسے تیسے کے
مرید ہو جاؤ۔ مولوی زکریا نے چونکہ حضرت کی بے انتہا شفقتوں میں پرورش پائی تھی اور
تعلیق میں تو حضرت کے گویا قوتِ بازو اور ہاتھ کا قلم یا آنکھوں کی روشنی ہی تھے اس لئے
حضرت ان کو بہت ہی پیار کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عرض کیا کہ حضرت جب اس کو اپنے

ساتھ تعلق ہو تو کیا مقتضاء تعلق یہ نہیں کہ اس کی خیر خواہی کی جائے؟ فرمایا میں منع تھوڑا ہی کرتا ہوں۔ بھئی اپنا اپنا اصول ہے۔ اس کے بعد مولانا کو خطاب فرما کر اپنے داماد کی بیعت کا قصہ سنایا کہ میں ایک دفعہ محمد یامین کو ساتھ لے کر گنگوہ حاضر ہوا اور عرض کیا کہ محمد یامین حضرت سے بیعت ہونا چاہتا ہے۔ حضرت نے کچھ اعراض فرما کر کہا خود بہکا کر لائے ہو گے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت تب مجھے تو اس امر میں اتنی غیرت ہے کہ اشارۃً بھی کسی سے یہ کہنا گوارا نہیں کہ حضرت کی طرف توجہ کرو۔ میرا شیخ تو آفتاب ہے لاکھ دفعہ کسی کا جی چاہے حاضر آستانہ ہو ورنہ جہاں چاہے بھٹکتا پھرے۔ بہلانے پھسلانے سے مجھے تو بڑی عار آتی ہے۔ طلب اور تلقین کے تمامی مراحل جب طے ہو جاتے اور سالک اپنا کام شروع کر دیتا تب تو آپ کی توجہ و شفقت کی کچھ انتہا نہ رہتی تھی۔ اب تک تو وہ طالب تھا اور آپ مطلوب مگر اکتساب میں لگ جانے کے بعد آپ طالب بنتے تھے اور سالک کو مطلوب سمجھتے تھے۔ توجہ کی یہ صورت کہ سالکین آنکھیں بند کر کے گردنیں جھکا کر شیخ کے گرد بیٹھیں اور شیخ اسی طرح بیٹھ کر اپنے خیال سے ان کے قلوب پر اثر ڈالے آپ کو پسند نہ تھا۔ مگر اصل توجہ کہ آپ سالک کا خیال دل میں رکھتے اور ہمت و عزم سے اسکی مدد فرماتے قریب و بعید دونوں حال یکساں تھا۔ ہاں خاص حالت میں اپنے پاس بلا لیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ چند روز میرے پاس رہو۔ اور اس کا نفع بس وہی سمجھتا ہے جس کو یہ مبارک وقت نصیب ہوا۔

مولانا عبد اللہ مرحوم کے قلب پر اثناء سلوک میں ایک غیر اللہ کا تعلق مستولی ہو گیا کہ شرم کے مارے حضرت سے عرض نہ کر سکے اور وہ اندر ہی اندر اپنا کام کرتا رہا کہ جنون کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ آپ نے مجبور کیا کہ تھانہ بھون چھوڑ کر سہارنپور تعلیم کریں۔ چنانچہ وہ آئے اور ان سے حضرت نے کچھ کام نہ لیا کہ کام کے قابل ہی نہ رہے تھے خود تصرف و ہمت سے مدد فرمائی کہ قلب سے کائی سی پھٹتی چلی گئی اور ایک مہینہ نہیں گذرا تھا کہ گویا ان کو ہوش آ گیا اور قلب بالکل خالی ہو کر محبت الٰہیہ سے معمور ہونے لگا۔ بدنظری اور امرد یا اجنبی عورت سے محبت کا تعلق آپ کو بہت گراں گذرتا تھا اور سالک کو اس سے بچنے کی بہت ہی زیادہ تاکید فرماتے تھے کہ یہ جب قلب کو گھیر لیتا

ہے تو پھر کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔

مولوی کفایت اللہ صاحب سابق مدرس مدرسہ اسلامیہ میرٹھ حضرت مولانا محمود حسن صاحب سے بیعت تھے اور گنگوہ میں پرورش پائی تھی۔ مولانا جس زمانہ میں مالٹا تھے ان پر اثناء ذکر و شغل میں ایک کیفیت پیدا ہوئی کہ خودکشی کی رغبت ہوتی تھی مگر کر نہ سکتے اور اس وجہ سے ایسے ضیق میں مبتلا تھے کہ مرجانا بہتر سمجھتے تھے انہوں نے حضرت کی خدمت میں خط لکھا اور مدد چاہی۔ حضرت نے حسب عادت انکسار کا جواب لکھا جس میں یہ فقرہ بھی تھا حیرانم کہ بچہء دہقان را چہ کار سپردند

صلاح کار کجا و من خراب کجا ! ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

مجھے ایسے کام کے لئے اہل کیوں سمجھ لیا وغیرہ وغیرہ۔ آخر یہ میرٹھ سے دیوبند گئے اور وہاں سے تھانہ بھون کا ٹکٹ لے کر سہارنپور پہنچے۔ اتفاق سے تھانہ بھون کی گاڑی نہ ملی اور مجبوراً مدرسہ مظاہر علوم میں آ گئے۔ بعد نماز ظہر حضرت سے ملے تو حضرت نے محبت کے ساتھ پاس بٹھا لیا اور جب حاضرین چلے گئے تو ان کی طرف خطاب فرمایا کہ تم نے کیا لکھا تھا مجھے تعجب ہوا کہ جانتے بوجھتے تم ایسی بات لکھو بھلا میں اس کا اہل کہاں؟ مولوی کفایت اللہ صاحب نے جرأت سے کام لیا اور کہا کہ حضرت اگر کوئی کہے کہ آپ اہل نہیں تو یہ آپ پر نہیں بلکہ حضرت گنگوہی پر اعتراض ہے کہ انہوں نے آپ کو خلیفہ کیوں بنایا۔ آپ یقیناً اہل ہیں اور حضرت گنگوہی کے خلیفہ ہیں۔ چونکہ میں نے اسی دروازے پر پرورش پائی ہے جہاں سے آپ کو سب کچھ ملا ہے اس لئے میرا فرض تھا کہ اپنا دکھ درد عرض کر دوں۔ اس پر حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر پوچھا کہ اب کیا حالت ہے؟ عرض کیا کچھ نہیں۔ بعد عشا مکمل شفقت حال سنا اور ذکر دوازدہ تسبیح میں کچھ ترمیم فرما کر ارشاد فرمایا کہ حضرت گنگوہی کے یہاں ایک شخص کو یہی حالت پیش آئی تھی تو حضرت نے بھی یہی بتایا تھا جو میں نے بتایا ہے۔ یہ کہیں کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات مل جائے کہ درس تدریس میں لگیں چھوڑا اس ذکر شغل کو جس میں جان سے عاجز ہو گیا اور حضرت اصرار فرمائیں کہ گھبراؤ مت ذکر شغل جاری رکھو اور کرتے رہو جو کر رہے ہو۔ یہاں تک کہ جب مکان تشریف لے جانے لگے تو فرمایا کتب خانہ کے

سامنے والے کمرے میں پچھلی رات کو بیٹھ کر اتنے زور سے بارہ تسبیح کرتا کہ میرے گھر تک آواز جاوے۔ پھر صبح کو نماز فجر کے بعد ارشاد ہوا کہ یہاں حجرہ سے باہر مراقب ہو کے بیٹھ جاؤ۔ مولانا لکھتے ہیں کہ اس وقت کی کیفیت ذکر میں نہیں آسکتی کہ اندر بیٹھے کیا کر رہے تھے۔ مجھے اپنا قلب زخمی نظر آتا تھا کہ جیسے اس میں پیپ پڑ گئی ہے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ حضرت اپنے دست مبارک سے اس کو صاف فرما رہے ہیں۔ بعض دفعہ میں چونک پڑتا اور پھر مراقب ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ بعد اشراق حضرتؒ حجرہ سے باہر تشریف لائے اور درس کے لئے تشریف لے چلے تو مجھے ساتھ لیا اور بخاری شریف کا سبق ہونے لگا۔ سبق میں مجھے وہ کیفیت نظر آئی کہ پھر نصیب ہونا مشکل ہے میرا دل چاہتا تھا کہ حضرت تقریر کو طول دیں اور اس کے لئے حضرت کو چھیڑنے کی ضرورت تھی لہذا میں نے الٹے سیدھے سوالات شروع کر دیئے پھر کیا تھا گویا سمندر میں تلاطم آگیا۔ حضرت نے ایک سوال کے کئی کئی جوابات دینا شروع کئے اور بعض دفعہ یہ بھی فرمایا کہ اس جواب کو کتابوں میں مت تلاش کرنا کہ یہ جواب کتابی نہیں ہے۔ بعض دفعہ میں اشکال پیش کرتا تو اس کا جواب دے کر فرماتے دوسرا اشکال اور ہے جس سے شراح نے تعرض نہیں کیا اور اس کے بعد وہ اشکال اور پھر اس کا جواب خود ارشاد فرماتے غرض وہ حال جاتا رہا اور طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا تو میں نے عرض کیا کہ میں نے ٹکٹ تھانہ بھون کا لیا تھا فرمایا اچھا جاؤ مگر واپسی میں کم از کم ایک دن یہاں کے واسطے رکھنا کہ ابھی خامی باقی ہے۔ چنانچہ واپسی میں بجائے ایک دن کے میں نے دو دن حضرتؒ کے پاس قیام کیا اور جو خامی مجھے محسوس نہ ہوتی تھی وہ محسوس ہونے لگی کہ جب نماز فجر کے بعد حضرتؒ کے حجرہ کے باہر مراقب ہو کر بیٹھتا تو معلوم ہوتا کہ قلب میں کوئی چیز بھری جا رہی ہے جس سے دل میں سکون و قوت اور راحت معلوم ہوتی۔ غرض اول حاضری میں زخم قلب کو آلائش سے پاک صاف فرمایا اور دوسری میں زخموں کو مندمل کیا اور آئندہ مرہم پٹی سے مستغنی و بے نیاز بنا دیا۔ اللہ جزائے خیر دے حضرتؒ کو کہ میری ایسی دستگیری فرمائی جس کا شکریہ تمام عمر ادا نہیں ہو سکتا۔

حضرتؒ اپنی قوت قلبیہ کے تصرف کو بہت کم کام میں لاتے اور خاص ضرورت ہی کے وقت صرف فرمایا کرتے تھے۔ سہارنپور میں اہل اسلام اور آریہ کا مناظرہ ہوا جو موضع رو پڑی سے منتقل ہو کر سہارنپور آیا تھا۔ حضرت شریک جلسہ تھے اور مسلمانوں کی طرف سے فریقین کی تقریروں کو قلمبند کرنے کے لئے مولوی کفایت اللہ اور مولوی احمد اللہ صاحب تجویز ہوئے تھے مگر مولوی احمد اللہ تھک گئے تو صرف مولوی کفایت اللہ صاحب نے اس خدمت کو انجام دیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ مجلس مناظرہ میں آریوں کی طرف ایک جوان خوبصورت گیروے کپڑے پہنے ہوئے سادھو تھا جو آرام کرسی پر لیٹا رہتا اور جب مسلمانوں کے مقرر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو وہ گردن جھکا کر بیٹھ جاتا تھا۔ مقررین اسلام کی تقریریں نہایت پراگندہ اور خراب ہو رہی تھیں حتیٰ کہ مولانا عبدالحق حقانی سے دور و تسلسل کی تقریر بھی نہ ہو سکی۔ تو میں نے صدر جلسہ مرزا عزیز بیگ کو ایک پرچہ پر لکھ کر دیا کہ مسلمانوں کی طرف سے جب مناظر تقریر کرنے کو کھڑا ہوتا ہے تو یہ جوگی اثر ڈالتا ہے۔ لہٰذا مولانا خلیل احمد صاحب کو اس کی اطلاع دے دو۔ صدر جلسہ نے یہ پرچہ پڑھ کر حضرتؒ کی طرف سرکا دیا اور حضرت نے پرچہ پڑھتے ہی گردن جھکا لی کہ دونوں حق و باطل میں تصرف قلب کی جنگ ہونے لگی۔ دو منٹ بھی نہ گذرے تھے کہ وہ سادھو بیقرار ہو کر آرام کرسی سے اٹھا اور میدان جلسہ سے باہر چلا گیا۔ پھر کیا تھا مسلمانوں کی وہ تقریریں ہوئیں کہ گویا دریا کا بند کھل گیا اور حالانکہ اس مناظرہ میں بہت کچھ بے عنوانیاں ہوئی تھیں مگر نتیجہ یہ نکلا کہ گیارہ آدمی مشرف باسلام ہوئے۔ اسی دن دوپہر کو کھانا کھانے میں حضرت نے فرمایا اس کا تو مجھے یقین تھا اور ہے کہ اسلام غالب رہے گا۔ الحق یعلو ولا یعلیٰ مگر حق تعالیٰ کی شان بے نیاز ہے اس کا خوف ہر وقت اور ہر بشر کو ہے۔"

سالانہ جلسہ سے فارغ ہو کر باہر کے مہمان رخصت ہوئے پنجاب جانے والی گاڑی پہلے آتی اور اس طرف کے مہمان گاڑی میں سوار ہوتے۔ گاڑی میں ایک سادھو بیٹھا تھا جو ہردوار سے آ رہا تھا اسٹیشن پر ازدحام دیکھ کر اس نے دریافت کیا کہ یہ بھیڑ

کیسی ہے؟ حضرت کے خادم نے جو اس گاڑی میں سوار ہوئے تھے جواب دیا کہ میاں سہارنپور میں ایک بڑے بزرگ شیخ ہیں سب لوگ مختلف اطراف سے انکی زیارت کو آئے تھے اور اب اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو رہے ہیں۔ وہ حضرتؒ کے حالات پوچھنے لگا اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ کہتے تھے کہ کچھ دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ قلب پر ایک غیر مانوس اثر اور دباؤ پڑ رہا ہے جس کا ظاہری سبب کوئی معلوم نہیں ہوتا اور دل اندر سے گھبراتا اور اڑان ہوا جاتا تھا۔ حیران تھا کہ دن ہے رات نہیں مجمع ہے تنہائی نہیں۔ ریل کا ڈبہ کچا کھچ بھرا ہوا ہے ..... جنگل یا بیابان نہیں ہے۔ پھر یہ وحشت و پریشانی کیوں ہے کہ طبیعت آپے سے نکلی جاتی ہے اور زبان گنگ اور سُن ہوئی جاتی ہے۔ اسی پریشانی میں تھا کہ دفعتہً حضرت کی شبیہ نظر آئی اور اس کا عکس دل پر پڑنا شروع ہوا اور اشارہ ہوا کہ پڑھو حسبی اللہ ونعم الوکیل چنانچہ زبان گنگ تھی مگر دل نے اس کا ورد شروع کیا اور گھبراہٹ و اضطراب کے بادل چھٹنا شروع ہو گئے۔ چند منٹ میں وہ کیفیت جاتی رہی اور قلب کو سکون نصیب ہوا۔ کان میں آواز آئی سادھو کہتا ہے واقعی تمہارے گرو بڑے کامل اور بہت زور والے ہیں۔ اس وقت میں سمجھا کہ یہ اثر ڈال رہا ہے اس لئے میں نے کہا بس تم میں اتنی ہی ہمت تھی ذرا کچھ کر کے دکھایا ہوتا۔ وہ کھسیانا ہو گیا اور منہ موڑ کر بیٹھ گیا کہ پھر بات تک نہیں کی۔ ہاں اپنی توجہ و خیال طالب سالک کی طرف بڑھانے کے لئے کہ گھڑی کو چلانے کی غرض سے گویا کوک دینا ہے آپ سالک کو تاکید فرمایا کرتے تھے کہ جلد جلد خط بھیجتے اور حالات کی اطلاع دیتے رہو۔ بلکہ اگر کسی کے خط میں معمول ٹلتا تو خود ابتداء فرماتے اور شکوہ لکھتے کہ تم کو اس کا خیال نہیں ہوتا کہ مجھے انتظار رہتا ہے آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ حضرتؒ کو اپنے ہوئے نسخہ میں تبدیلی کی ضرورت پیش نہ آتی تھی یا پہلی ہی مرتبہ تشخیص کامل کے بعد وہ تعلیم فرما دیتے جو آخر تک چلتا اور مقصود کی شان پیدا کر دیتا تھا ورنہ درمیان میں ایک دو مرتبہ خفیف سا اضافہ فرما دیتے تھے اور آخر تک اس کا نباہ کراتے تھے۔ حضرت کے تعلق میں تعداد اور برکت بہت زیادہ تھی کسی کا کوئی مشغلہ ملازمت و صنعت بشرطیکہ خلاف

شریعت نہ ہوا آپ نے کبھی نہیں چھڑایا۔ نوکری نہیں چھوڑنے دی۔ بیوی بچوں کے ساتھ محبت میں کمی نہیں آنے دی کھانا پینا کم نہیں کرایا چلہ کشی کبھی نہیں کرائی جنگل یا دریا کے کنارے کبھی نہیں بھیجا۔ دماغ میں خشکی کبھی نہیں آنے دی اور طاقت سے زیادہ بوجھ کبھی نہیں ڈالا۔ بلکہ ہمیشہ ان صورتوں سے منع کیا یہاں تک کہ اپنے پاس رہنے پر بھی کبھی زور نہیں دیا ہمیشہ بہت ہلکا کام بتایا کہ تمامی تعلقات مباحہ بحال رکھتے ہوئے بشاشت کے ساتھ انجام پا جائے۔ مگر اس کا ثمرہ اتنا کثیر دیکھا کہ برسہا برس مجاہدوں میں پڑنے والے بھی وہ بات نہ پا سکے۔ آپ کے سلسلہ میں نہ وجد و حال کی دھوم دھام تھی نہ گریہ و بکا کا شور و غل نہ مکاشفات کا ورود تھا نہ واردات کا صدور۔ گویا سالک آنکھیں بند کئے ریل میں بیٹھا ہوا مقصود کی طرف جاتا اور خود اس کو بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں اور کہاں پہنچ گیا۔ آپ کے تعلیمی اصول صرف دو تھے کہ امراض قلب میں ہر مرض کے مستقل علاج کی اس زمانہ میں فرصت نہیں رہی لہٰذا سہل طریقہ یہ ہے کہ سالک کے قلب پر ذکر اللہ کو غالب کر دیا جائے تاکہ محبت حق میں مغلوب ہو جائے اس سے تمام رذائل اور اخلاق ذمیمہ خود بخود جاتے رہیں گے کیونکہ محبت کا خاصہ ہے کہ جب دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے تو سب چیزوں کو مغلوب کر دیتی ہے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

اس اصول کا خلاصہ یہ تھا کہ جنگل کی جھاڑیوں کو درانتی سے کاٹنا دشوار بھی ہے اور مہینوں کا دھندا ہے۔ آسان تدبیر یہ ہے کہ چلتے ہوئے انجن سے ایک چنگاری آگ کی پھینک دو کہ سارے جھاڑ جھنکار بلکہ ان کی جڑوں میں رہنے والے سانپ بچھو بھی بھک سے اڑ جائیں گے۔ مگر اس کے لئے ضرورت ہے دو باتوں کی ایک یہ کہ جھاڑیاں خشک ہوں تاکہ آگ قبول کریں۔ دوم چنگاری والا انجن تیز رفتار ہو کر چھا پھینکتا چلا جائے اور اتنے یہاں کا میدان صاف ہو دوسرے جنگل پر جا کر آتش برسائے۔ پس اخلاق ذمیمہ کی تازہ شاخوں میں خشکی تو ذکر اللہ سے آتی تھی مگر آتش محبت آپ کے اس قلب پر پڑتی تھی جو محبت الٰہیہ کی انگیٹھی بنا ہوا تھا اور اس ویسے طالب کو آپ کے قلب میں اپنا تعلق بٹھاتا اور آپ کا جوش محبت میں ہمت و عزم

پر متوجہ ہونا ضروری تھا۔ اور جتنا اس میں وقت صرف ہوتا اسی قدر حصول مقصود میں توقف ہوتا تھا۔ دوسرا اصول یہ تھا کہ ذکر اللہ سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے جو ذاکر کو خود بخود معاصی سے متنفر اور طاعات کا شائق و راغب بنا دیتا ہے۔ کیونکہ معصیت سے اس نور میں کمی آتی ہے لہذا وہ اس سے گھبراتا اور کتراتا ہے اور طاعت سے اس میں ترقی ہوتی ہے لہذا وہ اس سے مانوس ہوتا اور اس کی طرف جھکتا ہے۔ گویا طاعت اسکی غذا بن جاتی ہے اور معصیت سم قاتل اور زہر ہلاہل۔ مگر اس ذکر میں جبتک لذت نہ آئے اس پر مواظبت نہیں ہو سکتی۔ اور لذت پیدا ہونے کی آسان صورت یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑا جائے اور عادات روزمرہ میں بھی آپ کے اتباع کا خیال رکھا جائے اور اوقات مختلفہ میں جو دعائیں آپ نے تعلیم فرمائی یا خود پڑھی ہیں ان کا دھیان اور ورد رکھا جائے۔ اور ہمہ وقت اس کا اہتمام رہے کہ میری کوئی حرکت و سکون سنت کے خلاف نہ ہو۔ تو محبوب رب العالمین کے ساتھ قلب کا یہ تعلق ذکر اللہ میں حلاوت و برکت پیدا کرے گا اور اس طرح پر سالک الذاکرین اللہ کثیرا میں داخل ہو کر ہمہ وقت اللہ کی یاد میں رہے گا۔ کریم کے دروازے پر جا ہوا فقیر انشاء اللہ خالی ہاتھ واپس نہ آئے گا۔ خصوصاً جبکہ مقبولین و محبوبین کی طرف منسوب اور ان کا نام لیوا بن کر یہ سمجھکر بیٹھا ہو کہ ملے یا نہ ملے مگر اس دروازے سے ٹلونگا نہیں کیونکہ یہاں سے اٹھا تو دروازہ ہی کون سا ہے جس پر جا کر پڑوں یا کچھ ملنے کی امید رکھوں۔" مگر اس پر دارا اور جماؤ کے لئے بھی کبوتران حرم سے وابستگی اور آستانہ حق پر جمنے والے شیخ سے چپٹا رہنے کی ضرورت ہے کہ اسی کا نام توحید مطلب اور حب شیخ و تعلق مع الشیخ ہے ؂

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد   دست برپائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

پانی سے بھرے ہوئے نل سے پانی حاصل کرنیکی صرف ایک صورت ہے کہ اپنا نل نیچا کر کے اس نل سے اتنا چپکا دیا جائے کہ سارا پانی نل ہی میں آوے۔ کہ بغیر بندش تام کے سارا پانی نل میں نہ آسکےگا ادھر ادھر نکل جائے گا اور نشیب اس لئے ضروری ہے کہ بلند بلکہ مساوی سطح پر بھی پانی کا ٹھہرنا اس کی طبیعت کے خلاف ہے۔ پس اس روحانی فیضان کے لئے آپ بیعت کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ اس کے بغیر طالب ہر جائی بنا رہتا ہے اور

اس کو وہ یکسوئی نہیں ہوتی جو ایک پاکدامن شریف عورت کی طرح اس کا یقین دلاتے کہ
میں زبردست محتاج ہوں اور بجز شوہر کے دوسرے مرد کی طرف آنکھ اٹھانا بھی مجھے
حرام ہے۔ ہاں مطلق صحبت کا فیضان ہر وارد و صادر کو پہنچتا تھا کہ بارش برستی ہے تو
اس کی خنکی اپنے اور غیر ہر شخص ہی کو محسوس ہوتی ہے۔ پس اگر کسی نے بدون بیعت کے آپ
سے تعلیم و تلقین ذکر کی درخواست کی تو آپ نے بیساختہ جواب دیا کہ یہ طریقہ مولانا اشرف
علی صاحب کا ہے تم تھانہ بھون چلے جاؤ۔ اسی اصول پر آپ نے حضرت گنگوہی کے منتسبین
کو بھی اکثر تجدید بیعت کے بعد ہی ذکر و شغل تلقین فرمایا۔ البتہ ان کی طرف توجہ سے زیادہ
کام لیا کہ ان کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔

طالب اگر شجرہ مانگتا تو آپ اکثر دے دیا کرتے مگر فرمایا کرتے کہ وظیفہ نہ بنانا کبھی
کبھی دعا میں توسل اہل اللہ یا حصول برکت کے لئے پڑھ لینا۔ مستورات کو آپ اکثر ذکر و
شغل تعلیم نہ فرماتے بلکہ نماز پنجگانہ کے اہتمام اور اتباع شریعت کی تاکید فرما کر ایک پارہ کی
تلاوت ایک منزل حزب الاعظم اور نماز کے بعد تسبیح فاطمہ اور کلمہ تمجید و لا حول و درود شریف
و استغفار کی تسبیحات تعلیم فرماتے اور فرمایا کرتے کہ شوہر کی اطاعت بچوں کی تربیت خانہ
داری کا انتظام خود طاعت ہے۔ اللہ کا حکم سمجھ کر رسول کے طریقہ کے موافق اس کو انجام دو
یہ بھی بہت کچھ ہے۔ پھر کوئی اضافہ چاہتا اور اس کو فرصت و فراغت دیکھتے تو تہجد و
اوابین اور اشراق کے نوافل بتاتے اور اس پر بھی کوئی اضافہ چاہتا اور اس کی طبیعت میں
مناسبت اور امور خانہ داری سے بہت مہلت متحقق فرماتے تو ذکر دوازدہ تسبیح اور پاس
انفاس تعلیم فرما دیا کرتے تھے۔ محض اتنی تعلیم پر اُن کے قلوب میں شریعت کی عظمت اور
شارع علیہ السلام کی محبت حق تعالیٰ کی مرضیات سے رغبت اور معاصی سے نفرت پیدا
ہو جاتی تھی کہ اصل ایمان ہے۔ مستورات میں صوفی کرم حسین صاحب کی لڑکی کو البتہ حضرت
نے تفصیلی طریق پر سلوک طے کرایا اور اس پر حالات و واردات بھی بہت زیادہ طاری ہوتے
جن کی نگہداشت میں حضرت نے خاص اہتمام فرمایا۔ چونکہ واردات سالک ذکر میں لانے کی
چیز نہیں اس لئے بیان کرنا فضول ہے اور ان کو چھوڑتا ہوں۔

اثنائے سلوک میں آپ کی عام تعلیم و نگہداشت مقصود پر نظر قاصر رکھنے کے متعلق ہوتی

تھی۔ کہ سالک اِدھر اُدھر نہ بھٹکے۔ چند امور جن کو نصائح سلوک کہنا چاہیئے اپنی یادداشت
اور حافظ فخر الدین صاحب کے خطوط سے ملخص کر کے درج کرتا ہوں۔ چونکہ شب کے
وقت خلوت اور سکون حاصل ہوتا ہے اس لئے ذکر و شغل کے لئے رات کا وقت بہتر
ہے۔ اگر کسی کو رات کا وقت نہ ملے یا کبھی رات کو کسی ضروری کام یا سو جانے کی وجہ سے
وظیفہ رہ جائے تو دن میں پورا کر لے کہ عبادت کے لئے رات دن سب برابر ہیں۔ جعل
اللہ لکم اللیل والنہار خلفۃ لمن اراد ان یذکر او اراد شکورا۔ تلاوت کلام اللہ چلتے
پھرتے لیٹے بیٹھے ہر حال میں درست ہے۔ مگر کلام مجید کو بغیر وضو نہ چھوئے اور حالت ناپاکی
میں زبان سے بھی نہ پڑھے۔ بیٹھے ہوئے پڑھنے میں بہتر ہے کہ گھٹنے سکیڑ لے۔ برہنگی کی حالت
میں نہ پڑھے۔ ہاں درود شریف وغیرہ ناپاکی کی حالت میں بھی پڑھنا درست ہے۔ سالک
کو حلال لقمہ اپنے پیٹ میں پہنچانا چاہیئے تاکہ نورانیت پیدا ہو۔ اور حرام بلکہ مشتبہ سے بھی
پرہیز کرنا ضروری ہے کہ ظلمت پیدا ہوتی ہے۔ ہدیہ و تحفہ صرف ان لوگوں کا قبول
کرنا چاہیئے جو محبت یا دینی تعلق غرض جائز وجہ سے پیش کرتے ہوں اور ایسے لوگوں سے
نہ لینا چاہیئے جو منصب اور عہدہ ملازمت کی وجہ سے یا ناجائز ضرورت پورا کرنے
کو دیں جنکی آمدنی کا بیشتر حصہ حرام یا مشتبہ ہو اُن کی دعوت وغیرہ بھی قبول نہ کرے۔ مگر
بلاوجہ مسلمانوں کے حالات میں تجسس بھی نہ چاہیئے۔ قبض کی حالت پیدا ہوا ہو تو
امیدوار رحمت بن کر توبہ و استغفار اور خشوع و خضوع کے ساتھ گریہ و زاری میں
مشغول ہو اور اپنے مولیٰ کریم سے توفیق طلب کرے اور نا اُمید نہ ہو۔ بحالت بسط ہر
وقت شکر نعمت ادا کرتا رہے کہ ازدیاد نعمت شکر نعمت کے ساتھ وابستہ ہے لئن
شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید۔ مراقبہ کی حقیقت نگہداشت
ہے کہ حضور کے ساتھ قلب کو خطرات ماسوای اللہ سے خالی و محفوظ رکھنا یہ جو شکل آنکھیں
بند کر کے اور گردن جھکا کر کیا جاتا ہے اور عرف میں اسی کو مراقبہ سمجھا گیا ہے صرف مبتدیوں
کو عادت ڈالنے کے لئے ہے کہ یکسوئی سے مناسبت ہو جائے۔ اور پھر رفتہ رفتہ
جب طبیعت معتاد ہو جاتی ہے تو وہ کیفیت مراقبہ قائم ہو کر ہمہ وقت جاری رہتی
ہے اور کسی وقت منقطع نہیں ہوتی۔ مراقبہ میں حق تعالیٰ کی صفت کا انضمام اس لئے

کرتے ہیں کہ اس صفت کے لحاظ سے اسکی عظمت اور اس کے ساتھ محبت قلب میں
راسخ ہو جائے۔ ورنہ آخر میں ایک بے کیف حضور رہ جاتا ہے جسکو نسبت سلسلہ کہتے
ہیں۔ سالک[9] کو پاکی اور طہارت کا بہت خیال رکھنا چاہیئے۔ بلکہ ہمیشہ باوضو رہنا چاہیئے
کہ سوتا بھی باوضو ہو۔ غیر جنس سے اختلاط ہرگز نہ رکھنا چاہیئے بجز اس کے کہ اس کی
اصلاح کی نیت سے ہو بشرطیکہ اس کی حالت زود اصلاح محسوس ہو اور اس اختلاط
میں اپنا کوئی قول یا فعل خلاف شرع سرزد نہ ہو۔ ورنہ علیحدگی[10] اختیار کرلے اور
ایسے مضر اختلاط سے سخت پرہیز کرے۔ جو عبادت[11] تھوڑی ہو مگر خلوص اور مداومت
کے ساتھ ہو وہ اس کثیر عبادت سے جو خلوص یا مداومت کے ساتھ نہ ہو بدرجہا بہتر
ہے کہ عبادت و ریاضت کی تمامی برکات وابستہ ہیں خلوص اور مداومت کے ساتھ
تصور[12] شیخ کی مطلق ضرورت نہیں اور اس میں تکلف اور آورد مضر ہے۔ جب مرید
کو شیخ کے واسطہ سے استفادہ ہوگا تو خود اس کی محبت سالک کے قلب میں پیدا
ہو جائے گی۔ اور یہ محبت ہو گی تو شیخ کا تصور و خیال خود آئے گا اصل شے
جس کا نفع ہے وہ محبت ہے اور تصور اس کا فرع غیر اختیاری۔ ورنہ محض تصور
بجائے مفید ہونے کے بسا اوقات مضر ہوتا ہے۔ تہجد[13] کی نفلوں کا اہتمام بہت
زیادہ کرنا چاہیئے کہ شعار صالحین ہے اور روحانیت کے لئے بیحد مفید۔ اگر شب
میں فوت ہو جائیں تو بعد طلوع آفتاب بارہ رکعت ادا کرلے۔ اور تہجد کے وقت اٹھنے
کا اطمینان ہو تو وتر بعد نوافل تہجد ادا کرے ورنہ بعد عشاء۔ مگر رمضان میں بعد تراویح
جماعت کے ساتھ پڑھنے چاہئیں۔ اور دنوں میں ان کو جماعت سے ادا نہ کرے۔
سالک[14] کو اپنے دل اور دماغ کی صحت کا زیادہ خیال کرنا چاہیئے کہ ان کو تقویت
پہنچانا بہ نیت تقویت فی العبادت خود عبادت ہے۔ اور اس کی طرف توجہ نہ کرنے
سے پھر انسان نہ دنیا کے کام کا رہتا ہے نہ دین کے کام کا۔ طریقت[15] سے مقصود یہ
ہے کہ دنیا و مافیہا کی طرف سے بے رغبتی ہو اور اللہ و رسول کی محبت دل میں جا
گزیں ہو۔ بس اس سے ادھر یا ادھر نظر نہ ہٹانا چاہیئے۔ کیفیات[16] و حالات ہر سالک
کو پیش آتے ہیں مگر جس قدر زیادہ صحابہ کرام کے حالات سے مطابقت ہو گی اتنے ہی

مامون ہوں گے۔ اور جتنی دُوری ہو گی اسی قدر پر خطر اور سلامتی سے دور ہوں گے۔ کشف[17] القبور اور کشوف کو ہم ہرگز قابل التفات نہیں کہ سب اطفال سلوک کے کھیل ہیں۔ اکثر پُرخطر اور قاطع راہ مقصود ہو جاتے ہیں۔ علم[18] کی فضیلت اسی لیے ہے کہ مورثِ عمل ہے۔ اور عمل اس لئے مطلوب ہے کہ وہ مورث حال ہے اگر نصیب نہ ہوا تو نہ عمل مفید کہ منافقین بھی کرتے بلکہ مسلمانوں سے زیادہ کرتے تھے اور نہ علم مفید کہ آخر شیطان کو بہت کچھ نصیب تھا اور حدیث میں ہے کہ عالم بے عمل دوزخ میں جائے گا۔ کہ اس کی آنتیں چکی کی طرح اس کے گرد گھومیں گی۔ سالک[19] کے لئے دو چیزیں سخت مُضر ہیں۔ بد[1]عت سے تعلق اور نعمت[2] الٰہیہ کا کفران۔ پس جسے ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ نصیب ہو تو منعم کا انعام سمجھ کر جُھک جائے اور ہزاراں ہزار شکر ادا کرے کہ بشر سا ناپاک اپنے خالق برتر کی پاک درگاہ میں نام لینے کے قابل بنا۔ اور وہاں اس کا تذکرہ ہوا کہ فاذکرونی اذکرکم۔ اللہ[20] والوں سے لپٹا رہے اور ان کی محبت دل میں ہو تو انشاء اللہ خاتمہ کبھی خراب نہ ہوگا۔ اور دل میں اگر اللہ والوں سے بغض ہوا تو خاتمہ خراب ہونے کا بہت اندیشہ ہے اس لئے کچھ بھی نہ کرے تو محض دخول سلسلہ بھی نفع سے خالی نہیں۔ علوم[21] دینیہ کی تدریس اور خدمت تعلیم بھی طرق وصول الی اللہ سے ہے کہ طرق وصول ایک شے میں منحصر نہیں۔ مگر اہل اللہ کے قواعد کا پابند ہونے کی حاجت ضرور ہے کہ بغیر روحانی تعلق کے محبت کا حصول دشوار ہے اور برکت بھی دخول سلسلہ ہی میں ہے۔ انسان[22] کی حالت ہر وقت یکساں نہیں رہتی۔ کبھی بحالت ذکر قلب میں سرور و انبساط ہوتا ہے۔ کبھی گرمی محسوس ہوتی ہے کبھی مزہ آتا اور دل لگتا ہے اور کبھی کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ طبیعت اُچاٹ ہوتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ نہیں اصل خیر و برکت ذکر کی مداومت میں ہے۔ یہ کسی حال نہ چھوٹنا چاہیے۔ اور غلامی کا امتحان بھی اسی میں ہے کہ بندہ خدا بنے بندۂ لذت نہ بنے۔ سب[23] کچھ کرے مگر اپنے کو متقی و کارگزار کبھی نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے فلا تزکوا انفسکم۔ اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے برّہ نام بھی پسند نہیں فرمایا۔ جب[24] کوئی اپنا بڑا اور بزرگ ناخوش ہو تو اس سے عاجزی اور خوشامد کرے

اور اس کا ذل اپنے ہاتھ میں لیوے چھوٹے اور بڑے میں یہی فرق ہے جو شخص
اس کے خلاف عمل درآمد کرے گا دینی یا دنیوی نقصان اٹھائے گا۔ شانِ حضور اور
اور اتباع سنّت میں جتنی ترقی ہوگی اسی قدر قرب الٰہی بڑھے گا اور برکت ہوگی۔

مولانا صادق الیقین کے بھانجے مولوی محمود الحق الثانی اپنے نانا شاہ سراج الیقین
صاحب قدس سرہ سے بیعت تھے۔ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ کو حضرت کی خدمت میں
سہارنپور حاضر ہو کر تجدید کی درخواست کی حضرت نے استخارہ کا حکم فرمایا اور بعد
استخارہ ان کے قلب پر وارد ہوا فاستجاب لھم ربھم انی لا اضیع عمل عامل
منکم چنانچہ انہوں نے پختگی ظاہر کی اور بعد مغرب حضرت نے بیعت فرما کر یہ مختصر
جامع مضمون ارشاد فرمایا "ہر چیز کی تحصیل سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مقصود
کیا ہے اور غیر مقصود کیا ہے تاکہ غلطی سے محفوظ رہے اور مقصود بخوبی ذہن نشین
اور متمیز ہو جائے یوں سمجھنا چاہیئے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد
مبارک میں ببرکت صحبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ ان ہی طاعات و
عبادات مشروعہ صوم و صلوٰۃ و جہاد وغیرہ کے حصول نسبت کا ہو جایا کرتا تھا۔ اور ایک
نظر اشرف الوریٰ میں کل مقامات طے ہو جاتے تھے۔ بعد اس کے جب اکابر امت مرحومہ
نے دیکھا کہ اس قوت قدسیہ کے مستور ہو جانے کے سبب اب یہ امور وصول الی اللہ کے
لئے کافی نہیں ہوتے تو انہوں نے خاص خاص طرق ذکر کے نکالے تاکہ کثرت ذکر سے
حق تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق پیدا ہو جائے۔ خواہ اس کو علاقہ محبت کہو یا بندگی اور
نیاز مندی کا۔ تو مقصود اذکار و اشغال سے یہ ٹھہرا کہ اسم کی کثرت اور تکرار سے مسمّی
یعنی حق تعالیٰ کا حضور ہو جائے۔ اسی کو حدیث شریف میں احسان سے تعبیر فرمایا ہے
اور ان تعبد ربک کانک تراہ اس کا حاصل اور مدلول ہے۔ باقی رہا یہ کیفیات اور
حالات یہ امور زائدہ ہیں مطلوب اور مقصود لذاتہ نہیں۔ کسی کو ہوتی ہیں اور کسی کو نہیں
ہوتیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے فرمایا ہے الکیفیات تربی بہا اطفال الطریقۃ طریق
باطن کے بچے ان سے پرورش کئے جاتے ہیں۔ پس طالب کو لازم ہے کہ مقصود کی طرف
ملتفت اور متوجہ رہے اور غیر مقصود کے درپے نہ ہو۔

حوادث پر صبر اور وقائع میں تقدیر پر نظر رکھنے کی تعلیم حضرت کے ہاں خاص اہتمام سے ہوتی تھی۔ حافظ فخر الدین صاحب کے والد ماجد کا انتقال ہوا تو حضرت نے تعزیت نامہ میں یہ الفاظ تحریر فرمائے "یہ ظاہر ہے کہ یہ دنیا گذشتنی اور گذاشتنی ہے۔ ہر ایک جزء اس کا ناپائدار ہے۔ اگرچہ مفارقت اعزہ بظاہر شاق ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو سب کے سب اپنے حقیقی دار کی طرف پس وپیش رجوع کر رہے ہیں اور ایک پائدار راحت کی طرف سفر ہو رہا ہے۔ اگر سچ پوچھو تو یہ نہایت لذیذ امر ہے۔ بہر کیف اللہ تعالی سب کو اپنے حبیب کی سچی متابعت کی توفیق عطا فرمائے جس کے ساتھ اخروی راحت وآرام وابستہ ہیں"۔ جنگ عظمی کے زمانہ میں جبکہ خانقاہوں، بتوں اور پہاڑی غاروں سے عجیب عجیب پیشینگوئیوں کی صدائیں آرہی تھیں۔ ایک خادم نے دریافت کیا کہ اب تو فقراء درویش بھی تبدیل سلطنت کا حکم لگانے لگے جس کی بنا پر بلاریمن اپنا جمع شدہ روپیہ لینے کے لئے مستعفی ہو رہا ہے لہذا میرے متعلق حضرت کا کیا مشورہ ہے؟ تو آپ نے تحریر فرمایا بھائی کسکو خبر ہے کہ کل کو کیا ہونے والا ہے تمہارا تو فنڈ میں ہزار دو ہزار ہی روپیہ ہوگا لوگوں کا تو کاروبار میں لاکھوں روپیہ لگا ہوا ہے۔ اگر ایسی موہوم باتوں پر وہ خیال کریں تو سب کاروبار بند ہو جائیں۔ پس تم سکون کے ساتھ اپنا کام کئے جاؤ۔ جو مشیت الٰہیہ ہوگی وہ خود ظاہر ہو جائے گی۔ ان باتوں پر التفات نہ کرو"۔

حضرت اپنے متوسلین کی تربیت محض قلم اور زبان ہی سے نہیں فرماتے تھے بلکہ مال اور جان سے بھی فرماتے تھے کہ کسی کو ناداری سے پریشان پاتے تو قرض یا ہدیۃً جس پر جتنی قدرت پاتے خود مدد فرماتے۔ کوئی سفارش چاہتا تو تحریراً وتقریراً سفارش فرماتے اور اسکی ہر ضرورت میں جتنا ہاتھ بٹا سکتے اس میں دریغ نہ فرمایا کرتے تھے۔ مولوی عبد الرحمن صاحب سلمہ خسرو دکن کے علاقہ صرف خاص تعلقہ ملوڑ کے صدر مقام قصبہ انوا کے باشندہ تھے اور ان کے باپ ہری رام نے کہ مرہٹہ متعصب ہندو خاندان کا تھا ان کا نام بلی رام رکھا تھا۔ اللہ

ﻉﻪ والد حافظ فخر الدین صاحب م

کی شان کہ ان کے قلب میں نورِ اسلام چمکا اور چودہ برس کی عمر تھی کہ باپ نے سرکاری مدرسہ میں بغرض تعلیم روانہ کیا تو اسکو بہانہ بنا کر گھر سے تن تنہا چلدیئے۔ اس خوف وہراس میں کہ کوئی عزیز قریب باخبر ہو کر پکڑ نہ لے منزل بمنزل چل کر ریلوے اسٹیشن پر آتے اور راستہ میں طرح طرح کی تکلیف اٹھا کر بمبئی پہنچے۔ یہاں علانیہ مشرف باسلام ہوئے اور اسلامی نام عبدالرحمن رکھا گیا۔ جو نور ان کے قلب میں چمکا تھا اس نے صرف اسلام پر قانع نہیں رکھا بلکہ ان کو گدگدایا کہ علم دین حاصل کریں۔ بمبئی میں چونکہ اہلِ وطن کے تجارتی تعلقات تھے اس لئے وہاں سے گھبرا کر دہلی آئے اور چھ مہینے میں قرآن شریف ختم کر کے ابتدائی تعلیم دینی شروع کر دی دہلی میں دل نہ لگا اور اس لئے مدرسہ مظاہر علوم میں آ گئے۔ یہاں پہنچکر تو گویا ماں کی آغوش میں پہنچگئے کہ حضرت نے سینہ سے لگا کر باپ اور ماں دونوں کو بھلا دیا۔ درسیات فارغ ہو کر سند لے چکے تو حضرت نے مدرسہ کا مدرس بنا دیا اور اپنے پاس سے جدا نہ ہونے دیا۔ پھر نکاح کا فکر کیا اور رشتہ تجویز فرما کر پیام لے گئے حتیٰ کہ مہر کی تقلیل پر خود زور دیا اور خود نکاح پڑھا کر روحانی بیٹے کو متاہل بنا بٹھایا۔

الحاصل چونکہ آپ مدنی مٹی سے پیدا ہوئے تھے اور تقدیر میں ہجرت و وفات لکھی گئی تھی اس لئے آپ نے ۱۶ رشوال سے ۱۵ ربیع الثانی تک ڈیڑھ سال کی رخصت مدرسہ سے لے کر دیارِ محبوب کا دفعتہ عزم کر دیا۔ اور اوائل شوال میں آپ نے اپنے عزیزوں دوستوں اور خدام سے رخصتی ملاقات کے لئے انبہٹہ گنگوہ دیوبند کاندھلہ اور میرٹھ کا سفر کیا کہ ایک ایک کے مکان پر گئے اور یہ الفاظ فرماتے کہ میرا جو گناہ معاف کرنا میں غریب جا رہا ہوں۔ کسی نے اگر جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کا سفر مبارک کرے اور بخیریت واپس لائے تو فرمایا بھائی جب میرا شباب تھا تو جب کبھی حاضر آستانہ ہوا ہوں یہی تمنا ساتھ لے کر گیا ہوں کہ وہاں کی پاک زمین مجھے قبضہ میں لیجاتے۔ اب جبکہ تمام میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے میرے ساتھ کے پڑھے ہوئے میرے ہمعصر عزیز دوست ایک ایک کر کے ملک بقا کو راہی ہو چکے

میں کب تک زندہ رہوں گا۔ اب اس توقع پر جارہا ہوں کہ شاید اب میرا وقت آگیا ہو اور مدینہ طیبہ کی خاک پاک مجھے نصیب ہوجائے اور جوار نبوی میں مجھ کو بھی جگہ مل جائے۔ دعا کرو حق تعالیٰ ایمان کے ساتھ اٹھنا نصیب فرمائے اور مراد پوری کرے" شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی سے فرمایا کہ میاں اپنے بچوں کا نکاح کردیتے تو ہم بھی شریک ہوجاتے۔ چنانچہ انہوں نے سلسلہ جنبانی کی اور خدا کی شان کہ چند ہی دنوں میں دونوں لڑکوں کا رشتہ پختہ ہوکر جلد سے جلد تاریخ بھی مقرر ہوگئی ورنہ برسوں ہیرا پھیری کرنا قومی رواج تھا۔ حضرت کے فرمانے کی برکت تھی کہ خود بخود سامان مہیا ہوگئے اور حضرت خوشی خوشی اس میں شرکت کے لیے میرٹھ تشریف لائے۔ یہاں بھی ایک ایک خادم کے مکان پر مستقل تشریف لے گئے اور آخری سلام فرما کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئے۔

حافظ فخر الدین صاحب نے عرض کیا کہ حضرت کے اس مبارک ارادۂ ہجرت سے خدام پریشان ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ ہم کیا کریں؟ فرمایا پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے اور سلسلہ اسی طرح چلتا رہا ہے کہ جب کوئی شیخ وصال کرتا ہے تو اس کے خلف کام کرتے ہیں اور ان سے مخلوق ہدایت وفیضان حاصل کیا کرتی ہے۔ پس میرے لوگوں کو چاہیئے کہ میرے خلفاء میں سے جس کی طرف چاہیں رجوع کریں اور اپنا کام کرتے رہیں۔ میں اگر ہندوستان ہی میں رہتا تو آخر کب تک زندہ رہتا۔ کوئی چیز باہر سے ہدیہ آئی اور حضرت نے حسب عادت گھر سے منگا کر مخلصین کے سامنے رکھی کہ کھائیں۔ مولوی زکریا بولے حضرت کے طفیل میں کیا کیا کچھ کھایا اور کھاتے ہیں۔ یہ سنکر فرمایا اب طفیل میں کھاتے ہو چند روز بعد انشاء اللہ مستقل کھاؤ گے کہ لوگ خود پیش کریں گے" کاندھلہ سے دہلی جاتے ہوئے ریل میں تنہائی پاکر میں نے عرض کیا کہ حضرت مبارک جگہ تشریف لے جارہے ہیں اس کی تو مسرت ہے مگر اپنی بیکسی کا قلق ہے کہ مولانا رائپوری حیات تھے تو حضرت کی مفارقت کا صدمہ وہاں حاضر ہوکر کم ہوجاتا

اور جب طبیعت گھبراتی تو رائپور جا کر سکون مل جاتا تھا اب جدھر نظر اٹھاتا ہوں کوئی اپنا نظر نہیں آتا۔ اتنا کہکر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے اور ہچکی بندھ گئی۔ حضرت بھی چشم نم ہوئے اور ذرا سکوت کے بعد فرمایا اللہ خلیفتی علیک انشاء اللہ کہیں جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور کوئی مشورہ کی ضرورت پیش آئے تو اپنے بھائیوں سے لیجو اور ان سے ملتے رہیو۔ غرض جلد جلد وہ آخری منظر ختم ہوگیا اور اوائل شوال میں حاضر ہوا تو شفقت کے ساتھ فرمایا لو بھئی اب ہماری تاریخ روانگی مقرر کردو کہ کس تاریخ کو یہاں سے چلیں بندہ ہی نے ۱۶ ر شوال مقرر کی کہ پنجشنبہ کا دن تھا مگر کیا خبر تھی کہ یہ تقرر آخری زیارت کا ہے جو اپنی زبان سے تجویز کر رہا ہوں۔ حضرت میرٹھ ہی میں تھے کہ حیدر آباد سے بلاوا آگیا اور مدرسہ کو نفع پہنچنے کی توقع تھی۔ ہرچند کہ لمبا سفر تھا مدت دراز بلکہ عمر بھر کے لئے قیام کی نیت سے سفر تھا سارا اسباب بندھوانا اور یہاں کے تمامی معاملات طے کرنا تھے ضعیفہ اہلیہ اور ان کے بیمار بھائی کو ساتھ لے جانا تھا اور پھر دو منو کے قریب رفقاء کی معیت تھی۔ اور ہر نزدیک و دور سب کو اطلاع ہو چکی تھی کہ ۱۶ ر شوال کو روانگی ہے اور اس لئے کوئٹہ اور کشمیر تک سے خدام رخصتی زیارت کے لئے آنے والے تھے۔ سب کچھ تھا مگر خداداد عزم بے نظیر ہمت مدرسہ اور کار تعلیم پر جان نثاری اور صدقات جاریات علمیہ کا شغف اور انہماک اتنا زبردست تھا کہ دنیا میں نظیر نہیں ملتی اس لئے یہیں سے ارادہ کر دیا کہ میں ۹ ر شوال کو حیدر آباد چلا جاؤں گا اور گھر والے حسب تجویز ۱۶ ر کو رفقاء کے قافلہ کے ساتھ روانہ ہوں میں وہیں سے بمبئی میں آملوں گا۔ چنانچہ آپ کہ گذرے جو عزم کیا تھا اور حیدر آباد روانہ ہوگئے۔ بندہ قافلہ کے ساتھ بمبئی تک گیا اور حضرت کا حیدر آباد لائن پر استقبال کر کے کہ مولانا رحیم بخش صاحب عاشقانہ طرز سے ہمراہ تھے قیام گاہ پر آیا۔ آخر چوتھے دن حضرت نے تاکیداً فرمایا کہ وطن

واپس جاؤ اور اب ٹھہرنا فضول ہے۔ وہ سماں عمر بھر نہ بھولوں گا۔ جب رخصت ہو کر عشا کے بعد چلا اور حضرتؒ گاڑی میں سوار کرانے کے لئے سڑک تک آئے۔ ہر چند عرض کیا کہ اندھیرا ہے راستہ خراب ہے وقت ناوقت ہے حضرت تکلیف نہ فرمائیں یہیں سے رخصت کر دیں مگر پدرانہ شفقت نے نہ مانا اور جب گاڑی پر سوار ہونے لگا تو حضرت نے چھاتی سے لگا لیا کہ میں رو رہا تھا اور حضرت کا قلب غیر معتدل حرکت کر رہا تھا۔ آخر ہوا جو ہونا مقدر تھا کہ حضرت مجھے دیکھتے رہے اور میں حضرت کو تکتا رہا یہاں تک کہ راستہ کے موڑ نے دو باپ بیٹوں کو ہمیشہ کے لئے جُدا کر دیا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد — روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

میرے لئے تو یہی آخری معانقہ تھا مگر آپ اپنے دو سو رفقا کی برات کے دولھا بنے ہوئے بیس دن بمبئی میں ٹھہرے کہ سب آپ ہی کی معیت کے شوق میں گھر دل سے نکلے تھے اور موجودہ جہاز یک مشت اتنے ٹکٹ نہیں دے سکتا تھا۔ آخر ۲ ذیقعدہ کو ذیانی جہاز میں آپ سوار ہوئے جس کے متعلق مشہور تھا کہ سب میں بُرا اور نہایت بوسیدہ و شکستہ جہاز ہے۔ خدا کی شان کہ اس کی رفتار اچھے جہازوں سے بھی بڑھ گئی اور ۱۷ ذیقعدہ کو آپ کامران میں بغرض قرنطینہ اُتر گئے۔ ۲۰ کو وہاں سے چل کر ۲۱ کو جدہ اور وہاں سے اونٹ کی سواری پر ۲۵ کو مکہ معظمہ پہنچ گئے مناسکِ حج سے فارغ ہو کر دار محبوب کا قصد فرمایا اور ۱۲ محرم ۱۳۱۵ھ کو حرم نبوی کی خاک پاک کا سُرمۂ چشم بنانا آپ کو نصیب ہوا کہ آپ کی عمر کا سوا برس باقی رہ گیا تھا۔ خوشی کی گھڑیاں قدرتی محسوس نہیں ہوا کرتیں۔ یہ زمانہ آپ کے لئے ایسی فرحت و سرور کا تھا کہ آپ کی تہتر سال ڈیڑھ ماہ کی عمر میں کوئی وقت بھی اس کی نظیر نہیں کہا جا سکتا۔ محبوب کا وطن، محبوب کا قرب وصال کی راتیں وصال کے دن جو کچھ بھی لذت ہو وہ تھوڑی ہے

پھر مشغلہ کلام محبوب کی شرح کا کہ اسی میں ہر آن و دماغ مشغول اور اسی میں زبان اور خیال منہمک یہی سبب ہے جس تمنا و شوق کی آگ اختتام میں جسل رہی تھی اس پر ٹھنڈے پانی کی پھوار ہی اور جس توقع و امید میں زندگی کے پل اور لمحے گذار رہے تھے خدا خدا کر کے اس کے بر آنے کی صورت نظر آئی خدام درد فرقت میں بیتاب مگر آپ وہاں سے مجھے تحریر فرماتے ہیں کہ میں ابتداء سفر سے اس وقت تک بحمد اللہ نہایت راحت و آرام سے ہوں اور حق تعالیٰ شانہ کے اس بے انتہا انعام پر کہ مجھ جیسے ناکارہ کو یہاں پہنچا دیا نہایت شادان و فرحاں ہوں ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیم صبح تیری مہربانی!

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد و آلہ وصحابہ و بارک وسلم۔

۱۷ صفر ۱۳۴۶ھ کو آپ کے رفقاء واپس ہند ہوئے اور مولوی محمد زکریا صاحب اور مولوی محمد جلیل صاحب کاندہلوی کے سوا سب کو آپ نے رخصت کر دیا۔ اب ہمہ تن تالیف بذل المجہود میں اشتغال ہو گیا اور وسط شعبان میں آپ اس کو ختم فرما کر بالکل فارغ ہو لئے۔ بذل کا ختم ہونا تھا کہ ادھر لقاء رب کا شوق بڑھنے لگا اور ادھر کشش اپنا کام انجام دینے لگی ؎

اگر از جانب معشوق نباشد کششے   طالب عاشق بیچارہ بجائے نرسد

تعلقات سے یکسوئی ہوتے لگی خلوت و تنہائی سے انس بڑھ گیا تلاوت کلام اللہ کی رغبت اتنی ہوئی کہ دیکھنے والے ترس کھاتے اور عرض کرتے کہ اس ضعیفی میں تعلیق ابو داؤد کی ناقابل برداشت محنت سے دماغ تھک لیا ہے اب اس پر رحم فرمایئے۔ مگر آپ جواب دیتے کہ دماغ سے کام ہی لینا کیا باقی ہے

ے صبح کو کھانے سے قبل تین چار پارے خود تلاوت فرماتے اور بعد ظہر دو پارے اہلیہ کو سناتے بعض آیات پڑھتے بے اختیار گریہ غالب ہو جاتا اور رونے لگتے تھے پھر ترجمہ فرما کر گھر والوں کو سناتے ۱۲

جو رعایت کروں اچھا ہے جس نے دیا ہے اسی کے کام آئے ہے
جان بھی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قیس سے پوچھو کر لیلیٰ کے ساتھ باتیں کرنے میں کیا مزہ ہے؟ اور اس سے اندازہ کرو کہ محب خدا کو کلام اللہ کی تلاوت میں کیا لذت آنی چاہیئے ماہ رمضان قریب آچکا تھا اور عمر کا آخری رمضان تھا کہ تجسروعن الخلائق وملکوتی صفت نصیب ہونے کے لیئے آئیندہ کبھی یہ وقت نصیب ہونے والا نہ تھا۔ اس لیئے آپ نے اپنے متوسلین کو بھی خطوط لکھ دیئے کہ آئیندہ جواب کا انتظار نہ دیکھیں۔ چنانچہ احقر کے پاس جو ۲ر شعبان کا لکھا ہوا خط آیا تو اس میں تحریر فرمایا تھا۔ اب رمضان شریف آگیا خطوط کا لکھنا دشوار ہوگا۔ لہذا جواب کا انتظار چھوڑ دیجیئے اور رمضان بعد مولوی زکریا وغیرہ احباب حج کے لیئے واپس ہوں گے اور بعد فراغ حج وطن کو واپس ہو جائیں گے پھر جواب کا ملنا نہایت ہی مشکل اور دشوار ہے۔ بہر کیف اب آپ اپنی خیریت سے اکثر اطلاع کرتے رہیں اور ممکن ہوا تو کبھی کبھی میں بھی اپنی خیریت لکھا دیا کروں گا۔" ادھر سے امراض وعوارض کے بھرمار پیش ہونے لگے کہ اول نزلہ کا سخت دورہ ہوا اور پھر بخار آیا کہ کئی دن تک آستانہ محبوب تک چلنے کی طاقت نہ رہی۔ مگر رمضان کی خاطر افاقہ ہوا اور وہ مبارک مہینہ اس مجاہدہ تامہ میں گذرا کہ بیان کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ رات دن کے چوبیس ۲۴ گھنٹے اور دو چار فنجان چائے اور بمشکل آدھی چپاتی۔ دن بھر تلاوت اور رات بھر سماعت کہ شاید سونے کے لیئے تین ۳ گھنٹے بھی نہیں تھے۔ رمضان ختم نہ ہوا تھا کہ تپ لرزہ شدید ہوا اور اسی میں فالج کا اثر۔ مگر آپ نے ہندوستان میں اطلاع نہ دی کہ خدام پریشان ہوں گے۔ چنانچہ ۱۲ر شوال کو بندہ کے پاس خط تحریر فرمایا۔ تو اس میں لکھا کہ گذشتہ ہفتہ میں مختصر خط لکھوا چکا ہوں مگر اس میں

اپنی بیماری کی خبر قصداً نہیں لکھی تھی کہ باعثِ تشویش ہوگی۔ اب الحمد للہ
افاقہ ہے اور طبیعت رُو بصحت ہے۔ اس لئے اطلاعاً لکھتا ہوں۔ آخر
رمضان المبارک میں مجھے کچھ تپ لرزہ کی سخت شکایت ہوئی مگر دو روز
بعد وہ تو بالکل جاتی رہی لیکن بائیں ٹانگ اور بائیں ہاتھ میں ایک خدر
واسترخاء کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے چلنا پھرنا بالکل ناممکن
ہو گیا تھا۔ اس میں کسی قسم کا درد یا تکلیف بالکل نہیں تھی صرف قوت مشی
اور قوت ماسکہ کام نہیں کرتی تھی۔ اب الحمد للہ کہ بہت افاقہ ہے اور
طبیعت گویا اچھی ہے۔ بے تکلف تو اب بھی چلنا یا پکڑنا نہیں ہوتا مگر تھوڑا
بہت چل سکتا ہوں۔"

اُس وقت آپ نے لکڑی اور آدمی کے سہارے آستانہ محبوب پر
حاضر ہونا شروع کر دیا کہ پاؤں بہ تکلیف اٹھاتے اور گویا گھسیٹتے ہوئے
چلتے تھے مگر پنجگانہ اوقات میں حاضر ہو جایا کرتے تھے۔ ذیقعدہ میں
آپ نے مولوی زکریا صاحب اور مولوی جلیل صاحب کو بھی رخصت
فرما دیا اور اب عجیب کیفیت میں دن گذرنے لگے کہ شوق تقاضا کرتا تھا جلد
وہ دن آئے جس میں قفسِ عنصری کا جال ٹوٹے اور ادب کہتا تھا کہ چپ
رہو مشیتِ الٰہیہ کے غلام بنے ہوئے کام کئے جاؤ۔

یہ دن کچھ عجیب حسرت اور مسرت سے مخلوط گذر رہے تھے کہ ان خوابوں
کا اور رؤیاء مبشرات کا خیال آتا جو عرصہ سے بار بار دیکھ رہے تھے تو اُمید
بڑھتی تھی کہ ضرور یہاں کی مٹی میں ملنا نصیب ہوگا۔ اور شاہنشاہ کی بے
نیازی و جلالتِ شان پر نظر جاتی تھی تو خوف ہوتا تھا کہ دیکھئے کیا مقدر ہے
یا امید وصالِ حقیقی شادمان تھے تو خوف قطعیت و اندیشۂ ہجر سے ترساں
و لرزاں ہے

ز جاں دادن نمی ترسم من اے جاں   ازیں ترسم کہ از تو دُور مانم

آپ نے ۵ ذیقعدہ ۴۶ھ کو مظاہر علوم کے ظاہری تعلق سے انقطاع کی تحریر سرپرستان کے نام رجسٹری کرا کے بھیجدی تھی کہ میں جب سہارنپور سے رخصت ہوا تھا تو میں نے ہجرت کی نیت نہیں کی تھی اور نہ اب تک ہجرت کی نیت کی ہے کیونکہ مجھ کو معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ کے نزدیک میں اس مقدس ارض کے قابل ہوں یا نہیں۔ اگر حق تعالیٰ شانہٗ کو مجھ جیسے نابکارہ کا قیام اس مقدس زمین میں منظور نہ ہوا تو اپنے سیاہ اعمال کے ساتھ واپس ہوجاؤں گا لیکن ابھی تک مجھ کو بحمد للہ یہاں دلبستگی ہے اور یہاں سے واپسی کے لئے مضطر نہیں ہوا۔ لہذا یہاں کے قیام سے کسی طرح برداشتہ خاطر نہیں ہوا ہوں۔ اگر خدا نخواستہ میں یہاں نہ ٹھہرایا گیا اور واپسی ہوئی تو بھی میں اس قابل نہیں رہا ہوں کہ مدرسہ کی کوئی خدمت بعوض تنخواہ بجا لاسکوں۔ اس لئے جو انتظامات مدرسہ کے عارضی طور پر کئے گئے تھے ان سب کو مستقل کردیا جائے۔ مگر اس کے چند ماہ بعد جبکہ آپ اپنے رفقاء کو ہندوستان بھیج چکے تو ہجرت کی نیت پختہ کرلی اور ایک دن گھر میں تشریف لاکر متعلقین سے فرمایا کہ اب مجھے اپنے قیام کا یقین ہوگیا ہے لہذا میں تو ہجرت کی نیت کرچکا۔ چنانچہ بقیہ ایام جتنے بھی گذرے وہ مہاجرانہ اقامت کے گذرے۔ حتٰی کہ ربیع الثانی کا دوسرا جمعہ پڑھکر عمر شریف کا آخری ہفتہ آیا اور آپ نے بعض علماء مدینہ کے اصرار پر ابوداؤد پڑھانا شروع کردیا کہ مولوی سید احمد صاحب قاری بنے اور مولانا عمری مدرس حرم شریف سامع۔ شنبہ اور یکشنبہ کو بعد عصر دو دن مدرسہ شرعیہ مدینہ میں درس دیا تھا کہ تیسرے دن دوشنبہ کو جب کہ ظہر کی نماز حرم شریف میں پڑھکر واپس ہوتے تو راستہ میں فرمایا سینہ کے اوپر کے حصہ میں پھر آج کچھ درد محسوس ہو رہا ہے" اس سے تین چار دن پہلے بھی اسی طرح ایک درد محسوس ہوا تھا جو مالش اور سینک

سے دو تین گھنٹے میں جاتا رہتا تھا۔ گھر پہنچکر مالش اور سینک ہوئی مگر عصر کے وقت معلوم ہوا کہ درد تو کم ہے لیکن ضعف بہت ہے کہ حرم شریف جانے کی ہمت نہیں ہے۔ چنانچہ عصر کی نماز مکان پر مولوی سید احمد صاحب کے اقتدا میں پڑھی اور باوجود ضعف کے کھڑے ہو کر پڑھی۔ پھر ضعف اور بڑھا کہ بدن میں بجائے حرارت کے خنکی اور پسینہ تھا۔ مغرب کی نماز کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے بیٹھکر پڑھی بلکہ مولوی سید احمد سے فرمایا کہ مختصر اور جلدی پڑھائیں عشا کی نماز کے لئے نیچے اترنا بھی دشوار ہو گیا اور پلنگ ہی پر بیٹھکر پڑھی۔ کرب اور بے چینی کے ساتھ ساتھ ضعف بڑھتا رہا اور تمام رات کلمہ و استغفار اور درود ورد زبان رہا۔ مطلق نیند نہیں آئی۔ صبح سہ شنبہ نمودار ہوئی تو نماز فجر بھی پلنگ پر بیٹھکر ادا فرمائی مگر پسینہ اور برودت برابر بڑھتا جا رہا تھا اور وقت پکار رہا تھا کہ یہ صبح ہوش و حواس کی آخری صبح ہے جس میں دوا دارو کا خدام کو اہتمام رہا مگر نہ پیشاب ہوا اور نہ کوئی دوا ہضم ہوئی۔ ظہر کے وقت اتنا ضعف ہو گیا کہ وضو بھی کرنے کی طاقت نہ رہی اور تیمم فرما کر پلنگ پر بحالت قعود نماز پڑھی اور اس کے بعد حرکت و سکون بے تکلف اور دوسرے کا محتاج ہو گیا۔ عصر کے وقت ہوش و حواس میں اختلال شروع ہو گیا اور امام کی آواز پر خود رکوع نہ کیا بلکہ جب حاجی مقبول احمد صاحب نے رکوع کا لفظ کہکر اشارہ کیا تو رکوع کیا اور جب سجدہ کو کہا تو سجدہ کر لیا۔ اس طرح چار رکعت بمشکل پوری کرا کے آپ کو لٹا دیا گیا اور اس کے بعد سکوت بڑھتا گیا کہ اس سے پہلے بات کا سمجھنا اور جواب دینا یا از خود کوئی بات فرمانا برابر جاری تھا۔ مغرب کے وقت مولانا سید احمد صاحب نماز پڑھانے کے لئے آئے تو بالکل غفلت تھی کہ نماز کے واسطے پکار کر اطلاع کی مگر کچھ جواب نہ ملا اور نہ اٹھنے کی طاقت محسوس ہوئی۔ خدام نے اپنی نماز علیحدہ پڑھ لی مگر انتظار رہا کہ کچھ التفات یا افاقہ ہو تو نماز کے لئے عرض کیا

جائے گا۔ لیکن بالکل دنیا سے قطع تعلق ہوچکا تھا اور سوائے پاس انفاس کے نہ کوئی حرکت تھی نہ کسی بات کا جواب نہ سوال۔ شب میں ایک دو مرتبہ ماء زمزم ڈالا گیا تو اس کے حلق سے اترنے میں بھی تکلف ہوا۔ لہذا وہ بھی ترک کر دیا گیا۔ پورے چوبیس ۲۴ گھنٹے اس عالم خموشی میں گذار کر یوم چہار شنبہ کہ عرب میں ۱۶ اور ہندوستان میں ۱۵ ربیع الثانی تھی منزل مقصود پر پہنچ لئے کہ بآواز بلند اللہ اللہ کہنا شروع کیا اور دفعتہً آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گئے۔ ہر چند کہ وقت تنگ تھا مگر غیب سے عجلت کے سامان مہیا ہو گئے غسل کا انتظام ہوا۔ سید احمد نواب صاحب مزور نے نہلایا۔ ابو مسعود نے پانی دیا اور مولوی سید احمد اور مولوی عبد الکریم نے مدد پہنچائی۔ جلد جلد جنازہ تیار ہوا اور آستانہ محمدیہ پر باب جبریل کے باہر صلوۃ جنازہ کی جگہ لا رکھا گیا۔ صلوۃ مغرب سے فراغ کے بعد مدرسہ شرعیہ مدینہ کے صدر مدرس مولانا شیخ طیب نے نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع کو لے چلے۔ باایں ضیق وقت کہ اطلاع کا موقع ہی نہیں ملا جنازہ کے ساتھ اتنا ازدحام تھا۔ کہ بہتیروں کو باوجود کوشش کے کندھا دینا نصیب نہ ہوا اور سریر کو صرف ہاتھ لگا دینا ہی غنیمت معلوم ہوا ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو   تو کجا بہر تماشہ مے روی

آخر آپ کا جسد انور جو آتش محبت میں گھل گھلکر مغز استخواں رہ گیا تھا تیرہ اہل بیت کے متصل عشاء سے قبل آغوش لحد کی سپرد کر دیا گیا اور وہ شب شب عروس قرار پائی کہ دیرینہ مراد جو صدہا مرتبہ آپ کی زبان اور قلم سے نکلی تھی کہ کاش میری مٹی بقیع کی خاک پاک میں مل جائے الحمد للہ پوری ہو گئی۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون ۔ للہ ما اخذ ولہ ما اعطی۔ کل من علیہا فان و یبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام ۔

مرض کے پہلے ہی دن آپ نے فرمایا تھا۔ "میں نے ایک خواب دیکھا ہے

کہ میں ایک مکان میں ہوں جس کے نیچے تہ خانہ ہے اور چھت اس کی تختوں سے پٹی ہے۔ اس میں سے دو تختے نیچے کو جھکے ہیں اور نکل گئے ہیں۔ پس میں بہت سہولت سے اس تہ خانہ میں اتر رہا ہوں۔ وہاں پہنچکر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بہت بڑا اور اچھا چونہ قلعی کیا ہوا روشن مکان ہے۔ اور اس میں ایک طرف دروازہ ہے جس سے روشنی وغیرہ آتی ہے لیکن لوٹنے کا ارادہ انہیں تختوں کی طرف سے جدھر سے آیا ہوں کر رہا ہوں۔ اتنا کہنے کے بعد فرمایا اس کے بعد میرا خیال دوسری طرف چلا گیا اور پھر آنکھ کھل گئی۔ اس کے بعد خود ہی تعبیر بتائی کہ وقت تو جب بھی ہو مگر یہ میرے لئے بشارت ہے کہ انشاء اللہ قبر میں سہولت ہوگی۔ اور وہ دروازہ وہ دروازہ جنت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے"۔

مولوی سید احمد صاحب خواب اور تعبیر سنکر جب باہر چلے گئے تو آپ نے اہلیہ کو پاس بلایا اور التجا کے درجہ میں یہ الفاظ فرمائے کہ جو کچھ تمہارے حقوق میرے ذمہ ہوں یا میں نے تم کو برا بھلا کہا ہو وہ سب اللہ واسطے معاف کر دو۔ اس کے بعد ان کے بھائی حاجی مقبول احمد سے کہ مدت سے حضرت کے پاس رہتے تھے فرمایا کہ میں تم پر بہت مرتبہ خفا ہوا ہوں اور اکثر برا بھلا کہا ہے تم بھی معاف کر دو۔

آخیر زمانہ میں اہلیہ کے ساتھ حسن معاشرت بہت بڑھ گیا اور ان کی بیوگی کے تصور سے ان کی دلدہی زیادہ فرمانے لگے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے فرمانے لگے کہ مدینہ منورہ میں رہ کر یہاں کے مصائب و تکالیف پر اگر کوئی صبر کرے تو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں خاص طور پر اس کی شفاعت کروں گا"۔ اہلیہ نے عرض کیا کہ مجھے تو کوئی تکلیف یا مصیبت نہیں ہے میں تو بحمد للہ بہت راحت سے ہوں۔ فرمایا آخر کچھ تو ہے ہی۔ یہی دل دہی ٹکڑے سے کی۔ غرض بات کو ٹلا دیا لیکن ان کو چند ہی روز بعد

بیوہ بننے پر معلوم ہوا کہ مصیبت کیا چیز ہے اور اس پر صبر کس قدر کٹھن ہے۔ مگر اللہ رے ہمت کہ شوہر کی آخری وصیت کو پورا کر دکھایا کہ بعالم غربت و تنہائی یکایک دُنیا آنکھوں میں تاریک ہوگئی اور بچاس برس کے محسن سرتاج کو صرف چوبیس ۲۴ گھنٹے بعالم ہوش اور چوبیس ۲۴ گھنٹے بعالم بیہوشی بیمار دیکھکر اچانک بقیع کو جاتا ہوا دیکھا مگر نہ چیخ نکالی نہ آہ و زاری کا تنور بھڑکایا۔ کلیجہ تھام کر بیٹھ گئیں۔ مگر صدمہ نے اندر ہی اندر چر لیا اور آخر کار چار مہینے ہوئے کہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ کو قبل مغرب خود بھی دُنیا سے رخصت ہو کر اگلے دن پنجشنبہ کو شوہر کے قدموں میں دفن ہوگئیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

شیخ سعید تکرونی مدنی کہتے ہیں کہ مجھے ہمیشہ سے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا بہت شوق تھا اور اکثر اس مطالب کے لئے دُعائیں پڑھا کرتا مگر زیارت سے مشرف نہ ہوتا تھا۔ جس زمانہ میں حضرت مولاناؒ مدینہ منورہ تشریف لائے تو قبل اس کے کہ مولانا سے میری شناسائی ہو میں نے خواب دیکھا کہ سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور مجھ سے کسی نے کہا کہ یہ رسول اللہ ہیں اور ایک عالم ہندی کا خلیل احمد نام کا انتقال ہوگیا ہے اُن کے جنازہ کی شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں۔" چنانچہ میں نے اپنا خواب اُسی زمانہ میں مولانا شیخ الفا ہاشم سے بیان کیا تھا۔ جب مولوی زکریا صاحب وغیرہ ہندوستان واپس ہوئے اور مولانا واپس نہ ہوئے تو شیخ الفا ہاشم نے مجھ سے کہا کہ تمہارے خواب کی صداقت کے بعض قرائن ظاہر ہو رہے ہیں کہ مولانا نے اقامت کی نیت فرمالی اور ہندوستان نہیں گئے۔"

اخیر زمانہ میں آپ کا اندرونی سوز وگداز زیادہ بڑھ گیا تھا کہ ضبط نہ فرما سکتے اور بات بات پر رقت وگریہ طاری ہوجاتا تھا۔ بزرگوں کی عمروں کا ایک بار ذکر ہو رہا تھا فرمانے لگے دو سال زندہ رہا تو اپنے شیخؒ

کی عمر کو پہنچ جاؤں گا۔ اتنا کہہ کر رو دیئے اور فرمایا سب چلے گئے میں ہی رہ گیا۔ ایک مرتبہ کسی نے عرض کیا کہ حضرت ہندوستان کا کب تک ارادہ ہے؟ تو چشم پر آب ہو گئے اور فرمایا اب تو بقیع کا ارادہ ہے۔ آخرت کا قیامت کا یا بزرگوں کا جس وقت بھی ذکر آتا تو آبدیدہ ہو جاتے اور آواز میں تغیر آجاتا تھا۔ آپ کے ہاتھ پر بدراس کی طرف کے ایسے لوگ جو نہ اُردو سمجھتے تھے نہ عربی بواسطہ ترجمان بیعت ہوئے تو مولانا اصغر حسین صاحب نے کہا حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب کو مالٹا میں لے جا کر بٹھا دیا اور حضرت کو یہاں پہنچا دیا کہ دور دور دراز کے لوگ جن کے طلب فیض کا کہیں گمان بھی نہ ہوتا فیض حاصل کرنے لگے یہ سُنکر آپ پر گریہ غالب ہو گیا اور فرمایا بھائی وہ بڑے لوگ تھے۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ لوگوں نے کہتے کہتے مجھے تو شیخ بنا دیا۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مدرسہ سے ڈیڑھ سال کی حاصل شدہ رخصت ہی آپ کی حیات دینویہ کی مدت تھی کہ اس میں نہ ایک دن کم ہوا نہ زیادہ۔ یہ رخصت کا زمانہ ۱۶ ربیع الثانی کو ختم تھا اور سورج ڈوبنے میں گھنٹہ بھر باقی تھا کہ آفتاب علم و عمل غروب اور مدرسہ کا چمکتا ہوا چراغ یکدم گُل ہو گیا۔ مگر بیسیوں مشعلیں روشن کر کے دُنیا میں چھوڑ گیا کہ شریعت و طریقت کے مہکتے ہوئے پھُول گلزار خلیل میں تا قیامت کھلتے رہیں۔ ان مجسم صدقات جاریات کے علاوہ آپ کی تصانیف ہدایات الرشید مطرقۃ الکرامہ اتمام النعم تنشیط الآذان المہند اور سب سے آخری تالیف بذل المجہود عبد کا نہ کارنامے ہیں جو ایصالِ ثواب کا سلسلہ تا دیر قائم رکھیں گے اور خود مدرسہ عالیہ مظاہر علوم تو ایسی مستقل یادگار ہے کہ اس کے علمی سمندر سے بواسطہ و بلا واسطہ جو طالب علم بھی دینی نفع اٹھائے گا وہ آپ ہی کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہے گا۔ نیز روحانی سلسلے میں آپ کی یادگار آپ کے

وہ خلفاء ہیں جن کے قلوب میں آپ آتشِ محبت الٰہیہ سلگا کر دُنیا سے اٹھے ہیں کہ سب سے اوّل حضرت حافظ قمرالدین صاحبؒ امام مسجد سہارنپور اور پھر حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کاندہلوی کہ اعلیحضرت امام ربانیؒ کی وفات کے چند ہی روز بعد آپ کی طرف سے مجاز ہوئے مگر افسوس کہ دونوں حضرات وصال فرما کر سہارنپور کے گورستان میں سو گئے۔ نیز مولانا مولوی عبداللہ صاحب گنگوہیؒ جن کو غالباً ۱۳۲۷ھ میں اجازت ملی تھی تپ کہنہ میں وفات پا کر کاندہلہ میں مدفون ہوئے فرحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

صرف سلسلۂ نقشبندیہ میں آپ نے مکہ مکرمہ میں الحاج محمد حسینؒ حبشی کو بھی اجازت دی تھی مگر ترکی انقلاب میں وہ کہیں چلے گئے اور اب پتہ نہیں کہ زندہ ہیں یا وصال فرما گئے۔ ہاں جو حضرات بقید حیات اور سلسلہ خلیلیہ کے مایۂ ناز ہیں وہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب مقیم نظام الدین دہلی۔ جناب حافظ فخرالدین صاحب ریلوے ملازم غازی آباد مولانا ظفر احمد صاحب مفتی خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔ مولانا حافظ فیض الحسن صاحب گنگوہی مقیم کانپور۔ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور اور مولانا رشید احمد صاحب سلمہ کرس الجمن ہدایت الرشید قصبہ گروٹ ریاست ہلکر ہیں۔ متعنا اللہ بطول بقائہم تلک عشرۃ کاملۃ۔

ممکن ہے اور کوئی صاحب بھی مجاز ہوں کہ حضرت کے الطاف خدام پر بیش از بیش تھے مگر کام کے لئے یہ حضرات کافی ہیں۔ اس لئے حضرت کے متوسلین یا دیگر حضرات طالبینِ سلوک میں جس کو بھی اکتساب کا شوق ہو ان حضرات میں جس سے طبعی اُنس پائیں اُن کی طرف رجوع کریں انشاءاللہ محروم نہ رہیں گے۔ ہر چند کہ بڑوں کو دیکھ لینے والی نظر چھوٹوں کو موقع نہیں سمجھتی مگر یاد رکھیں کہ پھر ایسے بھی نصیب نہ ہوں گے کہ زمانہ قحط الرجال کا ہے۔

اب میں ناظرین سے رخصت ہوتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہٗ

مجھے اور آپ کو اور تمامی امت محمدیہ کو توفیق بخشے کہ سنت کو اپنے دائرۂ اعمال کا مرکز بنائیں اور عادات ہوں یا عبادات۔ اقوال ہوں یا افعال حرکات ہوں یا سکنات۔ تفکرات ہوں یا تخیلات ہر امر اور ہر حال میں طریقۂ محمدیہ علیٰ صاحبہا کو مطمح نظر قرار دے کر محبانہ وعاشقانہ مگر عاقلانہ نہ دیوانہ طریق پر اللہ جل جلالہ کی رضا جوئی میں اپنی عمر کو ختم کردیں۔ اور اگر شامت اعمال سے یہ درجہ نصیب نہ ہو تو کم سے کم سنت کی عظمت اور متبعین سنت کے ساتھ محبت اور ان کے قدم بقدم چلنے کی رغبت قلب میں ضرور ہو کہ بس یہی کام آنے والی چیز ہے۔

نیز درخواست ہے کہ جو حضرات اس سے نفع اٹھائیں میرے لئے دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ اپنی محبت اور اپنے حبیب کا اتباع نصیب فرمائے اور دُنیا سے حلاوتِ ایمان کے ساتھ اٹھائے۔

عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبدہٖ ورسولہٖ سیدنا ومولانا وقائدنا وامیرنا وشفیعنا وہادینا ونبینا ومرشدنا محمد وآلہٖ وصحبہٖ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

بندۂ ناچیز عاشق الٰہی عفی عنہ

تمت بالخیر

تذکرۃ الخلیل

حیات طیبہ

مرشد الکل تاج المحدثین زبدۃ [illegible] سراج الصالحین

الامام الہمام [illegible] سیدنا خلیل احمد المدنی المہاجر قدس سرہ

مؤلفہ

حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مکتبہ قاسمیہ

[illegible] لاہور